بلوغ المرام
اردو ترجمہ
مِن أدلّةِ الأحکامِ
جلد اوّل
تألیف / ابو الفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی
شارح / مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری
دار السّلام
کتاب و سنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

بلوغ المرام
مِن أدلّةِ الأحكامِ
جلد اوّل
تألیف
ابو الفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی
(۷۷۳-۸۵۲ھ)
اتحاف الکرام شرح بلوغ المرام
شارح
مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری
مترجم
مولانا عبدالوکیل علوی
تصحیح و تنقیح
مولانا ارشاد الحق الاثری
دار السلام
پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
ریاض - لاہور

فہرست مضامین

جلد اوّل

جلد دوم

فہرست ائمہ مشاہیر
(حالات زندگی)

فہرست اسماء الرواۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

دارالسلام -- الریاض' لاہور -- اپنی علمی و دینی مطبوعات کی وجہ سے دینی اور علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ الحمدللہ' اس کی مطبوعات ہی اس کا بہترین تعارف ہیں.جو تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ بھی ہیں' زبان و بیان کے لحاظ سے معیاری بھی' اور طباعت و کتابت کے ظاہری حسن و جمال سے آراستہ بھی۔

اس کے اسی معیار اور کام نے اسے نہ صرف پاک و ہند کا ایک معیاری نشریاتی ادارہ بنا دیا ہے بلکہ اسے ایک بین الاقوامی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص اور اس کی مہربانی کا نتیجہ اور کارکنان ادارہ اور اس سے وابستہ اہل علم و تحقیق کی محنت و جانفشانی کا صلہ ہے' بس پر ہم بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز اور وابستگان ادارہ کے مشکور ہیں۔ جَزَاهُمُ اللهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ، وَوَفَّقَنَا اللهُ وَإِيَّاهُمْ لِمَا يُحِبُّ وَيَرْضَى

ادارے کی مطبوعات میں ایک اہم عربی کتاب "بلوغ المرام فی ادلۃ الاحکام" بھی ہے' ہم نے اسے پہلی مرتبہ جیبی سائز میں نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع کیا' اس سے قبل اسے مختصر عربی شرح کے ساتھ شائع کیا تھا' یہ شرح عالم اسلام کی ممتاز شخصیت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کردہ ہے۔

"بلوغ المرام" پاک و ہند کے دینی مدارس میں بھی داخل نصاب ہے اور علمی و دینی حلقوں میں بھی متند اول۔ اس لیے اس کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ حدیث کا یہ مجموعہ اپنے ایجاز و جامعیت کے اعتبار سے یقیناً بے مثال ہے' چنانچہ ہم نے اس کی اسی حیثیت کے پیش نظر اسے اردو میں مولانا مبارکپوری حفظہ اللہ کی شرح کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا' تاکہ اردو دان حلقہ بھی اس سے

استفادہ کر سکے۔

چنانچہ اس کے لیے ہم نے اپنے فاضل دوست اور برادر محترم مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کی خدمات حاصل کیں' انہوں نے اسے اس کی عربی شرح سمیت اردو کے قالب میں ڈھال دیا' فاضل محقق مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (فیصل آباد) نے اس پر نظرثانی فرمائی' اس کے بعد بھی اس کی نوک پلک درست کرنے میں ادارے کے بعض اور رفقاء نے بھی حصہ لیا۔

عزیزم حافظ عبدالعظیم سلمہ اللہ تعالیٰ میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ اس سارے کام کی نگرانی میں انہوں نے بڑی محنت فرمائی اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس طرح رفیق ادارہ جناب محمود الحسن اسد نے بھی اس کی تصحیح و نظرثانی میں بڑی پرخلوص محنت کی ہے۔ جَزَاهُمُ اللهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ

اس تمام تر سعی و کاوش کے باوجود اگر اس میں کچھ فروگزاشتیں رہ گئی ہوں تو قارئین کرام ان سے ہمیں آگاہ فرمائیں' ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں مزید اصلاح کر دی جائے گی۔ علمی و تحقیقی کاموں میں اصلاح و نظرثانی کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے' اس لیے ادارہ اس کو قارئین کی تجاویز و اصلاح کی روشنی میں مزید بہتر بنانے میں کبھی تامل نہیں کرے گا۔

خادم' توحید و سنت

عبدالمالک مجاہد

دارالسلام۔ الریاض لاہور

ربیع الاول ۱۴۱۸ھ / جولائی ۱۹۹۷ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا وَبَعْدُ:
حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب "بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام" اپنے موضوع میں درج ذیل متعدد خصائص کی بدولت نمایاں اور ممتاز حیثیت کی حامل ہے' یہ کہ مؤلف نے اس میں احکام کی احادیث میں سے ایسی احادیث کے جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے جو عموماً صحیح اور قوی ترین ہیں' جس سے اس فن کا حسن و جمال کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اور لمبی احادیث کا شاندار انداز میں اختصار پیش کیا اور حدیث کو ائمہ' حدیث کی طرف منسوب کرنے میں بڑی وسعت سے کام لیا ہے اور صحت و حسن اور ضعف کے اعتبار سے ہر حدیث کا درجہ بیان کرنے کا اعتناء کیا ہے' جیسا کہ بہت سی علل کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے۔ واضح ہو کہ ان کے انتہائی عمدہ اور نفیس کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ آپ حدیث بیان کرنے کے بعد حدیث کے بعض طرق میں وارد متعدد ٹکڑے اور اضافے بھی بیان کرتے ہیں' جو مطلق کو مقید اور مجمل کو مفصل بنانے اور مغلق کو واضح' تعارض کو رفع اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا فائدہ دیتے ہیں' بلکہ بعض دفعہ یہ اضافے اختلاف کے موقع پر ایسی نص ثابت ہوتے ہیں' جو تاویلات کا قلع قمع اور بحث و تحقیق سے مستغنی کر دیتی ہے۔

مذکورہ بالا اور دیگر متعدد خصوصیات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہل علم میں اس کتاب کو مقبول عام بنایا' مشرق و مغرب کے طلبہ کے ہاتھوں کا زینہ بنی اور اہل مدارس نے اسے نصاب میں شامل کر لیا اور اس فن کے عالی مقام علماء نے اس کی شروح و توضیحات کا اہتمام کیا اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

سابق الذکر اہتمام و اعتناء کے باوجود متعدد بھائیوں نے اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اس کتاب کی ایسی مختصر مگر نفیس شرح لکھنے کی تجویز پیش کی' جس میں قدیم و جدید انداز کی معروف و مشہور شروح کے التزام کے ساتھ ساتھ معانی کی تفہیم اور خاص طریقے سے ان کی تسہیل کے پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہو' چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے ہوئے اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں

میرے اور اہل علم کے لیے مفید اور نافع بنائے گا' اس عمل عظیم کو شروع کیا' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اہل اور اس پر قادر ہے۔

یاد رہے کہ قاری کو میری اس لطیف شرح میں بعض مقامات پر طوالت محسوس ہو گی' جو کہ اس شرح میں میرے عام اسلوب کے برعکس ہو گی' تاہم یہ اس وقت ہو گا جب میں کسی ایسے عمدہ فائدہ کا اثبات کرنا چاہوں جو عام کتابوں میں ناپید ہو یا میں یہ خیال کروں کہ حق اکثریا جملہ شارحین کے مذہب کے برعکس ہے یا میں ایسے غامض اور مخفی امور پاؤں جن کے حل میں شارحین نے محض احتمالات پر بھروسہ کیا ہو' جب کہ وہ طبعی' تاریخی' جغرافیائی اور دیگر قسم کی تحلیل کی روشنی میں علمی اور دقیق بحث کے محتاج ہوں' چنانچہ ایسے مقامات پر میں بحث میں کچھ طوالت دینے پر مجبور ہوا تاکہ حق اور صحیح مسلک واضح اور نمایاں ہو سکے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور وہی مجھے کافی اور اچھا کارساز ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ

صفی الرحمٰن مبارکپوری
شعبان ۱۳۹۴ھ

مؤلف کتاب کے مختصر حالات

ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن احمد کنانی شافعی' المعروف ابن حجر عسقلانی' سنت نبوی کا علم بلند کرنے والے قاضی القضاۃ اور حفاظ و رواۃ میں منفرد ہیں۔ دس شعبان ۷۷۳ھ کو مصر میں پیدا ہوئے اور مصر ہی میں پرورش پائی اور نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور الحاوی اور مختصر ابن حاجب اور دیگر کتب یاد کیں اور اپنے کسی ایک وصیت کرنے والے کے ساتھ مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور وہاں اہل علم سے سماع کیا' پھر آپ کو طلب حدیث کا شوق ہوا تو آپ حجاز' شام اور مصر کے کبار شیوخ الحدیث سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہوئے' چنانچہ آپ نے دس سال تک علم حاصل کرنے کے لیے زین عراقی کے پاس قیام کیا اور بلقینی' ابن الملقن اور دیگر اہل علم سے فقاہت حاصل کی' آپ کو جلیل القدر ائمہ و شیوخ الحدیث کے پاس بیٹھنے اور علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا' جو کسی دوسرے کو میسر نہ آیا' جیسا کہ متقدم الذکر ائمہ و شیوخ نے آپ کو فتویٰ دینے اور تدریس کرنے کا اجازت نامہ عطا کیا۔ اور آپ نے دونوں اصول یعنی کتاب و سنت اور دیگر علوم عز بن جماعہ سے' لغت المجد فیروز آبادی سے' عربی زبان عماری سے' ادب و عروض بدر مشتگی سے اور کتابت جماعہ سے حاصل کی اور فنون و علوم میں اس قدر سعی کی کہ ان کی چوٹیوں کو چھونے لگے اور قرأت سبعہ میں قرآن مجید کا کچھ حصہ تنوخی سے پڑھا۔

پھر علم حدیث کی نشرواشاعت کی طرف متوجہ ہوئے اور مطالعہ' قرأت' تدریس و تصنیف اور افتاء کی صورت میں اس پر جمے رہے اور متعدد جگہوں میں تفسیر' حدیث' فقہ اور وعظ و نصیحت کی تدریس کی اور ازھر' جامع مسجد عمرو اور دیگر مقامات پر خطبہ دیتے رہے اور اپنے سینے میں محفوظ خزینے کی املاء کروائی اور بڑے بڑے فضلاء اور نامور علماء آپ سے فیض یاب ہوئے اور آپ کے علمی چشمے سے سیراب ہونے کے لیے آپ کے پاس آتے رہے۔

آپ کی تصانیف ۱۵۰ کتب سے متجاوز ہیں۔ علم حدیث کے فنون میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں آپ نے ضخیم کتب تصنیف نہ کی ہوں' اور آپ کی یہ تصانیف آپ کی حیات ہی میں طباعت کے زیور سے آراستہ ہو گئی تھیں۔ اور بادشاہ اور امراء ایک دوسرے کو ان کتب کے تحائف دیا کرتے تھے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ اگر "فتح الباری شرح صحیح بخاری" کے علاوہ آپ کی کوئی اور تالیف نہ بھی ہوتی تو یہی

فتح الباری ہی آپ کی شہرت اور آپ کے عظیم المرتبت ہونے پر واقفیت حاصل کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آپ کی یہ کتاب سنت نبوی کے لیے قاموس کا مقام رکھتی ہے۔ ۸۱۳ھ میں اس کا مقدمہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے ۸۱۷ھ میں اس کی تالیف کا آغاز کر کے شروع رجب ۸۴۲ھ میں اس کی تکمیل کی۔ اور اس کی تکمیل پر آپ نے ایک دعوت عام کا اہتمام کیا' جس میں تمام عام و خاص مسلمان شریک ہوئے۔ اس دعوت پر آپ نے پانچ سو دینار خرچ کیے اور ایک بادشاہ نے آپ سے یہ کتاب طلب کر کے تین سو دینار میں خرید لی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سنت نبوی کی نصرت پر نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔ آمین!

اسی طرح حدیث کی کتابوں میں سے ان کی ایک کتاب "بلوغ المرام فی ادلۃ الاحکام" جو اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں ہے' گو یہ کتاب مختصر ہے' مگر اس کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں جن میں ایک یہی مولانا صفی الرحمان مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی اتحاف الکرام ہے جسے اردو دان طبقہ کے لیے اردو پیرائے میں ڈھالا گیا ہے۔

پہلے پہل آپ (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) مصری علاقوں کے قاضی بنے' پھر چند سال کے بعد مستقل طور پر شاہی علاقے بھی آپ کی قضاء میں شامل کر دیے گئے' جو اکیس سال سے زائد عرصہ تک آپ کے زیر قضاء رہے' شروع میں آپ قاضی بننے سے پرہیز کرتے رہے' حتیٰ کہ بادشاہ وقت نے آپ کو ایک خاص مقدمے میں قاضی مقرر کیا' پھر آپ بلقینی کے اصرار پر ان کے نائب بنے' بلقینی کی جانشینی کی وجہ سے انہیں کئی اور لوگوں کا نائب بننا پڑا' یہاں تک کہ آپ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے' آپ کی یہ تقرری ۱۲ محرم بروز ہفتہ ۸۲۷ھ عمل میں آئی' پھر سات مرتبہ آپ کی قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرری ہوئی اور سات ہی مرتبہ اس سے الگ ہوئے' پھر جمادی الثانی ۸۵۲ھ کو آخری مرتبہ اس عہدہ سے دستبردار ہوئے اور اسی سال میں آپ کی وفات ہوئی۔

اس کے علاوہ آپ' تواضع' بردباری' صبر و تحمل' خوش طبعی' وسعت و ظرافت' قیام و صیام' احتیاط و ورع' جود و سخاء' برداشت' باریک و لطیف کلام اور عمدہ اور نفیس نوادر کی طرف میلان میں مشہور و مختار تھے' جیسا کہ آپ ائمہ متقدمین و متاخرین اور اپنے پاس بیٹھنے والے ہر چھوٹے بڑے کا ادب و احترام کرنے میں منفرد اور بے مثال تھے۔

آپ بروز ہفتہ آٹھ ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو عشاء کی نماز کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اچھا ثواب اور بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

تلخیص از "التبر المسبوک وغیرہ"

کلمۂ مؤلف

بسم الله الرحمن الرحیم

آغاز اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے

الحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى نِعَمِهِ الظَّاهِرَةِ وَالبَاطِنَةِ قَدِيْماً وحَدِيثاً، والصَّلاةُ والسَّلامُ عَلَى نَبِيِّهِ وَرَسُولِهِ مُحَمَّدٍ وآلِهِ وصَحْبِهِ الَّذِيْنَ سَارُوا فِي نُصْرَةِ دِينِهِ سَيْراً حَثِيثاً، وعلى أَتْبَاعِهِمُ الَّذِين وَرِثُوا العِلْمَ، وَالعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، أَكْرِمْ بِهِم وَارِثاً ومَوْرُوثاً.

ظاہری، باطنی، قدیم و جدید انعامات و احسانات کی بنا پر تعریف صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے اور درود و سلام اس کے نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ پر اور (مزید برآں) اس کی آل اور اس کے اصحاب پر جنہوں نے آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی نصرت و اشاعت کے لیے اپنی پوری تندہی اور برق رفتاری کا مظاہرہ کیا اور تابعین کرامؒ پر جو "العلم" کے وارث ہوئے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ علماء ہی انبیاء کرامؑ کے وارث ہوتے ہیں۔ کیا خوب ہیں یہ وارث اور کتنا عمدہ اور اچھا ہے یہ ورثہ۔

أما بَعدُ، فَهذَا، مُخْتَصَرٌ يَشْتَمِلُ عَلَى أُصُولِ الأَدِلَّةِ الحَدِيْثِيَّةِ لِلأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ، حَرَّرْتُه تَحرِيْراً بَالِغاً، لِيَصِيْرَ مَنْ يَحفَظُه مِنْ بَين أَقْرَانِهِ نَابِغاً، ويَسْتَعِيْنَ بِهِ الطَّالِبُ المُبْتَدِي، ولاَ يَسْتَغْنِي عَنْهُ الرَّاغِبُ المُنْتَهِي.

حمد و صلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو احادیث میں احکام شرعیہ کے بنیادی دلائل پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کی تنقیح و تہذیب میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے کام لیا ہے تاکہ اسے یاد کرنے والا اپنے ساتھیوں میں بحیثیت ماہر اور بڑی شان والا بن جائے۔ مبتدی طالب علم اس کے ذریعہ مدد طلب کرے اور منتہی شوقین بھی اس کی اہمیت و ضرورت سے مستغنی نہ رہ سکے۔ (یعنی یہ کتاب مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔)

وَقَدْ بَيَّنْتُ عَقِبَ كُلِّ حَدِيثٍ مَنْ أَخْرَجَهُ مِنَ الأَئِمَّةِ، لِإِرَادَةِ نُصحِ

میں نے ہر حدیث نقل کرنے کے بعد اس محدث کا نام بھی بیان کر دیا ہے جس نے امت کی خیر

الأُمَّة، فَالمُرَادُ بِالسَّبْعَةِ: أَحْمَدُ والبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ وأَبُو دَاوُدَ والنَّسَآئِيُّ والتِّرْمِذِيُّ وَابنُ مَاجه، وَبِالسِّتَةِ: مَنَ عَدَا أَحْمَدَ، وبِالخَمْسَةِ: مَنْ عَدَا البُخَارِيَّ وَمُسْلِماً، وَقَدْ أَقُولُ: الأَرْبَعَةُ وأَحْمَدُ وَبِالأَرْبَعَة: مَنْ عَدَا الثَّلاثَةَ الأُوَلَ، وَبِالثَّلاثَةِ: مَنْ عَدَاهُمْ وَالأَخِيرَ، وبالمُتَّفَقِ: البخاريُّ وَمُسْلِمٌ، وَقَدْ لاَ أَذْكُرُ مَعَهُمَا غَيْرَهُمَا، وَمَا عَدَا ذَلِكَ فهُو مُبَيَّنٌ.

خواہی کے لیے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ جہاں میں نے ﴿ اخرجه السبعة ﴾ نقل کیا ہے اس سے میری مراد امام احمد رحمہ اللہ ' بخاری رحمہ اللہ ' مسلم رحمہ اللہ ' ابوداؤد رحمہ اللہ ' ترمذی رحمہ اللہ ' نسائی رحمہ اللہ اور ابن ماجہ رحمہ اللہ ہیں اور جہاں ﴿ اخرجه الستة ﴾ نقل کیا ہے اس سے مراد امام احمد بن حنبل کے ماسوا باقی تمام آئمہ ہیں اور ﴿ اخرجه الخمسه ﴾ سے مراد بخاری و مسلم کے علاوہ باقی پانچ امام ہیں اور کبھی میں ﴿ اخرجه الاربعة ﴾ کہتا ہوں اور ﴿ اربعة ﴾ سے مراد پہلے تین امام یعنی احمد ' بخاری اور مسلم کے علاوہ باقی آئمہ مراد ہوتے ہیں اور ﴿ اخرجه الثلاثة ﴾ سے مراد پہلے تینوں اور آخری کے علاوہ بقیہ تین امام مراد ہیں (یعنی امام ابوداؤد ' نسائی ' ترمذی) اور ﴿ متفق عليه ﴾ سے مراد بخاری اور مسلم ہیں اور بسا اوقات میں بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے آئمہ کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں۔ متذکرہ بالا صورتوں کے ماسوا باقی تمام صورتوں میں روایت کرنے والے آئمہ کا ذکر ہر موقع پر نمایاں طور پر ذکر کر دیتا ہوں۔

وَسَمَّيْتُه **بُلُوغُ المُرَامِ مِنْ أَدِلَّةِ الأَحْكَام**، واللَّهَ أَسْأَلُ أَن لاَّ يَجْعَلَ مَا عَلِمْنَاهُ عَلَيْنا وَبَالاً وَأَنْ يَرْزُقَنَا العَمَلَ بِمَا يَرْضَاهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى.

میں نے اس مختصر کتاب کا نام ﴿ بلوغ المرام من ادلة الاحكام ﴾ تجویز کیا ہے۔

آخر میں رب کائنات کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ ہمارے علم کو ہمارے لیے وبال نہ بنائے بلکہ اپنے پسندیدہ اور محبوب عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

لغوی تشریح: ﴿ بسم الله الرحمن الرحيم ﴾ سے مؤلف نے اپنی کتاب کا آغاز قرآن پاک کے طریقہ کی پیروی اور نبی ﷺ سے ایسے پسندیدہ اسلوب کے ساتھ ابتداء کرنے کی تعمیل کے لیے کیا ہے۔ ﴿ الحمد ﴾ میں حمد سے مراد ہے بہترین تعریف۔ بہترین اسلوب کے ساتھ جو انسان کے اختیار میں ہو۔ ﴿ النعم ﴾ ن پر دو اعراب منقول ہیں۔ کسرہ اور فتح۔ یہ جمع ہے اس کا واحد نعمة ہے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ ﴿ الظاهره ﴾ سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن کا انسان ادراک کر سکتا ہے اور شعور رکھتا ہے۔ ظاہری انعامات و احسانات میں انسان کی شکل و صورت کا موزوں و مناسب بنانا اور لذیذ و عمدہ طرح طرح کے کھانے جو

اس کے منہ کے ذریعہ شکم میں جاتے ہیں شامل ہیں اور ظاہری نعمت سے اسلام بھی مراد ہے۔ ﴿ الباطنه ﴾ ایسے انعامات جن کا انسان ادراک نہیں کر سکتا۔ بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو ارض و سماء میں ہی نہیں بلکہ انسان کے اپنے نفس میں پائی جاتی ہیں۔ جن کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ایسی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا انسان کو پہلے علم نہیں تھا پھر بعد میں اس کے علم میں آئی ہیں۔ باطنی نعمتوں میں عیوب پر پردہ پوشی بھی شامل ہے۔ قدیم و جدید سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن سے انسان نے اپنی زندگی کی سہولت اور آسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ عقل و خرد کو استعمال کر کے معیشت و معاشرت اور تمدن کے لیے ایجادات کی ہیں۔ دور جدید کے انکشافات نے انسانی تمدن کو ایسی نعمتوں سے روشناس کرایا ہے جن کے ذریعہ انسان بحر و بر تو درکنار فضا میں ہوا سے تیز رفتار ایجاد کی وجہ سے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ چند لمحوں میں ہزارہا میل دور بیٹھے ہوئے انسان سے گفتگو کر سکتا ہے۔ ﴿ الصلوۃ ﴾ کے معنی دعا رحمت' بزرگی اور عزت و تکریم کے ہیں ﴿ السلام ﴾ آفات ظاہری و باطنی سے تحفظ۔ مصنف نے کتاب کا آغاز حمد و ثنا کے بعد قرآن مجید میں رب کائنات کے ارشاد صلوا علیه و سلموا تسلیما کی تعمیل اور سلف کی پیروی میں صلوٰۃ و سلام سے کیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ رب العزت نبی کریم ﷺ کی عزت افزائی فرمائے اور آپ ﷺ کی شان بلند کرے۔ ﴿ ال ﴾ آدمی کے گھر کے افراد بھی اس میں شامل ہیں اور اس کے پیروکار بھی۔ یعنی اس لفظ میں بڑے لوگوں کی اولاد اور ان کے اتباع و پیروکار بھی شامل ہیں۔ مثلاً ال ابراہیم سے جس طرح ان کی اولاد مراد ہے اسی طرح ان کے متبعین بھی مراد ہیں بعینہ جس طرح ال فرعون میں فرعون کی اولاد بھی شامل ہے اور اس کے نظریہ کے پیروکار بھی۔ ﴿ صحبه ﴾ فتح یعنی زبر کے ساتھ۔ صاحب کی جمع ہے اور صحابی سے مراد وہ شخص ہے جس نے نبی کریم ﷺ سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان کی حالت میں وفات پائی ہو۔ اس میں اور بھی اقوال ہیں مگر زیادہ صحیح یہی ہے۔ ﴿ الحثیث ﴾ تیز رفتاری' تیز گامی۔ ﴿ اتباع ﴾ ہمزہ کے فتح یعنی زبر اور تاء کے سکون۔ تابع کی جمع ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اسلام کے حاصل کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔ تحصیل علم کے بعد اس کے دقیق مسائل نکالے۔ یہ بزرگ اگر جانفشانی اور سعی و جدوجہد کر کے علم حقیقی ہم تک نہ پہنچاتے تو آج انسانیت کفر و الحاد کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی پھرتی۔ ﴿ اکرم بهم فعل تعجب ﴾ یعنی کتنے معزز و مکرم ہیں یہ لوگ۔ ﴿ وارثا ﴾ اکرم ھم میں ضمیر مجرور کی تمیز کے طور پر ہے۔ اسے منصوب لایا گیا ہے۔ یعنی تابعین صحابہ کرامؓ سے دین حقیقی کے علم کو وراثت میں پانے کی وجہ سے بہت ہی معزز و مکرم ہیں۔ ﴿ اما بعد ﴾ حرف شرط ہے اور بعد کے "د" پر ضمہ ہے گویا مبنی بر ضمہ ہے۔ یہاں ظرف واقع ہو رہا ہے مضاف الیہ کی نیت موجود ہے مگر اضافت بظاہر موجود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حمد و صلوٰۃ کے بعد۔ ﴿ اصول ﴾ جمع ہے اصل کی۔ جس پر کسی چیز کا انحصار ہو۔ ﴿ الادلۃ ﴾ ہمزہ کے فتح "د" کے کسرہ اور "ل" کی تشدید دلیل کی جمع ہے۔ لغوی اعتبار سے دلیل کا معنی مطلوب و مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ ﴿ الاحکام ﴾ حکم کی جمع ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خطاب جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو۔ ﴿ حررته ﴾ تحریر سے ہے جس کے معنی تنقیح تہذیب کے ہیں۔ ﴿ نابغه ﴾ عظیم الشان ماہر کو کہتے ہیں۔ ﴿ المبتدی ﴾ فن

حدیث کا ابتدائی طالب علم۔ ﴿المنتھی﴾ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مطلوب و مقصود کی انتہا تک پہنچے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مختصر مگر جامع کتاب ابتدائی طلباء سے لے کر کامل ماہرین دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ ﴿عقب﴾ "ع" کے فتح اور "ق" کے کسرہ۔ بعد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ﴿من اخرجه﴾ اس میں "من" موصولہ ہے اور اخرجہ کے ساتھ مل کر بینت کا مفعول ہے اس میں اخراج' تخریج اور روایت کے معنی میں استعمال ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ محدث کا اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ کتاب میں بیان کرنا اور مصنف نے مخرجین کے ذکر کے ساتھ ہی حدیث کی حیثیت بھی بیان کر دی ہے کہ یہ حدیث محدثین کی نظر میں صحیح ہے حسن یا ضعیف ہے۔ ﴿النصح﴾ بھلائی اور خیر خواہی۔ ﴿فالمراد﴾ کا مطلب ہے میری مراد۔ یعنی اس کتاب میں جب میں بالسبعۃ کہتا ہوں تو میری مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اور جب میں حدیث بیان کرنے کے بعد "اخرجه السبعة" کہتا ہوں تو اس کا بھی وہی مطلب ہوتا ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ﴿عدا﴾ غیر اور سوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ ان الفاظ میں سے ہے جو استثناء کے لیے ہیں اور اس کے بعد آنے والا لفظ منصوب ہوتا ہے اور کبھی میں ﴿الاربعۃ واحمد﴾ کہتا ہوں تو اس سے مراد ﴿اخرجه الخمسه﴾ کی طرح پانچ محدث مراد ہوتے ہیں ﴿الاربعۃ واحمد﴾ اور ﴿اخرجه الخمسه﴾ بیان کا طریق مختلف ہے مگر مفہوم و مراد دونوں سے ایک ہی ہے۔ ﴿الثلاثۃ الاول﴾ الاول ہمزہ کے ضمہ اور "و" کے فتح۔ اول کی جمع ہے اور ثلاثہ سے میری مراد پہلی تین کتابوں بخاری' مسلم اور احمد کے علاوہ ہے۔ ﴿الاخیر﴾ سے ابن ماجہ مراد ہے۔ یعنی پہلی تین اور آخری ابن ماجہ کے علاوہ باقی ابوداؤد' ترمذی اور نسائی رہ جاتی ہیں بالثلاثۃ سے یہی تین مراد ہیں۔ ﴿معھما﴾ اس سے مراد بخاری و مسلم کے ساتھ۔ ﴿غیرھما﴾ حدیث کی نسبت بخاری و مسلم کی جانب ہے۔ حدیث کے مرتبہ صحت کے لیے کافی ہے مگر مزید برآں تائید کے لیے ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ﴿ما عدا ذلک﴾ ان سات محدثین کے علاوہ اور محدثین نے بھی روایت کیا ہے ان کے اسماء گرامی بھی واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ ﴿المرام﴾ کے معنی طلب کے ہیں اور مراد سے مطلوب ہے۔ ﴿واللہ﴾ مفعول مقدم ہے اس لیے منصوب ہے اسال کا مفعول ہے۔ مفعول کو مقدم بیان کرنے سے مقصود کلام میں حصر کرنا ہے یعنی میں صرف اللہ تعالیٰ سے دست سوال دراز کرتا ہوں۔ بجز اس کے کسی اور سے سوال نہیں کرتا۔ ﴿ما علمناہ﴾ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر جعل فعل کا پہلا مفعول ہے اور دوسرا مفعول و بالاً ہے۔ وبال کی "و" پر فتح ہے اس کے معنی برے انجام کے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ اللہ کے حضور استدعا کی ہے کیونکہ نیکی جب تک خالصۃ اللہ کے لیے نہ کی جائے تو وہ برائی اور گناہ بن جاتی ہے اور ان یرزقنا کے معنی ہیں یوفقنا یعنی ہمیں اللہ توفیق دے۔

١- كِتَابُ الطَّهَارَةِ

طہارت کے مسائل

١ - بابُ المِيَاه

پانی کی اقسام

(مختلف ذرائع سے حاصل شدہ پانی کا بیان)

(١) عَنْ أَبي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قال رسولُ الله ﷺ في البَحْرِ: «هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ والحِلُّ مَيْتَتُهُ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ وَابْنُ أَبي شَيْبَةَ وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ والتِّرْمِذِيُّ، وَرَوَاهُ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سمندر کے پانی کے متعلق (ایک شخص کے استفسار کے جواب میں) فرمایا کہ "اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ابن ابی شیبہ کے ہیں۔ ابن خزیمہ اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کو مالک' شافعی اور احمد نے بھی روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿كتاب الطهارة﴾ کتاب' کتب سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے اور ملانے کے ہیں اور مصنفین کے نزدیک کتاب مسائل کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو مستقل حیثیت کے حامل ہوں چاہے وہ کئی انواع یعنی مختلف ابواب پر مشتمل ہو یا نہ ہو۔ اور طہارت پلیدی یا ناپاکی کے ازالے کو کہتے ہیں۔

﴿باب المياه﴾ باب ایک ہی نوع سے متعلق مسائل جس میں بیان کئے جائیں اسے باب سے تعبیر کرتے ہیں اور ﴿مياه﴾ ماء کی جمع ہے "مویہ" اس کی تصغیر آتی ہے۔ بدوی عربوں نے اس کی صورت بگاڑ کر "مویہ" کر دی ہے۔ مصنف اس کو جمع اس بنا پر لائے ہیں کہ اس باب میں وہ کنوئیں کا پانی' دریا اور سمندر کا پانی اور چشموں اور باران رحمت کے پانی کا ذکر کریں گے۔

﴿ عن ابی هريرة ﴾ اس کا تعلق محذوف سے ہے جو روی یا مروی وغیرہ ہو سکتا ہے اور ﴿ فی البحر ﴾ کا مطلب ہے دریا و سمندر کے پانی کا کیا حکم ہے۔ پھر ﴿ الطهور ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے "طاء" کے فتح سے اگر اسے ادا کیا جائے تو اس صورت میں وہ اسم مراد ہوگا جو مطہر یعنی پاک کرنے والا کے معنی میں ہوگا۔ دریا و سمندر کا پانی بذات خود پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ ﴿ الحل ﴾ "حاء" کے کسرہ اور "لام" کی تشدید کے ساتھ۔ اس کے معنی ہیں حلال۔ ﴿ میتته ﴾ سے وہ جانور مراد ہے جو پانی میں ہی صرف زندہ رہ سکتا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد نہیں جو پانی کے باہر بھی زندہ رہ سکتا ہو۔

حاصل کلام: یہ حدیث دراصل ایک سائل کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یوں روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں' ہمارے ساتھ تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے' اب اگر ہم اس پانی سے وضو کریں تو پیاسے مرجائیں تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ فرمایا "وہ پانی پاک ہے۔"

یہ حدیث دلیل ہے' اس کی کہ سمندری پانی بغیر تفصیل کے مطلقاً پاک ہے۔ نیز یہ کہ سمندری جانور بھی حلال ہیں خواہ وہ کتے اور خنزیر کی شکل کے ہوں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی کو حلال سمجھتے ہیں۔ نبی ﷺ نے سائل کو سمندری پانی کی حلت کے ساتھ بغیر سائل کے دریافت کئے' اس میں طبعی موت مرے ہوئے جانور کی حلت بھی مزید بتا دی۔ اس لئے کہ جو آدمی سمندری پانی کی حلت کے متعلق شک میں مبتلا ہو سکتا ہے وہ تو اس میں مرے ہوئے جانور کی حلت کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ شک وشبہ میں رہ سکتا ہے۔ خاص کر جب کہ قرآن مجید میں مردار کی حرمت نص سے واضح ہے مگر اس کی تفصیل نہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ سمندر میں سفر کرنے والا اس صورتحال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کا جواب حکمت و دانائی اور شفقت پر مبنی ہے۔ یہ سائل کون تھا؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبدالله المدلجی رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبدالعرکی رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبیدالعرکی رضی اللہ عنہ تھا اور عرکی سمندر و دریا میں کشتی چلانے والے کو کہتے ہیں۔ یعنی ملاح۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سمندری پانی کا پاک ہونا' اس سے وضو کرنا' اس کو (صاف کر کے) اپنے استعمال میں لانا صحیح ہے اور اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو جانور صرف سمندر کے ہیں (یعنی وہ سمندر کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے) وہ سب حلال ہیں' چاہے سمندر میں مرجائے یا نکالنے کے بعد مر جائے اور یہ کہ سمندر میں سفر کرنا جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت ابوہریرة رضی اللہ عنہ ﴾ وہ جلیل القدر صحابی رسول ہیں جن سے سب سے زیادہ احادیث نبوی ہم تک پہنچی ہیں۔ صاحب استیعاب کی رائے کے مطابق ان کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن تھا۔ قبیلہ دوس سے تھے۔ ۷ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اٹھتر سال کی عمر پائی اور ۵۹ھ میں اس دنیائے فانی

سے کوچ کیا اور مدینہ منورہ کے بقیع غرقد نامی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان سے کم و بیش ۵۳۸۴ احادیث مروی ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲) وعَنْ أَبِيْ سَعِيدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قال رسول الله ﷺ: «إِنَّ المَاءَ طَهُورٌ لاَ يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ». أَخرَجَهُ الثَّلاَثَةُ وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "پانی پاک ہے' اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔" (اس روایت کو ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور احمد نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الخدری﴾ "خاء" کے ضمہ اور "د" کے سکون کے ساتھ۔ "خدرة" کی طرف منسوب ہے جو انصار کا ایک معروف و مشہور قبیلہ ہے۔ ﴿طهور﴾ "طاء" کے فتح کے ساتھ اس کے معنی پاک کے بھی ہیں اور پاک کرنے والے کے بھی۔ ﴿لا ينجسه﴾ میں ينجسه تنجيس سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اسے نجس یعنی ناپاک نہیں کرتی۔ مفہوم و معنی یہ ہے پانی میں نجاست کا محض گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔

حاصل کلام: حدیث کا مقصود یہ ہے کہ پانی پاک ہے محض نجاست کے واقع ہونے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ظواہر اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مشروط بات کی ہے کہ جب تک اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف عملاً رونما نہ ہو جیسا کہ آگے ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بیان ہوا ہے لیکن ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہم بئر بضاعہ کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ (بئر بضاعہ ایک پرانا کنواں تھا جس میں حیض والے کپڑے' کتے کے گوشت کے ٹکڑے اور بدبودار چیزیں ڈالی جاتی تھیں) آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا "پانی تو پاک ہے۔" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ الماء میں جو "لام" ہے یہ لام عہد کا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ سائل کے ذہن میں جس کنوئیں کا پانی مراد تھا اور وہ بئر بضاعہ کا پانی تھا' اس کنوئیں کی چوڑائی چھ ہاتھ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس میں پانی ناف سے اوپر کی حد تک رہتا تھا اور جب کم ہوتا تو ناف سے نیچے کی حد تک ہو جاتا۔ جیسا کہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب پانی اتنی کثیر مقدار میں ہو تو محض نجاست کا اس میں گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مطلق پانی میں نجاست گرنے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ (اگر مذکورہ کثیر مقدار ہو تو اس میں نجاست واقع ہونے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا ورنہ ناپاک ہو جاتا ہے)۔

راوی حدیث: ﴿ابو سعيد الخدری رضی اللہ عنہ﴾: ابوسعید کنیت ہے اور ان کا اسم گرامی سعد بن مالک بن سنان رضی اللہ عنہ ہے۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے ان کا تعلق تھا۔ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خدرہ

ایک انصاری قبیلہ ہے جس کی طرف یہ منسوب ہیں۔ تقریباً چھیاسی برس کی طویل عمر پائی اور ۷۴ھ کے آغاز میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ ۔ ان سے بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔

(۳) وعَنْ أَبِي أُمامَةَ البَاهِلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِنَّ المَاءَ لاَ يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ إِلاَّ مَا غَلَبَ عَلَى رِيحِهِ وَطَعْمِهِ وَلَوْنِهِ». أخرجُهُ ابنُ ماجه، وَضَعَّفَهُ أبو حاتِمٍ، وَلِلْبَيْهَقِيِّ: الماءُ طَهُورٌ إلاَّ إن تَغَيَّر رِيحُه أو طَعْمُه أو لَونُه بنَجاسَةٍ تحدُثُ فِيْهِ.

حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یقیناً پانی کو کوئی چیز ناپاک و پلید نہیں کرتی الا یہ کہ پانی پر اس ناپاک و پلید چیز کی بو' ذائقہ اور رنگت غالب ہو جائے۔" (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابوحاتم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے) بیہقی میں الفاظ حدیث اس طرح ہیں "پانی پاک ہے (اور پاک کرنے والا بھی ہے) بجز اس کے وہ ناپاک پانی میں گرنے والی چیز پانی کی بو' ذائقہ اور رنگت کو تبدیل کر دے۔"

لغوی تشریح: ﴿ لا ینجسہ ﴾ تنجیس سے ہے۔ محض نجاست کا پانی میں گر جانا اسے ناپاک نہیں بناتا۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ پانی کی مقدار کثیر ہو یعنی دو بڑے مشکوں کی مقدار کے برابر ہو۔ پھر اگر پانی دو بڑے مشکوں کی مقدار کے مساوی ہو اور اس میں نجاست گر کر اس کی بو' ذائقہ اور رنگت میں سے کوئی ایک وصف بھی تبدیل کر دے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اس میں پانی کی مقدار قلیل یا کثیر کا اعتبار نہیں ہو گا﴿ تحدث فیہ ﴾ معنی نجاست پانی میں واقع ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی سند میں رشدین بن سعد راوی متروک ہے اور وہ اسے موصول بیان کرتا ہے جبکہ راشد بن سعد جو ثقہ راوی ہے اسے مرسل بیان کرتا ہے۔ یہ حدیث اگرچہ اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے تاہم معنوی اعتبار سے اس کی صحت پر اجماع ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ اور ابن منذر رحمہ اللہ نے اس بات پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے کہ پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ نجاست کے اس میں گرنے سے اس کے تین اوصاف میں سے کسی ایک کی تبدیلی کی صورت میں وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی کو اگر زیادہ مقدار مثلاً دو قلے' یا اس سے زیادہ ہو تو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔ ہاں اگر نجاست گرنے کی وجہ سے اس کا رنگ' بو یا مزہ بدل جائے تو وہ پلید ہو جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوامامۃ الباھلی رضی اللہ عنہ ﴾: ابوامامہ کنیت۔ امامہ ھمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ باھلہ قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے باھلی کہلائے۔ ان کا نام صدی (تصغیر) بن عجلان ہے۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ مصر میں سکونت اختیار کی پھر حمص کی جانب منتقل ہو گئے۔ ان کی وفات ۸۱ھ یا ۸۶ھ میں ہوئی۔ شام میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی رضی اللہ عنہ یہی ہیں۔

(٤) وَعَنْ عَبدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِذَا كَانَ المَآءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحمِلِ الخَبَثَ». وفي لَفظٍ: «لَمْ يَنْجُسْ». أخرَجَهُ الأربَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيمَةَ وابنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب پانی کی مقدار دو بڑے مٹکوں کے برابر ہو تو وہ نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا۔" ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ "پانی نجس (ناپاک) نہیں ہوتا۔" (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ قلتین ﴾ "قاف" کے پیش اور "لام" کی تشدید۔ بڑے مٹکے کو کہتے ہیں۔ اس کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی وجہ سے اس کی مقدار میں اختلاف رائے واقع ہوا ہے۔ لیکن عرب میں ہجر کے مٹکے مشہور و معروف تھے۔ شعراء نے اپنے اشعار میں بکثرت اس کا استعمال کیا ہے اور امثال میں بھی اسے بہت بیان کیا ہے۔ اس طرح حدیث میں بیان شدہ مٹکے سے مراد یہی ہجر کا مٹکا ہے اور دوسرا کوئی مراد نہیں ہو سکتا اور ان کے مٹکے میں اڑھائی سو رطل پانی کے سمانے کی گنجائش تھی لہٰذا دو قلوں کے پانی کی مقدار پانچ صد رطل ہوئی جو موجودہ زمانہ کے پیمانہ کے مطابق دو سو ستائیس کلوگرام ہوتی ہے۔ ﴿ یحمل الخبث ﴾ الخبث میں "خاء" اور "با" دونوں پر زبر ہے۔ معنی اس کے نجاست اور گندگی کے ہیں۔ ﴿ لم یحمل الخبث ﴾ کے معنی ہیں کہ پانی اس نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا' قبول کرنے سے انکاری ہے اور صرف نجاست کے پانی میں گرنے سے وہ ناپاک ہوتا بھی نہیں۔ وفی لفظ ﴿ لم ینجس ﴾ میں ایک قرأت کے مطابق تو "جیم" پر زبر (فتح) ہے اور دوسری قرأت کے مطابق پیش (ضمہ) ہے' دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث پانی کی قلیل و کثیر مقدار کے فرق اور حد بندی میں بالکل واضح اور صریح ہے۔ ان تمام احادیث سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلوں (مٹکوں) سے کم ہوگی تو نجاست کے اس میں محض گرنے سے ہی وہ ناپاک ہو جائے گا۔ خواہ اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی ایک وصف میں تغیر واقع ہوا ہو یا نہ اور اس کی مقدار قلتین (مٹکوں) کے برابر یا اس سے زیادہ ہوگی۔ تو محض وقوع نجاست سے وہ ناپاک نہیں ہوگا بلکہ وہ خود بھی پاک ہی رہے گا اور دوسری چیز کو پاک کرے گا اور جب ان اوصاف ثلاثہ (بو' ذائقہ اور رنگت) میں سے کوئی وصف اس کی وجہ سے رونما ہوگا تو وہ پانی ناپاک شمار ہوگا۔ جیسا کہ ابوامامہ سے مروی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔

جہاں تک "بئر بضاعۃ" والی حدیث کا تعلق ہے اس کے متعلق تمہیں علم ہے کہ اس میں پانی دو قلوں سے بھی زیادہ تھا۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث کے ایک جم غفیر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ' احمد رحمۃ اللہ علیہ' اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ' یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ' ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ' طحاوی رحمۃ اللہ علیہ' ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ' دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ' ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ'

حاکم رحمہ اللہ' خطابی رحمہ اللہ' بیہقی رحمہ اللہ' ابن حزم رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے قوت المغتذی میں نقل کیا ہے۔ یہ اہلحدیث اور شوافع کی دلیل ہے کہ دو قلوں سے کم پانی کثیر کے زمرہ میں نہیں آتا اور دو قلوں یا اس سے زیادہ پانی کی مقدار کثیر ہے۔ احناف کا "دہ دردہ" کا مسئلہ عقلی ہے۔ حدیث کے مقابلہ میں عقل کی کیا حیثیت ہے۔

معلوم ہوا کہ کھڑے پانی میں نہ تو نجاست ڈالی جائے اور نہ جنبی نہائے۔ پانی اگر دو قلوں سے کم ہو تو نجاست پڑنے سے ناپاک ہو جاتا ہے' چاہے اس کا رنگ' بو اور مزہ بدلے یا نہ بدلے اور اگر دو قلوں سے زیادہ ہو تو اس وقت تک پلید نہیں ہوتا جب تک اس کا رنگ' بو اور مزہ نجاست پڑنے سے بدل نہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ﴾ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ زاہد اور وسیع علم کے مالک تھے۔ صغر سنی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت بھی کی۔ پہلی مرتبہ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ ۷۳ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ذی طویٰ نامی جگہ میں دفن ہوئے۔

(٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: «**لا يَغْتَسِلْ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ**». أخرجه مسلم.

وللبخاري: «لاَ يَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ الَّذي لاَ يَجْرِي، ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ». وَلِمُسْلِمٍ «منه» وَلأَبِي دَاوُد «وَلاَ يَغْتَسِلُ فِيهِ مِنَ الْجَنَابَةِ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص حالت جنابت میں ہو وہ کھڑے (ساکن) پانی میں غسل نہ کرے۔" (مسلم) اور بخاری کے الفاظ ہیں کہ "تم میں سے کوئی بھی کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے اور پھر اس میں غسل کرے۔" صحیح مسلم کے الفاظ فیہ کے بجائے منہ ہیں یعنی اس سے کچھ پانی لے کر غسل کرے اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں "ولا یغتسل فیہ من الجنابۃ" یعنی "جنابت لاحق ہو جانے کی صورت میں اس میں غسل نہ کرے۔"

لغوی تشریح: ﴿ الدائم ﴾ ایسا ساکن جو بہتا نہ ہو ﴿ جنب ﴾ جیم اور نون کے ضمہ (پیش) کے ساتھ۔ جسے جنابت لاحق ہو جائے اور جنابت ایسی کیفیت ہے جو جماع یا احتلام کی وجہ سے انزال کے بعد پیدا ہو۔ ﴿ ثم یغتسل فیہ ﴾ اس میں ثم دوری ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی عقل مند آدمی سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اور ﴿ یغتسل ﴾ میں پیش (رفع) بھی جائز ہے' مبتدا محذوف "ھو" کی خبر ہونے کے اعتبار سے اور سکون (جزم) پڑھنا بھی جائز ہے ﴿ لایغتسل ﴾ کی نہی پر عطف کی وجہ سے اور زبر (نصب) پڑھنا بھی جائز ہے' (ان) پوشیدہ (مقدر) مان لینے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت میں "فیہ" کی جگہ "منہ" ہے اگر "فیہ" ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس

پانی میں داخل ہونا اور غوطہ لگانا منع ہے اور "منہ" ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس سے کسی برتن میں پانی لے کر الگ طور پر غسل کرنے کی بھی نہی ہے۔ بہرحال مسلم کی روایت سے صرف غسل کرنے کی ممانعت نکلتی ہے اور بخاری کی روایت میں اس میں پیشاب کرنے اور اس میں غسل کرنے دونوں کی ممانعت ہے۔ ابوداؤد کی روایت کی رو سے دونوں کی انفرادی طور پر ممانعت ہے یعنی اس میں پیشاب کرنا بھی ممنوع ہے اور اس پانی میں یا اس میں سے کچھ لے کر نہانا دونوں کی ممانعت ہے۔ تمام روایات سے حاصل یہ ہوا کہ دونوں عمل ہی ممنوع ہیں۔ یہ اس بنا پر کہ کھڑا پانی اگر مقدار میں کم ہے تو پھر وہ ناپاک ہو جائے گا اور کثیر مقدار میں ہے تو یکے بعد دیگرے پیشاب اور غسل کرنا پانی کے اوصاف میں تغیر و تبدل کا موجب ہو گا۔

پس نہی تحریم کیلئے ہے جبکہ پانی کم مقدار میں ہو اور جب پانی مقدار میں کثیر ہو تو پھر نہی تنزیہی ہے کیونکہ کثیر مقدار رواں اور جاری کے حکم میں ہوتا ہے اور وہ ناپاک و نجس نہیں ہوتا۔

(٦) وعَنْ رَجُلٍ صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ تَغْتَسِلَ المَرأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ، أَوِ الرَّجُلُ بِفَضْلِ المَرْأَةِ، وَلِيَغْتَرِفَا جَمِيعاً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ.

ایک ایسے آدمی سے روایت ہے جو نبی ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ "عورت' مرد کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے غسل کرے یا مرد' عورت کے باقی ماندہ غسل کے پانی سے غسل کرے۔ ہاں دونوں اکٹھے چلو سے لے لیں۔ (تو کوئی مضائقہ اور حرج نہیں) "

(ابوداؤد و نسائی۔ اور اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿عن رجل صحب﴾ صحب باب سمع یسمع سے فعل ماضی ہے اور اس مرد کی صفت میں واقع ہو رہا ہے۔ صحابی کا نام ظاہر نہ ہونا روایت حدیث میں ضرر رساں نہیں' کیونکہ اہل السنۃ کا اتفاق ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول" کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں اور ﴿بفضل الرجل﴾ سے مراد ہے کہ آدمی کے غسل کرنے کے بعد جو پانی بچ جائے۔ ﴿ولیغترفا﴾ میں "لام" امر کا ہے اور ﴿اغتراف﴾ کے معنی ہیں دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی لینا۔ یعنی دونوں چلو سے پانی لینا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نہی سے مراد نہی تنزیہی ہے۔ آئندہ حدیث میں اس کا جواز منقول ہے' تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ عورت کے غسل سے بچا ہوا پانی اپنے غسل کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ چلو سے بیک وقت مرد و عورت کا پانی لینا ایسا فعل ہے کہ جس میں ایک کا اثر دوسرے پر پڑ سکتا ہے اس طرح دونوں ایک دوسرے کا بدل بن جاتے ہیں اس میں چونکہ کوئی مضائقہ نہیں تھا اس لئے اس کی اجازت دے دی گئی۔

اگر خاوند و بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے پانی لے کر نہائیں تو جائز ہے۔ لیکن صرف خاوند یا صرف بیوی کے غسل جنابت کے بعد اس کا بچا ہوا پانی دوسرے کیلئے اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے'

تاکہ دونوں کے ذہن میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

(۷) وعَن ابنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغتَسِلُ بِفَضلِ مَيمُونَةَ رَضِي الله تعالى عنها. أخرجه مسلم. وَلِأَصحابِ السُّنَنِ: اغتَسَلَ بَعضُ أَزوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَفنَةٍ، فَجَآء النَّبِيُّ ﷺ لِيَغتَسِلَ مِنها، فَقَالَت له: إِنِّي كُنتُ جُنُباً، فَقَالَ: «إِنَّ المَاءَ لاَ يَجنُبُ». وَصَحَّحَهُ التِّرمِذِيُّ وَابنُ خُزَيمَةَ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنی اہلیہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہالیا کرتے تھے۔ (مسلم) اصحاب سنن کی روایت میں اس طرح ہے کہ ازواج مطہرات میں سے ایک نے ٹب نما برتن میں غسل کیا۔ نبی ﷺ تشریف لائے کہ اس میں باقی بچے ہوئے پانی سے غسل فرمالیں تو اس نے آپؐ سے عرض کیا کہ میں نے اس میں حالت جنابت سے غسل کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا "پانی ناپاک نہیں ہوتا۔" (اس روایت کو ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاصحاب السنن ﴾ سے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، اسی طرح دارمی، دارقطنی، ابن خزیمہ اور حاکم مراد ہیں۔ ﴿ جفنة ﴾ "جیم" کے فتح اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ ایک بڑا ساپیالہ اور عام لوگ اسے "اجانة" (یعنی چمڑے کی ٹوکری) کہتے ہیں۔ ﴿ یغتسل منها ﴾ یعنی اس کے پانی سے ﴿ فقالت: انی کنت جنبا ﴾ سے مراد ہے کہ میں نے اس پانی سے غسل کیا ہے اور یہ پانی میرے غسل کا بچا ہوا ہے۔ ﴿ لایجنب ﴾ میں جنب سمع اور کرم دونوں ابواب سے پڑھنا جائز ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ باب اکرام سے ہو۔ اس کا معنی ہے کہ جنبی کے کسی پانی والے برتن سے پانی لے کر غسل کرنے کی وجہ سے وہ پانی ناپاک نہیں ہو جاتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کو یہ شک پیدا نہ ہو کہ یہ حدیث پہلی کے مخالف ہے۔ درحقیقت امت کی سہولت اور آسانی کیلئے ایسا فرمایا ہے اور خود عمل کر کے بتا دیا دونوں احادیث اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اس حدیث میں جو نہی ہے وہ نہی تنزیہی ہے، تحریمی نہیں۔ یہ حدیث جواز پر دلالت کرتی ہے اور پہلی ترک اولیٰ پر۔

رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہا لیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور آپ دونوں ایک برتن سے پانی لے کر نہاتے تھے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی اسی حدیث کی دوسری سند سے واضح ہے۔ اصحاب سنن والی روایت بلحاظ سند ضعیف ہے۔ للذا راجح یہی ہے کہ خاوند اور بیوی دونوں اکٹھے تو ایک برتن سے پانی لے کر نہا سکتے ہیں مگر علیحدہ علیحدہ نہانے کی صورت میں ایک کو دوسرے کا بچا ہوا پانی استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالله بن عباس رضی اللہ عنہما ﴾ ان کا نام عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ

عنہما تھا۔ یہ وہی ہیں جنہیں اس امت کے بحر العلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بہت ذہین تھے۔ اپنی احاصت علمی کی شہرت کی وجہ سے تعریف سے مستغنی ہیں اس لیے کہ آپؓ کو نبی صلی اللہ علیہ و سلم نے علم و حکمت اور فقہ و تاویل میں زیادتی کی دعا دی تھی۔ ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے اور ۶۷ھ میں طائف میں وفات پائی۔

﴿میمونہ رضی اللہ عنہا﴾ میمنہ بنت حارث الھلالیہؓ ۔ رسول اللہ ﷺ نے ۷ ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر ان سے نکاح کیا۔ ۶۱ھ یا ۵۱ھ یا ۶۶ھ کو وفات پائی۔

(٨) وعَنْ أبي هُرَيرةَ رضي اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: طُهُورُ إنَاءِ أَحَدِكُمْ إِذَا وَلَغَ فِيهِ الكَلْبُ أَنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ، أُولاَهُنَّ بِالتُّرَابِ». أخرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَفِي لَفظٍ لَهُ «فَلْيُرِقْهُ». وَلِلتِّرمِذِيِّ: «أُخرَاهُنَّ أَوْ أُولاَهُنَّ بِالتُّراب».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”تم میں سے کسی کے برتن میں جب کتا منہ ڈال جائے تو اسے سات مرتبہ دھویا جائے۔ سب سے پہلے اسے مٹی مل کر (صاف کرنا چاہئے) “ (مسلم) اور مسلم نے ”فلیرقہ“ یعنی اس کو گرا دینا چاہئے‘ نقل کیا ہے اور ترمذی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں ”پہلی یا آخری مرتبہ مٹی کے ساتھ صاف کرنا چاہئے۔“

لغوی تشریح: ﴿طھور﴾ طاء کے پیش (ضمہ) کے ساتھ۔ یہ مصدر ہے اور ترکیب میں مبتدا واقع ہو رہا ہے اور لفظ ﴿اناء﴾ جس کا معنی برتن ہے‘ کی طرف مضاف ہے۔ ﴿ولغ﴾ ولوغ الکلب کتے کا اپنی زبان کے اطراف کے ساتھ پینا (چاٹنا) ولغ باب فتح یفتح سے بھی آتا ہے اور اسی طرح حسب یحسب اور سمع یسمع سے بھی آتا ہے۔ ﴿ان یغسلہ﴾ یہ خبر واقع ہو رہی ہے جو جزاء شرط پر دلالت کرتی ہے۔ ﴿اولاھن﴾ کا مطلب یہ ہے سات مرتبہ دھونے کی صورت میں سب سے پہلی مرتبہ۔ ﴿فلیرقہ﴾ یہ ”اراقہ“ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں برتن میں خورد و نوش کی جو چیز ہو اسے انڈیل کر فارغ کر دینا۔

حاصل کلام: ترمذی کی یہ عبارت کہ اخراھن او اولاھن غالب گمان یہ ہے کہ یہ راوی کا شک ہے ورنہ ایسا نہیں کہ دھونے والے کو اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ چاہے پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرے یا آخری مرتبہ اور اولاھن کا لفظ بکثرت روایات میں آنے کی وجہ سے اور خاص طور پر بخاری و مسلم کے روایت کرنے کی وجہ سے راجح ہے۔ یعنی اس بات کو ترجیح ہے کہ پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرنا چاہئے۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ کتے کا منہ‘ اس کا لعاب دہن اور اس کا جوٹھا نجس و ناپاک ہے اور یہی اس کے سارے بدن کے نجس و ناپاک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور برتن کے سات مرتبہ دھونے کو واجب ٹھہراتی ہے اور مٹی کے ساتھ صاف کرنا بھی واجب ہے۔ یہی محققین کی رائے ہے اور بعض نے کہا

کہ سات مرتبہ دھونا اور ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرنا مندوب ہے واجب نہیں اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے لیکن سچ بات یہی ہے کہ دلیل ان دونوں اقوال کی تائید نہیں کرتی اور معلوم رہے کہ جب محض نجاست کے ازالہ کیلئے سات مرتبہ دھونے کی شرط نہیں ہے تو پھر ضروری ہے کہ نجاست کے علاوہ سات مرتبہ دھونے کے حکم کی حکمت اور ہو۔ دور حاضر کے کچھ اطباء نے واضح کیا ہے کہ اکثر کتوں کی آنتوں میں بہت چھوٹے چھوٹے جرثومے پائے جاتے ہیں۔ یہ چار ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ جب کتا اپنا فضلہ خارج کرتا ہے تو اس فضلہ سے بکثرت انڈے خارج ہوتے ہیں اور فضلہ خارج ہونے کی جگہ (دبر) کے اردگرد بالوں کے ساتھ ان میں کثرت سے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا اپنی زبان سے اپنا وجود صاف کرتا ہے تو یہ انڈے اس کی زبان اور منہ کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا کسی برتن میں منہ ڈالتا ہے یا پانی پیتا ہے یا انسان اس کے منہ کا بوسہ لیتا ہے جیسا یورپین اقوام اور اس کے مقلدین عموماً ایسا کرتے ہیں تو یہ انڈے ان اشیاء کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور خورد و نوش کے وقت آسانی سے اس کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ منہ میں رسائی حاصل کرنے کے بعد اس انسان کے معدہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اس سے جرثومے نکل کر معدہ کی دیواروں میں سوراخ کر کے خون کی نالیوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح دل' دماغ اور پھیپھڑے کی بے شمار بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام چیزوں کا یورپین اطباء اپنے شہروں میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ان جراثیم زدہ کتوں کی پہچان اور امتیاز بڑا مشکل کام ہے۔ اس کیلئے وقت درکار ہے اور انتہائی دقیق بحث مطلوب ہے۔ ایسے آلات کے ذریعہ جن کا استعمال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ شرعاً اسے نجس و ناپاک قرار دینا اور سات مرتبہ دھونا برتنوں کی صفائی اور نظافت کیلئے ہے تاکہ مذکورہ بالا کوئی چیز برتن کے ساتھ لگی نہ رہ جائے اور یہ سراسر حکمت ہے اور قرین صواب ہے۔ حقیقت حال اللہ کے علم میں ہے۔

(احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام لابن دقیق العید' ج ۱' ص : ۲۷) خورد و نوش کی جس چیز میں کتا منہ ڈال جائے اسے استعمال میں نہ لانا چاہئے اسے گرا دینا چاہئے اور حدیث کی رو سے اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتا خود بھی ناپاک ہے اور جس چیز کو منہ لگائے وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ اگر برتن ہو تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ مسلم کی ایک روایت میں تو ساتویں بار کی بجائے آٹھویں مرتبہ مٹی سے دھونے کا ذکر ہے۔ یعنی پہلی بار مٹی سے صاف کیا جائے پھر سات بار پانی سے دھویا جائے۔ اس طرح کرنے سے مزید صفائی اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔ احناف تین مرتبہ دھونے سے برتن کے پاک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل دار قطنی اور طحاوی میں منقول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے تین مرتبہ دھونا چاہئے' حالانکہ صحیح سند کے ساتھ ان کا فتویٰ یہ بھی منقول ہے کہ ایسے برتن کو سات بار دھویا جائے۔ لہٰذا جو فتویٰ روایت کے موافق ہے' وہی راجح ہے اور وہ اسناد کے اعتبار سے بھی تین بار دھونے کے فتویٰ سے زیادہ صحیح ہے۔ (فتح الباری' ج ۱' ص : ۲۷۷) تعجب ہے کہ عموماً فقہائے حنفیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہتے ہیں (معاذ اللہ) مگر یہاں حدیث مرفوع

اور صحیح کے مقابلہ میں ان کے مرجوح فتویٰ اور رائے کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی مرحوم نے اس سلسلے میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے اعتراضات باردہ کا کافی و شافی قابل دید جواب دیا ہے۔ (السعایۃ، ج ۱، ص: ۴۴۹۔ ۴۵۴)

(۹) وعن أَبِيْ قَتَادة رضي الله تعالى عنه أَنَّ رَسولَ الله ﷺ قَالَ في الهِرَّةِ: «إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ، إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ”وہ نجس نہیں ہے کیونکہ یہ ہر وقت آمدورفت رکھنے والا گھریلو جانور ہے۔“ (اس روایت کو چاروں (ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی الھرۃ ﴾ اس کا مطلب ہے کہ بلی کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ ھرۃ کے علاوہ اسے قط اور سنور بھی کہتے ہیں۔ ﴿ الطوافین ﴾ ”واؤ“ کی تشدید۔ واحد اس کا طواف ہے اور یہ ایسا جانور ہے جس کی آمدورفت بکثرت رہتی ہے اور وہ گھر کا خادم ہے۔ بلی کو خادم کے ساتھ تشبیہہ دینے سے مقصود یہ اشارہ کرنا ہے کہ بلی کی نوعیت اس گھریلو خادم کی سی ہے جس کا گھریلو کام کے سلسلہ میں اہل خانہ کے پاس ملنے جلنے اور ان کی ضروریات کی فراہمی کیلئے کثرت سے آنا ناگزیر ہوتا ہے۔ دشواری اور دقت کے دور کرنے کی غرض سے بلی کو غیر نجس قرار دیا گیا ہے۔ اس کے غیر نجس ہونے کی بدولت ہی اس کے جوٹھے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اپنے وضو کا برتن ایک جگہ رکھا تھا۔ اتنے میں بلی آئی اور اس برتن میں منہ ڈال کر پانی پینے لگی تو حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اس برتن کو فوراً جھکا دیا تا کہ بلی آسانی سے اور سیر ہو کر پی لے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ ”بلی نجس نہیں ہے۔“

اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلی کا جوٹھا پلید نہیں ہے بشرطیکہ اس کے منہ پر نجاست نہ لگی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ ان کی کنیت ہے۔ اصل نام حارث بن ربعی ہے۔ بڑے مشہور و معروف صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ (فارس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لقب سے مشہور ہیں۔ انصار سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انصاری کہلائے۔ غزوۂ احد وغیرہ میں شریک جنگ رہے۔ سن وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۴۰ھ بعض نے ۵۴ھ بیان کیا ہے۔ آخری قول زیادہ مشہور ہے۔ (تہذیب الاصابہ)

(۱۰) وعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله تعالى عنه قال: جَاءَ أعرابيٌّ،

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بدوی آیا اور مسجد کے کونے میں پیشاب کرنا

فَبَالَ فِي طَآئِفَةِ الْمَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ النَّاسُ، فَنَهَاهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، فلما قَضَى بَولَهُ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِذَنُوبٍ من مَآءٍ فَأُهْرِيقَ عَلَيْه. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

شروع کر دیا تو لوگوں نے اسے ڈانٹا۔ لیکن نبی ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا' جب وہ بدوی پیشاب سے فارغ ہوا تو آنحضرت ﷺ نے پانی کا ایک ڈول طلب فرمایا اور اس جگہ پر بہا دیا (جہاں اس نے پیشاب کیا تھا)۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اعرابی ﴾ اعراب کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اعرابی یعنی بادیہ نشین۔ اس کے معنی بدوی و دیہاتی کے ہیں۔ یہ اعرابی کون تھے؟ یہ کہا گیا ہے کہ وہ ذوالخویصرۃ یمانی تھے اور وہ بڑے پیٹ والے آدمی تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ معکبر الضبی تھے۔ ﴿ طائفۃ المسجد ﴾ مسجد کا کوئی کونہ یا کنارہ۔ مسجد کی کسی جانب۔ ﴿ فزجرہ الناس ﴾ لوگوں نے اسے ڈانٹا' جھڑکا' سختی سے منع کیا۔ ﴿ فنھاھم رسول اللّٰہ ﷺ ﴾ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور پیشاب رکوانے کی کوشش سے منع فرمایا کیونکہ پیشاب منقطع کرنا مرد کی شرم گاہ کیلئے ضرر رساں ہے اور بسا اوقات ایسا کرنے کی وجہ سے گردہ اور مثانہ کا خبیث مرض لاحق ہو جاتا ہے اور اس لئے بھی آپؑ نے لوگوں کو منع فرمایا کہ پیشاب کا منقطع کرنا بدن' لباس اور مسجد کے دوسرے حصے جہاں پیشاب نہیں کیا کے نجس اور گندہ کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ ادھورا پیشاب لے کر بھاگ کھڑا ہوتا تو اس کے اپنے کپڑے اور بدن کے علاوہ مسجد کے دوسرے حصوں میں پیشلب کے چھینٹوں کا گرنا ممکن تھا جس سے گندگی زیادہ پھیلتی۔ ﴿ بذنوب ﴾ ذال کے زبر کے ساتھ۔ پانی سے لبالب بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ ﴿ فاھریق ﴾ دراصل اریق تھا "ھا" کو ھمزہ سے بدل کر اس پر مزید ایک ھمزہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں انڈیل دیا گیا۔

حاصل کلام: ترمذی نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اسی طرح بیان کی ہے اور اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ آدمی کا پیشاب ناپاک ہے۔ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے نیز یہ بھی مسئلہ ثابت ہوا کہ زمین اگر ناپاک ہو تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے۔ خواہ زمین نرم و سہل ہو یا سخت و صعب۔ مزید برآں اس حدیث سے مسجد کی عظمت اور اس کا احترام' نادان آدمی کے ساتھ نرمی کرنا سختی اور درشتی نہ کرنا' حضور ﷺ کا حسن خلق اور نہایت عمدہ طریقہ سے تعلیم دین دینا وغیرہ باتیں نمایاں ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت انس رضی اللہ عنہ ﴾ : حضور ﷺ کے خادم خاص ہیں ان کی والدہ ام سلیم نے آپؑ کی خدمت کیلئے خدمت گار کے طور پر پیش کر کے سعادت حاصل کی۔ مدنی زندگی میں آخری سانس تک خدمت کرتے رہے۔ ابو حمزہ ان کی کنیت تھی۔ خزرج کے قبیلہ نجار سے ہونے کی وجہ سے نجاری خزرجی کہلائے۔ وہ ۹۱ھ کو فوت ہوئے اور بصرہ میں ہی دفن ہوئے۔

(۱۱) وعنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا المَيْتَتَانِ فَالجَرَادُ وَالحُوتُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالكَبِدُ وَالطِّحَالُ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَفِيْهِ ضَعْفٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''دو مری ہوئی چیزیں اور دو خون ہمارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ دو مری ہوئی چیزیں (جنہیں ذبح نہ کیا گیا) ایک ٹڈی اور دوسری مچھلی۔ باقی رہے دو خون تو اس سے مراد ایک جگر اور دوسری تلی ہے۔'' (احمد اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے اور اس میں کمزوری ہے)

حاصل کلام: مصنف نے اس روایت کو اس باب میں اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس پر تنبیہہ ہو جائے کہ مچھلی اور ٹڈی جب پانی میں مر جائیں خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ' وہ پانی نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔ اس روایت کی سند عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وہ اپنے باپ سے اور وہ آگے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سلسلہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن سے مروی حدیث منکر ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ جیسا کہ امام ابو زرعۃ اور ابوحاتم نے کہا ہے۔ بیہقی نے کہا کہ اس حدیث کو زید بن اسلم کی اولاد یعنی عبداللہ اور عبدالرحمٰن اور اسامہ نے مرفوع بیان کیا ہے اور ابن معین نے ان (یعنی زید بن اسلم کی اولاد) کو ضعیف قرار دیا ہے البتہ احمد بن حنبل ان میں سے عبداللہ کو ثقہ کہتے ہیں۔ گو اس حدیث کا سنداً موقوف ہونا صحیح ہے' مگر یہ مرفوع ہے کیونکہ صحابی کا "احلت لنا" کہنا حکماً مرفوع تسلیم کیا گیا ہے یا "حرم علینا" کہنا اسی طرح حکماً مرفوع ہے جیسے "امرنا" یا "نهینا"۔

یہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ ٹڈی بہرصورت حلال ہے۔ خواہ اپنی طبعی موت مرے یا کسی دوسرے سبب سے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ اگر ٹڈی آدمی کے پکڑے یا سر کے کٹنے سے مرے تو حلال ہے بصورت دیگر حرام ہے۔ حدیث بالا امام صاحب کے فتویٰ کے خلاف ہونے کی بنا پر اس کی تردید کرتی ہے۔ یہی حال مچھلی کا ہے خواہ پکڑنے کے بعد مری ہو خواہ دریائی لہروں نے باہر پھینک دی ہو اور وہ مر گئی ہو۔ دونوں صورتوں میں حلال ہے۔ احناف کے ہاں اگر مچھلی پکڑنے یا دریا کے باہر پھینک دینے اور دیگر کسی سبب سے مری ہو تو حلال ہے اور اگر وہ خود بخود مر جائے یا کسی حیوان کے مارنے سے مرے تو حلال نہیں حرام ہے۔ حدیث بالا احناف کے بھی خلاف ہے۔ احناف نے ابوداؤد کی جس روایت سے استنباط کیا ہے اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لہٰذا ٹڈی اور مچھلی کی حلت کو کسی شرط سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی اور ٹڈی دل دونوں حلال ہیں چاہے خود مر جائیں یا کسی طریقہ سے مار دیا جائے دونوں مردار کے عمومی حکم سے خارج ہیں' ان کا ذبح کرنا مشروع نہیں ہے۔

(۱۲) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جب تمہارے کسی

ﷺ: «إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ، ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِي أَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءً، وَفِي الآخَرِ شِفَاءً». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَزَادَ: «وَإِنَّهُ يَتَّقِي بِجَنَاحِهِ الَّذِي فِيهِ الدَّاءُ».

مشروب میں مکھی گر جائے تو اسے اس میں ڈبکی دے کر نکالنا چاہئے اس لئے کہ اس کے ایک پر میں مرض (کے جراثیم) ہوتے ہیں اور دوسرے میں شفا و علاج کے۔" (اس کو بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔) ابوداؤد کی روایت میں اتنا مزید اضافہ ہے کہ مکھی مشروب میں اپنا وہ پر ڈبوتی ہے جس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔

لغوی تشریح ﴿الذباب﴾ پیش اور تخفیف کے ساتھ۔ سب کے جانی پہچانی۔ یعنی مکھی۔ ﴿شراب﴾ پینے کا ہر مشروب۔ ﴿فليغمسه﴾ "میم" کے زیر کے ساتھ۔ ﴿غمس﴾ سے۔ "غمس" کے معنی پانی یا مائع یعنی بہنے والی چیز میں غوطہ لگانا' ڈبکی مارنا۔ ﴿لينزعه﴾ نزع سے۔ باہر نکالنا' کھینچ کر نکالنا۔ دونوں صیغوں پر لام' لام امر ہے اور معنی ہوئے کہ غوطہ دینا اور نکالنا چاہئے۔ ﴿والجناح﴾ سے مراد پر' جس کے ذریعہ پرندہ پرواز کرتا ہے' اڑتا ہے۔ ﴿داء﴾ بیماری اور مرض اور ایک روایت میں "سما" بھی منقول ہے۔

حاصل کلام: ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ مکھی اپنا وہ پر بچا کر رکھتی ہے جس میں بیماری اور مرض کے جراثیم ہوتے ہیں۔ یعنی مکھی جب مشروب میں پر ڈالتی ہے تو اپنا بیماری والا پر اس لئے ڈالتی ہے کہ اپنا آپ بیماری سے بچا لے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور ابن ماجہ رحمہ اللہ کے ہاں یہ ہے کہ مکھی زہر والا پر آگے کرتی ہے اور جس میں شفاء ہوتی ہے اسے پیچھے رکھتی ہے۔ غوطہ دینا اور ڈبکی دے کر نکالنے میں مقصود بیماری کو توڑنا اور زہر کو شفا کے ذریعہ زائل کرنا ہے۔

حدیث مذکور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مکھی اگر کسی سیال چیز میں گر کر مرجائے تو وہ نجس نہیں ہو جاتی۔ اس سے یہ حکم بھی نکالا گیا ہے کہ جس میں بہنے والا خون ہی جسم میں موجود نہ ہو۔ مثلاً شہد کی مکھی' مکڑی' بھڑ وغیرہ اور انہیں سے ملتے جلتے دیگر پرند۔ تو ان کے کسی مشروب یا بہہ نکلنے والی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس اور ناپاک نہیں ہو جاتا' کیونکہ نجاست زدہ ہونے کا سبب تو بہہ جانے والا خون ہے جو اس کی موت کے وقت جسم سے بہہ کر نکل جاتا ہے اور مذکورہ حیوانات میں یہ سبب یعنی خون ہی موجود نہیں۔ اس لئے ان کے مائع قسم کی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس نہیں ہوتا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دفع ضرر کیلئے مکھی کا مارنا جائز ہے ورنہ بغیر کسی ضرورت معقول کے کسی کو مارنا ناروا فعل ہے۔ یہ تو معلوم حقیقت ہے کہ اکثر اوقات مکھی گرم چیز میں گر کر مرہی جاتی ہے اور بعض اوقات ٹھنڈی چیز میں ڈبکی دینے سے بھی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پینے کی کسی چیز میں مکھی کے گرنے سے وہ چیز ناپاک نہیں ہو جاتی بلکہ اس صورت میں اسے ڈبکی دے کر باہر پھینک دینا

چاہئے۔

(١٣) وعَنْ أَبِيْ واقِدٍ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله ﷺ: «**مَا قُطِعَ مِنَ البَهِيمَةِ، وَهِيَ حَيَّةٌ، فَهُوَ مَيِّتٌ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "زندہ جانور میں سے جو کچھ کاٹ لیا جائے وہ مردار ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں اور ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ما قطع ﴾ یہاں "ما" موصولہ ہے اور "قطع" فعل مبنی مفعول کے لئے ہے۔ یعنی جو کچھ زندہ جانور کے جسم سے کاٹ لیا گیا۔ ﴿ البھیمۃ ﴾ ہر چار پاؤں پر چلنے والا جانور مگر چیر پھاڑ کرنے والا نہ ہو۔ ﴿ وھی حیۃ ﴾ اس میں "واؤ" حالیہ ہے یعنی اس حال میں کہ اسے ذبح نہ کیا گیا بلکہ زندہ ہو۔ ﴿ فھو ﴾ سے مراد زندہ جانور سے جو کچھ کاٹ کر الگ کر لیا گیا وہ مردہ ہے' اس کا کھانا حرام اور نجس ہو جاتا ہے۔ پانی وغیرہ کو نجس کر دینے والے باقی نجاسات کے حکم میں یہ بھی شامل ہے۔

حاصل کلام: اہل جاہلیت زندہ جانوروں سے کچھ گوشت کاٹ کر کھایا کرتے تھے۔ اس حدیث میں ان کے اس فعل شنیع کا رد ہے اور یہ کہ ایسا کاٹا ہوا گوشت مردار اور پلید ہے۔ لہٰذا اس کا کھانا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوواقد لیثی ﴾ ابو واقد کنیت ہے اصل نام حارث بن عوف ہے۔ بنی عامر بن لیث کی طرف منسوب ہیں اس لئے لیثی کہلائے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ بدر کے غزوہ میں شریک تھے۔ بعد میں مکہ کی رہائش اختیار کر لی۔ ۶۵ھ / ۶۸ھ میں وفات پائی۔ جبکہ ان کی عمر ۷۵ برس تھی۔ فنج میں مدفون ہوئے۔

٢ - بَابُ الآنِيَةِ — برتنوں کا بیان

(١٤) عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ اليَمَانِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «**لاَ تَشْرَبُوا فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ وَلاَ تَأْكُلُوا فِي صِحَافِهَا، فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الآخِرَةِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیا کرو اور ان کے پیالوں میں کھایا بھی نہ کرو۔ دنیا میں یہ کافروں کیلئے ہیں اور آخرت میں فقط تمہارے لئے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الانیۃ ﴾ آنیۃ' اناء کی جمع ہے جس کے معنی برتن کے ہیں۔ "ابواب الطہارت" کے درمیان میں برتنوں کے احکام بیان کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ شریعت اسلامیہ میں بعض برتن ایسے ہیں جنہیں استعمال کرنا جائز ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا استعمال ممنوع ہے۔ اس طرح ایک پاکباز

انسان کو جائز اور ممنوع برتنوں میں امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿ صحافھا ﴾ صحاف صحفۃ کی جمع ہے جس کے معنی پیالہ کے ہیں۔ ﴿ لھم ﴾ سے مشرکین مراد ہیں۔ ﴿ فی الدنیا ﴾ یعنی دنیا میں یہ برتن ان کیلئے ہیں' کا یہ مطلب نہیں کہ سونے اور چاندی کے برتن مشرکین کیلئے حلال ہیں بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ جس پر یہ مشرکین عملاً کاربند ہیں۔ یعنی دنیا میں یہ برتن مشرکین کے استعمال میں ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا' پینا حرام ہے اور ان برتنوں کے پانی سے وضو اور غسل کرنا عموم کے اعتبار سے حرام ہے کہ ان کا استعمال درست نہیں' ورنہ اس حدیث کا اصل مقام کھانے پینے کا باب تھا۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ جواہرات و یاقوت وغیرہ کے برتنوں میں کھانا اور پینا اور وضو و غسل کرنا جائز ہے۔ البتہ جن برتنوں پر سونے چاندی کا پانی ملمع کیا گیا ہو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ اجتناب کرنا بہرحال بہتر اور اولیٰ ہے۔

سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا یا ان برتنوں کے پانی سے وضو و غسل کرنا سب حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ﴾ : حذیفہ تصغیر ہے۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ مشہور صحابی ہیں اور صحابی باپ یمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور راز دان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (ذوالنورین) کی شہادت کے چالیس روز بعد ۳۶ یا ۳۵ھ میں مدائن میں فوت ہوئے۔

(۱۵) وعن أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنها قالت: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «الَّذِي يَشْرَبُ فِي إِنَاءِ الفِضَّةِ إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص چاندی کے برتنوں میں (کھاتا) پیتا ہے تو وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ انڈیلتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یجرجر ﴾ "جرجرۃ" سے ماخوذ ہے۔ پیٹ میں داخل ہوتے وقت گلے میں پانی سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسے "جرجرۃ" کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی سونے چاندی کے برتنوں میں خورد و نوش کی ممانعت ہے اور اس ممانعت پر عمل پیرا نہ ہونے والوں کیلئے جہنم کی آگ کی وعید ہے کہ ایسے لوگ نار جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

راوی حدیث: ﴿ ام سلمۃ ﴾ ان کا نام ھند بنت ابی امیہ۔ ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسواد المخزومی کی زوجیت میں تھیں۔ حبشہ کی جانب پہلی ہجرت میں ان کے ساتھ تھیں۔ غزوۂ احد میں ابوسلمہ کو جو زخم لگا تھا اس کی وجہ سے یہ وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد شوال ۴ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ ۵۹ھ میں یا ۶۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ بقیع قبرستان میں

دفن ہوئیں۔

(١٦) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِذَا دُبِغَ الإِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَعِنْدَ الأَرْبَعَةِ «أَيُّما إِهابٍ دُبِغَ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جب کچے چمڑے کو (مسالہ لگا کر) رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔" (مسلم) اور سنن اربعہ میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ "جونسا چمڑہ بھی رنگا جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿ دبغ ﴾ دباغ سے ماخوذ ہے۔ یہاں مفعول واقع ہو رہا ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ چمڑے کی رطوبت اور دیگر فضلات (گندگیوں) کو خشک کرنا اور جو چیز اس کی بدبو اور خرابی کی موجب ہو اسے زائل کرنا۔ ﴿ الاھاب ﴾ بروزن کتاب۔ مطلق چمڑے کیلئے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جسے ہنوز رنگا نہ گیا ہو۔ ﴿ ایما اھاب دبغ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تمام چمڑے شامل ہیں۔ "ایما" عمومیت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

حاصل کلام: پس حدیث اپنے عموم پر رہتے ہوئے یہ مطلب دے رہی ہے کہ ہر قسم اور ہر نوع کے حیوانات کے چمڑے اس میں شامل ہیں اور خنزیر یعنی سور کا چمڑہ بالاتفاق اس سے مستثنیٰ ہے اور اکثریت کے نزدیک کتے کا چمڑا بھی اس زمرے میں شامل ہے اور محققین علماء کے نزدیک ان تمام جانوروں کا چمڑا بھی اس میں شامل ہے جن کا گوشت کھایا نہیں جاتا۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ دباغت (رنگائی) کے بعد ہر قسم کا چمڑہ پاک ہو جاتا ہے' وہ چمڑہ خواہ حلال جانور کا ہو یا حرام کا ہو' جانور خواہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا خود اپنی طبعی موت مرا ہو۔ اس اصول عمومی کے باوجود بعض جانور ایسے ہیں جن کے چمڑے کو دباغت کے باوجود پاک قرار نہیں دیا گیا' مثلاً خنزیر کا چمڑہ ہے اسے نجس عین ہونے کی بنا پر پاک قرار نہیں دیا گیا اور انسان کا چمڑہ ہے اسے بھی بوجہ اس کی کرامت و بزرگی اور شرف کے حرام ٹھہرایا گیا ہے' تاکہ بے قدری سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ خنزیر اور کتے پر اگر تکبیر پڑھ کر انہیں ذبح کیا جائے تو اس صورت میں وہ بھی پاک ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح رائے نہیں ہے اسی طرح احناف کا کتے کے چمڑے کو دباغت کے بعد حلال قرار دینا بھی صائب و صحیح رائے پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ جن جانوروں کے چمڑے دباغت کے بعد پاک ہو جاتے ہیں ان کے سینگ' بال' دانت اور ہڈیاں وغیرہ کام میں لائی جا سکتی ہیں نیز ان کی تجارت بھی کی جا سکتی ہے۔

(١٧) وعن سَلَمَةَ بْنِ المُحبّقِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قال رسولُ الله ﷺ: «دِبَاغُ جُلُودِ المَيْتَةِ طَهُورُهَا». صَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مردہ جانوروں کے چمڑوں کو رنگنا ہی ان کی طہارت و پاکیزگی ہے۔" (ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

راوی حدیث: ﴿ سلمۃ ﴾ "سین" "لام" اور "میم" کے زبر کے ساتھ۔ ﴿ المحبق ﴾ "میم" کی پیش، حاء کی زبر، "باء" کی تشدید اور زیر کے ساتھ، مگر محدثین "با" پر فتح کے قائل ہیں اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ ابوسفیان ان کی کنیت ہے۔ بصری صحابہ میں ان کو شمار کیا جاتا ہے۔ ھذیل بن مدرکہ بن الیاس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ھذلی کہلاتے ہیں۔ وہ حنین میں تھے جب انہیں ان کے بیٹے "سنان" کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے فرمایا۔ جو تیر میں رسول اللہ ﷺ کی مدافعت میں چلاتا تھا اس کی خوشی مجھے میرے بیٹے کی بشارت سے زیادہ ہے۔

(۱۸) وعَنْ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِشَاةٍ يَجُرُّونَها، فَقَالَ: «**لَوْ أَخَذْتُمْ إِهَابَها**» فَقَالُوا: إِنَّها مَيْتَةٌ، فَقَالَ: «**يُطَهِّرُهَا المَاءُ والقَرَظُ**». أَخْرَجَه أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک مردہ بکری کے پاس سے ہوا جسے لوگ گھسیٹتے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "کاش تم نے اس کی کھال ہی اتار لی ہوتی۔" اس پر وہ بولے، (حضور ﷺ) وہ تو مری ہوئی ہے۔ آپؐ نے (یہ سنکر کر فرمایا پھر کیا ہوا؟) "اس کو پانی اور کیکر کی چھال پاک کر دیتی ہے۔"

(ابوداوٗد۔ نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ القرظ ﴾ "قاف" اور "راء" کے زبر کے ساتھ۔ کیکر کے پتے، چھال۔ عرب میں اس کے ساتھ چمڑے کی دباغت مشہور و معروف تھی۔

حاصل کلام: یہ اور پہلی دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مردار کے چمڑے دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے برتنوں سے وضو وغیرہ بھی جائز ہے۔

معلوم ہوا کہ مردار چوپایوں کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے لہٰذا ایسی کھال سے ڈول وغیرہ بنانا جائز ہے۔

(۱۹) وعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الخُشَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّا بِأَرْضِ قَومٍ أَهْلِ كِتَابٍ، أَفَنَأْكُلُ فِي آنِيَتِهِمْ؟ قَالَ: «**لاَ تَأْكُلُوا فِيهَا إِلاَّ أَنْ لاَ تَجِدُوا غَيْرَهَا، فَاغْسِلُوهَا، وَكُلُوا فِيهَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم اہل کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں کیا ہم ان کے استعمال کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟ جواب میں آپؐ نے فرمایا "ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، البتہ اگر ان کے ماسوا اور برتن میسر نہ ہو سکیں تو پھر ان کو دھو کر ان میں کھا سکتے ہو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿انا﴾ ہمزہ کے کسرہ "نون" کی تشدید کے ساتھ، ضمیر متکلم کے ساتھ حرف تاکید ہے' ﴿اھل الکتاب﴾ کتاب والے' مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور یہ لفظ ان کیلئے بطور صفت استعمال ہوا ہے۔ ﴿افناکل فی انیتھم﴾ ایک تردد اور تذبذب پیدا ہوتا تھا کہ یہود و نصاریٰ اکثر اوقات اپنے برتنوں میں سور کا گوشت پکاتے ہیں اور ان میں شراب پیتے ہیں۔ ابوداؤد اور مسند احمد کی روایت میں یہ صراحت و وضاحت موجود ہے کہ ہم اہل کتاب کے ساتھ رہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکا رہے ہوتے ہیں اور اپنے پینے کے برتنوں میں شراب نوشی کر رہے ہوتے ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "پھر ان کے برتنوں میں مت کھاؤ' پیو۔" آپؐ کا جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے برتنوں میں خورد و نوش سے احتراز کرنا چاہئے تاوقتیکہ ان کے استعمال کرنے میں اضطراری حالت پیش نہ آجائے۔ پھر جب مجبوری لاحق ہو جائے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے تو پھر بھی ان کے پاک کرنے پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ خود ان کو پاک کیا جائے۔ اس حدیث میں نہی حرمت کیلئے نہیں ہے بلکہ طبعی منافرت کیلئے کہ ذوق سلیم ان برتنوں میں کھانے سے انکار کرتا ہے اور اس سے بھی نفرت کرتا ہے کہ جن برتنوں میں ایسی گندگی اور نجس چیزیں پکائی جائیں ان میں پکی ہوئی چیز استعمال کی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے زیر استعمال برتنوں میں کھانا' ان میں پینا اور ان برتنوں کے پانی سے وضو کرنا وغیرہ جائز نہیں۔ اس کی علت اور وجہ واضح ہے کہ یہ لوگ ناپاک اور نجس چیزیں ان میں پکاتے ہیں۔ جب اہل کتاب کے برتنوں میں کھانا پینا وغیرہ جائز نہیں تو ہنود' دہریوں اور ملحدوں کے ان برتنوں میں بھی کھانے پینے سے اجتناب کرنا چاہئے جن میں ناپاک و نجس چیزیں پکائی اور کھائی جاتی ہوں۔

راوی حدیث: ﴿ابوثعلبۃ الخشنی﴾ "خاء" کے پیش اور "شین" کی زیر کے ساتھ' خشین بن نمر جس کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا' کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے خشنی کہلائے۔ بیعت رضوان کرنے والوں میں سے تھے۔ اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا تو وہ سب اسلام لے آئے۔ شام میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ۷۵ھ میں وفات پائی۔ نماز پڑھ رہے تھے کہ سجدہ کی حالت میں روح پرواز کر گئی۔ ان کے اور ان کے والد کے نام میں شدید اختلاف ہے۔ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔

(۲۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللهُ تعالى عنهما: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَأَصْحابَه تَوَضَّؤُوا مِن مَزادَةِ امْرَأَةٍ مُشْرِكَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مشرکہ عورت کے مشکیزہ سے پانی لے کر اس سے وضو کیا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مزادۃ﴾ میم کے زبر اور زائے معجمہ کے ساتھ۔ مشکیزہ کے معنی میں آیا ہے۔ جس کی

ساخت چمڑے سے ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے اہل کتاب کے علاوہ مشرکین کے بھی زیر استعمال برتنوں کے پاک ہونے کی جانب راہنمائی ملتی ہے اور یہ اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مردہ جانور کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے کیونکہ جس مشکیزہ سے آپؐ نے پانی لیا وہ ایک مشرکہ عورت کے قبضہ میں تھا اور مشرکین کے ذبح کردہ جانور کی کھال سے تیار کیا گیا تھا اور ان کے ذبائح تو مردار ہی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کے ایسے برتن جن میں نجاست وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو ان کا استعمال بغیر کسی تردد و تذبذب کے جائز و درست ہے اور اس حدیث سے دباغت شدہ کھال کے پاک ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ﴾ خزاعی کعبی تھے۔ ان کا شمار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ ان کی کنیت ابونجید تھی۔ غزوۂ خیبر کے زمانہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں ۵۲ھ یا ۵۳ھ میں وفات پائی۔

(۲۱) وعن أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ الله تعالى عنه: أَنَّ قَدَحَ النَّبِيِّ ﷺ انْكَسَرَ فَاتَّخَذَ مَكَانَ الشَّعْبِ سِلْسِلَةً مِنْ فِضَّةٍ. أَخرَجهُ البُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ذاتی پیالہ ٹوٹ گیا تو آپؐ نے اس ٹوٹی جگہ پر چاندی کا تار لگوا دیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ القدح ﴾ "قاف" اور "دال" دونوں پر زبر۔ چھوٹا "پیالہ"۔ ﴿ الشعب ﴾ "شین" کے زبر اور "عین" کے سکون کے ساتھ۔ ٹوٹی ہوئی جگہ۔ ﴿ سلسلة ﴾ دونوں جگہ سین پر زبر۔ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا' جوڑنا اور دونوں جگہ سین کے زیر کے ساتھ بھی ہے تو اس صورت میں لڑی' زنجیر وغیرہ کے معنی ہوں گے۔ وہ لوہے کی زنجیر دھاگے کی طرح باریک ہوگی۔ معنی یہ ہوا کہ دونوں جانب شکستہ مقام کو چاندی کے تار سے ملا دیا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ایسی ضروریات و اغراض کیلئے تھوڑی سی چاندی استعمال کرنا جائز ہے۔ گویا کھانے پینے کے برتنوں میں ضرورتاً اتنی کم مقدار میں سونا اور چاندی اگر لگا ہو تو ایسے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے اور ان سے وضو' غسل وغیرہ کرنا بھی بلا کراہت درست اور جائز ہے۔ سونے' چاندی سے بنے ہوئے برتنوں کے استعمال میں تکبر اور تعلی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کبر و نخوت اور تعلی خالق کائنات کو پسند نہیں۔ اس لئے ان کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا اور شکستہ کو تار کے ذریعہ پیوستہ کر کے استعمال کرنے میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کبر وغرور اور تعلی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس بنا پر استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

۳ - بَابُ إِزَالَةِ النَّجَاسَةِ وَبَيَانِهَا — نجاست کی تفصیل اور اسے

دور کرنے کا بیان

(۲۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ الله ﷺ عَنِ الخَمْرِ تُتَّخَذُ خَلاً؟ قال: «لاَ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ (مسلم و ترمذی۔ اور ترمذی نے اسے حسن اور صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عن الخمر ﴾ یعنی حرمت شراب کے بعد۔ شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ ﴿ خل ﴾ "خاء" کے فتح اور لام کی تشدید' شراب یا انگور وغیرہ کے شیرہ سے تیار کردہ سرکہ' یعنی کیا شراب کی صورت تبدیل کر کے سرکہ بنا لینا جائز ہے یا نہیں؟ ﴿ فقال: لا ﴾ اس کے جواب میں فرمایا ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس میں نہی تحریم کیلئے ہے۔

حاصل کلام: اس میں یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے۔ البتہ اس میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں کہ شراب جب سرکہ بن جاتا ہے تو اس کے جواز اور حرمت کے بارے میں کیا رائے ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس کی حرمت پر کوئی واضح دلیل نہیں اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ ایک چیز کی حالت کے بدلنے سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے لیکن شراب کا سرکہ بنانا ممنوع ہے۔

اس حدیث کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس یتیموں کی شراب تھی۔ حرمت شراب کے حکم آنے کے بعد انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ یتیموں کا بڑا نقصان ہو گا۔ اس نقصان سے بچنے کیلئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شراب کو سرکہ میں تبدیل کرنے کی اجازت طلب کی۔ جس کے جواب میں آپؐ نے ایسا کرنے سے صاف طور پر منع فرما دیا۔ اس کھلی اور واضح ممانعت کے باوجود جس کسی نے شراب سے سرکہ بنانے کے جواز کا فتویٰ دیا اس نے نص صریح کی خلاف ورزی کی۔ اس حدیث (اور دیگر ادلہ شرعیہ) سے معلوم ہوا کہ شراب کا ہر قسم کا استعمال ناجائز ہے اور اس سے سرکہ بنانا بھی ممنوع ہے۔

(۲۳) وعَنْهُ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ أَمَرَ رَسُولُ الله ﷺ أَبَا طَلْحَةَ فَنَادَى: أَنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَنْهَيَانِكُمْ عَنْ لُحُومِ الحُمُرِ الأَهْلِيَّةِ، فإِنَّها رِجْسٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ جس روز غزوہ خیبر تھا رسول اللہ ﷺ نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا (کہ لوگوں کو مطلع کر دیں) انہوں نے بآواز بلند اعلان کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ دونوں تمہیں گھریلو گدھوں کے گوشت کو کھانے سے منع فرماتے ہیں' کیونکہ وہ رجس (ناپاک) ہے۔ (بخاری

و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یوم خیبر ﴾ سے غزوۂ خیبر کے روز مراد ہے۔ خیبر مدینہ کے شمالی جانب ۹۶ میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے۔ یہاں یہود رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد محرم ۷ھ میں یہ غزوۂ یہود کے ساتھ واقع ہوا۔ فتح خیبر کے بعد نبی ﷺ نے ان کو اسی جگہ پر اس شرط کے ساتھ رہنے کا حق دیا کہ وہ اپنے کھیتوں کے اناج اور باغات کے پھلوں کا آدھا حصہ مسلمانوں کو دیں گے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو تیماء اور اریحا کی طرف جلا وطن کر دیا۔ ﴿ ینھیانکم ﴾ میں تثنیہ کی ضمیر اللہ اور اس کے رسول کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں اللہ اور اس کا رسول منع فرماتے ہیں۔ ﴿ الحمر ﴾ "حاء" اور "میم" کے پیش کے ساتھ۔ اس کا واحد حمار ہے۔ اردو میں جسے گدھا کہتے ہیں۔ ﴿ الاھلیۃ ﴾ گھریلو (جنگلی نہیں) اھلیۃ کی نسبت اھل کی طرف ہے یعنی وہ جسے انسان اپنے گھر میں اہل و عیال کے ہاں پرورش کرتا اور پالتا ہے۔ ﴿ رجس ﴾ راء کے زیر سے۔ ہر وہ چیز جسے ایک انسان گندگی تصور کرتا ہے خواہ وہ نجس ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ گدھے کا جوٹھا نجس اور ناپاک ہے۔

حاصل کلام: گدھے کا گوشت بالاتفاق حرام ہے۔ صرف ابن عباس رضی اللہ عنہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ گدھے کا جوٹھا ائمہ اربعہ کے نزدیک پاک ہے۔ بعض فقہاء مثلاً امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اسے ناپاک کہتے ہیں۔ اس بارے میں ائمہ اربعہ کی رائے قابل ترجیح اور زیادہ قرین صواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت ابو طلحۃ رضی اللہ عنہ ﴾: ابوطلحہ کنیت۔ نام زید بن سہل بن الاسود بن حرام انصاری، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے اور اس کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوۂ احد میں حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے ہاتھ شل ہو گیا۔ معرکہ حنین میں بیس دشمنان اسلام کو قتل کیا۔ ۳۴ھ یا بقول بعض ۵۱ھ میں وفات پائی۔

(٢٤) وعن عَمْرو بْنِ خَارِجَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِمِنًى وَهُوَ عَلَى رَاحِلَتِهِ، وَلُعَابُهَا يَسِيْلُ عَلَى كَتِفِي. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری پر مقام منیٰ میں ہمیں خطاب فرمایا اور اس اونٹنی کا لعاب دہن میرے کندھوں پر بہتا تھا۔ (احمد و ترمذی۔ اور ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ بمنی ﴾ تنوین کے ساتھ مکہ مکرمہ کے ساتھ یہ وہ جگہ ہے جہاں حج کے مشہور ترین شعائر میں سے قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ﴿ لعابھا ﴾ "لام" کے ضمہ کے ساتھ۔ منہ سے پانی کی صورت میں جو رال ٹپکتی اور گرتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ان حیوانات کا لعاب دہن پاک ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عمرو بن خارجہ بن منتفق اسدی ﴾ : بقول بعض اشعری اور بقول شخصے انصاری اور کسی کے بقول جمحی قبیلے سے ہیں۔ ابوسفیان کے حلیف تھے۔ ان کے اسدی ہونے کے بارے یں زیادہ شہرت ہے۔ مشہور صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔

(۲۵) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رسولُ الله ﷺ يَغْسِلُ المَنِيَّ ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الصَّلاَةِ في ذَلِكَ الثَّوبِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى أَثَرِ الغَسْلِ فِيْهِ. متفق عليه.

ولمسلم: «لَقَدْ كُنْتُ أَفْرُكُه مِنْ ثَوبِ رَسولِ اللهِ ﷺ فَرْكاً، فَيُصلِّي فِيْهِ. وَفِي لفظٍ لَهُ: «لَقَد كُنْتُ أَحُكُّهُ يَابِساً بِظُفرِي مِنْ ثَوْبِهِ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ (کپڑے پر لگی ہوئی) منی کو دھویا کرتے تھے۔ پھر اسی کپڑے کو زیب تن فرما کر نماز پڑھ لیتے تھے اور میں دھونے کے نشان اور اثر کو صاف طور پر (اپنی آنکھوں سے) دیکھتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی کو کھرچ دیا کرتی تھی۔ پھر آپ اسی کپڑے میں نماز ادا فرما لیتے تھے۔

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب منی خشک ہو جاتی تو میں اپنے ناخن سے اسے کھرچ کر کپڑے سے اتار دیتی۔

لغوی تشریح: ﴿ افركه ﴾ اس میں ضمیر متصل "ہ" سے مراد منی ہے۔ راء کے کبھی پیش سے اور کبھی زیر کے ساتھ۔ باب نصر ینصر اور ضرب یضرب دونوں سے آتا ہے۔ ﴿ الفرك ﴾ کے معنی مل کر صاف کرنا کہ اس کا اثر زائل ہو جائے۔ ﴿ احكه ﴾ میں بھی ضمیر متصل ہ سے مراد منی ہے۔ "حاء" کے پیش کے ساتھ "حک" سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بھی ملنا کے آتے ہیں۔ ﴿ يابسا ﴾ حال واقع ہوا ہے جس کے معنی خشک کے ہیں۔

حاصل کلام: اس بارے میں وارد تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منی کو مطلقاً کپڑے سے دھونا واجب نہیں خواہ وہ خشک ہو یا تر' بلکہ اس کو زائل کرنے کیلئے جبکہ وہ خشک ہو اتنا کافی ہے کہ اسے صاف کر دے ہاتھ سے یا کپڑے کے ٹکڑے سے یا اذخر گھاس سے اور ان دونوں جیسی چیزوں مثلاً لکڑی یا سرکنڈے وغیرہ سے۔ ایک گروہ نے ان احادیث کی روشنی میں یہ استدلال کیا ہے کہ منی پاک ہے۔ مگر اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ منی پاک ہے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے نیل الاوطار میں کہا ہے کہ تعبدا منی کو دھو کر' ہاتھ کے ساتھ صاف کر کے' اسے مل کر' رگڑ کر وغیرہ طریقوں سے زائل کرنا ثابت ہے۔ کسی چیز کا نجس ہونا یہ معنی نہیں رکھتا۔ پس صحیح موقوف اور صائب مسلک یہی ہے کہ منی ناپاک ہے لہٰذا مذکورہ بالا تمام طریقہ ہائے طہارت میں سے کسی ذریعہ سے اس کو پاک کیا جائے۔

مگر علامہ شوکانی نے السیل الجرار اور الدرر البھیھہ میں منی کو پاک قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی نجاست پر کوئی نص نہیں۔ گویا اس بارے میں ان کی رائے مختلف ہے۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ انسان کا مادہ منویہ پاک ہے یا ناپاک۔ اس میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک مکتب فکر کی رائے ہے کہ منی آب بنی اور لعاب دہن کی طرح پاک ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمائندگی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ائمہ میں سے اور صحابہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ' حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کرتی ہیں اور دوسرے مکتب فکر کی نمائندگی ائمہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خشک منی کھرچ دینے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ پانی سے دھونا ضروری نہیں۔ دونوں مکتب فکر کے پاس دلائل ہیں۔ منی کو پاک قرار دینے والوں کی دلیل اسے کھرچ دینا ہے' اس کے بعد چونکہ کپڑا دھویا نہیں گیا اس لئے یہ پاک ہے ورنہ کھرچنے کے بعد اسے دھویا ضرور جاتا اور جس گروہ نے اسے ناپاک کہا ہے ان کی دلیل منی سے آلودہ جگہ کو پانی سے دھونا ہے اگر یہ پاک ہوتی تو دھونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسے پاک کہنے والوں کا جواب یہ ہے کہ کپڑے کو دھویا تو صرف نظافت کی بنا پر گیا ہے نجاست کی وجہ سے نہیں۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع الفوائد' ص: ۱۱۹۔ ۱۲۶' ج ۳ میں اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے۔

راوی حدیث : ﴿ عائشۃ صدیقہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما ﴾ : ہجرت مدینہ سے دو سال قبل ماہ شوال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا اور رخصتی اھ میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ ۵۷ھ یا ۵۸ھ کے ماہ رمضان کی ۱۷ تاریخ کو فوت ہوئیں۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کی گئیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ بکثرت احادیث کی راویہ ہیں۔ اشعار عرب سے بخوبی واقف تھیں۔ آپ کی برأت آسمان سے نازل ہوئی۔ جس کا قرآن مجید کی سورۂ نور میں ذکر ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے حجرہ میں مدفون ہیں۔

(٢٦) وعَن أَبِي السَّمْحِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسولُ اللهِ ﷺ: «يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الجَارِيَةِ، وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الغُلَامِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَه الحَاكِمُ.

حضرت ابوالسمح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لڑکی کے پیشاب سے کپڑا دھویا جائے گا اور لڑکے کے پیشاب سے کپڑے پر پانی کے چھینٹے مارے جائیں گے۔" (اسے ابوداؤد و نسائی اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ من بول الجاریۃ ﴾ اس میں "من" تعلیل یعنی علت و وجہ کیلئے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کپڑے' بدن وغیرہ پر لڑکی کے پیشاب لگنے کی وجہ سے۔ ﴿ الجاریۃ ﴾ لڑکی' بچی کے معنی۔ ﴿ یرش ﴾

"رش" سے ماخوذ ہے اور مجہول کا صیغہ ہے اور معنی اس کے چھڑکنے کے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جہاں پیشاب لگا ہو وہاں پانی اتنا چھڑکا جائے کہ اتنے متاثرہ حصہ پر پانی غالب آئے اور متاثرہ جگہ کو ڈھانپ لے مگر اتنی کثیر مقدار میں چھڑکنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پانی وہاں سے بہہ نکلے اور قطروں کی صورت میں نیچے گرنے لگے۔

حاصل کلام: حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں شرعی حکم الگ الگ ہے۔ لڑکی کے پیشاب سے کپڑے کو دھونے کا اور لڑکے کے پیشاب کیلئے پانی کا چھڑکنا اس وقت تک ہے جب تک دونوں کی غذا دودھ ہے۔ دودھ کے علاوہ غذا کھانے کی صورت میں دونوں کے پیشاب نجاست کے اعتبار سے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پاک ہے۔ بس حدیث میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ بچے کے پیشاب کو پاک کرنے میں شریعت نے ذرا نرمی دی ہے۔
حاصل کلام یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے پیشاب میں فرق ہے۔ شیر خوارگی کے ایام میں لڑکی کا پیشاب لڑکے کی بہ نسبت زیادہ ناپاک ہے۔ شیر خوارگی کے بعد دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ، ابن وہب رحمہ اللہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حسن بصری رحمہ اللہ اور اسحٰق بن راھویہ رحمہ اللہ کے نزدیک لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا کافی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ دھونا قرار دیتے ہیں جو صحیح نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوالسمح ﴾ "سین" پر زبر اور "میم" ساکن۔ ابوالسمح اس کی کنیت ہے۔ ایاد (ھمزہ کے کسرہ کے ساتھ) ان کا نام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نام اور کنیت ایک ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپؐ کے خادم تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گم ہوگئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں وفات پائی؟ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

(۲۷) وعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي دَمِ الحَيْضِ يُصِيبُ الثَّوْبَ: «تَحُتُّهُ، ثُمَّ تَقْرُصُهُ بِالمَاءِ، ثُمَّ تَنْضَحُهُ، ثُمَّ تُصَلِّي فِيهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيهِ.

حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض کا خون جو کپڑے کو لگ جائے کے متعلق فرمایا۔ "پہلے اسے کھرچ ڈالو پھر پانی سے مل کر دھو لو پھر اس پر کھلا پانی بہاؤ پھر اس میں نماز پڑھ لو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ تحتہ ﴾ "تا" کے فتح "حاء" کے ضمہ اور دوسرے "تا" کے تشدید اور ضمہ کے ساتھ، باب نصر ینصر سے صیغہ مؤنث "حت" سے ماخوذ ہے جس کے معنی تلنا اور کھرچنا ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ کپڑے پر لگے ہوئے خون کو اچھی طرح مل کھرچ کر دور کر دینا اور "ہ" کی ضمیر منصوب "دم" کی جانب راجع ہے۔ ﴿ ثم تقرصہ ﴾ اس میں "ہ" کی ضمیر کپڑے کی طرف راجع ہے "ر" پر ضمہ ہے، باب نصر ینصر سے ہے۔ اس سے مراد ہے کہ کپڑے کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں سے خوب مل کر دھویا

جائے۔ یعنی عورت اس کپڑے پر پانی ڈال کر اچھی طرح بھگو کر تر کر لے پھر اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے اطراف کے ساتھ اچھی طرح مل کر دھوئے' تاکہ خون کا جتنا حصہ کپڑے میں جذب ہو چکا تھا وہ اس سے خارج ہو جائے۔ ﴿ ثم تنضحه ﴾ "ضاد" پر فتحہ اور اسے کسرہ دینا بھی جائز ہے۔ فتح یفتح اور ضرب یضرب سے۔ معنی یہ ہوئے کہ آخر میں اس پر اچھی طرح پانی بہاؤ۔

حاصل کلام: خون کو اولاً خوب رگڑنے کا حکم ہے' تاکہ پانی کے اس میں سرایت کرنے کا راستہ بن سکے پھر اسے دھونے کا حکم ہے' تاکہ خون کا اثر زائل ہو جائے۔ محض دھونے سے ایسی صفائی حاصل ہونا مشکل تھا۔ نضح کا اس مقام پر موقع کی مناسبت سے معنی غسل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ باب میں غسل کا ذکر کیا ہے اور اس کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ نضح اور غسل دونوں پر حاوی ہے پس یہ حدیث ہی نضح کے معنی غسل کے لینے کی واضح دلیل ہے۔

خون حیض رگڑنے اور مل کر دھونے کے باوجود اپنے اثرات اور نشانات باقی چھوڑے تو اس میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔ ایسے کپڑوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے جیسا کہ آنے والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ﴾ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بہن۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ مکہ میں ایمان لانے والے قدیم الاسلام مسلمانوں میں سے تھیں۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ ۷۳ھ میں اپنے بیٹے عبداللہ کے قتل کئے جانے کے ایک ماہ بعد مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً سو برس تھی۔ ایسی پیرانہ سالی کے باوجود نہ ان کا کوئی دانت گرا اور نہ ہی عقل میں کسی قسم کا کوئی تغیر پیدا ہوا۔

(۲۸) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قال: قَالَتْ خَوْلَةُ: يَا رَسُولَ اللهِ! فَإِن لَمْ يَذْهَبِ الدَّمُ؟ قَالَ: «**يَكْفِيكِ المَاءُ، وَلاَ يَضُرُّكِ أَثَرُهُ**». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ خولہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! سے استفسار کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (اگر خون آلود کپڑے کو اچھی طرح مل کر دھونے کے باوجود) خون کا نشان ختم نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ ارشاد فرمایا "بس تیرا اس پر اچھی طرح پانی بہانا کافی ہے' اس کا نشان تیرے لئے ضرر رساں نہیں۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فان لم يذهب ﴾ یعنی خون آلود کپڑے کو خوب ملنے' رگڑنے اور کھرچنے کے اور اچھی طرح پانی سے دھونے کے بعد بھی اگر خون کا اثر نہ جائے۔ ﴿ يكفيك الماء ﴾ یعنی پانی کے ساتھ دھونا تیرے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد کسی تذبذب' تردد اور شک کی ضرورت نہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نجاست عین کو زائل کرنے کے بعد کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے باقی ماندہ اثرات و نشانات کو دور کرنا کپڑے کی پاکیزگی کیلئے شرط نہیں ہے۔ اس روایت کی سند میں چونکہ ابن لهيعة ایک ایسا راوی ہے جسے علماء فن رجال نے ضعیف قرار دیا ہے ورنہ جہاں تک حدیث میں مذکورہ مسئلہ کا تعلق ہے وہ معنوی اعتبار سے صحیح ہے۔

راوی حدیث: ﴿ خولة رضی اللہ عنہا ﴾ خاء کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ خولہ سے مراد خولہ بنت یسار ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ خولہ بنت یمان ہوں گی۔ مگر مؤلف نے اس کی تردید کر دی ہے۔ (الاصابہ)

٤ - بَابُ الوُضُوءِ — وضو کا بیان

(٢٩) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه عن رسول اللهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: «لَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ وُضُوءٍ». أَخرَجَهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَذَكَرَهُ البُخَارِيُّ تَعْلِيقاً.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اگر مجھے اپنی امت کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دے دیتا۔" (مالک' احمد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ باب الوضوء ﴾ "واؤ" کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی ہیں ہاتھوں اور پاؤں وغیرہ کے اطراف کو دھونا۔ مطلقاً اور شرعاً دونوں طرح دھونے کو شامل ہے۔ وضو کا عمل' اس سے سب واقف ہیں اور معروف و مشہور ہے۔ اگر وضو میں "واؤ" کے فتح کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی اس برتن میں موجود پانی کے ہیں جس سے وضو کیا جاتا ہے۔

﴿ لو لا ان اشق ﴾ کا مطلب ہے کہ اگر مجھے یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ میں اپنی امت کو کہیں تکلیف اور مشقت میں مبتلا نہ کر دوں۔ ﴿ لامرتهم ﴾ تو میں ان کو حکم دیتا۔ اس میں امر ایجاب کے حکم میں۔ یعنی میں واجب قرار دیتا۔ ایسا حکم صادر ہے۔ فرمانے سے رکنا رفع مشقت کی مصلحت کے پیش نظر اس کا مقتضی ہے۔ مسواک کرنا مسنون ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی وضو کیا جائے اس کے ساتھ مسواک کرنا مسنون ہے۔ مسلم اور ابوداؤد میں مروی ہے کہ مسواک کرنا منہ کو صاف اور اپنے پروردگار کو راضی کرنے کا موجب ہے۔ مزید یہ کہ مسواک تمام انبیاء و رسل کی سنت ہے۔ مسند امام احمد' ابن خزیمہ' حاکم اور دارقطنی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جو نماز مسواک کر کے پڑھی گئی ہو اس کا ثواب

بے مسواک نماز سے ستر گنا زیادہ ہے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر پہلے سے وضو موجود ہو تو نماز کی ادائیگی سے پہلے مسواک کر لینی چاہئے تا کہ اتباع سنت کا تقاضا پورا ہو سکے۔

(٣٠) وعَنْ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ رضي الله تعالى عنه: أَنَّ عُثْمَانَ دَعَا بِوَضُوءٍ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلُ ذَلِكَ، ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هَذَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت حمران مولیٰ عثمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی طلب فرمایا۔ پہلے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں تین مرتبہ دھوئیں۔ پھر منہ میں پانی ڈال کر کلی کی پھر ناک میں پانی چڑھایا اور اسے جھاڑ کر صاف کیا۔ پھر تین مرتبہ اپنا چہرہ دھویا۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ کہنی تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر اسی طرح بایاں ہاتھ کہنی تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر اپنے سر کا مسح کیا۔ پھر اپنا دایاں اور بایاں پاؤں ٹخنوں تک تین' تین مرتبہ دھویا۔ پھر فرمایا کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے جس طرح ابھی میں نے وضو کیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بوضوء ﴾ "واؤ" کے فتح کے ساتھ۔ وہ پانی جس سے وضو کیا جائے۔ ﴿ تمضمض ﴾ المضمضہ سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ میں پانی داخل کر کے اسے وہیں گردش کرائے۔ پھر باہر پھینک دے۔ ﴿ استنشق ﴾ استنشاق سے ماخوذ ہے۔ پانی کا ناک کے داخلی حصہ میں پہنچا کر بذریعہ سانس سے اوپر چڑھانا۔ ﴿ استنثر ﴾ ناک سے داخل شدہ پانی کو باہر نکالنا۔ ﴿ المرفق ﴾ کسرہ کے ساتھ۔ "ر" ساکن اور "فا" کی فتح کے ساتھ۔ بازو کی ہڈی یعنی کلائی کے جوڑ سے بازو کے اوپر والے حصے کا ہڈی کا جوڑ۔ یعنی کہنی۔ ﴿ الی الکعبین ﴾ ٹخنوں تک۔ پنڈلی اور پاؤں کے ملنے کی جگہ۔ ابھری ہوئی ہڈیاں۔ اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں جنہیں مؤلف نے اختصاراً حذف کر دیا ہے۔ ان کا تعلق وضو سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا: من توضا نحو وضوئی هذا ثم صلی رکعتین لا یحدث فیھا نفسه غفرله ما تقدم من ذنبه۔ کہ "جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا' پھر اس نے اپنے دل میں کوئی ایسی بات بھی نہ کی جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے"۔

حاصل کلام: اس حدیث سے اعضاء وضو میں سے ہاتھ منہ اور پاؤں کا تین تین مرتبہ دھونا ثابت ہوتا

ہے۔ دوسری روایت میں دو، دو مرتبہ اور بعض روایات میں ایک ایک مرتبہ دھونے کا ذکر بھی آیا ہے۔ محدثین فقہاء نے ان روایات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ ہر عضو کا ایک ایک مرتبہ دھونا واجب اور تین تین مرتبہ دھونا مسنون ہے، دو دو مرتبہ بھی دھو لیا جائے تو بھی کافی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ واجب تو صرف ایک مرتبہ دھونا ہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حمران رضی اللہ عنہ ﴾ "حاء" کے ضمہ اور "میم" کے سکون۔ حمران بن ابان۔ ہمزہ کے فتح کے ساتھ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک غزوہ میں اسے قید کیا۔ جو مسیب بن نجبہ کے حصہ میں آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسیب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ طبقہ ثانیہ سے تعلق رکھتا ہے ثقہ ہے اور ۷۵ھ میں فوت ہوا۔ بعض نے سن وفات ۷۶ھ اور ۷۱ھ بھی ذکر کی ہے۔

﴿ عثمان رضی اللہ عنہ ﴾ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۔ تیسرے خلیفہ راشد، سابقین اولین میں سے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو لخت جگر رقیہ رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا یکے بعد دیگرے ان کی زوجیت میں رہیں۔ اسی وجہ سے ذوالنورین کے لقب سے مشہور و معروف ہوئے۔ جمعہ کے روز جام شہادت نوش کیا۔ یہ ۳۵ھ / ۱۸ ذی الحجہ کا واقعہ ہے۔

(۳۱) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِيْ صِفَةِ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَاحِدَةً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، بَلْ قَالَ التِّرْمِذِيُّ: إِنَّهُ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي الْبَابِ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "آپؐ نے اپنے سر کا مسح ایک مرتبہ کیا۔" (اسے ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے بلکہ ترمذی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس باب میں یہ حدیث سب سے زیادہ صحیح ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہی فرض ہے۔ علماء امت کی غالب اکثریت کا یہی مسلک ہے البتہ امام شافعی رحمہ اللہ مسح میں تکرار کے قائل ہیں اور دوسرے اعضاء کی طرح تین بار مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال ابوداؤد کی ایک روایت سے ہے لیکن اکثر احادیث (جو صحیحین اور سنن میں مروی ہیں) کی بناء پر جمہور علماء کا مسلک ہی راجح ہے اور اقرب الی الصواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ﴾ چوتھے خلیفہ راشد۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ کے والد ماجد اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد تھے۔ ماسوا جنگ تبوک کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو منصب خلافت پر فائز ہوئے اور ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کو جمعہ کی صبح کوفہ میں ایک شقی القلب عبدالرحمٰن بن ملجم نے پے درپے تین وار کر کے شہید کر دیا۔

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے وضو کے

عَاصِمٍ رضي الله تعالى عنه - فِيْ صِفَةِ الوُضُوءِ - قَالَ: وَمَسَحَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَدْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

متعلق مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر کا مسح اس طرح کیا کہ دونوں ہاتھ سر کے آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی جانب واپس لے آئے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِيْ لَفْظٍ لَهُمَا: بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ حَتَّى ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى المَكَانِ الَّذِيْ بَدَأَ مِنْهُ.

ایک روایت میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اس طرح ہے کہ آپؐ سر کے اگلے حصہ سے شروع کر کے ہاتھوں کو سر کے پچھلے حصہ یعنی گدی تک لے گئے اور پھر اسی طرح دونوں ہاتھوں کو سر کے بالوں کا مسح کرتے ہوئے اسی جگہ واپس لے آئے جہاں سے مسح کا آغاز کیا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ اقبل بیدیه وادبر ﴾ یعنی مسح دونوں ہاتھوں سے سر کے اگلے حصہ سے شروع کیا اور سر کے آخری حصہ تک لے جا کر واپس اسی مقام پر لے آئے۔ اس کی وضاحت ﴿ بدا بمقدم راسه ﴾ کا جملہ کرتا ہے۔ ﴿ قفا ﴾ سر کے آخری حصہ کو کہتے ہیں جو گردن کے پچھے حصہ کے ساتھ ملحق ہے۔ ﴿ رجع ﴾ رجع سے ماخوذ ہے اور یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سر کے مسح کا آغاز سر کے اگلے حصہ سے کیا جانا چاہئے۔ ائمہ ٔ اربعہ (امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ' امام مالک رحمہ اللہ' امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ) کے علاوہ اسحٰق بن راہویہ کی یہی رائے ہے۔ لیکن ترمذی میں منقول ایک روایت جسے ترمذی نے حسن کہا ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کے مسح کا آغاز پچھلے حصہ سے کرنا بھی جائز ہے۔ اس بنا پر بعض اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔ وکیع بن جراح بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ مگر یہ روایت حسن نہیں اس کا ایک راوی عبداللہ بن محمد بن عقیل متکلم فیہ ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے اس پر حافظے کی وجہ سے جرح کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالله بن زيد بن عاصم رضی اللہ عنہ ﴾ انصاری تھے۔ انصار کے قبیلہ بنی مازن بن نجار کے فرد تھے۔ غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔ جنگ یمامہ میں وحشی کے ساتھ مل کر مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔ ۶۳ھ میں معرکہ حرہ کے روز شہادت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے۔ یہاں یہ شبہ نہ رہے کہ یہ عبداللہ بن زید وہ ہیں' جنہوں نے خواب میں اذان سنی تھی۔ یہ عبداللہ بن زید بن عاصم ہیں اور وہ عبداللہ بن زید بن عبد ربہ تھے۔ گویا دادا دونوں کے الگ الگ تھے۔ ابن عبد ربہ کا ذکر باب الاذان میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

(۳۳) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رضي الله تعالى عنهما، فِيْ صِفَةِ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے وضو کی کیفیت کے بارے میں روایت ہے کہ آپؐ نے اپنے سر کا مسح

الوُضُوءِ قَالَ: ثُمَّ مَسَحَ ﷺ بِرَأْسِهِ وَأَدْخَلَ إِصْبَعَيْهِ السَّبَّاحَتَيْنِ فِي أُذُنَيْهِ، وَمَسَحَ بِإِبْهَامَيْهِ عَلَى ظَاهِرِ أُذُنَيْهِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

کیا اور اپنے ہاتھوں کی دونوں شہادت والی انگلیوں کو کانوں میں داخل کیا اور انگوٹھوں سے کانوں کے باہر کا مسح کیا۔ (اس روایت کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿السباحتین﴾ ۔ "اصبعیہ" کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ اس کا واحد السباحۃ اس انگلی کو کہتے ہیں جو انگوٹھے اور انگشتِ وسطی کے مابین ہے۔ ﴿عند التسبیح﴾ چونکہ اس سے اشارہ کیا جاتا ہے اس بنا پر اسے سباحۃ کہتے ہیں۔ سباحتین' اس کا تثنیہ ہے۔ یعنی دونوں ہاتھوں کی انگشتہائے شہادت۔ ﴿الابھام﴾ پانچوں انگلیوں میں پہلے نمبر۔ پانچوں انگلیوں سے زیادہ فائدہ بخش اور رسغ (کٹ) کے زیادہ قریب۔ ﴿ظاھر اذنیہ﴾ سے مراد دونوں کانوں کا بالائی حصہ۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا بین ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کانوں کے ظاہر اور باطن دونوں پر مسح فرمایا ہے۔ ظاہر سے مراد کان کا وہ حصہ ہے جو سر کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور باطن وہ ہے جو منہ کے قریب ہوتا ہے۔ ترمذی نے کانوں کے ظاہر اور باطن پر مسح کی حدیث بیان کرکے کہا کہ اہل علم کا عمل اسی پر ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن عمرو بن العاص بن وائل سہمی قریشی رضی اللہ عنہما﴾ ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب کعب بن لوی پر جا ملتا ہے۔ اپنے والد سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے۔ اپنے والد محترم سے صرف تیرہ برس چھوٹے تھے۔ بڑے پایہ کے عالم فاضل' حدیث کے حافظ اور عابد تھے۔ بکثرت احادیث نبوی ان سے مروی ہیں۔ یہ ارشادات نبوی ﷺ کو قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ ۶۳ھ یا ۷۰ھ میں وفات پائی۔ تدفین کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ مکہ مکرمہ میں' طائف میں اور مصر میں۔

(٣٤) وعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهِ فَلْيَسْتَنْثِرْ ثَلاَثاً، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبِيتُ عَلَى خَيْشُومِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی نیند سے بیدار ہو تو تین مرتبہ اپنا ناک جھاڑ کر صاف کرے اس لئے کہ شیطان ناک کے نتھنوں کی ہڈی پر رات بسر کرتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

(٣٥) وعَنْهُ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلاَ يَغْمِسْ يَدَهُ فِي الإِنَاءِ حَتَّى يَغْسِلَهَا ثَلاَثاً، فَإِنَّهُ لاَ يَدْرِي

یہ روایت بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ہے جس میں مذکور ہے کہ "تم میں سے جب کوئی نیند سے بیدار ہو تو تین مرتبہ دھونے سے پہلے اپنا ہاتھ پانی

أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

کے برتن میں نہ ڈالے۔ کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں کہ رات بھر ہاتھ کہاں کہاں گردش کرتا رہا (اور کس کس چیز کو چھوتا اور مس کرتا رہا)" (بخاری و مسلم' مذکورہ بالا حدیث میں مذکورہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فلا یغمس ﴾ میم کے کسرہ کے ساتھ۔ معنی ہیں کہ داخل نہ کرے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم استحباب پر مبنی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اسے واجب قرار دیتے ہیں اور جمہور کی رائے ہی اقرب الی الصواب ہے۔ البتہ جب اسے یقین حاصل ہو جائے کہ اس کا ہاتھ نجاست و گندگی سے آلودہ ہوا ہے تو ہاتھ کا دھونا ضروری ہے۔ نیز یہ مقدمات وضو میں سے بھی ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں مذکور لفظ فی الاناء اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص شب و روز میں جس وقت نیند سے اٹھے تو اس کیلئے مستحب ہے کہ کسی برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے تین مرتبہ دھو لے۔ یہ حکم ہر قسم کے برتن کے لئے ہے البتہ نہر اور بڑا حوض و تالاب اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور ان میں ہاتھ داخل کرنا جائز ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتح الباری میں یہی رائے بیان کی ہے۔

(٣٦) وعَنْ لَقِيطِ بْنِ صَبِرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَسْبِغِ الوُضُوءَ، وَخَلِّلْ بَيْنَ الأَصَابِعِ، وَبَالِغْ فِي الاسْتِنْشَاقِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَائِماً». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. وَلأَبِيْ دَاوُدَ فِي رِوَايَةٍ: «إِذَا تَوَضَّأْتَ فَمَضْمِضْ».

حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وضو اچھی طرح پورا کرو اور انگلیوں کا خلال کرو' ناک میں پانی اچھی طرح چڑھایا کرو مگر روزے کی حالت میں (ایسا نہ کرو)" (اس روایت کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے) ابوداؤد کی ایک روایت کے الفاظ ہیں "جب تو وضو کرے تو کلی کر۔"

لغوی تشریح: ﴿ اسبغ ﴾ اسباغ سے فعل امر ہے۔ اسباغ کے معنی ہیں' اعضاء وضو کو پوری طرح اور اچھی طرح دھونا۔ ﴿ خلل ﴾ تخلیل سے فعل امر ہے۔ "خلال" یہ ہے کہ انگلیوں کے درمیان انگلی اس طرح داخل کرے کہ دونوں انگلیوں کا درمیانی حصہ پوری طرح تر ہو جائے۔ ﴿ الا ان تکون صائما ﴾ روزے دار کو پانی اتنا اوپر نہ چڑھانا چاہئے' تاکہ کہیں پانی گلے میں نہ اتر جائے اور روزہ ٹوٹ جائے۔ ناک کے اندرون پانی مبالغہ سے چڑھانا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اعضاء وضو کو اچھی اور پوری طرح دھونا۔ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا' تاکہ کہیں کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿ لقیط بن صبرۃ رضی اللہ عنہ ﴾ "لام" کے فتحہ اور "قاف" کے کسرہ سے۔ صبرۃ "صاد"

کے فتحہ اور "باء" کے کسرہ کے ساتھ۔ نسب نامہ یوں ہے لقیط بن صبرہ بن عبداللہ بن المنتفق بن عامر العامری رضی اللہ عنہ۔ وفد بنی المنتفق کے قائد تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لقیط بن عامر بن صبرہ ہیں جو ابورزین العقیلی کے نام سے مشہور ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ دونوں الگ الگ شخصیات ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ امام علی بن مدینی اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے۔ (الاصابہ۔ تہذیب)

(٣٧) وعَنْ عُثْمَانَ رضي الله تعالى عنه: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهُ فِي الوُضُوءِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ وضو کرتے ہوئے اپنی داڑھی کا خلال کیا کرتے تھے۔ (ترمذی۔ اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: داڑھی کا خلال نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور یہ مسنون ہے واجب نہیں۔

(٣٨) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِثُلُثَي مُدٍّ فَجَعَلَ يَدْلُكُ ذِرَاعَيْهِ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو تہائی مد پانی پیش کیا گیا تو آپؐ نے دھونے کیلئے بازوؤں کو ملنا شروع کیا۔ (احمد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اتی ﴾ مفعول واقع ہوا ہے۔ ﴿ مد ﴾ میم کے ضمہ اور دال کی تشدید کے ساتھ۔ پانی کا پیمانہ جس میں ایک رطل اور تہائی رطل پانی سمائے۔ آج کل کی اصطلاح میں چھ سو گرام وزن بنتا ہے۔ ﴿ یدلک ﴾ ملتے ہوئے دھونا۔ ﴿ ذراعیہ ﴾ ہتھیلی سے لے کر کہنی تک کے حصہ کو ذراع یعنی ہاتھ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے اتنی مقدار پانی سے وضو فرمایا۔ یہ کم سے کم پانی ہے جو وضو کے بارے میں نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اتنا پانی وضو میں استعمال کیا۔

حاصل کلام: دو تہائی مد کی مقدار والی حدیث بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے اتنے پانی سے وضو کیا اور ایک روایت میں ایک مد سے وضو کرنے کا ذکر بھی ہے۔ حجازی مد' انگریزی سیر اور کلو سے کچھ زیادہ کا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ مقدار میں پانی بلا ضرورت استعمال کرنے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

(٣٩) وعَنْهُ: أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَأْخُذُ لِأُذُنَيْهِ مَاءً خِلَافَ المَاءِ الَّذِيْ أَخَذَهُ لِرَأْسِهِ. أَخْرَجَهُ البَيْهَقِيُّ، وَقَالَ:

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دیکھا آپؐ جو پانی سر کے مسح کیلئے لیتے تھے' کانوں کے مسح کیلئے اس سے الگ

إِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ أَيْضاً.

لیتے تھے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور ترمذی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ بِلَفْظِ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ بِمَآءٍ غَيْرِ فَضْلِ يَدَيْهِ. وَهُوَ الْمَحْفُوظُ.

اور مسلم کے ہاں اسی سند سے یہ روایت بایں الفاظ منقول ہے کہ "آپ نے سر کا مسح کیا مگر وہ ہاتھوں سے بچا ہوا پانی نہیں تھا" یعنی نیا پانی استعمال کیا اور یہی مسلم کی روایت محفوظ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿وهو عند مسلم﴾ سے مراد ہے کہ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ ملاحظہ ہو (مسلم کتاب الطہارت باب وضو النبی ﷺ) ﴿من هذا الوجه﴾ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس سند سے بیہقی نے اس کو بیان کیا ہے مسلم میں بھی اسی سند سے بیان ہوئی ہے۔ ﴿بماء﴾ ھمزہ مجرور ہے۔ تنوین کے ساتھ۔ گرائمر کے اعتبار سے موصوف واقع ہو رہا ہے اور ﴿غیر فضل یدیه﴿ اس کی صفت ہے اور ﴿الفضل﴾ کے معنی ضرورت سے زائد بچا ہوا یعنی وضو پوری طرح مکمل کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے۔ پورے جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں ہاتھوں کو دھونے کے بعد جو پانی کی تری ہاتھوں کے ساتھ لگی رہی اس سے سر کا مسح نہیں کیا' بلکہ مسح کیلئے نیا پانی لیا۔ ﴿وهو المحفوظ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مسلم نے جس سیاق سے روایت بیان کی ہے وہ محفوظ ہے۔ اس میں کسی قسم کا کلام نہیں اور بیہقی کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا مشروع ہے مگر مصنف نے اس کے غیر محفوظ ہونے کی جانب اشارہ کر دیا۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے "زاد المعاد" میں پورے یقین و وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ نبی ﷺ سے کانوں کیلئے نیا پانی لینا ثابت نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ امام عبدالرحمٰن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (ج ۱' ص: ۴۹) میں کہا ہے کہ میں کسی مرفوع صحیح حدیث سے واقف نہیں جس میں یہ بیان ہو کہ آپؐ نے کانوں کیلئے نیا پانی لیا اور اس پر کلام نہ ہو۔ ہاں! ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے فعل سے یہ ثابت ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں نافع کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی دونوں انگلیوں سے اپنے کانوں کیلئے نیا پانی لیتے تھے۔

حاصل کلام: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی یہی رائے ہے کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا چاہیے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ جب کان سر کے ساتھ شامل ہیں تو پھر سر کے مسح کا پانی ہی کانوں کیلئے کافی ہے۔ بکثرت احادیث صحیحہ اسی رائے کی تائید کرتی ہیں۔ بیہقی' ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صراحتاً مروی ہے کہ فمسح براسه واذنيه کہ آپؐ نے پانی لیا تو اس سے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(٤٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ القِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ أَثَرِ الوُضُوءِ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "قیامت کے روز میری امت کے لوگ ایسی حالت میں آئیں گے کہ وضو کے اثرات کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے۔ تم میں سے جو شخص اس چمک اور روشنی کو زیادہ بڑھا سکتا ہو اسے ضرور بڑھانی چاہیے۔" (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ غرا ﴾ یاتون کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ اعراب اس طرح ہے کہ غین پر ضمہ اور راء پر تشدید ہے اور اغر کی جمع ہے اور "اغر" اسے کہتے ہیں جس کے سفیدی ہو اور ﴿ غرة ﴾ دراصل اس سفید چمک کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی میں ہوتی ہے۔ ﴿ محجلین ﴾ تحجیل سے اسم مفعول واقع ہو رہا ہے اور اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے پاؤں میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وضو کی چمک کی وجہ سے ان کے چہرے' ہاتھ اور پاؤں دمک اور چمک رہے ہوں گے۔ ﴿ یطیل ﴾ اطالۃ سے ماخوذ ہے۔ دراز کرنے' لمبا کرنے اور طویل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿ غرته ﴾ اپنی چمک' روشنی۔ مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک پانی پہنچانا ضروری و لازمی ہو وہاں سے آگے تک پہنچانا۔

حاصل کلام: اس حدیث کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اعضاء وضو کو حد فرض سے زیادہ تک دھونا مثلاً ہاتھوں کو کندھوں تک اور پاؤں کو گھٹنوں تک۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی حدیث نے یہی مفہوم سمجھا اور اسی پر ان کا اپنا عمل تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسے مستحب سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اسے مستحب نہیں سمجھتے' وہ فرماتے ہیں کہ وضو کی حد متعین ہے اور زیور اپنے مقام پر ہے۔ ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عضو وضو کو تین' تین مرتبہ دھوئے اور ایک تیسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ وضو موجود ہو مگر ثواب کی نیت سے تازہ وضو کرے اور ہر وقت باوضو رہنا بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہ دونوں مفہوم ظاہر کے خلاف ہیں۔ اس آخری جملہ کے بارے میں راوی کو تردد ہے کہ یہ مرفوع ہے یا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ مسند امام احمد اور فتح الباری میں ہے۔ اس لئے اس سے مقررہ حد سے زائد حصہ کو دھونے پر استدلال محل نظر ہے۔ (اغاثۃ اللھفان' ص: ۲۰۰' ج ۱)

(٤١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عنها قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِي تَنَعُّلِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَطُهُورِهِ، وَفِيْ شَأْنِهِ كُلِّهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ جوتا پہننے' بالوں میں کنگھی کرنے اور وضو کرنے بلکہ ہر کام کیلئے دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یعجبه التمین ﴾ یعنی آپ ﷺ کو دایاں آگے کرنا محبوب و پسندیدہ تھا۔ ﴿ فی تنعله ﴾

جوتا پہننے کے وقت ﴿ وتـرجـلـه ﴾ بالوں میں کنگھی کرتے وقت۔

حاصل کلام: آنحضور ﷺ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پسند فرماتے۔ مثلاً مسجد میں داخل ہونے' نماز سے فارغ ہونے کے وقت سلام پھیرنے' اعضاء وضو کو دھونے' کھانے پینے' مصافحہ کرنے' دودھ دوھنے' لباس پہننے' سرمہ لگانے اور مسواک کرنے کے وقت وغیرہ۔ دور جدید کا مسلمان ان گراں مایہ چیزوں کو فراموش کر بیٹھا ہے اور غیروں کی نقالی میں دائیں کی بجائے بائیں کو پسند کرنے لگا ہے۔ بڑی قابل افسوس بات ہے۔

(٤٢) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَءُوا بِمَيَامِنِكُمْ». أَخرَجَهُ الأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم وضو کرنے لگو تو اپنے دائیں جانب سے ابتدا کیا کرو۔" (اسے ابوداوٗد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کو دایاں پہلو ہی پسند اور محبوب تھا۔ خود بھی اسی پر عمل پیرا رہے اور امت کو بھی حکم فرمایا کہ دائیں جانب سے ابتدا کرنی چاہئے۔

(٤٣) وعَنِ المُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رضي الله تعالى عنه، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعلَى العِمَامَةِ وَالخُفَّيْنِ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے وضو کیا تو اپنی پیشانی کے بالوں' پگڑی اور موزوں پر مسح کیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بناصیته ﴾ سر کا اگلا حصہ۔ جہاں سے بال کاٹے جاتے ہیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں بال اگتے ہیں۔ یہ حصہ پیشانی سے متصل ہوتا ہے۔ ﴿ العمامة ﴾ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو سر پر باندھا جاتا ہے اور سر پر باندھنے کیلئے اسے کئی بل دینے پڑتے ہیں۔ ﴿ الخفین ﴾ خف کا تثنیہ ہے۔ پاؤں میں ٹخنوں تک جو چیز پہنی جائے اسے خف یعنی موزہ کہتے ہیں جو چمڑے سے تیار ہوتا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ محض پیشانی پر مسح کرنا کافی نہیں اور پگڑی پر مسح کے جمہور قائل نہیں۔ مگر علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے کہ آپؐ کبھی صرف ننگے سر پر مسح فرما لیتے اور کبھی پگڑی پر اور کبھی پگڑی اور پیشانی سمیت دونوں پر اور فقط پیشانی پر مسح کرنا آپؐ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ حدیث اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ موزہ پر مسح کرنا جائز ہے اسی طرح یہ حدیث اس کا بھی ثبوت ہے کہ پگڑی پر مسح جائز اور درست ہے۔اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ کچھ مسح سر پر کیا جائے اور کچھ پگڑی پر۔ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف پگڑی پر مسح کیا جائے۔ ترمذی میں منقول ایک صحیح حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ' عمر رضی اللہ عنہ'

انس رضی اللہ عنہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، مکحول رحمۃ اللہ علیہ، ابوثور رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ، اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ اور وکیع رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہ محض پگڑی پر مسح کو ناکافی سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ مغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ یا ابوعیسیٰ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ مغیرہ بن شعبہ بن مسعود ثقفی۔ مشہور و معروف صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ غزوۂ خندق کے ایام میں مسلمان ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے۔ یہ ان کا پہلا معرکہ تھا جس میں وہ شریک ہوئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر مقرر ہوئے اور ۵۰ھ میں کوفہ ہی میں وفات پائی۔

(٤٤) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رضي الله تعالى عنهما - فِيْ صِفَةِ حَجِّ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ ﷺ: «ابْدَءُوا بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ». أَخرَجَهُ النَّسَائِيُّ هٰكَذَا بِلَفظِ الأَمرِ، وَهُوَ عِندَ مُسْلِمٍ بِلَفظِ الخَبَرِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کے حج کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "آغاز اسی طرح کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے آغاز کیا ہے۔" (نسائی نے امر کے صیغہ کے ساتھ روایت کیا ہے یعنی حکماً فرمایا کہ "ابتدا کرو" جبکہ امام مسلم نے جملہ خبریہ میں اسے بیان کیا ہے یعنی ہم شروع کرتے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فی صفۃ حجۃ النبی ﷺ ﴾ دراصل یہ اشارہ ہے اس لمبی حدیث کی طرف جو کتاب الحج میں بیان ہوئی ہے۔ ﴿ ابدوا بما بدا اللہ بہ ﴾ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پہلے فرمایا ہے۔ اسے عملاً پہلے انجام دیا جائے اور یہ بات معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا جب آپ ﷺ نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا ارادہ کیا اور اس بات کا عزم کیا کہ پہلے صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے۔ اس لئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صفا کا ذکر پہلے کیا "ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ" (۲: ۱۵۸) لیکن مصنف حدیث کا اتنا ٹکڑا وضو کے باب میں اس لئے لائے ہیں کہ لفظ کے عموم کی طرف اشارہ ہو جائے کہ یہ لفظ عام ہے کسی سبب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سعی کے مسئلہ کے بارے میں مخصوص طور پر ذکر کیا ہے لیکن اس کے لفظ کی عمومیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں قاعدہ کلیہ کے ضمن میں وضو کی آیت بھی داخل ہے اور وہ ہے: "فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برئوسکم وارجلکم الی الکعبین۔ (۵:۶) اس بنا پر وضو میں چہرہ پہلے دھویا جائے گا اور باقی ماندہ اعضاء علی الترتیب دھوئے جائیں گے اور لفظ الخبر لانے سے مراد ہے کہ ابدئووا کی بجائے نبدئا سے کہنا چاہئے۔ چنانچہ نسائی نے صیغہ امر (ابدووا) کے ساتھ اور مسلم نے جملہ خبریہ یعنی (نبداء) سے نقل کیا ہے۔

حاصل کلام: مصنف اس حدیث کو باب الوضو میں لا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اعضاء وضو کے دھونے میں

بھی ترتیب ملحوظ رکھنی چاہئے۔ قرآن نے جس عضو کو پہلے دھونے کا حکم دیا ہے اسے پہلے دھویا جائے جس طرح قرآن مجید نے مناسک حج کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "ان الصفاء والمروة" یعنی سعی کا آغاز صفا سے کیا جائے اسی طرح وضو کی آیت میں جو ترتیب مذکور ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اور آیت وضو میں چہروں کا دھونا پہلے مذکور ہے ہاتھ اور باقی اعضاء بعد میں ہیں۔ اسی ترتیب سے وضو کیا جانا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ جابر بن عبدالله رضی الله عنهما ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ انصار کے قبیلہ "سلم" سے تعلق کی بنا پر انصاری سلمی کہلائے۔ مشہور اور کبار صحابہ ؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ آخر عمر میں بصارت سے محروم ہوگئے تھے۔ ۷۴ھ میں ۹۴ برس کی عمر پاکر فوت ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ مدینہ منورہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

(٤٥) وعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ أَدَارَ الْمَاءَ عَلَى مِرْفَقَيْهِ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِي بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت جابر بن عبداللہ ؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر اچھی طرح پانی ڈالتے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ ادار الماء ﴾ پانی بہانا۔ اس حدیث کی سند میں قاسم بن محمد بن عقیل متروک راوی ہے۔

(٤٦) وعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «لاَ وُضُوءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. وَالتِّرْمِذِيُّ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ وَأَبِي سَعِيْدٍ نَحْوَهُ. وَقَالَ أَحْمَدُ: لاَ يَثْبُتُ فِيْهِ شَيْءٌ.

حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "وضو کا آغاز کرتے وقت جس نے پہلے بسم اللہ نہ پڑھی اس کا کوئی وضو نہیں۔" (اس حدیث کو احمد' ابوداؤد' ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر ان کی بیان کردہ سند ضعیف ہے اور ترمذی نے یہ حدیث سعید بن زید سے روایت کی ہے اور اسی طرح اسے ابوسعید سے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس بارے میں کوئی چیز ثابت نہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لا وضوء ﴾ یہ عبارت اس پر دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ کا پڑھنا وضو کیلئے رکن ہے یا شرط ہے۔ کیونکہ ظاہر عبارت سے کمال کی نفی نہیں بلکہ صحت اور وجود کی نفی مراد ہے۔ جیسا کہ لا (جو نفی جنس پر دلالت کرتا ہے) کی ہوتی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے گویا کہا ہے کہ اس باب میں کوئی چیز ثابت نہیں مگر اس کے مختلف طرق اور کثیر شواہد کی بنا پر حافظ ابن الصلاح' ابن کثیر اور علامہ عراقی وغیرہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عصر حاضر میں علامہ البانی حفظہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس لئے وضو کی ابتدا میں بھی بہر نوع بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وضو کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد ظاہری کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ جس نے عمداً بسم اللہ نہ پڑھی اس کا وضو نہیں ہوا۔

راوی حدیث: ﴿سعید بن زید رضی اللہ عنہ﴾ اس سے مراد سعید بن زید بن عمرو بن نفیل العدوی القرشی ہے۔ ان کی کنیت ابوالاعور ہے۔ ان خوش قسمت دس صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جنہیں لسان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ان کی زوجیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ فاطمہ بنت خطابؓ تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دائرہ اسلام میں آنے کا یہ دونوں حضرات ذریعہ اور سبب بنے۔ معرکہ بدر کے علاوہ باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۵۱ھ میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

(٤٧) وعَنْ طَلْحَةَ بْنِ مُصَرِّفٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالِاسْتِنْشَاقِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت طلحہ بن مصرف رحمۃ اللہ علیہ اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشم خود دیکھا ہے آپؐ کلی اور ناک کیلئے الگ الگ پانی لیتے تھے۔ (اس روایت کو ابوداؤد نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یفصل﴾ یفرق کے معنی میں، جس کے معنی فرق کرنا ہے۔ یعنی آپؐ کلی کرنے کیلئے پانی الگ لیتے تھے اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے الگ لیتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کلی کے الگ اور ناک کیلئے الگ پانی لینا ثابت ہوتا ہے۔ مصنف نے اس روایت کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ اس کی سند میں مصرف بن کعب مجہول اور لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ اس کے برعکس بخاری اور مسلم کی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی چلو سے ناک میں بھی پانی چڑھا لیتے اور کلی بھی کر لیتے تھے، جیسا کہ آئندہ حدیث کے تحت آرہا ہے۔

راوی حدیث: ﴿طلحہ بن مصرف﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابوعبداللہ ہے۔ مصرف کا اعراب۔ "میم" کا ضمہ اور "راء" پر کسرہ اور تشدید۔ تابعین میں ثقہ شمار کئے گئے ہیں۔ طبقہ خامسہ میں سے ہیں۔ بہترین قاری اور فاضل شخصیت ہیں۔ ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ البتہ ان کے والد مصرف مجہول الحال ہیں۔

﴿عن جدہ﴾ ان کا نام کعب بن عمرو یا عمرو بن کعب بن جحدب الیامی رضی اللہ عنہ ہے۔ یمن کے قبائل ہمدان میں مشہور و معروف قبیلہ "یام" کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر یامی کہلاتے ہیں۔ ابن عبدالبر کے قول کے مطابق انہوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ صحابی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی صحابیت سے انکار کیا ہے لیکن انکار کرنے والوں کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

(٤٨) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الوُضُوءِ -: ثُمَّ تَمَضْمَضَ ﷺ وَاسْتَنْثَرَ ثَلاَثاً، يُمَضْمِضُ وَيَنْثُرُ مِنَ الكَفِّ الَّذِيْ يَأْخُذُ مِنْهُ المَاءَ. أَخرجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وضو کے بیان کے بارے میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ آپؐ کلی اور ناک میں پانی اسی ہاتھ سے داخل کرتے جس سے پانی لیتے تھے۔ (ابوداوٗد' نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ یمضمض و ینثر من الکف الذی یاخذ منه الماء ﴾ یعنی چلو بھرپانی لیتے۔ اس میں سے کلی کرنے کیلئے کچھ پانی منہ میں داخل کرتے اور بقیہ پانی ناک میں چڑھاتے۔ یہ عمل آپؐ تین مرتبہ فرماتے۔ یہاں ﴿ ینثر ﴾ سے دراصل استنشاق مراد ہے۔ یعنی پانی ناک میں ڈالنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایک ہی چلو پانی منہ اور ناک دونوں کیلئے استعمال ہو سکتا ہے اور نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ اس عمل کو حضور ﷺ تین مرتبہ کرتے تھے اور نسائی کی روایت میں صراحت ہے کہ آپؐ ناک بائیں ہاتھ سے جھاڑتے تھے۔ منہ اور ناک میں پانی دائیں ہاتھ سے داخل کرتے۔

(٤٩) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ رضي الله تعالى عنه - فِيْ صِفَةِ الوُضُوءِ -: ثُمَّ أَدْخَلَ ﷺ يَدَهُ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفٍّ وَاحِدٍ، يَفْعَلُ ذٰلِكَ ثَلاَثاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے وضو کے سلسلہ بیان میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا' پھر کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا' ایک ہی چلو سے' ایسا آپؐ نے تین مرتبہ کیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ من کف واحد ﴾ کف مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مراد ہے پانی کا ایک چلو (چلو بھرپانی) آپؐ نے کلی کرنے کیلئے تھوڑا سا پانی منہ میں ڈالا اور باقی پانی ناک جھاڑنے کیلئے ناک میں چڑھایا۔

حاصل کلام: دونوں احادیث کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے ایک ہی چلو کے کفایت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ طلحہ بن مصرف کی حدیث علیحدگی اور تفریق کی مقتضی ہے' لیکن وہ مصرف کے مجہول الحال ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔ صاحب السبل نے اپنی رائے اس طرح دی ہے کہ دونوں طرح کی روایات یعنی جمع اور عدم جمع کے بارے میں اقرب بات یہ ہے کہ اختیار دیا گیا ہے' دونوں میں سے جس پر عمل کر لے۔ دونوں مسنون ہیں۔ اگرچہ جمع کرنے کی روایات تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور صحیح بھی ہیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ جو روایات صحیح اور متعدد ہیں وہ راجح اور دوسری مرجوح ہیں۔

(٥٠) وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله تعالى

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

عنه قَالَ: رَأَى النَّبِيُّ ﷺ رَجُلاً وَفِي قَدَمِهِ مِثْلَ الظُّفْرِ لَمْ يُصِبْهُ المَاءُ، فَقَالَ: «ارْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوءَكَ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

ﷺ کی نظر ایک ایسے آدمی پر پڑی جس کے پاؤں کی ناخن برابر جگہ پر پانی نہ پہنچا یعنی خشک رہ گئی۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ "واپس جاؤ اور اچھی طرح عمدہ طریق سے وضو کرو۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر واضح دلیل ہے کہ سارا پاؤں دھونا فرض ہے۔ ایک دوسری حدیث میں جسے مسلم نے روایت کیا ہے کہ پاؤں کا جتنا حصہ خشک رہ گیا اس کیلئے آگ ہے۔ ابوداؤد میں بھی خالد بن معدانؒ سے ایک روایت اسی معنی میں منقول ہے کہ آپؐ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے قدم کی پشت پر تھوڑا سا خشک داغ تھا۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ جا پہلے تازہ وضو کر اور پھر نماز پڑھ۔ یہ اور اسی قبیل کی دوسری روایات اس پر دال ہیں کہ پاؤں کو دھونا فرض ہے، مسح ناکافی ہے۔ انہی احادیث کی روشنی میں ائمہ اربعہ اہل سنت اور مجتہدین امت نے بالاتفاق پاؤں کے دھونے کو فرض قرار دیا۔ جو لوگ پاؤں کے دھونے کو فرض قرار نہیں دیتے اور مسح کے قائل ہیں۔ ان احادیث سے ان کے نظریئے کی تردید ہوتی ہے۔

(۵۱) وعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالمُدِّ، وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ "مد" پانی سے وضو اور "صاع" یعنی چار سے پانچ مد تک پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الصاع﴾ چار مد کا ہوتا ہے اور مد ۳/۱۔۱ رطل کا ہوتا ہے۔ صاع موجود زمانہ کے پیمانہ کے حساب سے ۲.۵۰ کلوگرام ہوتا ہے۔ حدیث سے ظاہر طور پر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ عموماً غسل کیلئے چار یا پانچ مد پانی استعمال فرماتے تھے۔

حاصل کلام: وضو اور غسل کیلئے حتی الوسع اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جتنا نبی کریم ﷺ نے کیا ہے۔ بلاوجہ ضرورت سے زائد پانی استعمال کرنا اسراف میں شمار ہوگا۔ جو شریعت کی رو سے پسندیدہ نہیں ہے۔ مسلم میں ایک "فرق" پانی سے آنحضور ﷺ کے غسل کرنے کی روایت بھی منقول ہے۔ فرق ایک برتن ہوتا تھا جس میں تقریباً ساڑھے نو سیر پانی آتا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لبالب بھرا ہوا تھا بلکہ ایک روایت میں تو یہ ذکر بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضور ﷺ دونوں ایک فرق" سے غسل فرما لیا کرتے تھے۔ اسی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں پانی کی مقدار متعین کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ ذکر کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اتنے پانی سے وضو یا غسل کر لیا کرتے تھے۔

(٥٢) وعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُسْبِغُ الوُضُوءَ، ثُمَّ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، وأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، إِلاَّ فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الجَنَّةِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ».

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ وہ وضو کرے اور خوب اچھی طرح کرے پھر یوں کہے کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں' اس کا کوئی ساجھی و شریک نہیں اور نیز میں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں' مگر اس کیلئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کہ اب جس دروازے سے چاہے داخل جنت ہو۔“ (مسلم' ترمذی) اور ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ ”اے اللہ مجھے توبہ کرنے اور پاک رہنے والوں میں سے کر دے۔“

لغوی تشریح: ﴿الا فتحت﴾ یہ الا استثناء کا ہے۔ اس سے مراد کلام اول میں جو حصر ہے اس کی نفی مقصود ہے اور ﴿فتحت﴾ صیغہ مجہول ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز کھولے جائیں گے۔ صیغہ ماضی سے تعبیر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کا وقوع یقینی اور حتمی ہے جس طرح ماضی کے گزر جانے کا یقین ہوتا ہے اسی طرح اس کا واقع ہونا بھی یقینی اور لابدی امر ہے۔ ﴿وزاد﴾ سے مراد یہ ہے کہ ترمذی نے ﴿محمدا عبده ورسوله﴾ نقل کرنے کے بعد ”اللهم اجعلنی ....الخ“ کے الفاظ مزید نقل کئے ہیں اور ﴿التواب﴾ میں ”واؤ“ مشدد ہے جس کے معنی ہیں جو شخص کثرت سے توبہ کرنے والا ہو۔

راوی حدیث: ﴿عمر رضی اللہ عنہ﴾ سے مراد عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزی رضی اللہ عنہ۔ کنیت ابو حفص ہے۔ نادر الوجود شخصیت تھے۔ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انہوں نے آفاق ارض کو حکم' عدل اور فتوحات سے بھر دیا تھا۔ دور جاہلیت میں قبیلہ قریش کے سفیر تھے۔ ٦ نبوت ذی الحجہ کو دارارقم میں دست نبوت پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کے قبول اسلام میں ان کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ اور بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بڑا کردار ہے۔ سارے غزوات میں شریک رہے مگر تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کے عہد خلافت میں فتوحات کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ عراق' فارس' شام اور مصر وغیرہ کے علاقے اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل ہوئے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے غلام ابو لولو کے اقدام سے مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ یہ شہادت کا واقعہ ٢٤ھ محرم کا ہے۔

٥ - بَابُ المَسحِ عَلَى الخُفَّين۔ موزوں پر مسح کرنے کا بیان

(٥٣) عَنِ المُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَتَوَضَّأَ فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ، فَقَالَ: «**دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ**» فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ تھا' آپؐ نے وضو کرنا شروع کیا تو میں آپؐ کے موزے اتارنے کیلئے لپکا۔ آپؐ نے فرمایا "چھوڑ دو میں نے جب یہ موزے پہنے تھے تو میں وضو سے تھا۔" پھر آپؐ نے ان پر مسح فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فاهویت ﴾ میں نے اپنے ہاتھوں سے مدد لی' سہارا لیا یا پھر یہ معنی ہیں' حالت قیام سے نیچے کی طرف بیٹھنے کیلئے جھکا۔ ﴿ لانزع ﴾ اخرج کے معنی میں ہے کہ میں نکالوں۔ ﴿ خفیه ﴾ آپؐ کے موزے پاؤں سے نکالوں۔ ﴿ دعهما ﴾ اترک کے معنی میں آیا یعنی موزوں کو چھوڑ دو۔ ﴿ طاهرتین ﴾ حال واقع ہو رہا ہے معنی یہ ہوئے کہ دونوں پاؤں پاک ہیں۔ اس لئے موزوں کو نہ نکالو اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے موزوں میں پاؤں جب داخل کئے ہیں اس وقت وہ پاک تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ موزوں پر مسح اسی صورت میں درست اور جائز ہے جبکہ وضو کر کے پہنے گئے ہوں۔ ابوداؤد اور مؤطا امام مالک میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقع پر نماز فجر کے وقت پیش آیا۔

(٥٤) وللأَرْبَعَةِ عَنْهُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ أَعْلَى الخُفِّ وَأَسْفَلَهُ. وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

نسائی کے علاوہ باقی سنن کی چاروں کتابوں میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ نبی ﷺ نے موزوں کے اوپر اور نیچے دونوں جانب مسح کیا۔ (اس روایت کی سند ضعیف ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موزوں پر مسح اوپر اور نیچے دونوں جانب ہونا چاہئے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اور صحیح حسن روایت کے مخالف ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔ ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ میں منقول اس روایت کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں ثور بن یزید ہے جو رجاء بن حیوۃ کے واسطہ سے بیان کرتا ہے اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ثور کا رجاء سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت ضعیف ہے۔

(٥٥) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَوْ كَانَ الدِّينُ بِالرَّأْيِ لَكَانَ أَسْفَلُ الخُفِّ أَوْلَى بِالمَسْحِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "اگر دین کا دارومدار رائے اور عقل پر ہوتا تو پھر موزوں کی نچلی سطح پر مسح اوپر کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس تھا۔ میں

مِنْ أَعْلاَهُ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُد بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

نے خود رسول اللہ ﷺ کو موزے کے بالائی حصہ پر مسح کرتے دیکھا ہے۔" (ابوداؤد نے اس کو حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام دین کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے عقل و رائے پر نہیں۔ اگر عقل پر اس کا انحصار اور دارومدار ہوتا تو موزوں کی بالائی سطح پر مسح کبھی جائز نہ ہوتا' بلکہ نچلی سطح پر ہوتا' کیونکہ گندگی سے آلودہ نچلا حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا نص صحیح کی موجودگی میں عقل اور رائے پر عمل کرنا درست نہیں۔

(٥٦) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفْراً أَن لاَّ نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ إِلاَّ مِنْ جَنَابَةٍ، وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبُولٍ وَنَوْمٍ. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَصَحَّحَاهُ

حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب ہم مسافر ہوتے تو رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے کہ ہم تین دن اور تین راتیں موزے نہ اتاریں' الا یہ کہ حالت جنابت لاحق ہو جائے۔ البتہ بیت الخلاء جانے کی صورت میں' پیشاب اور نیند کی وجہ سے اتارنے کی ضرورت نہیں۔" (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ترمذی میں منقول روایت کے ہیں۔ ترمذی اور ابن خزیمہ دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سفرا ﴾ یعنی مسافرین سین کے فتح اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ مسافر کی جمع ہے جیسے "رکب" اور "تجر" راکب اور تاجر کی جمع ہے اور ﴿ خفاف ﴾ خف کی جمع ہے اور ﴿ الامن جنابۃ ﴾ اور ﴿ ان لا ننزع ﴾ میں جو نفی ہے اس سے استثناء ہے۔ جنابت کی حالت لاحق ہونے کی صورت میں موزے اتارنے ضروری ہیں۔ خواہ ابھی مدت پوری نہ ہوئی ہو۔ البتہ بول و براز اور نیند کی وجہ سے موزے اتارنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تین شب و روز مدت پوری ہونے پر اتارنا پڑیں گے۔

حاصل کلام: موزوں پر مسح بلااختلاف جائز ہے۔ موزوں پر مسح کی روایات بیان کرنے والے صحابہؓ کی تعداد اسی (٨٠) کے لگ بھگ ہے۔ جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اس کے ثبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام کرخی کی رائے ہے کہ مسح خفین کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچتی ہیں۔ انکار کرنے والے کے بارے میں ان کا قول ہے کہ مجھے ان کے کفر کا اندیشہ ہے۔

مقیم اور مسافر کی مدت مختلف ہے مسافر کیلئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات شرعی حد ہے۔ مدت کا آغاز وضو ٹوٹنے کے وقت سے شروع ہوگا' موزہ پہننے کے وقت سے نہیں' مثلاً ایک شخص نماز ظہر کے وقت وضو کر کے موزے پہنتا ہے اور اس کا وضو شام کو جا کر ٹوٹتا ہے تو اس کیلئے آغاز مدت

شام کا وقت ہوگا۔ مسح کا طریقہ اس طرح ہے کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پانی سے تر کر کے ان کے پوروں کو پاؤں کی انگلیوں سے پنڈلی کے آغاز تک کھینچ لے جائے۔ حدث لاحق ہونے کی صورت میں اگر موزہ اتار لیا جائے تو مسح ٹوٹ جاتا ہے اور اختتام مدت کے بعد بھی مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ صفوان رضی اللہ عنہ ﴾ "صاد" کی فتحہ اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ بن عسال عین کے فتح اور سین کی تشدید۔ صفوان بن عسال مرادی الجملی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں لڑے جانے والے ۱۲ غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے صحابہ کرامؓ میں سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے روایت کی ہے۔

(۵۷) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ، وَيوماً وَلَيْلَةً لِلْمُقِيْمِ، يَعْنِيْ فِي المَسْحِ عَلَى الخُفَّيْنِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کیلئے موزوں پر مسح کے لئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات مدت مقرر فرمائی ہے۔ (مسلم)

(۵۸) وعَنْ ثَوْبَانَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ سَرِيَّةً فَأَمَرَهُمْ أَنْ يَمْسَحُوا عَلَى العَصَائِبِ، يَعْنِي العَمَائِمَ، وَالتَّسَاخِيْنَ، يَعْنِي الخِفَافَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ (یعنی چھوٹا لشکر) روانہ فرمایا اور انہیں پگڑیوں اور موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سریۃ ﴾ سین پر فتح "راء" پر کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ چھوٹا سا لشکر جسے دشمن کے علاقہ میں بھیجا جاتا۔ اہل مغازی نے سریہ اس کو قرار دیا ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شامل نہ ہوئے ہوں اور جس میں آپؐ نے شمولیت بصورت قیادت فرمائی اسے علمائے مغازی کی اصطلاح میں غزوہ کہتے ہیں اور اس مقام پر اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ ﴿ عصائب ﴾ عصابۃ کی جمع ہے اور ﴿ عمائم ﴾ عمامۃ کی جمع ہے۔ عصابۃ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ سر کو باندھا جاتا ہے اور ﴿ تساخین ﴾ "تاء" کے فتح کے ساتھ تسخان کی جمع ہے۔ جن کے معنی بالترتیب کسی راوی نے پگڑی اور موزہ کے کئے ہیں۔ عصابۃ تو دراصل پٹیوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس کے حقیقی معنی نہیں بلکہ مرادی معنی ہیں۔ ابن ارسلان نے کہا کہ التساخین ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس سے پاؤں سردی سے بچ سکیں خواہ وہ موزہ ہو یا جراب۔

حاصل کلام: پٹیوں سے مراد ایسی پٹیاں بھی ہو سکتی ہیں جو زخمیوں کے زخموں پر باندھی جاتی ہیں یا کسی کا باوز یا ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں لکڑی کی پھٹیاں رکھ کر باندھ دیتے ہیں انہی کو عصائب کہا جاتا ہے۔ جنگ کیلئے روانہ کرتے وقت اس قسم کا حکم دینا بظاہر تو یہی معنی رکھتا ہے کہ معرکہ آرائی کے دوران زخمی حضرات اعضاء وضو دھونے کی بجائے زخم کی پٹیوں ہی پر مسح کر لیا کریں۔ ابوداؤد میں ہے کہ سریہ سے واپسی پر صحابہ کرامؓ نے سردی کی شکایت کی تو آپؐ نے پگڑی اور تساخین پر مسح کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿ ثوبان بن بجدد بن جحدر رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ ثوبان کا اعراب۔ "ثاء" پر فتح "واؤ" ساکن۔ اور بجدد میں "با" کے ضمہ جیم ساکن اور دال اول پر ضمہ اور دال ثانی ساکن اور بن جحدار میں جیم پر فتح "حاء" ساکن، دال پر فتح۔ یہ سراۃ کے باشندے تھے جو مکہ و مدینہ کے مابین ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ حمیر قبیلہ میں سے تھے۔ زندگی بھر حضر و سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے اور ہر طرح کی خدمت بجالاتے رہے۔ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر آزادی سے ہمکنار کیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد شام میں رہائش پذیر ہو گئے۔ شام سے پھر حمص کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(٥٩) وعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مَوْقُوفاً، وأنسٍ مَرْفوعاً: «إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ وَلَبِسَ خُفَّيْهِ فَلْيَمْسَحْ عَلَيْهِمَا، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا، وَلاَ يَخْلَعْهُمَا إِنْ شَاءَ إِلاَّ مِنْ جَنَابَةٍ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوف اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ "جب تم میں سے کوئی موزے پہن کر وضو کرے تو ان پر مسح کر لینا چاہئے اور ان کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔ اگر چاہے تو ان کو نہ اتارے، الاّ یہ کہ غسل جنابت کی ضرورت پیش آجائے۔" (اسے دارقطنی نے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ لا یخلعهما ﴾ یعنی موزوں کو نہ کھینچے اور پاؤں سے انہیں نہ نکالے۔

(٦٠) وعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِي الله تَعالى عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ وَلَيالِيَهُنَّ، وَلِلْمُقِيمِ يَوْماً ولَيْلَةً، إِذَا تَطَهَّرَ فَلَبِسَ خُفَّيْهِ، أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپؐ نے مسافر کیلئے (مسح کی مدت) تین دن اور تین راتوں کی رخصت فرمائی ہے اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات۔ اس حالت میں کہ اس نے باوضو ہو کر موزے پہنے ہوں تو ان پر مسح کر لینا چاہئے۔ (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

راوی حدیث: ﴿ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام نُفیع (تصغیر نافع کی) بن حارث ہے۔ یہ طائف کے قلعہ سے کچھ نوجوانوں کے ہمراہ چرخی کے ذریعہ باہر آئے۔ اسلام قبول کر لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ کبار و فضلاء صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ کثیر الاولاد تھے۔

(٦١) وعَنْ أُبَيِّ بْنِ عِمَارَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَمْسَحُ عَلَى الخُفَّيْنِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: يَوْماً؟ قَالَ: **نَعَمْ**، قَالَ: ويَوْمَيْنِ؟ قَالَ: **نَعَمْ**، قَالَ: وثَلاَثَةَ أَيَّامٍ؟ قَالَ: **نَعَمْ، وَمَا شِئْتَ**. أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: لَيْسَ بِالقَوِيِّ.

حضرت ابی بن عمارۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا میں موزوں پر مسح کر سکتا ہوں؟ فرمایا "ہاں کر سکتے ہو" عرض کیا ایک دن؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں ایک دن" عرض کیا دو دن؟ آپ نے فرمایا "ہاں دو دن" میں نے عرض کیا تین دن؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں تین دن اور جب تک تیری مرضی ہو"۔ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کو اس کے ضعیف ہونے کی بنا پر اور صحیح و حسن احادیث جو مدت کی تعیین کرتی ہیں کے خلاف واقع ہونے کی وجہ سے نہیں لیا گیا۔ چونکہ حدیث کی سند صحیح نہیں اور وہ حدیث صحیح ہے جس میں مسافر کیلئے تین دن' تین راتیں اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ صحیح اور قوی حدیث کے مقابلہ میں ضعیف کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے تو "شرح المہذب" میں اس حدیث کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے رجال غیر معروف ہیں۔ ابن الجوزی نے تو اس حدیث کو موضوع گردانا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابی بن عمارۃ رضی اللہ عنہ﴾ ہمزہ کے ضمہ "باء" کے فتح اور "یاء" پر تشدید۔ عمارۃ عین کے نیچے کسرہ اور کبھی اوپر ضمہ بھی پڑھا گیا ہے۔ مدینہ کے انصار میں سے مشہور صحابی ہیں۔ مصر میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ یہ وہ صحابی ہیں جنہیں دو قبلوں (بیت المقدس اور بیت اللہ) کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کا شرف و فضل حاصل ہے مگر اس کی حدیث و سند پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔

٦ - بَابُ نَوَاقِضِ الوُضُوءِ — وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان

(٦٢) عَنْ أَنَسٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ الله ﷺ عَلَى عَهْدِهِ يَنْتَظِرُونَ العِشَاءَ. حتَّى تَخْفِقَ رُءُوسُهُم، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلاَ يَتَوَضَّئُونَ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرامؓ نماز عشاء کا اتنا انتظار کرتے کہ غلبہ نیند کی وجہ سے ان کے سر جھک جاتے۔ مگر وہ از سر نو وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیتے۔ (ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی

الدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَصْلُه فِي مُسْلِمٍ.

اصل مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب نواقض الوضو ﴾ نواقض' ناقض کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ﴿ تخفق ﴾ نیند کے غلبہ کی وجہ سے جھک جاتے۔ ﴿ روسھم ﴾ راس کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں سر۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے جب تک انسان گہری نیند نہ سوئے اس وقت تک اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس سے پہلے صفوان بن عسال کی روایت گزشتہ باب میں گزر چکی ہے جس میں مطلق نیند سے وضو کے ٹوٹنے پر دلالت ہوتی ہے۔ اس روایت کی روشنی میں اس کو بھی گہری نیند پر محمول سمجھا جائے گا یا یہ کہا جائے گا کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے نیند سے مراد معمول کی نیند لی ہے اور صحابہ کرام اس نیند سے بھی واقف تھے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس نیند سے بھی جس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کی وضاحت اور بیان کی ضرورت نہیں۔ بہرصورت یہ بات معلوم ہوئی کہ ٹیک یا تکیہ لگا کر سونے کی صورت میں نیند ناقض وضو ہوگی بصورت دیگر نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ٹیک لگانے یا تکیہ کا سہارا لینے کی حالت میں جسم انسانی کے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پیٹ سے ریح کے خروج کا غالب امکان ہوتا ہے' اسی بنیاد پر احتیاط کے پیش نظر وضو نئے سرے سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(٦٣) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَبِي حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلاَ أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلاَةَ؟ قَالَ: «لاَ، إِنَّمَا ذَلِكِ عِرْقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلاَةَ، وإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں ایسی عورت ہوں جو ہمیشہ استحاضہ کے خون میں مبتلا رہتی ہوں' پاک ہوتی ہی نہیں۔ کیا ایسی حالت میں نماز چھوڑ دوں؟ آپؐ نے فرمایا ''نہیں' یہ تو ایک رگ ہے (جو پھٹ جاتی ہے اور خون بہتا رہتا ہے) حیض کا خون نہیں ہے۔ ہاں جب ایام حیض شروع ہوں تو نماز کو چھوڑ دو اور جب یہ ایام پورے ہو جائیں تو خون دھو کر نماز پڑھو۔'' (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ: «ثُمَّ تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلاَةٍ». وَأَشَارَ مُسْلِمٌ إِلَىٰ أَنَّهُ حَذَفَهَا عَمْداً.

اور بخاری میں مزید یہ الفاظ ہیں ''پھر ہر نماز کے لئے وضو کرو'' مسلم نے اشارہ کیا ہے کہ اسے انہوں نے عمداً چھوڑا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ استحاض ﴾ صیغہ مجہول واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ استحاضہ ایام ماہواری کے مقرر اوقات کے علاوہ عورت کے اندام نہانی سے نکلنے والے خون کو کہتے ہیں۔ ﴿ افادع ﴾ اس میں ھمزہ استفہام کا ہے اور ''فاء'' تعقیب کیلئے ہے اور ﴿ ادع ﴾ ودع سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ ﴿ انما ذلک ﴾ اس میں ''کاف'' کے نیچے کسرہ ہے۔ اس لئے کہ مخاطب عورت ہے اور معنی یہ ہیں۔ خون کا بہنا۔ ﴿ عرق ﴾ عین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔ معنی یہ ہوئے رگ سے خون بہنے کی وجہ سے۔ اس رگ کا نام عاذل یا عاذر ہے۔ ﴿ ولیس بحیض ﴾ یہ حیض کا خون نہیں کیونکہ وہ خون رگ کے پھٹنے سے جاری نہیں ہوتا بلکہ عورت کے رحم کے اندر سے خارج ہوتا ہے۔ ﴿ فاذا اقبلت حیضتک ﴾ ''حا'' پر فتح اور کسرہ بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حیض کا خون شروع ہو۔ ﴿ فدعی ﴾ چھوڑ دو۔ ﴿ واذا ادبرت ﴾ یہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ فاعل واقع ہو رہا ہے اور ضمیر حیض کی جانب راجع ہے۔ مطلب یہ ہے جب خون بند ہو جائے۔ ﴿ ثم توضئی لکل صلاۃ ﴾ پھر ہر نماز کیلئے نیا وضو کرو۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ استحاضہ ایسی ناپاکی ہے جو ناقض وضو ہے۔ اس باب میں اس حدیث کے لانے کی غرض یہی بتانا ہے کہ استحاضہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حاصل کلام: عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض کا خون' یہ خون ہر ماہ عورت کے بالغ ہونے سے لے کر بڑھاپے تک ایام حمل کے علاوہ برابر آتا رہتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور دوسرا نفاس کا خون ہے یہ وہ خون ہوتا ہے جو بچہ کی پیدائش کے بعد تقریباً چالیس دن' یا اس سے کم و بیش زچگی میں آتا رہتا ہے۔ تیسرا خون استحاضہ کا ہے' یہ خون متذکرہ دونوں خونوں سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے یہ ایک عاذل نامی رگ کے پھٹنے سے جاری ہوتا ہے اور مسلسل جاری رہتا ہے اور بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے اس کے جاری ہونے کا کوئی مقرر و متعین وقت نہیں ہے' ساری عمر بھی جاری رہ سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا ﴾ حبیش ۔ حبش کی تصغیر ہے۔ مشہور صحابیہ ؓ ہیں۔ قبیلہ قریش کی شاخ اسد سے تھیں۔ ان کے باپ کا نام قیس بن مطلب بن اسد بن عبدالعزی بن قصی۔ یہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ بڑے رتبے والی تھیں۔ انہوں نے ہجرت بھی کی تھی۔

(٦٤) وعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كُنْتُ رَجُلاً مَذَّاءً فَأَمَرتُ المِقْدَادَ أَن يَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: **فِيْهِ الوُضُوءُ**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کثرت سے مذی کے خارج ہونے کا مریض تھا۔ میں نے مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کریں۔ مقداد رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی وجہ سے وضو کرنا ہوگا یا غسل جنابت؟) آپ ؐ نے فرمایا ''ایسی حالت

میں وضو ہی ہے۔" (بخاری و مسلم' البتہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ مذاء ﴾ ذال پر تشدید۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے بکثرت مذی خارج ہوتی رہتی ہے۔ مذی کیا ہے؟ مذی سفید' رقیق لیس دار پانی ہے جو بیوی سے چھیڑ چھاڑ کے وقت اور جماع کے ارادے کے وقت مرد کی شرمگاہ سے خارج ہوتی ہے۔ ﴿ فامرت المقداد ﴾ مقداد کو مسئلہ کی بابت پوچھنے کیلئے کہا۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں رسول اکرم ﷺ کی لخت جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ حیا داری کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براہ راست سوال کرنے سے گریز کیا۔

راوی حدیث: ﴿ مقداد رضی اللہ عنہ ﴾ میم کے کسرہ کے ساتھ۔ مقداد بن عمرو بن ثعلبہ البھرانی الکندی۔ ان کی کنیت ابوالاسود یا ابوعمرو ہے اور مقداد بن اسود کے نام سے مشہور ہیں اور اسود سے مراد اسود بن عبد یغوث الزھری ہے۔ اس لئے کہ اس نے مقداد کو متبنی بنا لیا تھا اور جاہلیت میں اس کے ساتھ حلیفانہ تعلقات و روابط قائم کر لئے تھے۔ اسلام لانے والوں میں ان کا نمبر چھٹا ہے۔ دو مرتبہ ہجرت کے شرف سے شرف یاب ہوئے۔ کبار' فضلاء اور بہترین اوصاف و خصائل کے مالک صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عہد رسالت میں واقع ہونے والے تمام غزوات میں شریک رہے۔ معرکہ بدر کے روز گھڑ سواروں میں شامل تھے۔ فتح مصر میں حاضر تھے۔ ۳۳ھ میں جوف کے مقام پر جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے' وفات پائی۔ ان کی میت کو اٹھا کر مدینہ لائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبرستان بقیع میں دفن کئے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔

(٦٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله تعالى عنها، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَآئِهِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَضَعَّفَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی کسی اہلیہ کا بوسہ لیا اور نماز کے لئے نکل گئے اور وضو نہیں فرمایا۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

حاصل کلام: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ابراہیم تیمی کرتے ہیں مگر ابراہیم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ نہیں سنا۔ اس لئے یہ مرسل اور کمزور ہے۔ مگر بخاری میں ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کی تاریکی میں نماز تہجد ادا فرمایا کرتے تھے۔ میرے پاؤں آپؐ کی سجدہ گاہ میں ہوتے تھے۔ سجدہ کیلئے جانے سے پہلے میرے پاؤں کو آپؐ اپنے ہاتھ سے چھوتے تو میں پاؤں دور کر لیتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے اعضاء جسم میں سے کسی کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بوسہ لینے اور محض چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا خواہ شہوت سے چھوئے یا شہوت کے بغیر۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کے قائل ہیں اور ائمہ میں

سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

(٦٦) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئاً فَأَشْكَلَ عَلَيْه، أَخَرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ أَمْ لاَ؟ فَلاَ يَخْرُجَنَّ مِنَ المَسْجِدِ، حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتاً أَوْ يَجِدَ رِيحاً». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں ہوا کی حرکت محسوس کرے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ آیا پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں تو ایسی صورت میں (وضو کرنے کیلئے) وہ مسجد سے باہر نہ جائے' تاوقتیکہ (یقین نہ ہو جائے) ہوا کے خارج ہونے کی آواز یا بدبو سے محسوس کرے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وجدفی بطنه شیئا ﴾ اپنے پیٹ میں کسی چیز کو محسوس کیا۔ گویا ریح گردش کر رہی ہے۔ ﴿ اشکل ﴾ مشتبہ ہو جائے۔ مشکل ہو جائے۔ ﴿ اخرج ﴾ ہمزہ اس میں استفہام کا ہے۔ یعنی اسے یہ شک میں مبتلا کر دے کہ آیا ریح خارج ہوئی ہے یا نہیں۔ ﴿ فلا یخرجن ﴾ محض شک اور تردد کی بنا پر نماز نہ توڑے۔ ﴿ حتی یسمع ﴾ تاآنکہ وہ ہوا کے بآواز خارج ہونے کو سنے ﴿ اویجدریحا ﴾ یا پھر بے آواز ہوا کا پیٹ سے خارج ہونے والی بدبو محسوس کرے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو جائے کہ ہوا پیٹ سے خارج ہوئی ہے خواہ ان دو طریقوں کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہو۔ ان دو کا بالخصوص ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ اس باب میں یہی دو ذرائع غالب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے صاف معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس مفہوم کو ذرا وسیع کریں تو اس سے ایک اصول کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہر چیز اپنے حکم پر قائم رہتی ہے' تاوقتیکہ اس کے برخلاف یقین و وثوق نہ ہو جائے۔ شک و تردد کوئی قابل اعتبار چیز نہیں۔

(٦٧) وعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: مَسَسْتُ ذَكَرِي، أَوْ قَالَ: الرَّجُلُ يَمَسُّ ذَكَرَهُ فِي الصَّلاَةِ أَعَلَيْهِ وُضُوءٌ؟ فَقَالَ النبي ﷺ: «لاَ إِنَّمَا هُوَ بَضْعَةٌ مِنْكَ». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَقَالَ ابْنُ المَدِيني: هُوَ

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے کہا میں نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا ہے یا یوں کہا کہ ایک آدمی نماز میں اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے تو کیا اسے نئے سرے سے وضو کرنا چاہئے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نہیں' وہ تو تیرے اپنے جسم کا ایک ٹکڑا ہے' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔“ ابن مدینی کہتے ہیں

أَحْسَنُ مِنْ حَدِيْثِ بُسْرَةَ. بسرہ کی حدیث سے یہ حدیث بہت بہتر ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اوقال ﴾ اس میں فاعل وہ ضمیر ہے جو اس میں مخفی ہے اور جس مرد کا پہلے ذکر آیا ہے اس کی طرف راجع ہے۔ ﴿ الرجل یمس ﴾ مبتداء اور خبر﴿ بضعة ﴾ "باء" پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور "ضاد" ساکن ہے معنی اس کے گوشت کا ٹکڑا۔ ﴿ منك ﴾ سے مراد ہے کہ تیرے جسم کا ٹکڑا ہے جس طرح دیگر اعضاء جسم ہیں اسی طرح یہ بھی ہاتھ پاؤں کی طرح گوشت کا ٹکڑا ہے۔ یہ تو معلوم شدہ ہے کہ انسان اپنے جسم کے کسی دوسرے حصہ کو چھو کر وضو نہیں کرتا تو اسی طرح شرم گاہ کو چھو لینے سے بھی وضو کی ضرورت نہیں۔ جو بھی اس کلام پر غور و فکر کرے گا وہ سمجھ جائے گا کہ یہ قیاس و اجتہاد کی بنا پر تھا اور اس وقت شرم گاہ کو چھونے کے بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا۔

حاصل کلام: علی بن عبداللہ جو ابن المدینی کے نام سے مشہور ہیں ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۴ھ میں وفات پائی۔ یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ابوداوٗد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین مس ذکر (یعنی شرمگاہ کو چھونے) سے وضو کے قائل نہ تھے۔ علی بن عبداللہ یعنی ابن المدینی اور ابن المبارک اور اہل کوفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ دوسری طرف بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین مس ذکر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل ہیں' ان کی دلیل بسرہ کی روایت ہے جو آئندہ آرہی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ طلق بن علی رضی اللہ عنہ ﴾ ابوعلی ان کی کنیت ہے۔ "طاء" پر فتح' "لام" ساکن ہے۔ نسب نامہ یوں ہے طلق بن علی بن طلق بن عمرو حنفی' سحیمی' یمامی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے اسی وقت یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسجد نبوی کی تعمیر میں زور و شور اور شوق سے حصہ لیا۔ کہتے ہیں کہ ان سے چودہ احادیث نبویہ مروی ہیں۔

(٦٨) وَعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ رضي الله تعالى عنها أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ، وَقَالَ الْبُخَارِيُّ: هُوَ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي هَذَا البَابِ.

بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا اسے وضو کرنا چاہئے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاری کی رائے یہ ہے کہ اس باب میں یہ صحیح ترین حدیث ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من مس ذکرہ ﴾ جس نے اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا یا ایسی حالت میں جب کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ ﴿ فلیتوضا ﴾ اسے وضو کرنا چاہئے یعنی نئے سرے سے نماز کیلئے وضو کرنا چاہئے۔

حاصل کلام: یہ حدیث صریح طور پر اس پر دلالت کرتی ہے کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی راجح قول ہے' اس لئے کہ کلام میں ایک مقرر حکم ہے' اجتہاد کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ متقین

ائمہ جن میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ' ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ' دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ' بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں نے طلق بن علی سے مروی حدیث کو ضعیف اور بسرہ بنت صفوان سے مروی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور جہاں تک ابن مدینی کے اس قول کا تعلق ہے کہ طلق بن علی کی روایت بسرہ کی روایت سے زیادہ بہتر ہے۔ اس رائے کو ائمہ نے قبول نہیں کیا۔ تقریباً اٹھارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بسرہ والی حدیث کی تائید میں مروی ہے' مزید برآں یہ کہ بسرہ والی حدیث کی سند کے راوی صحیحین کے راویوں کے ہم پلہ ہیں اور طلق بن علی کی روایت کے سند کے راویوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو صحیحین کے راویوں جیسا ہو اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان راویوں میں سے ہیں جو مس ذکر سے وضو ٹوٹنے کے قائل ہیں اور راوی حدیث ہیں۔ یہ طلق بن علی کی آمد کے چھ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بعد اسلام لائے تھے اور طلق بن علی ابتدا ہی میں (جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تھے اور مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی) مدینہ میں آئے تھے پھر اپنے وطن یمامہ کی طرف واپس چلے گئے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ٦ھ کے آخر میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بایں صورت بھی بعد میں حاضر ہونے والے صحابی کی روایت راجح ہے۔

راوی حدیث: ﴿ بسرۃ بنت صفوان رضی اللہ عنہا ﴾ بسرۃ کے باء پر ضمہ اور سین ساکن ہے۔ پورا نام بسرہ بنت صفوان بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ قرشیہ اسدیہ۔ سابقین صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پہلے پہل ہجرت کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور اقتدار تک بقید حیات رہیں۔

(٦٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ أَوْ رُعَافٌ أَوْ قَلَسٌ أَوْ مَذْيٌ، فَلْيَنْصَرِفْ فَلْيَتَوَضَّأْ، ثُمَّ لِيَبْنِ عَلَى صَلاَتِهِ، وَهُوَ فِي ذَلِكَ لاَ يَتَكَلَّمُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه، وَضَعَّفَهُ أَحْمَدُ وَغَيْرُهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کو نماز میں قے آجائے یا نکسیر پھوٹ پڑے یا پیٹ کے اندر کی چیز منہ کے راستہ سے باہر آجائے یا مذی کا خروج ہو جائے تو اسے نماز سے نکل کر وضو کرنا چاہئے اور جہاں سے نماز چھوڑی تھی اسی پر بنا کر لے۔ بشرطیکہ اس دوران میں اس نے گفتگو نہ کی ہو۔" (ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے اور احمد نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رعاف ﴾ "راء" پر ضمہ۔ ناک کے راستہ سے جو خون نکلتا ہے اسے "رعاف" یعنی نکسیر کہتے ہیں۔ ﴿ قلس ﴾ "قاف" پر فتح اور "لام" ساکن۔ خورد و نوش کی کوئی چیز جو منہ کے راستہ سے باہر آجائے۔ ﴿ لیبن ﴾ اس میں لام' لام امر ہے اور بناء یہ ہے کہ آدمی نے نماز شروع کی ایک یا دو یا زیادہ رکعات پڑھ چکا تھا کہ بے وضو ہو گیا۔ اب تازہ وضو کر کے بغیر کسی قسم کی گفتگو کیے آکر نماز شروع کر دے۔ جتنی پہلے پڑھ چکا تھا انہیں شمار کرے اور باقی ماندہ رکعات پوری کر کے سلام پھیر دے۔ اس بے وضو ہونے سے پہلے کی پڑھی ہوئی رکعات بھی ضائع نہیں جائیں گی اور از سر نو پوری نماز بھی پڑھنا نہیں

پڑے گی۔ ﴿ وھو فی ذلک لا یتکلم ﴾ اور وہ اس دوران میں کسی قسم کی گفتگو نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کا وضو ٹوٹ گیا تو بناء کیلئے یہ شرط ہے کہ وضو کر کے واپس آنے اور نماز میں شامل ہونے تک کسی قسم کی بات چیت نہ کرے۔ اگر بات چیت کر لی تو بناء نہیں کر سکتا' از سر نو پوری نماز پڑھنا ہو گی۔

حاصل کلام: مذی کے خارج ہونے کی صورت میں فقہاء بالاتفاق وضو کے ٹوٹ جانے کے قائل ہیں البتہ قے آنے' پیٹ میں سے کھانے پینے کی کوئی چیز منہ کے راستہ سے نکلنے اور ناک میں سے خون کے جاری ہونے یعنی نکسیر پھوٹنے کی صورت میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ اس کا قائل ہے کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بناء کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بناء والی حدیث ضعیف ہے اور مرسل ہے۔ نیز احادیث صحیحہ کے معارض و مخالف بھی ہے' لہٰذا اس کے ذریعہ حجت قائم نہیں ہوتی۔

ائمہ و فقہاء کا بناء کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دونوں بناء کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں۔ پہلے گروہ کی دلیل یہی حدیث ہے جسے احمد نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب نمازی بے وضو ہو گیا تو نماز نہ رہے گی۔ جب نماز ہی نہ رہی تو بناء کس پر ہو گی۔ اسی طرح نکسیر سے وضو ٹوٹنے کے مسئلہ میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قے اور نکسیر دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نکسیر وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ کرامؓ میں سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' جابر بن یزید رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما' ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور تابعین میں ابن مسیب رحمہ اللہ' مکحول رحمہ اللہ اور ربیعہ رحمہ اللہ وغیرہ بھی قے اور نکسیر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں۔

(۷۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ. قَالَ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الإِبِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا' کیا میں بکری کا گوشت کھاؤں تو بعد میں وضو کروں؟ آپؐ نے فرمایا "اگر دل چاہے تو کر لو۔" اس شخص نے پھر عرض کیا اور اونٹ کے گوشت سے؟ فرمایا "اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فاتوضاء ﴾ ہمزہ استفہام اس جگہ حذف ہے اور یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ ﴿ من لحوم الغنم ﴾ یعنی بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔ عام طور پر اصحاب حدیث کی رائے یہی ہے۔ اس کے گوشت کے ناقض وضو ہونے کی حکمت اور سبب معلوم ہونا

ضروری نہیں کیونکہ تعبدی احکام کی حکمت کا عقل میں آنا ضروری نہیں۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے "اعلام الموقعین" ج:۱، ص: ۱۴۷ پر اس کی بڑی عمدہ اور معنوی اعتبار سے بڑی معقول وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر اونٹ کی کوہان پر شیطان ہوتا ہے اور یہ معلوم حقیقت ہے کہ جن کی پیدائش آگ سے کی گئی ہے۔ کھانے والے کی مشابہت کھانے کے ساتھ ہوگی۔ لہٰذا جب اونٹ کا گوشت کھائے گا (اور وہ اس کی خوراک ہوگا) تو اس میں ازخود قوت شیطانیہ پیدا ہوگی۔ اور شیطان کی تخلیق بھی آگ سے ہوئی ہے اور آگ کو پانی کے ذریعہ بجھایا جاتا ہے۔ حدیث مذکور بھی اسی کیفیت کی ترجمان ہے۔ جب بندہ اونٹ کا گوشت کھا کر بعد میں وضو کرے گا تو اس کے وضو میں وہ چیز شامل ہوگی جو اس شیطانی قوت کو بجھائے گی تو ایسی صورت میں یہ فساد انگیز چیز زائل ہو جائے گی۔

اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ اہل سنت میں اختلاف ہے۔ امام احمد، اسحاق بن راہویہ، ابن منذر، ابن خزیمہ وغیرہ محدثین علماء کا یہی مذہب ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو برقرار نہیں رہتا۔ بیہقی اور تمام اہل حدیث کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کسی بھی حلال جانور کے گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک وضو برقرار رہتا ہے۔ ان کی دلیل ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان وغیرہ کی روایت ہے۔ یہ حضرات اس حدیث سے وضو سے ہاتھ منہ دھونا مراد لیتے ہیں جس طرح خوردونوش سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ دھویا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک وضو کا لغوی معنی مراد ہوگا، اصطلاحی معنی نہیں۔ آخری حکم یہ ہے کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کی ضرورت نہیں، مگر یہ بات درست نہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ "امام احمد وغیرہ کا مسلک دلیل کے اعتبار سے مضبوط ہے، ابوداؤد وغیرہ کی حدیث عام ہے اور مسلم کی یہ حدیث خاص اونٹ کے بارے میں ہے اس لئے خاص حکم عام حکم سے مقدم ہے۔" نیز ایک شرعی لفظ "وضو" کو بلا دلیل لغوی معنی پر محمول کرنا بھی درست نہیں۔

راوی حدیث: ﴿جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ﴾ جابر بن سمرہ بن جنادہ مشہور و معروف صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ کوفہ میں رہے۔ غالباً ان سے ایک سو چھیالیس احادیث مروی ہیں۔ ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(۷۱) وعَنْ أَبِي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ غَسَّلَ مَيِّتاً فَلْيَغْتَسِلْ، وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَقَالَ أَحْمَدُ: لاَ يَصِحُّ شَيءٌ فِي هٰذَا الْبَابِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس نے میت کو غسل دیا وہ خود بھی غسل کرے اور جس نے میت کو اٹھایا وہ وضو کرے۔" (اس حدیث کو احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اور احمد کا قول ہے کہ اس باب میں کوئی بھی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ قال احمد ﴾ سے مراد امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ﴿ لا یصح شئی فی ھذا الباب ﴾ اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ روایت حسن درجہ سے کم نہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی بنا پر منسوخ ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میت کو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل نہیں ہے۔ صرف ہاتھوں کو دھو لینا ہی کافی ہے۔" (حاکم، بیہقی)

حاصل کلام: صحیح یہ ہے کہ ﴿ من غسل میتا فلیغتسل ﴾ میں حکم استحباب کیلئے ہے یعنی میت کو نہلانے والے کیلئے خود غسل کرنا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل سنن دار قطنی اور مسند احمد میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ بیان ہے کہ ہم میت کو غسل دیا کرتے تھے پھر بعد میں بعض لوگ غسل کر لیتے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ بیہقی اور حاکم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اس کی مؤید ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن عمر رضی اللہ عنہما، عائشہ رضی اللہ عنہا، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ البتہ بعض وجوب کے بھی قائل ہیں مگر جنازہ اٹھانے والے پر وضو کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(۷۲) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ رضي الله تعالىٰ عنهما أَنَّ فِي الكِتَابِ الَّذي كَتَبَهُ رَسولُ اللهِ ﷺ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ: أَنْ لاَ يَمَسَّ القُرْآنَ إِلاَّ طَاهِرٌ. رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلاً، وَوَصَلَهُ النَّسَائِيُّ وابْنُ حِبَّانَ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام کی جو تحریر عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھ کر دی تھی اس میں تحریر تھا کہ "قرآن پاک کو پاکیزہ انسان (جس نے وضو کیا ہو) ہی ہاتھ لگائے۔" (امام مالک نے اسے مرسل روایت کیا ہے، نسائی اور ابن حبان نے اس کو موصول بیان کیا ہے، دراصل یہ حدیث معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الا طاھر ﴾ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدث اکبر ہو یا اصغر دونوں سے پاک ہونا چاہئے۔ ﴿ وھو معلول ﴾ مصنف نے اس روایت کو معلول غالباً اس بنا پر کہا ہے کہ ان کے خیال میں یہ روایت سلیمان بن داؤد یمامی سے مروی ہے اور یہ شخص واقعتاً ایسا ہے جس کو ترک کرنے پر سب کا اتفاق ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس روایت کے راوی سلیمان بن داؤد خولانی ہیں اور وہ ثقہ راوی ہے۔ ائمہ حدیث نے اس کی تعریف کی ہے۔ اس لئے حدیث معلول نہ ہوئی۔ (السبل)

حاصل کلام: طہارت دو قسم پر ہے ایک طہارت تو وہ ہے جس کی تعبیر حدث اکبر سے کی جاتی ہے اور دوسری حدث اصغر سے۔ اگر حدث اکبر یعنی جنابت وغیرہ ہو تو ایسی صورت میں قرآن مجید کو چھونا، ہاتھ لگانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ محض بے وضو ہونے کی صورت میں اختلاف ہے بہتر ہے کہ باوضو ہاتھ لگایا جائے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما ﴾ یہ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری،

رضی اللہ عنہ مدنی قاضی ہیں۔ مشہور تابعی ہیں۔ ۱۳۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔

﴿ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ ﴾ عمرو بن حزم بن یزید خزرجی نجاری مراد ہیں۔ ابو ضحاک ان کی کنیت ہے۔ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نجران کی طرف عامل بنا کر اس لئے بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو دینی احکام و مسائل کی تعلیم سکھائیں۔ قرآن مجید پڑھائیں' لوگوں سے ملاقات کی وصولی کیلئے حسابات و نصابات ان کو تحریر کر کے سپرد کئے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ جو تحریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دی تھی اس میں فرائض' سنن' صدقات اور دیات کی تفصیلات تھیں۔ اسی مکتوب کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ۵۰ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔

(۷۳) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيانِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَعَلَّقَهُ البُخارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا اور بخاری نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے)

حاصل کلام: مطلب اس کا یہ ہے کہ جماع' بول و براز وغیرہ کی حالت میں ذکر سے اجتناب کرنا ہے باقی اوقات میں ذکر کی اجازت ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت کے ماسوا قرآن پڑھا کرتے تھے' زبان پاک ہے زبانی ذکر الٰہی ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔

(۷٤) وعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَصَلَّى، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَلَيَّنَهُ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور نیا وضو کئے بغیر نماز ادا کی۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے کمزور کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ احتجم ﴾ پچھنے لگوائے۔ حجامت عربی میں سینگ یا کسی دیگر آلہ کے ذریعہ جسم کے حصہ سے خون نکلوانے کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بول و براز کے دونوں قدرتی راستوں کے علاوہ دوسرے کسی ذریعہ سے اخراج خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ جس کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ﴿ لینہ ﴾ تلیین سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کمزوری و ضعف کے ہیں۔ اس کے ضعف کی وجہ اس روایت کے راویوں میں صالح بن مقاتل ایسا راوی ہے جو قوی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کمزور قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بول و براز کے قدرتی دونوں راستوں کے علاوہ بدن سے خون کا نکلنا ناقض وضو نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ' ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۷۵) وعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «العَيْنُ وِكَاءُ السَّهِ، فَإِذَا نَامَتِ العَيْنَانِ اسْتَطْلَقَ الوِكَاءُ». رَوَاهُ أحْمَدُ وَالطَّبَرَانِيُّ، وَزَادَ: «وَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ».

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "آنکھوں کا کھلا رہنا ریح خارج ہونے کا بندھن ہے جب آنکھ سونے کی وجہ سے بند ہو جاتی ہے تو بندھن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ (کھل جاتا ہے) (مسند احمد' طبرانی) (طبرانی نے اتنا اضافہ بھی اپنی روایت میں بیان کیا ہے کہ "جس شخص کو نیند آجائے وہ از سر نو وضو کرے۔"

وَهَذِهِ الزِّيَادَةُ في هَذَا الحَدِيْثِ عِنْدَ أَبِي دَاوِدَ مِنْ حَدِيثِ عَلِيٍّ دُونَ قَوْلِهِ: «اسْتَطْلَقَ الوِكَآءُ» وَفِي كِلاَ الإسْنَادَيْنِ ضَعْفٌ.

اتنا اضافہ ابوداؤد کی اس روایت میں بھی ہے جسے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے البتہ اس روایت میں استطلق الوکاء "یعنی بندھن کھل جاتا ہے" والی عبارت نہیں ہے۔ (باعتبار سند دونوں احادیث ضعیف ہیں)

وَلأَبِي دَاوُدَ أَيْضاً عَنِ ابْنِ عَبَّاس رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا مَرْفُوعاً: «إِنَّمَا الوُضُوءُ عَلَى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعاً». وفي إسناده ضعف أيضاً.

اور ابوداؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے یہ مرفوع روایت بھی مروی ہے "وضو تو اس شخص پر ہے جو لیٹ کر سو جائے۔" (سند کے اعتبار سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ وكاء السه ﴾ الوكاء واؤ پر کسرہ اور کاف پر مد۔ اس دھاگے یا رسی کو کہتے ہیں جس سے مشکیزہ وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے۔ ﴿ والسه ﴾ سین پر فتح اور "ھا" مخفف۔ دبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ استطلق ﴾ کھل جانا۔ ڈھیلا ہونا۔ ﴿ مضطجعا ﴾ پہلو کے بل لیٹ کر۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند فی نفسہ ناقض وضو نہیں ہے بلکہ اس سے وضو کے ٹوٹ جانے کا گمان اور ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دونوں روایتوں کی سندوں میں ضعف ہے کیونکہ ان میں ایک "بقیہ" نامی راوی ہے جس کے بارے میں بہت سے محدثین نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ضعف خفیف سا ہے۔ منذری' نووی اور ابن الصلاح نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ لیٹ کر سونے کی حالت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے مطلق نیند سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ دونوں احادیث میں موافقت و تطابق اس طرح ہے کہ پہلو کے بل گہری نیند آتی ہے۔ ایسی حالت میں اعضاء جسم ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں ریح خارج ہونے کا گمان

غالب ہوتا ہے، جبکہ ہلکی نیند میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سیدھا یا چت لیٹ کر گہری نیند کی صورت میں بھی وضو نہیں ٹوٹتا ایسا نہیں۔ گہری جس صورت میں ہو وہ ناقض وضو ہوگی۔ پہلو کے بل عموماً نیند گہری ہوتی ہے اس لئے اس کا خاص ذکر کر دیا۔

راوی حدیث : ﴿ معاویہ ﴾ معاویہ سے مراد معاویہ بن ابی سفیان بن حرب رضی اللہ عنہما ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا والی مقرر فرما دیا۔ یہ اس ولایت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت سے دستبرداری کے اعلان کے بعد ان کی بیعت کی گئی اور بالاتفاق وہ امیر مقرر ہوئے۔ یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ ۶۰ھ ماہ رجب میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔

(٧٦) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله تعالى عنهما، أَنَّ رَسُولَ الله ﷺ قَالَ: «يَأْتِي أَحَدَكُمُ الشَّيْطَانُ فِي الصَّلاَةِ فَيَنْفُخُ فِي مَقْعَدَتِهِ، فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ أَحْدَثَ، وَلَمْ يُحْدِثْ، فَإِذَا وَجَدَ ذٰلِكَ فَلاَ يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتاً أَوْ يَجِدَ رِيحاً». أَخْرَجَهُ الْبَزَّارُ.

وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ ابْنِ زَيْدٍ.

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ.

وَلِلْحَاكِمِ عَنْ أبي سَعِيْدٍ مَرْفُوعاً: «إِذَا جَآءَ أَحَدَكُمُ الشَّيْطَانُ، فَقَالَ: إِنَّكَ قَدْ أَحْدَثْتَ، فَلْيَقُلْ: إِنَّكَ كَذَبْتَ». أَخْرَجَهُ ابْنُ حِبَّانَ بَلَفْظِ: «فَلْيَقُلْ فِي نَفْسِهِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”نماز میں تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور اس کی مقعد میں پھونک مارتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ خیال ڈال جاتا ہے کہ وہ بے وضو ہو گیا ہے حالانکہ وہ بے وضو نہیں ہوا ہوتا۔ لہٰذا تم میں سے جب کوئی ایسا محسوس کرے تو ریح کے خارج ہونے کی آواز سننے یا اس کی بدبو پانے تک نماز سے نہ پھرے۔“ (اسے بزار نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل بخاری میں عبداللہ بن زید اور مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موجود ہے) صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان جیسے ہی الفاظ مروی ہیں۔

اور حاکم نے ابوسعید کے واسطہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ ”جب تم میں سے کسی کے پاس شیطان آئے اور ذہن میں وسواس ڈالے کہ تو بے وضو ہو گیا تو یہ شخص اسے جواب میں کہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔“ اس کو ابن حبان نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ ”وہ شخص اپنے دل میں کہے کہ تو جھوٹا ہے۔“

٧ - بَابُ آدَابِ قَضَاءِ الحَاجَةِ
قضائے حاجت کے آداب کا بیان

(۷۷) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الخَلَاءَ وَضَعَ خَاتَمَهُ. أَخرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قضاء حاجت کیلئے تشریف لے جاتے تو انگشتری (اپنے دست مبارک سے) اتار کر الگ رکھ دیتے تھے۔ (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ روایت معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب آداب قضاء الحاجۃ﴾ قضاء حاجت۔ بول و براز سے کنایہ ہے۔ ﴿الخلاء﴾ "خاء" کے فتحہ اور آخر پر الف ممدودہ۔ خالی جگہ۔ خالی مکان۔ پھر کثرت استعمال میں یہ قضاء حاجت کی جگہ کیلئے بولا جانے لگا۔ (بیت الخلاء) کیونکہ قضاء حاجت کے اوقات کے علاوہ یہ جگہ عموماً خالی رہتی ہے اور اس لئے بھی اسے خلا کہتے ہیں کہ انسان کیلئے اس میں تنہائی میسر آتی ہے۔ ﴿وضع خاتمہ﴾ اپنی انگوٹھی اتار کر رکھ دیتے' کیونکہ اس میں "محمد رسول اللہ" منقش تھا اور اس میں تنبیہہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ گندگی والی جگہوں سے ایسی چیزوں کو دور ہی رکھا جائے جس میں اللہ کا ذکر ہو۔ ﴿وھو معلول﴾ معلول اس لئے ہے کہ یہ روایت ھمام' ابن جریج' عن الزھری کے واسطہ سے روایت کرتا ہے' حالانکہ ابن جریج نے یہ روایت زہری سے نہیں سنی' بلکہ اس نے تو زیاد بن سعد کے واسطہ سے زھری سے سنا ہے اور اس کے الفاظ بھی دوسرے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے چاندی کی انگوٹھی بنوائی پھر اسے اتار دیا۔

حاصل کلام: اس روایت کو ابوداؤد نے معلول قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں "ہمام" راوی کو وہم ہوا ہے حالانکہ ابن معین ایسے نقاد حدیث نے اسے ثقہ قرار دیا ہے نیز یہ کہ اس حدیث کو ہمام کے علاوہ اور طرق سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ متن حدیث سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء وغیرہ ناپاک اور گندی جگہوں میں ایسی کوئی چیز لے کر دیدہ دانستہ داخل نہیں ہونا چاہئے جس پر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ یا آیات قرآن مجید وغیرہ لکھی ہوئی ہوں۔

(۷۸) وعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الخَلَاءَ قَالَ: **«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الخُبْثِ وَالخَبَائِثِ»**. أَخرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کیلئے بیت الخلا میں داخلہ کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے "اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث" اے اللہ! میں آپ کی پناہ پکڑتا ہوں' خبیث جنوں اور خبیث جنیوں سے۔ (اس کو ساتوں" یعنی بخاری' مسلم' احمد' ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ اور ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿اذا دخل﴾ جب بیت الخلاء میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ ﴿الخبث﴾ "خاء" اور

"باء" دونوں پر ضمہ۔ اور "با" پر سکون بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ خبیث کی جمع ہے۔ ﴿ الخبائث ﴾ خبیثۃ کی جمع ہے۔ اول کا معنی نر، شیطان اور ثانی کا معنی مادہ شیطان مراد ہے اور یہ بھی علم میں رہے کہ بیت الخلاء قسم کی جگہیں ایک کنارے یا دور بنائے جاتے ہیں اور متذکرہ دعا کے کلمات دخول سے پہلے پڑھنے چاہیں بعد میں نہیں۔ ہاں اگر کھلی فضا ہو، تعمیر شدہ مکان میں بیت الخلاء نہ ہو تو رفع حاجت کیلئے نیچے بیٹھنے کیلئے کپڑا اٹھاتے وقت اس دعا کو پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: گندے مقامات اور جگہوں پر گندگی سے انس رکھنے والے جنات بسیرا کرتے ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے قضائے حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخلہ سے پہلے دعا سکھائی ہے۔ انسان کی مقعد بھی چونکہ قضاء حاجت کے وقت گندی ہوتی ہے، اس لئے جنات انسان کو اذیت دیتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں، ان سے محفوظ رہنے کیلئے دعا کی تعلیم دی۔

(۷۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَدْخُلُ الخَلآءَ، فَأَحْمِلُ أَنَا وَغُلَامٌ نَحْوِي إِدَاوَةً مِنْ مَّاءٍ، وَعَنَزَةً فَيَسْتَنْجِيَ بِالمَآءِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قضاء حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو میں اور ایک میرا ہم عمر لڑکا پانی کا ایک برتن اور ایک چھوٹا سا نیزہ لے کر ہمراہ جاتے۔ اس پانی سے آپؐ استنجا فرمایا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اداوۃ ﴾ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ چمڑے کا بنا ہوا چھوٹا سا برتن جس میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ ﴿ من ماء ﴾ پانی سے بھرا ہوا۔ ﴿ وعنزۃ ﴾ منصوب۔ اداوۃ پر عطف کی وجہ سے۔ عین اور نون دونوں پر فتح۔ ایسا لمبا عصا جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے یا پھر چھوٹا سا تیر بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل نکلتے ہیں مثلاً اپنے سے کم عمر یا کم مرتبے والے سے خدمت لینا۔ پانی کے ساتھ استنجاء کرنا۔ نیز پانی سے استنجا کا افضل ہونا۔ ڈھیلا اور پانی دونوں سے استنجا کرنا تو افضل ترین ہے جیسا کہ جمہور علماء کا مذہب ہے۔

(۸۰) وعَنِ المُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: خُذْ الإِدَاوَةَ، فَانْطَلَقَ حَتّٰى تَوَارَى عَنِّيْ، فَقَضَى حَاجَتَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھے فرمایا "پانی کا برتن (ساتھ) لے چلو۔ چنانچہ آپؐ رفع حاجت کیلئے (اتنی دور) تشریف لے گئے کہ میری نظر سے اوجھل ہوگئے۔ وہاں آپؐ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ توارى ﴾ چھپ گیا۔ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

حاصل کلام: آنحضرت ﷺ کا فعل اس پر دلالت کرتا ہے کہ قضائے حاجت کرنے والے کو پردہ کا انتظام کرنا چاہئے یا ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ "اگر رفع حاجت کھلی جگہ میں کرنا پڑے اور پردہ پوشی کیلئے کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو تو ریت یا مٹی وغیرہ جو چیز دستیاب ہو اسے اوٹ کیلئے استعمال کرے ورنہ شیطان اس کی مقعد کے ساتھ تمسخر کرے گا۔"

(٨١) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اتَّقُوا اللاَّعِنَيْنِ، الَّذِي يَتَخَلَّى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ**». رَوَاه مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو لعنت کا سبب بننے والی جگھوں سے اجتناب کرو۔ ایک لوگوں کے راستہ میں' دوسرا (ان کے بیٹھنے آرام کرنے کی) سایہ دار جگہ میں قضاء حاجت کرنے سے۔" (مسلم)

وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ عَنْ مُعَاذٍ: «وَالمَوارِدَ». وَلَفْظُه: «**اتَّقُوا المَلاعِنَ الثَّلاثَةَ، البَرَازَ فِي المَوَارِدِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، والظِّلِّ**». ولأحمد عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما: «أَوْ نَقْعِ مَآءٍ». وَفِيهِمَا ضَعْفٌ.

اور ابوداؤد نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے جو روایت کی ہے' اس میں اس طرح ہے کہ "لعنت کے تین اسباب سے اجتناب کرو۔ گھاٹوں پر' شاہراہ عام پر اور سایہ کے نیچے رفع حاجت کرنے سے۔" اور امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے جو روایت بیان کی ہے اس میں ہے "جہاں پانی جمع ہوتا ہو وہاں بھی رفع حاجت سے بچنا چاہئے۔" (یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں)

وَأَخْرَجَ الطَّبَرَانِيُّ: النَّهْيَ عَنْ قَضَاءِ الحَاجَةِ تَحْتَ الأَشْجَارِ المُثْمِرَةِ وَضَفَّةِ النَّهْرِ الجَارِي، مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

اور طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت بیان کی ہے اس میں ہے کہ "پھل دار و سایہ دار درخت کے نیچے اور جاری و ساری نہر کے کنارے پر قضاء حاجت نہ کرے۔" (اس کی سند میں بھی ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اتقوا ﴾ پرہیز کرو' اجتناب کرو۔ ﴿ لاعنین ﴾ لاعن سے تثنیہ ہے۔ مطلب ہے ان دو امور سے اجتناب کرو جو لعنت کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ لاعن سے مراد صاحب لعن ہو۔ جیسے صاحب ابن کو لابن اور صاحب تمر کو "تامر" کہہ دیتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لاعن ملعون کے معنی میں ہو۔ ﴿ الذی یتخلی ﴾ جو قضائے حاجت سے فارغ ہوتا ہے۔ ﴿ فی طریق الناس ﴾ لوگوں کے عام آمدورفت کے راستہ میں۔ یہ لعنت زدگی کے اسباب میں سے ایک ہے اور دوسرا ﴿ او فی ظلھم ﴾ وہ مقام و جگہ جہاں لوگ سایہ حاصل کرتے ہوں اور قیلولہ کیلئے استعمال میں لاتے ہوں اور

اپنے اترنے اور آرام کرنے کیلئے بیٹھنے کے طور پر استعمال کرتے ہوں اور اس سے مطلق سایہ مراد نہیں ہے کیونکہ جس سایہ کی لوگوں کو ضرورت نہ ہو وہاں قضاء حاجت میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے۔ ﴿ الملاعن ﴾ ملعن کی جمع "میم" پر فتح۔ ایسی جگہیں اور مقامات جو لعنت کا موجب ہوں۔ ﴿ الثلاثة ﴾ منصوب ہے' ملاعن کی صفت ہونے کی بنا پر۔ ﴿ البراز ﴾ "باء" پر فتحہ اصل میں تو کھلی اور وسیع جگہ کو کہتے ہیں' مگر یہ ﴿ الغائط ﴾ یعنی پیٹ سے بذریعہ مقعد خارج ہونے والا فضلہ سے کنایہ ہے۔ اگر البراز کو منصوب پڑھیں تو اس صورت میں ملاعن سے بدل ہوگا اور اگر اسے مرفوع پڑھیں تو پھر یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ ﴿ فی الموارد ﴾ مورد کی جمع ہے۔ اس جگہ یا مقام' چشمہ یا نہروغیرہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ پانی پینے یا پلانے یا وضو اور غسل وغیرہ کیلئے حصول پانی کیلئے جاتے ہیں (جنہیں گھاٹ کہتے ہیں) ﴿ قارعة الطریق ﴾ ایسے کھلے راستہ کو کہتے ہیں جہاں سے لوگ گزرتے ہوں اور اپنے جوتے' پاؤں اور چوپایوں کے ذریعے اسے پامال کرتے ہیں۔ ﴿ او نقع ماء ﴾ نون پر فتح اور قاف ساکن۔ جمع شدہ اور روکا ہوا پانی۔ ﴿ فیهما ضعف ﴾ دونوں سے۔ مراد ہے' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دونوں روایات ضعیف ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت تو اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کو ابوسعید حمیری' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے حالانکہ وہ ان کو ملا تک نہ تھا' للذا یہ روایت منقطع ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کے ضعیف ہونے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لھیعہ ہے جب اس کی کتابیں خاکستر ہوگئیں تو اس نے روایات کو خلط ملط کرنا شروع کر دیا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو راوی روایت کرتا ہے وہ مبہم ہے' اس کا نام نہیں لیا گیا۔ ﴿ تحت الاشجار المثمرة ﴾ پھل دار درختوں کے نیچے گندگی کرنے سے مطلب ہے جو پھل پک کر نیچے گرے وہ گندگی سے ملوث ہو کر گندا ہو جائے گا جو کھانے اور استعمال کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ یہاں سے گزرنے والا نادانستگی میں انہیں اٹھائے یا کسی اور ضرورت و حاجت کیلئے یہاں سے گزرے تو ان گندگیوں سے اذیت پائے گا۔ ﴿ ضفة النهر ﴾ ضاد پر فتحہ اور "فاء" پر تشدید۔ کنارے اور ساحل کو کہتے ہیں اور اس کا سبب بھی وہی ہے کہ لوگ اس سے اذیت و تکلیف اٹھائیں گے۔ ﴿ بسند ضعیف ﴾ اس کی سند میں فرات بن سائب متروک راوی ہے۔ اس وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

حاصل کلام : ان احادیث میں قضائے حاجت کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے۔ پانچ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں رفع حاجت کرنے کی ممانعت ہے وہ یہ ہیں: عام راستہ پر' سایہ دار درخت کے نیچے' پانی کے گھاٹ پر' پھل دار درخت کے نیچے' رواں دواں نہر کے کنارے۔ شارع عام پر عموماً رفع حاجت ممنوع ہے البتہ جو متروک ہو چکا ہو عام گزرگاہ نہ رہی ہو تو وہاں گنجائش ہے۔

راوی حدیث : ﴿ معاذ رضی اللہ عنہ ﴾ انصاری تھے۔ قبیلہ خزرج سے تعلق تھا' بڑے معزز اور بزرگ فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا والی

(گورنر) بنایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے بعد شام کا والی مقرر کیا۔ ۱۷ھ میں طاعون عمواس میں اور ایک قول کے مطابق ۱۸ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۳۸ سال تھی۔

(۸۲) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَغَوَّطَ الرَّجُلاَنِ فَلْيَتَوَارَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَنْ صَاحِبِهِ، وَلاَ يَتَحَدَّثَا، فَإِنَّ اللَّهَ يَمْقُتُ عَلَى ذَلِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ السَّكَنِ وَابْنُ الْقَطَّانِ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب دو آدمی قضاء حاجت کریں تو ان کو ایک دوسرے سے پردہ میں ہونا چاہئے اور اس حالت میں ایک دوسرے سے باہم گفتگو بھی نہ کریں۔" اس لئے کہ ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ (اس روایت کو احمد نے روایت کیا ہے اور ابن سکن اور ابن قطان نے اسے صحیح قرار دیا ہے مگر یہ حدیث معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿تغوط﴾ قضاء حاجت کیلئے نکلے اور اپنی حاجت پوری کی۔ ﴿فلیتوار﴾ اس میں لام امر کا ہے اور "راء" پر فتح ہے۔ معنی ہے کہ چھپنا چاہئے' پردہ میں ہونا چاہئے۔ ﴿ولا یتحدثا﴾ قضاء حاجت کے وقت دونوں کو بات چیت نہیں کرنی چاہئے۔ ﴿یمقت﴾ مقت سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتا ہے۔ ﴿علی ذلک﴾ دونوں کے مابین آڑ اور پردہ کا نہ ہونا اور رفع حاجت کی صورت میں بات چیت کرنا مراد ہے۔ ﴿وھو معلول﴾ کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں علت یہ ہے کہ اسے عکرمہ بن عمار نے یحیٰی بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ منفرد ہے اور اس کی یحیٰی سے روایت میں کلام ہے۔ البتہ امام مسلم رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے۔

حاصل کلام: علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو عکرمہ بن عمار عن یحیٰی بن ابی کثیر کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے' اس لئے کہ یہ راوی ان کے نزدیک معلول ہے' حالانکہ عکرمہ کی روایت کو امام مسلم نے قبول کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس سے استشہادا روایت کی ہے۔ یہ حدیث واضح ثبوت ہے اس کا کہ قابل ستر اعضاء کو چھپانا واجب ہے نیز قضاء حاجت یعنی بول و براز کے وقت باہم گفتگو کرنا حرام ہے۔ اس لئے ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور بغض شدید کی صورت میں وعید فرمائی گئی ہے اگر یہ فعل بقول بعض کے مکروہ ہوتا تو اتنی سخت وعید کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسے موقع پر حضور ﷺ سے سلام کا جواب چھوڑنا بھی عملاً ثابت ہے جو اس کا مؤید ہے۔

(۸۳) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: «لاَ يَمَسَّنَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ وَهُوَ يَبُولُ، وَلاَ يَتَمَسَّحْ مِنَ الْخَلاَءِ

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "تم میں سے کوئی بھی پیشاب کرتے وقت دائیں ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو ہرگز نہ چھوئے اور قضاء حاجت کے بعد سیدھے

بِيَمِينِهِ، وَلاَ يَتَنَفَّسْ فِي الإِنَآءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ہاتھ سے استنجا بھی نہ کرے نیز پانی پیتے وقت اس میں سانس بھی نہ لے۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لا یمسن ﴾ مس سے نہی کا صیغہ ہے اور نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے۔ ﴿ ولا یتمسح ﴾ یعنی استنجاء نہ کر اور ﴿ تمسح ﴾ کے معنی ہیں ہاتھ کو بہنے والی چیز کے ساتھ ملنا یا پھیرنا کہ گندگی دور ہو جائے یا ناپاک چیز سے لتھڑی ہو' اسے ہاتھ سے صاف کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے سیدھے ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو پیشاب کرتے ہوئے نہ چھوئے اور نہ پکڑے۔ ایسا کرنا حرام بھی ہے اور سوء ادب بھی اور کم ظرفی بھی اور دوسرا کوئی مشروب وغیرہ پیتے وقت برتن میں سانس لینا۔ برتن میں سانس لینا اس لئے ممنوع ہے کہ سانس کے ذریعہ خارج ہونے والے جراثیم پئے جانے والے مشروب وغیرہ میں شامل ہو کر معدہ میں داخل ہوں گے۔ یہ جراثیم طبی تحقیق کی رو سے صحت کیلئے نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں۔ جس حدیث میں سانس لینے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پینے والا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ نہ چڑھا جائے بلکہ تین دفعہ پئے اور سانس باہر نکالے۔

(٨٤) وعَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ نَهَانَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن نَسْتَقْبِلَ القِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِاليَمِينِ، أَوْ أَن نَسْتَنْجِيَ بِأقَلَّ مِنْ ثَلاَثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيعٍ أَوْ عَظْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم قضاء حاجت اور پیشاب کے وقت قبلہ رخ ہوں یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں یا تین ڈھیلوں سے کم سے استنجا کریں یا گوبر' لید اور ہڈی سے استنجا کریں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نستنجی ﴾ الاستنجاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی پتھر یا پانی سے گندگی کو دور کرنا۔ اور ﴿ النجو ﴾ اس گندگی کو کہتے ہیں جو مقعد سے خارج ہوتی ہے۔ ﴿ الرجیع ﴾ لید یا گوبر۔

راوی حدیث: ﴿ سلمان رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ اصل میں ان کا تعلق فارس سے تھا۔ دین (حق) کی تلاش میں گھر سے نکلے اور نصرانی (عیسائی) بن گئے۔ پھر مدینہ میں منتقل ہو گئے۔ مدینہ میں آتے ہی نبی ﷺ پر ایمان لے آئے۔ سلمان الخیر ان کا لقب تھا۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسے بڑی اچھی طرح نبھایا۔ ان کے خلوص اور محبت دین کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں ارشاد فرمایا کہ "سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مدائن کا والی مقرر کیا۔ محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتے اسے راہ اللہ میں خیرات کر دیتے۔ ٣٢ھ کو وفات پائی۔ ان کی عمر ٢٥٠ یا ٣٥٠ برس تھی۔

(٨٥) وَلِلسَّبْعَةِ مِنْ حَدِيْثِ أَبي

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

أَيُّوبَ: لاَ تَسْتَقْبِلُوا القِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، وَلاَ تَسْتَدْبِرُوهَا، وَلٰكِنْ شَرِّقُوا أَو غَرِّبُوا.

"قضاء حاجت اور پیشاب کرتے وقت قبلہ رخ نہ بیٹھو اور نہ اس کی طرف پشت کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی جانب کرو۔" اس کو ساتوں (یعنی امام بخاری' مسلم' احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاتستدبروها ﴾ اس کی طرف اپنی پشت بھی نہ کرو۔ ﴿ ولكن شرقوا اوغربوا ﴾ تشریق تغریب سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔ یہ خطاب اہل مدینہ سے ہے۔ ان کا قبلہ بجانب جنوب پڑتا ہے۔ اہل مدینہ یا اسی طرح کے دوسرے لوگ جن کا قبلہ جنوب یا شمال میں پڑے گا وہ اپنے رخ مشرق یا مغرب کی طرف کریں گے اس طرح استقبال اور استدبار دونوں سے بچ جائے گا اور جن کا قبلہ مشرق یا مغرب ہوگا تو وہ اپنا رخ شمال یا جنوب کی طرف کریں گے۔ استقبال و استدبار قبلہ سے بچنے کیلئے اہل مدینہ کو مشرق اور مغرب کا رخ کرنے کا حکم اسی وجہ سے دیا گیا ہے۔ حکم کا دارومدار اسی پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ﴿ لا تستقبلوا ولا تستدبروها ﴾ کا حکم نہی ایسی جگہ کیلئے ہے جہاں کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو اور کھلا میدان ہو۔ گھروں میں جہاں آدمی کے سامنے دیوار وغیرہ حائل ہو تو وہاں کیلئے یہ حکم نہیں ہے جیسا کہ مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے واضح ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی ہمشیرہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے حجرہ کی چھت پر کسی ذاتی ضرورت کیلئے چڑھا تو (کیا دیکھتا ہوں) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت فرما رہے تھے اور اس وقت آپ کا رخ شام کی طرف تھا اور پشت بیت اللہ کی جانب۔ مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف نہ کرے اور نہ پشت۔ یہ حکم تو اہل مدینہ کیلئے مخصوص ہے اس لئے کہ ان کیلئے قبلہ جنوب کی طرف پڑتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ﴾ ابوایوب ان کی کنیت ہے' ان کا نام خالد بن زید بن کلیب ہے۔ مدینہ میں تشریف آوری کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی ان کے دولت کدہ پر فروکش ہوئی تھی۔ آپ کا شمار کبار اور اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ ارض روم میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ (۵۰ھ میں) ان کی قبر دیوار قسطنطنیہ کے زیر سایہ ہے۔

(٨٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تعالى عنها، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَتَى الغَائِطَ فَلْيَسْتَتِرْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو قضاء حاجت کیلئے جائے اسے پردہ کر کے بیٹھنا چاہیے۔" (ابوداؤد)

(٨٧) وعَنْهَا رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا خَرَجَ مِنَ الغَائِطِ قَالَ: «غُفْرَانَكَ». أَخرَجَهُ الخمسة وصححه أبُو حَاتِمٍ وَالحَاكِمُ.

جب قضاء حاجت سے فارغ ہو کر بیت الخلاء سے باہر آتے تو "غفرانک" فرماتے (اے اللہ! تیری بخشش اور پردہ پوشی مطلوب ہے) (اس روایت کو پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے' ابوحاتم اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ غفرانک ﴾ منصوب واقع ہوا ہے' فعل محذوف ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں بخشش طلب کرتا ہوں یا پھر مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مجھے بخش دے اچھی طرح بخشنا۔

(٨٨) وعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيُّ ﷺ الغَائِطَ، فَأَمَرَنِي أَنْ آتِيَهُ بِثَلاَثَةِ أَحْجَارٍ، فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ، وَلَمْ أَجِدْ ثَالِثاً، فَأَتَيْتُه بِرَوْثَةٍ، فَأَخَذَهُمَا وَأَلْقَى الرَّوْثَةَ، وَقَالَ: «إِنَّها رِكْسٌ». أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ. وَزَادَ أَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ «ائتِنِي بِغَيْرِها».

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کو چلے تو مجھے حکم دیا کہ میں ان کیلئے تین پتھر لے آؤں۔ مجھے دو پتھر تو مل گئے تیسرا نہ مل سکا۔ میں (مجبوراً گوبر کا ایک خشک ٹکڑا لے آیا۔ آپ ؐ نے دونوں پتھر تو لے لئے اور گوبر کے خشک ٹکڑے کو دور پھینک دیا اور فرمایا "یہ تو بذات خود پلیدی ہے۔" (اسے بخاری نے روایت کیا ہے) احمد اور دارقطنی نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ "اس کی بجائے اور لے آؤ۔"

لغوی تشریح: ﴿ بروثۃ ﴾ چوپائے جانور کا گوبر یا لید۔ ابن خزیمہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ وہ گدھے کی لید تھی۔ ﴿ رکس ﴾ "را" پر کسرہ "کاف" ساکن۔ نجاست اور گندگی و پلیدی۔ ﴿ ائتنی بغیرھا ﴾ "اتیان" سے امر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قضاء حاجت کے بعد مقعد کی صفائی کیلئے تین پتھر استعمال کرنا واجب ہے۔ خواہ صفائی اس سے کم ہی سے حاصل ہو جائے اور اگر تین سے بھی مطلوب صفائی حاصل نہ ہو تو پھر مزید بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ (یعنی پانچ' سات علی ھذا القیاس) آج کل ٹشو پیپر سے بھی صفائی ہو سکتی ہے۔ اس کی تعداد بھی اتنی ہی ہونی چاہئے۔

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز خود ناپاک و نجس ہو اس سے طہارت حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ تعداد کے ساتھ صفائی بھی مشروط ہے۔ خواہ تعداد میں اضافہ ہی کرنا پڑے۔

راوی حدیث: ﴿ ابن مسعود ﴾ نام ان کا عبداللہ تھا۔ بزرگ اور نہایت عقلمند و دانش مند فقہاء صحابہ کرام ؓ میں شمار ہوتے تھے۔ غزوۂ بدر اور دیگر معرکوں میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم

خاص تھے۔ حضر و سفر کے ساتھی تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کا تقرب حاصل تھا۔ صاحب النعلین تھے۔ ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی۔

(۸۹) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِعَظْمٍ أَوْ رَوْثٍ، وَقَالَ: «إِنَّهُمَا لاَ يُطَهِّرَانِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہڈی اور گوبر سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے' ساتھ ہی فرمایا کہ "یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے۔" (دار قطنی نے اسے روایت کیا ہے اور صحیح بھی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انهما لا يطهران ﴾ (یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے) گوبر اس وجہ سے پاک نہیں کر سکتا کہ وہ خود نجس و ناپاک ہے اور ہڈی میں چکناہٹ ہوتی ہے۔ اس سے نجاست کی صفائی نہیں ہو سکتی اور تری کو خشک نہیں کر سکتی ہے اور ان کے استعمال سے منع کا سبب نبی کریم ﷺ نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ جنوں کا طعام ہے اور ﴿ روث ﴾ ان کے جانور کا چارہ ہے۔ ایک چیز کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں ان میں باہمی کوئی منافات نہیں ہے۔

حاصل کلام: امام بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ہڈی اور گوبر سے استنجا نہ کرنے کی کیا حکمت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نصیبین کے علاقہ سے جنوں کا ایک وفد میرے پاس آیا اور انہوں نے مجھ سے خوراک کے متعلق استفسار کیا۔ تو اللہ رب العزت کے حضور دعا کی کہ یا اللہ! ان کو ہڈیوں اور گوبر وغیرہ سے خوراک دستیاب ہوتی رہے۔ لہٰذا (دعا قبول ہوئی) یہ ان کی خوراک ہے' اسے گندا نہ کرو۔ بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی اور لید بذات خود ان کی خوراک ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے اوپر کوئی غیر مرئی کھانے والی چیز پیدا ہوتی ہے جو ان کی خوراک ہوتی ہے جسے یہ جنات کھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں گویا دونوں ان کی خوراک کی پیدائش کا مقام ہیں۔

(۹۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اسْتَنْزِهُوا مِنَ الْبَوْلِ، فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَلِلْحَاكِمِ: «أَكْثَرُ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْبَوْلِ» وَهُوَ صَحِيحُ الإِسْنَادِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "پیشاب (کی چھینٹوں) سے بچو۔ اکثر عذاب قبر اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔" (دار قطنی نے اسے روایت کیا ہے) اور حاکم کی روایت میں ہے اکثر عذاب قبر پیشاب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (اس کی سند صحیح ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ استنزهوا ﴾ اجتناب کرو۔ بچو۔ ﴿ منه ﴾ میں من تعلیلیہ ہے۔ مطلب یہ ہوا۔ پیشاب

سے پرہیز اور اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے۔

(۹۱) وعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي الخَلاَءِ أَنْ نَقْعُدَ عَلَى اليُسْرَى ونَنْصِبَ اليُمْنَى. رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قضاء حاجت کی تعلیم دیتے ہوئے ہمیں فرمایا کہ "ہم بائیں پاؤں پر وزن دے کر بیٹھیں اور دائیں کو کھڑا رکھیں (اس پر بوجھ کم ڈالیں)" (اس کو بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿علمنا﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے' صیغہ غائب ہے۔ "نا" ضمیر متکلم جمع کی ہے اور مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿فی الخلاء﴾ قضاء حاجت کے آداب کے بارے میں۔ ﴿ننصب﴾ نصب سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو کھڑے کرنے' قائم کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ بسند ضعیف اس لئے کہ اس کی سند میں ایک غیر معروف راوی ہے۔

حاصل کلام: حکیم کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔ وہ حکمت خواہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں پاؤں پر بیٹھنے کا حکم دیا ہے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کا معدہ بائیں طرف ہوتا ہے۔ بائیں پاؤں پر' بیٹھنے سے اخراج فضلہ میں سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿سراقہؓ﴾ سین پر ضمہ۔ سراقہ بن مالک بن جعشم' جعشم جیم پر ضمہ' عین ساکن اور شین پر ضمہ۔ قبیلہ مدلج میں سے تھے' اس لئے مدلجی کہلائے۔ ابوسفیان ان کی کنیت تھی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جو ہجرت کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انعام کے لالچ میں گرفتار کرنے کیلئے آپؐ کے تعاقب میں نکلا اور جب آپؐ کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا تھا۔ تو اس نے امان طلب کی۔ آپؐ نے امان دے دی۔ ۲۴ھ میں وفات پائی۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔

(۹۲) وَعَنْ عِيسَى بْنِ يَزْدَادَ (يُزْدَادَ) عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلْيَنْتُرْ ذَكَرَهُ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَة بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت عیسیٰ بن یزداد نے اپنے والد سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی پیشاب کرے تو عضو مخصوص کو تین مرتبہ جھاڑ لے۔" (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلینتر﴾ "نتر" سے ماخوذ ہے۔ جو کچھ ناک کے اندر ہو اسے جھاڑ کر نکالنا۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ "یزداد" صحابی نہیں بلکہ مجہول راوی ہے اس کا بیٹا عیسیٰ بھی مجہول ہے۔

حاصل کلام: پیشاب سے فراغت کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ سونتنا یا جھاڑنا اس لئے ہے کہ اگر قابل

خارج قطرۂ پیشاب کہیں رک گیا ہو تو وہ خارج ہو جائے اور پوری طرح اطمینان ہو جائے۔ یہ روایت گو ضعیف ہے مگر پیشاب کے قطروں سے محفوظ رہنے کی روایت اس کی مؤید ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ عذاب قبر اس لئے ہو رہا ہے کہ پیشاب کے قطروں سے بچتے نہ تھے۔

راوی حدیث: ﴿عیسی بن یزداد﴾ یہ دونوں باپ بیٹا مجہول ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں کہ عیسیٰ اور اس کے باپ کی کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ عقیلی کہتے ہیں۔ ان کی متابعت نہیں کی گئی اور نہ ہی ان کا تعارف ہے۔ یزداد کو باء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

(۹۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله تعالى عنهما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَأَلَ أَهْلَ قُبَآءٍ فَقَالَ: **إِنَّ اللَّهَ يُثْنِي عَلَيكُمْ.** فَقَالُوا: إِنَّا نُتبِعُ الحِجَارَةَ الماءَ. رَوَاهُ البَزَّارُ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. وَأَصْلُه فِي أَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، بِدُوْنِ ذِكْرِ الحِجَارَةِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اہل قباء سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری (پاکیزگی کے بارے میں) بڑی تعریف فرمائی ہے' اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم ڈھیلوں کے استعمال کے بعد مزید طہارت کیلئے پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ (اسے ضعیف سند کے ساتھ بزار نے روایت کیا ہے۔ اس کی اصل ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہے (اسی سلسلے میں) ابن خزیمہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے البتہ اس میں ڈھیلوں کا ذکر نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿اهل قباء﴾ سال فعل کا مفعول ہے اور قباء قاف پر ضمہ اور آخر پر الف ممدودہ اور کسرہ کے ساتھ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مذکر ہے اور منصرف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مؤنث غیر منصرف ہے مدینہ کے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ ﴿يثني عليكم﴾ یعنی اللہ رب العزت نے اپنے اس قول کے ساتھ تمہاری تعریف کی ہے کہ ﴿فيه رجال يحبون ان يتطهروا والله يحب المطهرين﴾ (۹:۱۰۸) ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو طہارت کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ ﴿نتبع الحجارة الماء﴾ یعنی پہلے ہم پتھر سے استنجاء کرتے ہیں پھر اس کے بعد پانی سے صفائی حاصل کرتے ہیں اور ﴿نتبع﴾ باب افعال سے ہے اور ﴿الحجارة﴾ اس کا مفعول اول ہے ﴿الماء﴾ مفعول ثانی ہے۔ ﴿بسند ضعيف﴾ سے مراد ہے کہ چونکہ بزار نے محمد بن عبدالعزیز زھری سے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے اسی طرح اس سند میں عبداللہ بن شبیب بھی ضعیف راوی ہے۔

حاصل کلام: مسند بزار کی روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کی سند کے دو راوی محمد بن عبدالعزیز اور عبداللہ بن شبیب ضعیف ہیں۔ "قباء" مدینہ طیبہ سے تین میل بجانب جنوب ہے۔ ہجرت کے موقعہ پر آپؐ نے پہلے یہیں قیام فرمایا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استنجاء میں ڈھیلے کے ساتھ پانی استعمال کرنا افضل ہے۔

٨ - بَابُ الْغُسْلِ وَحُكْمُ الْجُنُبِ غسل اور جنبی کے حکم کا بیان

(٩٤) عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ الله ﷺ: «الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "پانی کا استعمال خروج پانی سے ہے۔" (یعنی جب تک منی کا خروج نہ ہو اس وقت تک غسل واجب نہیں ہوتا۔) (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور اصل روایت بخاری میں بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿الماء من الماء﴾ اس میں "من" تعلیل کا ہے اور بعض روایات میں ﴿انما الماء من الماء﴾ کلمہ حصر کے ساتھ۔ پہلے ماء سے معروف پانی مراد ہے اور دوسرے "ماء" سے منی مراد ہے۔ معنی یہ ہے کہ پانی کے ساتھ غسل اس وقت واجب ہوگا جب انزال ہو اور منی خارج ہو جائے۔ کوئی آدمی جب اپنی بیوی کے ساتھ اکٹھے لیٹ جائے اور وہ عمل کرے جس سے منی کا خروج ہو تو غسل ضروری ہوگا اگر اتنے عمل کے باوجود بھی منی کا خروج نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس میں جماع اور احتلام دونوں شامل ہیں۔ روایات میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حکم جماع کے بارے میں وارد ہے۔ اس کا مقتضایہ ہے کہ اگر ایک آدمی جماع تو کرتا ہے مگر انزال نہیں ہوا تو اس پر غسل واجب نہیں۔ ابتداء اسلام میں حکم اسی طرح تھا مگر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو آگے آرہی ہے اور دیگر روایات سے یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اب صرف جماع سے غسل واجب ہوتا ہے' انزال ہوا ہو یا نہ ہو۔ احتلام کے بارے میں یہ حدیث وارد نہیں ہوئی' مگر الفاظ چونکہ عام ہیں اس لئے یہ بھی اس میں شامل ہے اور وہ یہ کہ احتلام میں بھی جب تک انزال نہ ہو غسل واجب نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث کو احتلام کے بارے میں سمجھا گیا ہے جماع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں یہ حکم بھی تھا کہ جماع سے اس وقت غسل فرض ہوتا ہے جب آدمی کو انزال ہو۔ لیکن کچھ مدت بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ مرد و عورت کے اعضاء مخصوص ایک دوسرے سے ملاپ کرلیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال کی نوبت پیش نہ آئی ہو۔

(٩٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ الله ﷺ: «إِذَا جَلَسَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ شُعَبِهَا الْأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا، فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «وَإِنْ لَمْ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کہ جب تم میں سے کوئی عورت کی چار شاخوں کے درمیان میں بیٹھے پھر اپنی پوری کوشش کر لے تو اس پر غسل واجب ہوگیا۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ

يُنْزِلْ». "خواہ انزال نہ ہوا ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿اذا جلس﴾ یعنی مرد جب بیٹھ جائے ﴿بین شعبھا﴾ عورت کی شاخوں میں۔ ﴿شعب﴾ شعبہ کی جمع ہے۔ شین پر ضمہ ہے عین پر فتحہ۔ درخت کی شاخ کیلئے استعمال ہوتا ہے یا کسی چیز کا کچھ حصہ بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے۔ عورت کی چار شاخوں سے مراد اس کے دو بازو اور دو پاؤں یعنی ٹانگیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد عورت کے پاؤں اور رانیں ہیں اور یہ بھی ایک قول ہے کہ اس سے عورت کی دونوں پنڈلیاں اور دونوں رانیں مراد ہیں۔ جو بھی مراد ہو مقصود اس سے عورت سے جماع سے کنایہ ہے اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ﴿والزق الختان الختان﴾ بھی مروی ہے۔ (عضو مخصوص کے عورت کی شرم گاہ سے ملاپ پر غسل واجب ہو جاتا ہے) ﴿ثم جھدھا﴾ اس میں کنایہ ہے مرد کے عضو مخصوص کا عورت کی شرم گاہ میں دخول سے۔

حاصل کلام: مرد کا عضو مخصوص جب عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے خواہ حشفہ ہی غائب ہو ایسی صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خلفاء اربعہ' ائمہ اربعہ کے علاوہ اکثر صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کا یہی مذہب ہے۔ اس کو جماع پر محمول کیا جائے تو اس حدیث کو پہلی حدیث کا ناسخ سمجھا جائے گا۔

(٩٦) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ سُلَيْمٍ - وَهِيَ امْرَأَةُ أَبِي طَلْحَةَ - قَالَتْ: يا رسولَ اللهِ! إِنَّ اللَّهَ لاَ يَسْتَحيِي مِنَ الحَقِّ، فَهَلْ عَلَى المَرأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ؟ قَالَ: «نَعَمْ، إِذَا رَأَتِ المَاءَ»، الحديث مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام سلیم ابوطلحہ کی اہلیہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے حیاء نہیں کرتا تو بتائیں کیا عورت کو جب احتلام ہو جائے تو اس پر بھی غسل فرض ہے؟ فرمایا "ہاں! جب وہ پانی دیکھے" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا یستحیی من الحق﴾ "حاء" کے بعد دو یاء ہیں "حاء" اس میں ساکن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ حق کے بیان کرنے سے رکتا اور حیا کی بنا پر اسے ترک نہیں کرتا۔ اسی طرح جن مسائل کے دریافت کرنے کی مجھے ضرورت و احتیاج ہے ان سے میں رک نہیں سکتی۔ ساتھ ہی مزید کہا۔ ایسے ہی مسائل جن کو دریافت کرنے سے عورتیں عموماً شرماتی ہیں اور عذر پیش کرتی ہیں۔ ﴿اذا احتلمت﴾ جب اسے احتلام ہو جائے ایک دوسری روایت میں ﴿اذا رات ان زوجھا یجامعھا فی المنام﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ یعنی جب وہ دیکھے کہ خواب میں اس کا شوہر اس سے زن و شو کے تعلقات کئے ہوئے ہے۔ ﴿اذ رات الماء﴾ جب نیند سے بیدار ہو تو منی دیکھے۔

راوی حدیث: ﴿ام سلیم رضی اللہ عنہا﴾ ان کا نام رمیصاء یا غمیصاء بنت ملحان تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ فاضلہ و عالمہ خاتون تھیں۔ مالک بن نضر کی زوجیت میں تھیں۔ یہ مسلمان ہو گئیں۔ اس نے اپنے

خاوند کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اس وجہ سے ناراض ہو کر شام کی طرف بھاگ گیا اور فوت ہو گیا۔ مالک بن نضر کی وفات کے بعد ابو طلحہؓ نے ان کو پیغام نکاح دیا۔ ابو طلحہؓ ابھی مشرک تھے۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے شرط پیش کی کہ اسلام قبول کر لو تو میں تمہارے ساتھ نکاح کر لوں گی۔ اس شرط کو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے قبول کیا اور مسلمان ہو گئے تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ان سے نکاح کر لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(۹۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فِي الْمَرأَةِ تَرَى فِي مَنَامِها مَا يَرَى الرَّجُلُ، قال: **تَغْتَسِلُ**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «فَقَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: وَهَل يَكُونُ هَذا؟ قَالَ: «نَعَم، فَمِنْ أَيْنَ يَكُونُ الشَّبَهُ؟».

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کے متعلق فرمایا جو خواب میں وہی کچھ دیکھے جو ایک نوجوان مرد دیکھتا ہے (احتلام) کہ وہ غسل کرے۔ (بخاری و مسلم)
اور مسلم نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے جواب دینے پر مزید دریافت کیا' کیا ایسا (عورت) کے ساتھ بھی ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں' اگر ایسا نہ ہوتا تو مشابہت کہاں سے ہوتی۔"

لغوی تشریح: ﴿ما یری الرجل﴾ اس سے مراد ہے احتلام۔ ﴿فمن این یکون الشبہ؟﴾ شبہ میں شین پر کسرہ ہے اور "با" ساکن ہے اور دونوں پر فتحہ بھی جائز ہے۔ مماثلت کے معنی ہیں اور اس میں (این) استفہامیہ ہے جو دراصل حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس خیال کی تردید کیلئے ہے کہ آیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے۔ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ بچہ کبھی باپ سے مشابہت رکھتا ہے اور کبھی ماں سے اور ننھیال سے اور یہ اسی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ شہوت کے وقت عورت کے اندر بھی منی کود کر خارج ہو اور بچہ کی خلقت و ساخت میں حصہ دار بنے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا انکار اس پر دلالت کرتا ہے کہ عورتوں کو احتلام بڑی نادر صورت ہے۔ یعنی بہت کم ہوتا ہے مردوں کی طرح کثرت سے نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: جس طرح مردوں کو احتلام لاحق ہوتا ہے اور ان پر غسل کرنا فرض ہے اسی طرح عورتوں کو بھی یہ صورت لاحق ہوتی ہے ان کو غسل کرنا بھی فرض ہے باقی رہا بچہ کی مشابہت کا مسئلہ تو اس بارے میں حدیث سے ثابت ہے کہ جب مرد کا پانی غالب ہوتا ہے تو نومولود کی مشابہت باپ پر ہوتی ہے اور جب ماں کا پانی غالب ہو تو بچہ کی مشابہت والدہ سے ہوتی ہے۔

(۹۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ الله ﷺ يَغْتَسِلُ مِنْ أَرْبَعٍ: مِنَ الجَنَابَةِ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ جنابت' جمعہ کے روز' سینگی لگوانے کے بعد اور میت

وَيومَ الجُمُعَةِ، وَمِنَ الحِجَامَةِ، وَمِنْ غُسْلِ المَيِّتِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيْمَةَ.

کو غسل دینے کی وجہ سے۔ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث میں جن چار چیزوں سے غسل کرنے کا ذکر ہے ان میں غسل جنابت بالاتفاق فرض ہے۔ جمعہ کے روز غسل جمہور صحابہ و تابعین اور اکثر ائمہ کے نزدیک مسنون ہے البتہ امام احمد اور امام مالک کا ایک قول یہ ہے کہ وہ فرض ہے۔ امام داؤد ظاہری اور ابن خزیمہ کا بھی یہی مسلک ہے اور حافظ ابن قیم کا زاد المعاد میں اسی طرف رجحان ہے۔ سینگی لگوانے سے غسل مسنون ہے فرض نہیں۔ پہلے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ آپؐ نے سینگی لگوائی اور وضو کئے بغیر نماز پڑھی۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ نے غسل تو کیا کبھی وضو بھی سنگی لگوانے کے بعد نہیں کیا۔ رہا میت کو غسل دینے سے غسل' تو پہلے اس کے بارے میں بھی گزر چکا ہے کہ یہ مستحب ہے' فرض نہیں۔ جمہور اہل علم کا یہی فیصلہ ہے۔

(٩٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ ثُمَامَةَ بْنِ أُثَالٍ عِنْدَمَا أَسْلَمَ - وَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَغْتَسِلَ. رَوَاهُ عَبدُ الرَّزَّاقِ، وَأَصْلُهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ کے متعلق مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے غسل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ (عبدالرزاق نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام : کافر جب اسلام لانے کیلئے آمادہ ہو تو پہلے اسے غسل کرنا چاہئے۔ یہ غسل واجب ہے یا مسنون و مستحب اس میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسے مستحب سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث : ﴿ ثمامہ بن اثالؓ ﴾ دونوں لفظوں کے پہلے حرف یعنی "ثا" اور "الف" دونوں پر ضمہ ہے۔ یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کے فرد تھے اور سرداری کے منصب پر بھی فائز تھے۔ عمرہ ادا کرنے نکلے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے گشتی شاہ سواروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ وہ ان کو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں لائے اور انہیں مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ تین روز بعد نبی ﷺ نے بطور احسان انہیں آزاد فرما دیا۔ اس کے بعد یہ مسلمان ہوگئے اور بہت عمدہ اسلام کا ثبوت دیا۔ جن دنوں لوگ مرتد ہو رہے تھے یہ بڑی مضبوطی اور ثابت قدمی سے اسلام پر ڈٹے رہے۔ جب اس کی قوم کے لوگ مسیلمہ کذاب کے فتنہ کا شکار ہوگئے تو یہ ان کے خلاف بڑے حوصلے اور عزم و ہمت سے ثابت قدم رہے۔

(١٠٠) وعَن أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «غُسْلُ يَوْمِ الجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُحْتَلِمٍ». أَخرَجَهُ السَّبْعَةُ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جمعہ کے روز غسل کرنا ہر بالغ پر واجب ہے۔'' (اس کو ساتوں یعنی بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور احمد نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ محتلم ﴾ بالغ کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو غسل یوم جمعہ کو واجب قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں ''واجب'' کا لفظ صراحتاً آیا ہے۔ مگر جہاں تک جمہور کا تعلق ہے وہ اسے مسنون قرار دیتے ہیں اور اس میں وجوب کے حکم کو تاکید کیلئے سمجھتے ہیں۔

(۱۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الجُمُعَةِ فَبِهَا وَنِعْمَتْ، وَمَنِ اغْتَسَلَ فَالغُسْلُ أَفْضَلُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرمِذِيُّ.

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جمعہ کے روز جس نے وضو کیا اس نے اچھا اور بہتر کیا اور جس نے غسل کیا تو غسل تو بہرحال افضل ہے اور بہترین ہے۔'' (اس کو پانچوں یعنی احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فبھا ﴾ ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ یہ طریقہ مسنون ہے یا پھر اسے رخصت پر محمول کیا گیا ہے کہ ایسا کرنے کی اجازت و رخصت ہے یا یہ بھی معنی کئے گئے ہیں کہ جمعہ کے روز وضو پر اکتفا کرنا ایک اچھی اور عمدہ عادت ہے۔ ﴿ ونعمت ﴾ کا بھی وہی مفہوم ہے جو ﴿ فبھا ﴾ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ طریقہ مسنون بھی ہے یا اچھی اور عمدہ خصلت بھی اور یہ حدیث جمعہ کے روز غسل کے وجوب کے موقف کی تائید کرتی ہے' لیکن جو حدیث اس کے وجوب پر دال ہے وہ زیادہ صحیح اور راجح ہے اور عدم وجوب پر دلالت کرنے والی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے زیادہ صحیح' راجح اور قوی کو اختیار کرنا زیادہ محتاط طریقہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ جمعہ کا غسل واجب نہیں۔ اس لئے کہ واجب کو افضل نہیں کہا جاتا غالباً اسی وجہ سے جمہور علماء نے واجب سے لغوی معنی مراد لئے اصطلاحی نہیں۔ لغوی معنی کو تقویت مسلم کی روایت سے ملتی ہے جو اس کے فرض نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ نہایت اولیٰ بات یہی ہے کہ مسلمان کو جمعہ کے روز غسل کرنے میں بہت احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئے۔ صاحب زاد المعاد علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غسل کیلئے بہت تاکید ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ لفظ وجوب وتر کے سلسلہ میں اگر کچھ قوت رکھتا ہے تو غسل جمعہ کیلئے اس سے زیادہ باعث قوت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ سمرہ ﴾ سین کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ ﴿ جندب ﴾ جیم کے ضمہ' نون

ساکن اور دال پر ضمہ۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور فزار قبیلہ کے فرد ہونے کی وجہ سے فزاری کہلائے۔ انصار سے حلیفانہ روابط و تعلقات تھے۔ یہ ان حفاظ میں سے تھے جنہیں بکثرت احادیث و قرآن یاد تھا۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ خوارج کے گروہ حروریہ کے سلسلہ میں بڑے سخت تھے۔ ۵۹ھ کے آخر میں وفات پائی۔

(۱۰۲) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُقْرِئُنَا الْقُرْآنَ مَا لَمْ يَكُنْ جُنُباً. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَهٰذَا لَفْظُ التِّرْمِذِيِّ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حالت جنابت کے علاوہ ہر حالت میں ہمیں قرآن مجید پڑھا دیا کرتے تھے۔ (اسے پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ترمذی کے ہیں اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنبی مرد کو غسل سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرنی چاہئے۔ جبکہ قرآن کی نیت سے ایک آیت بھی نہیں پڑھنی چاہئے' چنانچہ امام ابویعلیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپؐ نے پہلے وضو کیا اور پھر بعد میں قرآن مجید پڑھا اور ارشاد فرمایا کہ "جس کسی کو جنابت لاحق ہو اس کیلئے مناسب یہی طریقہ ہے (کہ وضو کر کے تلاوت قرآن مجید کرے) اور جنبی نہ پڑھے اگرچہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو"۔

(۱۰۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا أَتَى أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ، ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَعُودَ، فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وُضُوءًا**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، زَادَ الحَاكِمُ: «**فَإِنَّهُ أَنْشَطُ لِلْعَوْدِ**».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم میں سے کوئی اپنی اہلیہ کے پاس جائے (یعنی تعلق زن و شو قائم کرے) پھر دوبارہ لطف اندوز ہونے کا ارادہ ہو تو درمیان میں وضو کر لے۔" (مسلم)

اور حاکم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (یہ وضو) دوبارہ مباشرت کیلئے زیادہ باعث نشاط ہے یعنی فرحت بخش اور تازگی پیدا کرتا ہے

وَللأَرْبَعَةِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنَامُ وَهُوَ جُنُبٌ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَمَسَّ مَاءً. وَهُوَ مَعْلُولٌ.

اور سنن اربعہ (یعنی ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت جنابت میں پانی کو ہاتھ لگائے بغیر سو جاتے۔ (یہ روایت معلول ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ انشط ﴾ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بہت نشاط و مسرت اور فرحت و تازگی بخش ہے۔

اطیب اور اجود ہے تروتازگی اور عمدگی لذت طبیعت میں پیدا کرتا ہے۔ ﴿ من غیر ان یمس ماء ﴾ اس جملہ میں جس نفی کا ذکر ہے وہ غسل اور وضو دونوں کو شامل ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نہ وضو فرماتے اور نہ ہی غسل کرتے۔ اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح اور صاف ہوگئی کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ والی روایت میں وضو کرنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے وہ مستحب ہے' واجب نہیں یا جو پہلو زیادہ مفید ہے اس کی جانب اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ ﴿ وھو معلول ﴾ اس حدیث کے معلول ہونے کی وجہ محدثین کی نظر میں ابواسحٰق کا ابوالاسود کے واسطہ سے روایت کرنا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ابواسحٰق کا ابواسود سے سماع ثابت نہیں لیکن امام بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور انہوں نے اس کا سماع ثابت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معلول اس لئے کہا کہ ان کے نزدیک بھی ابواسحٰق کا ابو اسود سے سماع ثابت نہیں مگر امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ ثابت کرنے سے کہ ان کا سماع یقینی ہے' حدیث معلول نہیں رہتی۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ خورد و نوش اور مباشرت کیلئے عضو مخصوص دھو کر وضو فرما لیتے تھے۔ اکثر علماء امت کے نزدیک یہ وضو واجب نہیں مستحب ہے۔

(١٠٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الجَنابَةِ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَهُ، ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِيْنِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَأْخُذُ المَاءَ فَيُدْخِلُ أَصابِعَهُ فِي أُصُولِ الشَّعْرِ، ثُمَّ حَفَنَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلاثَ حَفَنَاتٍ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلَى سَائِرِ جَسَدِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تو اس طرح آغاز کرتے۔ پہلے ہاتھ دھوتے پھر سیدھے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے اور اپنا عضو مخصوص دھوتے۔ پھر وضو کرتے' پھر پانی لے کر اپنی انگلیوں کے ذریعہ سر کے بالوں کی تہہ (جڑوں) میں داخل کرتے۔ پھر تین چلو پانی کے بھر کر یکے بعد دیگرے سر پر ڈالتے۔ پھر باقی سارے وجود پر پانی بہاتے (سب سے آخر میں) پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ (بخاری و مسلم' متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَلَهُمَا فِي حَدِيْثِ مَيْمُونَةَ: «ثُمَّ أَفْرَغَ عَلَى فَرْجِهِ وَغَسَلَهُ بِشِمَالِهِ، ثُمَّ ضَرَبَ بِهَا الأَرْضَ».

اور بخاری و مسلم میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس طرح ہے "پھر اپنے عضو مخصوص پر پانی ڈالتے اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھوتے اور ہاتھوں کو زمین پر مار کر مٹی سے ملتے اور (صاف کرتے) " اور ایک دوسری روایت میں اس طرح

وَفِي رِوَايَةٍ: «فَمَسَحَهَا بِالتُّرَابِ». وَفِي آخِرِهِ: «ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِالمِنْدِيْلِ

ہے۔ "پھر دونوں ہاتھ مٹی سے مل کر اچھی طرح

فَرْدَّهُ»، وَفِيْهِ: «وجَعَلَ يَنْفُضُ الْمَآءَ بِيَدِهِ».

صاف کرتے۔" اس روایت کے آخر میں ہے کہ "میں نے آپؐ کی خدمت میں رومال (تولیہ) پیش کیا مگر آپؐ نے اسے واپس لوٹا دیا اور بدن (پر جو پانی رہ گیا تھا) اسے اپنے ہاتھ سے جھاڑنا شروع کیا۔"

لغوی معنی: ﴿ يفرغ ﴾ افراغ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی چھڑکتے تھے۔ ڈالتے تھے۔ انڈیلتے تھے۔ ﴿ يغسل فرجه ﴾ عضو مخصوص اوراس کے اردگرد کے حصے کو جو رانوں کے ساتھ ملحق ہوتا دھوتے تھے جیسا کہ ابوداؤد میں وارد ﴿ مرافغ ﴾ کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ ﴿ مرافغ ﴾ مرفغ کی جمع ہے، یعنی شرم گاہ کا اردگرد۔ ﴿ فيدخل ﴾ ادخال سے يدخل بنا ہے۔ باب افعال ہے۔ ﴿ فيدخل اصابعه ﴾ اپنی انگلیوں کو داخل کرتے اپنے سر کے بالوں کی جڑوں تک۔ ﴿ في اصول الشعر ﴾ اپنی انگلیوں سے سر کے دائیں پہلو والے بالوں میں پہلے ڈالتے اور بائیں جانب بعد میں تاکہ بالوں کی جڑوں اور جسم کی کھال تک پانی کی تری پہنچ جائے۔ ﴿ ثم حفن ﴾ دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی بھر کر ڈالتے۔ ﴿ حفنات ﴾ حفنة کی جمع ہے "حاء" اور "فاء" دونوں پر فتحہ ہے۔ ﴿ حفنة ﴾ کے معنی لپ اور چلو کے آتے ہیں یعنی دونوں ہاتھوں کو ملا کر دونوں ہتھیلیوں کو پانی سے بھرنا ﴿ ثم افاض الماء ﴾ پھر پانی بہاتے یا انڈیلتے۔ یعنی کھلا پانی جسم پر بہا دیتے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور میں کچھ پہلو وضاحت طلب ہیں۔ مختلف احادیث کے ملانے سے وضاحت ہوتی ہے کہ غسل کرنے سے پہلے آپؐ ہاتھ دھوتے۔ اس میں تعداد کا ذکر نہیں کہ کتنی بار دھوتے۔ ام المومنین میمونہؓ کی روایت میں دو یا تین بار دھونے کا ذکر ہے پھر آپؐ اپنی شرمگاہ کو دھوتے پھر ہاتھ مٹی پر مار کر ہاتھ صاف کرتے پھر اسی طرح غسل کرتے جس طرح نماز کیلئے غسل کیا جاتا ہے۔ پھر سر کے بالوں کا خلال کرتے۔ پہلے سر کے دائیں جانب بالوں میں خلال کر کے پانی کی تری جڑوں تک پہنچاتے پھر بائیں طرف والے بالوں میں اسی طرح کرتے۔ پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ حضرت میمونہؓ کی روایت میں ہے کہ پہلے ایک طرف ہو جاتے پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ اسی غسل میں کئے گئے وضو سے نبی کریم ﷺ نے صبح کی دو سنتیں اور نماز فجر کے فرض ادا فرمائے گویا دوبارہ از سر نو وضو کرنے کی ضرورت و حاجت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو اور غسل کے بعد چہرے اور ہاتھوں اور باقی بدن پر پانی کے اثرات کو تولئے یا رومال وغیرہ سے صاف کرنا ضروری نہیں کیونکہ بعض روایات میں کپڑے سے پانی خشک کرنے کا ذکر بھی آیا ہے اور وضو کے پانی کو ہاتھ سے جھاڑنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اور جس روایت میں ہاتھ سے پانی جھاڑنے کی ممانعت آئی ہے وہ حدیث ضعیف ہے۔ صحیح حدیث کی موجودگی میں ضعیف کی کوئی وقعت و حیثیت نہیں۔

(١٠٥) وعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا

تعالی عنها قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أَشُدُّ شَعَرَ رَأْسِي، أَفَأَنْقُضُهُ لِغُسْلِ الجَنَابَةِ؟ وَفِيْ رِوَايَةٍ: وَلِلْحَيْضَةِ؟ فَقَالَ: **لاَ، إِنَّمَا يَكْفِيْكِ أَنْ تَحْثِي عَلَى رَأْسِكِ ثَلاَثَ حَثَيَاتٍ**. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

یارسول اللہ (ﷺ)! میں اپنے سر کے بال (یعنی مینڈھیوں کی شکل میں) باندھ لیتی ہوں۔ کیا غسل جنابت کے موقع پر ان کو کھولوں؟ اور ایک روایت میں حیض سے فارغ ہو کر غسل کے وقت کے الفاظ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ''نہیں (کھولنے کی ضرورت نہیں) بس تیرے لئے یہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر تین چلو پانی بہا دیا کر۔'' (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اشد ﴾ شد یشد سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی باندھنا مضبوطی کے ساتھ۔ ﴿ اتحثی ﴾ انڈیل تو' ڈال تو۔ ﴿ حثیات ﴾ خفنات کے معنی میں ہے۔ پانی سے بھرے ہوئے دونوں ہاتھوں کے چلو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے جنابت لاحق ہو جائے اور جسے حیض آیا ہو اس کیلئے غسل کیلئے بالوں کا کھولنا ضروری نہیں البتہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے بالوں کو کھولنے کا حکم فرمایا مگر یہ دونوں روایتیں باہم متعارض نہیں کیونکہ بال کھولنے کا حکم محض استحباب کیلئے ہے جنابت اور غسل حیض میں عورت پر واجب نہیں کہ وہ سر کے بال کھولے صرف بالوں کی جڑ یا سر کا چمڑا تر ہونا چاہئے۔ سارے بال تر ہونا ضروری نہیں۔ مسلم اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کو کسی ذریعہ سے اطلاع ملی کی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عورتوں کو غسل جنابت و حیض کے وقت سر کے بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے اظہار تعجب فرمایا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں کس طرح عورتوں کو بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں اس سے تو بہتر ہے کہ وہ عورتوں کو سر منڈوانے کا حکم دیں۔ میں اور آنحضور ﷺ ایک ہی ٹب نما برتن میں غسل کر لیا کرتے تھے اور میں سر پر صرف تین بار پانی ڈال لیتی تھی۔ گویا سر کے بال کھولنے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔

(١٠٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**إِنِّي لاَ أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلاَ جُنُبٍ**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''میں حائضہ عورت اور حالت جنابت میں مبتلا مرد کیلئے مسجد میں داخلہ حلال نہیں کرتا (یعنی ان دونوں کو مسجد میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتا)'' (اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا احل المسجد ﴾ احلال سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ میں مسجد میں داخلہ کو حلال

نہیں کرتا۔ یہ صیغہ تحریم کے بارے میں صریح ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حائضہ عورت اور جنبی مرد دونوں مسجد میں نہ قیام کر سکتے ہیں اور نہ عام حالت میں مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں البتہ اگر مسجد کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ گزرنے کا نہ ہو تو ائمہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا مسجد میں سے گزرنا ناجائز قرار دیتے ہیں۔ یہ حدیث امام موصوف کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ جائز ہونے کی دلیل قرآن مجید کی آیت ﴿ الاعابری سبیل ﴾ ہے' یعنی جنبی مسجد میں نہ جائے ہاں اگر مسجد میں سے گزرنا پڑے تو مجبوراً گزر سکتا ہے اور حدیث سے مراد ٹھہرنے کی ممانعت ہے۔ نہ کہ گزرنے کی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ تو آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی بنا پر وضو کے بعد مسجد میں ٹھہرنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جو کوئی آدمی ضرورتاً مسجد میں سو گیا ہو اس حالت میں اسے حالت جنابت لاحق ہو گئی تو ایسے آدمی کیلئے بالاتفاق مسجد سے نکل جانا جائز ہے۔

(۱۰۷) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَرَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، تَخْتَلِفُ أَيْدِينَا فِيهِ، مِنَ الجَنَابَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ ابْنُ حِبَّانَ: «وَتَلْتَقِي».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ایک ہی برتن سے غسل جنابت کر لیا کرتے تھے۔ اس برتن میں ہمارے ہاتھ یکے بعد دیگرے داخل ہوتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ابن حبان نے اتنا اضافہ مزید نقل کیا ہے کہ بسا اوقات دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو جاتے تھے۔

لغوی تشریح : ﴿ تختلف ایدینا فیه ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے بعد برتن میں داخل ہوتے تھے۔ مثلاً پہلے میرا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یا پھر پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں میرا۔ ﴿ من الجنابة ﴾ جنابت کی وجہ سے۔ اس میں غسل کرنے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ غسل کس وجہ سے کرتے تھے؟ ﴿ تلتقی ﴾ مل جاتے' چھو جاتے' ایک دوسرے سے۔ جب ایک ہی برتن میں یکے بعد دیگرے ہاتھ داخل ہوں گے تو ان کا باہمی طور پر دوسرے کے ساتھ چھو جانا غسل کیلئے باعث نقصان نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے غسل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک برتن کے پانی سے میاں بیوی کا اکٹھے غسل کرنا بھی جائز ہے۔

(۱۰۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ تَحْتَ كُلِّ شَعَرَةٍ جَنَابَةً،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "ہر بال کی تہہ (نیچے) میں جنابت کا اثر ہوتا ہے اس لئے بالوں کو

فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ، وَأَنْقُوا الْبَشَرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَاهُ، وَلأَحْمَدَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوُه، وَفِيْهِ رَاوٍ مَجْهُولٌ.

(اچھی طرح) دھویا کرو اور جسم کو اچھی طرح (مل کر) صاف کیا کرو۔" (ابوداؤد اور ترمذی دونوں نے اسے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی ضعیف بھی قرار دیا ہے۔ مسند احمد میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت ہے اور اس میں ایک راوی مجہول الحال ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انقوا ﴾ انقاء سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ صاف کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (صاف کرو) ﴿ البشر ﴾ "با" اور شین پر فتحہ۔ انسان کی جلد کا ظاہر۔ آدمی کی جلد و کھال کی اوپر والی سطح۔ ﴿ وضعفاه ﴾ دونوں (ابوداؤد و ترمذی) نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی حارث ابن وجیہ نامی ضعیف ہے۔ محدثین نے اس کی روایت کو منکر قرار دیا ہے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور اس کی دلیل ہے کہ غسل جنابت کی صورت میں سارا جسم دھونا فرض ہے البتہ کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ احناف کے نزدیک یہ بھی فرضیت کے حکم میں شامل ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی مشہور قول یہی ہے جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ مسنون ہے۔ بہرحال حدیث ہذا کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ غسل جنابت میں سارا بدن حتیٰ کہ بالوں کو خوب اچھی طرح مل کر دھونا چاہئے' ایسا نہ ہو کہ بلا کسی اشد مجبوری کے جسم کا کوئی حصہ بال برابر یا بالوں کے نیچے جگہ خشک رہ جائے۔

***

٩ - بَابُ التَّيَمُّمِ

تیمم کا بیان

(١٠٩) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أُعْطِيتُ خَمْساً لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الأَرْضُ مَسْجِداً

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو بھی نہیں دی گئیں۔ مجھے ایک مہینہ کی مسافت سے (دشمن پر) رعب و دبدبے سے مدد دی گئی ہے۔ ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور

وَطَهُوراً، فَأَيُّما رَجلٍ أَدْرَكَتْهُ الصَّلاةُ فَلْيُصَلِّ». وذَكَرَ الحَدِيْثَ.

طہارت و پاکیزگی کا ذریعہ بنائی گئی ہے' اب جس آدمی کو (جہاں بھی) نماز کا وقت آجائے اسے نماز پڑھ لینی چاہئے۔" اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

وَفِيْ حَدِيْثِ حُذَيْفَةَ عِنْدَ مُسْلِمٍ: «وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوراً إِذَا لَمْ نَجِدِ المَآءَ».

مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "جب ہمیں پانی دستیاب نہ ہو تو زمین کی مٹی ہمارے لئے حصول طہارت و پاکیزگی کیلئے پاک بنا دی گئی ہے۔"

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عِنْدَ أَحْمَدَ: «وَجُعِلَ التُّرَابُ لِي طَهُوراً».

مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "مٹی میرے لئے حصول طہارت کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿باب التیمم﴾ تیمم کا لغوی معنی ہے قصد و ارادہ کرنا۔ شرعی اصطلاح میں پاک و صاف مٹی کی طرف قصد و ارادہ کرنا۔ نماز وغیرہ کو مباح کرنے کی غرض سے چہرہ اور دونوں ہاتھوں پر مٹی ملنے کو کہتے ہیں۔ ﴿اعطیت﴾ مجھے دی گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ ﴿خمسا﴾ پانچ ممیّزات و خصائص۔ ﴿نصرت﴾ مدد دیا گیا ہوں صیغہ مجہول ہے۔ ﴿بالرعب﴾ "راء" پر ضمہ اور عین ساکن ہے۔ معنی اس کے خوف ہیں۔ ﴿مسیرة شهر﴾ مہینہ بھر کی مسافت و دوری سے۔ میرے دشمن پر میرا رعب و دبدبہ پڑ جاتا ہے۔ ممیّزات خمسہ میں سے یہ پہلا امتیاز ہے اور دوسرا ﴿جعلت لی الارض مسجدا﴾ کا امتیاز ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی نہیں دیا گیا۔ کیونکہ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ صرف اپنے گرجوں اور عبادت گاہوں ہی میں نماز ادا کر سکتے تھے۔ ﴿وطهورا﴾ "طاء" پر فتحہ ذریعہ پاکیزگی و طہارت' جنابت اور ناپاکی کو دور کرنے اور زائل کرنے کا ذریعہ۔ اس طرح سے ادائیگی نماز کیلئے جائز ہونے کا موقع پیدا کیا گیا ہے۔ ﴿ادركته﴾ اس کا وقت آپہنچے' یعنی نماز کا وقت ہو جائے۔ ﴿فليصل﴾ تو اسے نماز پڑھ لینی چاہئے خواہ مسجد نہ ملے اور پانی بھی مہیا نہ ہو سکے۔ ﴿وذكر﴾ سے مراد راوی حدیث ہے۔ یعنی راوی نے باقی حدیث بیان کی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سے مصنف نے بالخصوص آپ کو عطا کئے جانے والے دو امتیازات و خصائص کا ذکر کیا ہے اور باقی تین یہ ہیں۔ غنائم کا حلال کیا جانا۔ یعنی دوران جنگ دشمن سے جو اموال افواج اسلام کے قبضہ میں آئیں وہ آپ کیلئے اور امت مسلمہ کیلئے حلال کئے گئے ہیں۔ نیز شفاعت کبریٰ بھی آپ ہی فرمائیں گے۔ یہ امتیاز بھی صرف آپ ہی کا طرۂ امتیاز ہے' تاکہ روز محشر کی تکلیف سے لوگوں کو آرام و سکون اور راحت نصیب ہو اور روئے ارض کے تمام انسانوں اور جنوں کیلئے آپ کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں آخری تین امتیازات کو حذف کر دیا ہے اور انہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جن کا تعلق طہارت اور نماز سے ہے۔

پانی کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں شریعت اسلامیہ نے تیمم کی سہولت بہم پہنچا کر امت مسلمہ

کیلئے بہت بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ زمین کے تمام اجزاء سے تیمم درست ہے۔ زمین سے نکلنے والی معدنیات جو زمین کا حکم رکھتی ہوں ان سے بھی تیمم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ معدنیات غبار رکھنے والی ہوں۔

(١١٠) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِيْ حَاجَةٍ، فَأَجْنَبْتُ، فَلَمْ أَجِدِ الْمَآءَ، فَتَمَرَّغْتُ فِي الصَّعِيدِ، كَمَا تَمَرَّغُ الدَابَّةُ، ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، فَذَكَرْتُ لَهُ ذَلِكَ، فَقَالَ: **إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ أَنْ تَقُولَ بِيَدَيْكَ هَكَذَا،** ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدَيْهِ الأَرْضَ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ مَسَحَ الشِّمَالَ عَلَى الْيَمِيْنِ وظَاهِرَ كَفَّيْهِ وَوَجْهَهُ. متفق عليه وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے کسی ضرورت و حاجت کے سلسلہ میں بھیجا۔ میں جنبی ہوگیا اور پانی مجھے دستیاب نہ ہو سکا تو میں مٹی میں اس طرح لوٹ پوٹ ہوا جس طرح چوپایہ لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔ (ضرورت سے فارغ) ہو کر میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ آپؐ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا "تجھے اپنے ہاتھ سے اس طرح کر لینا ہی کافی تھا۔" پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک مرتبہ زمین پر مارا پھر بائیں کو دائیں پر ملا اپنے ہاتھوں کی پشت اور چہرے پر۔ (بخاری اور مسلم' اور متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ «وَضَرَبَ بِكَفَّيْهِ الأَرْضَ، وَنَفَخَ فِيْهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ.»

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں اور پھونک مار کر گرد و غبار اڑا دیا پھر ان کو اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیا۔

لغوی تشریح: ﴿فاجنبت﴾ میں جنبی ہوگیا۔ ﴿فتمرغت﴾ لوٹ پوٹ ہوا۔

حاصل کلام: یہ حدیث قول و فعل دونوں اعتبار سے یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے ایک ضرب ہی کافی ہے اور ہتھیلیوں کی بیرونی اور اندرونی سطح پر مسح کرنا ہے۔ کہنیوں تک نہیں۔ اس باب میں یہ حدیث صحیح ترین ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو دوسری روایات ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا پھر موقوف جو اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم میں چہرے اور ہاتھوں کیلئے ایک ہی ضرب کافی ہے۔ جمہور محدثین و فقہاء کا یہی مذہب ہے' البتہ احناف اور شافعی دو ضربوں کے قائل ہیں۔ ایک ضرب چہرے کیلئے اور دوسری ہاتھوں کیلئے ہے۔ مذکورہ بالا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ان کی دلیل ہے۔ اس باب میں صحیح ترین روایت ہونے کے اعتبار سے اسی پر عمل ہے۔ نیز عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے پانی نہ ملنے پر اپنی عقل و

دانش سے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کا عمل اختیار کیا کہ جب پانی سے غسل کیا جاتا ہے تو سارا بدن دھویا جاتا ہے اور مٹی بھی چونکہ پانی کے قائم مقام ہے اس لئے سارے جسم پر مٹی لگنی چاہئے۔ نص کا علم نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے ایسا عمل کیا ورنہ نص کی موجودگی میں مجتہد کے قیاس کی کوئی حیثیت نہیں' لہٰذا جب نص قیاس کے مخالف ہو تو اس صورت میں کسی کیلئے بھی یہ روا نہیں کہ وہ نص کو چھوڑ کر قیاس پر عمل کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے زمین پر اپنی ہتھیلیاں ماریں اور ان پر پھونک دیا۔ لہٰذا ضرب لگانے کے بعد پھونک دینا بھی مسنون ہے۔ ایک جنبی کیلئے پانی کی عدم موجودگی میں اتنا تیمم کر لینا کفایت کر جاتا ہے۔

راوی حدیث : ﴿ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ﴾ عین پر فتحہ' میم پر فتحہ اور تشدید۔ ان کی کنیت ابو الیقظان تھی۔ اولین سابقین صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ مکہ میں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر ان کے پایہ ثبات میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ (یعنی ہجرت حبشہ' ہجرت مدینہ) غزوۂ بدر سمیت سارے معرکوں میں شمولیت کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا "افسوس اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔" ۳۶ھ میں معرکہ صفین کے موقع پر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں سے تھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکریوں میں سے ایک باغی اور سرکش گروہ نے ان کو قتل کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۳ برس کی تھی۔

(۱۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**التَّيَمُّمُ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ**» . رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ الأَئِمَّةُ وَقْفَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "تیمم دو ضربوں سے (مکمل) ہوتا ہے (تیمم میں دو ضربیں ہیں) ایک ضرب چہرے کیلئے اور ایک ضرب دونوں ہاتھوں کیلئے کہنیوں تک۔" (اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور دوسرے ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے)

حاصل کلام : ﴿ التیمم ضربتان ..... الخ ﴾ والی حدیث کو حاکم اور بیہقی نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ائمہ حدیث نے علی بن ظبیان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور دیگر علماء نے بھی اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔ اس کے اور بھی کئی طرق ہیں مگر سبھی ضعیف شمار کئے گئے ہیں۔

(۱۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**الصَّعِيدُ وَضُوءُ الْمُؤْمِنِ الْمُسْلِمِ، وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيَتَّقِ اللَّهَ،**

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مٹی مومن مسلمان کا وضو ہے خواہ دس برس تک اسے پانی نہ ملے۔ مگر جب پانی دستیاب ہو جائے تو پھر اللہ سے ڈرنا چاہئے اور اسے اپنے جسم پر پانی پہنچانا چاہئے۔" (اس کو بزار نے

وَلْيُمِسَّهُ بَشَرَتَهُ». رَوَاهُ الْبَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ القَطَّانِ، وَلٰكِن صَوَّبَ الدَّارَقُطْنِيُّ إِرسَالَهُ، وَلِلتِّرمِذِيِّ عَنْ أَبِي ذَرٍّ نَحْوُه، وَصَحَّحَهُ وَالحاكِمُ أَيْضاً.

روایت کیا ہے اور ابن القطان نے صحیح قرار دیا ہے' تاہم دارقطنی نے اس کے مرسل ہونے کو درست اور قرین صواب کہا ہے اور ترمذی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے جسے ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور حاکم نے بھی صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الصعید ﴾ پاکیزہ مٹی کو کہتے ہیں۔ ﴿ وان لم یجد ﴾ اس میں "ان" وصلیہ ہے۔ ﴿ عشر سنین ﴾ دس برس۔ اس سے مراد مبالغہ ہے وقت و مدت کا تعین مقصود نہیں۔ مطلب ہے کہ جتنی مدت تک پانی دستیاب نہ ہو اس وقت تک تیمم کی اجازت ہے۔ ﴿ فلیتق اللہ ﴾ اللہ سے ڈرنا چاہئے کا مفہوم یہ ہے کہ طہارت و وضو میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہونے پائے اور صرف مٹی پر انحصار نہ کرے۔ ﴿ ولیمسہ ﴾ امساس سے ماخوذ ہے۔ یعنی پانی پہنچائے۔ ﴿ بشرتہ ﴾ "با" اور شین دونوں پر فتحہ ہے۔ مراد جسم کی کھال ہے۔ ﴿ صوب ﴾ تصویب سے ماخوذ ہے اور معنی یہ ہوئے کہ اس حدیث کا مرسل ہونا درست اور صحیح ہے۔ یہ حدیث یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے وقت و مدت کا تعین نہیں اور جب پانی کی دستیابی کی صورت میں عذر باقی نہ رہے تو پھر پانی کا استعمال واجب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں تیمم کو وضو قرار دیا ہے تو گویا تیمم وضو کا قائم مقام اور بدل ہے۔ جب یہ پانی کا بدل ہے تو پھر دونوں کے احکام بھی ایک جیسے ہوں گے۔ یعنی ایک وضو سے جتنی نمازیں پڑھ سکتا ہے تیمم سے بھی اتنی پڑھی جا سکتی ہیں۔ بعض لوگ اس حدیث کی رو سے تیمم سے رفع حدث کے قائل نہیں ان کے نزدیک صرف نماز مباح ہوتی ہے' جب نماز سے فارغ ہو گا تو پھر ویسا ہی جنبی ہو گا جیسا کہ تیمم سے پہلے تھا۔ پہلا مسلک احناف کا ہے ان کے نزدیک ایک تیمم سے جب تک تیمم قائم رہے کئی فرائض ادا ہو سکتے ہیں۔ سعید بن المسیب' حسن بصری' زہری' سفیان ثوری کی بھی یہی رائے ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ' امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تیمم سے طہارت کاملہ حاصل نہیں ہوتی' بلکہ اس سے جو طہارت حاصل ہوتی ہے اس کی حیثیت معذور کی اس طہارت کی طرح ہے جو محض ضرورت کیلئے ایک محدود مدت تک حاصل ہوتی ہے اور اس سے صرف ایک ہی فرض جس کیلئے تیمم کیا گیا ہو ادا ہو سکتا ہے۔

ترمذی میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح ہے "ابوذر رضی اللہ عنہ کو جب مدینہ منورہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا آپؐ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو اونٹوں میں رہنے کا حکم فرمایا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے اونٹوں میں رہنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی ابوذر رضی اللہ عنہ تو تباہ ہو گیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ "کیا ہوا؟؟" ابوذرؓ نے عرض کیا جنابت لاحق ہو جاتی ہے اور میرے پاس پانی نہیں ہوتا (کیا کروں؟) ارشاد ہوا "جسے پانی نہ ملے اس کیلئے مٹی پاک کرنے کا ذریعہ ہے اگرچہ دس سال تک یہی حال رہے۔"

راوی حدیث: ﴿ ابوذر رضی اللہ عنہ ﴾ "راء" پر تشدید۔ نام ان کا جندب بن جنادہ تھا۔ جنادہ میں جیم پر ضمہ ہے۔ ان صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو زاہد' دنیا سے بے رغبت تھے۔ مکہ میں ابتداء اسلام میں ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ پھر اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے۔ مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش ہوئے۔ مقام ربذہ میں رہائش رکھی۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ بہت متقی' پرہیزگار اور توکل علی اللہ کرنے والے تھے۔

(۱۱۳) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعالَى عَنْهُ، قَالَ: خَرَجَ رَجُلاَنِ فِي سَفَرٍ، فَحَضَرَتِ الصَّلاَةُ، وَلَيْسَ مَعَهُمَا مَآءٌ، فَتَيَمَّمَا صَعِيْداً طَيِّباً، فَصَلَّيَا، ثُمَّ وَجَدَا الْمَآءَ فِي الوَقْتِ، فَأَعَادَ أَحَدُهُمَا الصَّلاَةَ، وَالوُضُوءَ، وَلَمْ يُعِدِ الآخَرُ، ثُمَّ أَتَيَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، فَذَكَرا ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ لِلَّذِي لَمْ يُعِدْ: «**أَصَبْتَ السُّنَّةَ، وَأَجْزَأَتْكَ صَلاَتُكَ**»، وَقَالَ لِلآخَرِ: «**لَكَ الأَجْرُ مَرَّتَيْنِ**». رَوَاه أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسائِيُّ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے' نماز کا وقت آگیا مگر ان کے ساتھ پانی نہیں تھا۔ دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی۔ پھر پانی بھی دستیاب ہوگیا جبکہ ابھی نماز کی ادائیگی کا وقت باقی تھا ان میں سے ایک صاحب نے وضو بھی کیا اور نماز دوبارہ ادا کرلی مگر دوسرے نے نہ وضو کیا اور نہ ہی نماز دہرائی۔ سفر سے واپسی پر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا۔ آپؐ نے اس شخص کو جس نے نماز دوبارہ نہیں پڑھی تھی فرمایا "تو نے سنت کے مطابق کیا اور تیری نماز کافی ہوگئی" اور دوسرے سے فرمایا "تجھے دگنا اجر ملے گا۔" (ابوداؤد۔ نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ اصبت السنة ﴾ تو نے شرعی طریقہ پالیا۔ ﴿ اجزاتک ﴾ یعنی تجھے کافی ہوگئی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تیمم کر کے نماز ادا کرلی گئی ہو اور بعد میں دوران وقت ہی پانی مل گیا ہو تو ایسی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ فقہائے اربعہ کا یہی مذہب ہے۔

جس آدمی نے نماز دوبارہ پڑھی تھی اسے دوگنا اجر ملنے کی توجیہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک اجر تو اسے نماز پڑھنے کا ملا اور دوسرا اجتہاد کرنے کا۔ اجتہاد اگرچہ درست نہیں تھا تاہم غلط اجتہاد پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔

(۱۱٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فِي قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ﴾ قَالَ: إِذَا كَانَتْ بِالرَّجُلِ الجِرَاحَةُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالقُرُوحُ،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وان کنتم مرضی او علی سفر" کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جب کسی شخص کو راہ خدا میں زخم اور گھاؤ لگے اور اسی حالت میں اسے جنابت لاحق ہو جائے

فَيُجْنِبُ، فَيَخَافُ أَن يَموتَ إِنِ اغْتَسَلَ، تَيَمَّمَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْقُوفاً وَرَفَعَهُ البَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ.

اور غسل کرنے کی صورت میں مرجانے کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کر لے۔ (اس روایت کو دار قطنی نے موقوف' بزار نے مرفوع اور ابن خزیمہ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مرضی ﴾ مریض کی جمع۔ بیمار آدمی ﴿ علی سفر ﴾ علی فی کے معنی میں استعمال ہوا' یعنی مسافر ہو اور بعد کی آیت او جاء منکم من الغائط او لا مستم النساء فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا (۶:۵) کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یوں بیان فرمائی۔ کہ جب کسی انسان کو ایسا زخم لگے جو اسلحہ وغیرہ کا ہو اور ﴿ القروح ﴾ قرح کی جمع ہے جس کے معنی پھوڑے کے ہیں اور قرآنی آیت کی روشنی میں قروح ان زخموں اور گھاؤ کیلئے استعمال ہوتا ہے جو میدان جنگ میں اسلحہ کی وجہ سے لگے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ "اگر (آج) تمہیں زخم لگا ہے تو اسی طرح کا زخم ان لوگوں کو بھی لگ چکا ہے۔"

حاصل کلام: اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو اور تمہیں پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تیمم کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز پڑھنا چاہو اور وضو یا غسل میں کوئی امر مانع ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔ اس آیت میں بیماری اور مرض سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد معمولی پھوڑا پھنسی' خارش اور خراش تو بہرحال نہیں ہو سکتے لہٰذا اس سے مراد وہ بیماری ہے جسے عرف عام میں بیماری و مرض سمجھا جاتا ہے اور یہ بیماری کس درجہ کی ہو تو تیمم جائز ہے اس بارے ائمہ کے مابین اختلاف رائے ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی بیماری میں تیمم جائز درست ہے جس سے انسان کی موت واقع ہونے کا اندیشہ ہو یا کسی عضو اور حصہ جسم کے ضائع یا عیب دار ہونے کا خوف ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بیماری کے طول پکڑ جانے کا ڈر ہو تب بھی تیمم جائز ہے۔ اس آیت میں سفر میں ہونے کی صورت میں بھی تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ اس سفر سے وہ سفر مراد نہیں ہے جس میں نماز قصر ادا کی جاتی ہے اور روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے بلکہ اس سفر سے مطلق سفر مراد ہے اور مقصود اس سے صرف سفر میں پانی کا نہ ہونا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

محدثین کی اس حدیث کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اس معاملہ میں دار قطنی کی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ بزار نے اس روایت کو جریر بن عطاء کے حوالہ سے نقل کیا ہے حالانکہ ابن معین نے کہا ہے کہ جریر کا عطاء سے سماع اس موقع پر ہے جب ان کے حافظہ میں اختلاط پیدا ہو چکا تھا اس اعتبار سے اس کا مرفوع ہونا درست نہ ہوا۔

(۱۱۵) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: انْكَسَرَتْ إِحْدَى

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میرا گٹ ٹوٹ گیا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو کے بارے میں

زَنْدَيَّ، فَسَأَلْتُ رَسولَ اللهِ ﷺ فَأَمَرَنِي أَنْ أَمْسَحَ عَلَى الجَبائِرِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِسَنَدٍ وَاهٍ جِدًّا.

پوچھا (کہ اب میں کیا کروں؟) تو آپ نے ارشاد فرمایا "پٹیوں پر مسح کر لیا کرو۔" (اسے ابن ماجہ نے نہایت ہی کمزور و ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ زندی ﴾ "زاء" پر فتحہ' نون ساکن اور "یا" پر تشدید۔ زند و احد' تثنیہ زندی اور یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور "زند" ہتھیلی کی جانب بازو کا جوڑ جسے ﴿ رسغ ﴾ یعنی گٹ کہتے ہیں الجبائر ﴿ جبیرۃ ﴾ کی جمع ہے۔ کپڑے کا ٹکڑا یا لکڑی کا جسے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر مضبوطی سے لپیٹ کر باندھا جاتا ہے۔ ﴿ واہ ﴾ وھی یھی وھیا سے ماخوذ ہے۔ نہایت کمزور اور ضعیف۔ اس حدیث کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عمرو بن خالد الواسطی ہے وہ نہایت جھوٹا اور دروغ گو آدمی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کے بقول اس حدیث کے ضعیف ہونے پر حفاظ حدیث کا اتفاق ہے۔

(١١٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهُ، فِي الرَّجُلِ الَّذِي شُجَّ فَاغْتَسَلَ فَمَاتَ: إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْهِ أَن يَّتَيَمَّمَ وَيَعْصِبَ عَلَى جُرْحِهِ خِرْقَةً ثُمَّ يَمْسَحَ عَلَيْهَا، وَيَغْسِلُ سَائِرَ جَسَدِهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ فِيْهِ ضَعْفٌ، وَفِيْهِ اخْتِلَافٌ عَلَى رَاوِيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس شخص کے بارے میں جس کے سر پر زخم آیا تھا اور اسی حالت میں اس نے غسل کر لیا اور وفات پا گیا' کہ اسے تو تیمم کر لینا ہی کافی تھا۔ اپنے زخم پر پٹی باندھ کر مسح کرتا اور باقی بدن کو دھو لیتا۔ (اس روایت کو ضعیف سند کے ساتھ ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راویوں میں بھی اختلاف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شج ﴾ شج سے ماخوذ ہے' صیغہ مجہول ہے۔ سر میں جو زخم آئے اسے شج کہتے ہیں۔ ابوداؤد نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اس قصہ و واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں نکلے۔ ہم میں سے ایک آدمی کے سر پر پتھر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اسی حالت میں اسے احتلام کی نوبت پیش آ گئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ میرے لئے تیمم کی گنجائش و رخصت رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا جب تمہیں پانی کے استعمال کی طاقت ہے تو ہم تیرے لئے کوئی رخصت نہیں پاتے (یعنی ہم ایسی حالت میں تمہیں تیمم کی اجازت نہیں دے سکتے) اپنے ساتھیوں کے کہنے کی بنا پر اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا۔ جب ہم واپس ہوئے تو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے فوت ہونے کی اطلاع دی (اور سارا واقعہ بیان کیا) آپ نے فرمایا "ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی مار ہو ان پر۔ جب انہیں مسئلہ کی نوعیت کا علم نہیں تھا تو انہوں نے دریافت کیوں نہیں کیا۔ بے خبری اور عدم واقفیت کا علاج دریافت کرنا ہے۔" پھر آپ نے مندرجہ بالا ارشاد فرمایا۔ "یہ اس کیلئے کافی ہوتا۔" الخ۔ ﴿ یعصب ﴾ تعصیب سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پٹی کو مضبوطی سے باندھنا۔ زخمی جگہ پر پٹی وغیرہ باندھنے سے پہلے تیمم کرنا۔ جنابت کا اثر زائل کرنے کیلئے ہے' جیسا کہ موزے پہننے سے پہلے پاؤں دھونا طہارت کیلئے

ہوتا ہے' تاکہ حالت طہارت میں موزے پہنے جائیں اور پھران پر مسح کیا جاسکے۔

راوی حدیث: ﴿ وفیه اختلاف علی راویه ﴾ اس راوی کا نام عطاء ہے۔ اس سے جابر کے حوالہ سے بھی مروی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے بھی اور ایک نسخہ میں ﴿ علی رواته ﴾ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطاء کے نیچے یعنی عطاء کے شاگردوں میں اختلاف رائے ہے۔

(۱۱۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لاَّ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ بِالتَّيَمُّمِ إِلاَّ صَلاَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ يَتَيَمَّمُ لِلصَّلاَةِ الأُخْرَى.

رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ جِدًّا.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سنت یہی ہے کہ تیمم کرنے والا شخص تیمم سے ایک ہی نماز پڑھے اور دوسری نماز کیلئے ازسرنو تیمم کرے۔ (اس کو دارقطنی نے بہت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من السنة ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ۔

حاصل کلام: حدیث ضعیف ہے' اس لئے کہ اس کے راوی حسن بن عمارہ ہیں اور وہ ضعیف ہے اور سابقہ حدیث نمبر ۱۳۰ اس کے بظاہر خلاف ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے۔ اس لئے تیمم سے بھی کئی نمازیں ادا ہو سکتی ہیں۔

۱۰ - بَابُ الحَيْضِ۔

حیض (سے متعلق احکام) کا بیان

(۱۱۸) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: إِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِنَّ دَمَ الحَيْضِ دَمٌ أَسْوَدُ يُعْرَفُ، فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ فَأَمْسِكِي عَنِ الصَّلاَةِ، فَإِذَا كَانَ الآخَرُ فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا استحاضہ کی دائمی مریضہ تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ "حیض کے خون (کی رنگت) سیاہ ہوتی ہے' آسانی سے پہچان ہو سکتی ہے۔ جن ایام میں یہ خون آرہا ہو تو ان ایام میں نماز چھوڑ دو اور جب کوئی دوسرا ہو تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔" (ابوداؤد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوحاتم کے نزدیک یہ منکر ہے)

وَفِيْ حَدِيْثِ أَسْمَآءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ عِنْدَ أَبِيْ دَاوُدَ: وَلْتَجْلِسْ فِي مِرْكَنٍ، فَإِذَا رَأَتْ صُفْرَةً فَوْقَ المَآءِ

ابوداؤد میں مروی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک ٹب میں بیٹھ جائے اور جب وہ پانی کے اوپر زردی دیکھے تو ظہر اور عصر دونوں نمازوں

فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالعَصْرِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالعِشَآءِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَتَوَضَّأُ فِيْ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ.

کیلئے ایک غسل کر لے اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نماز کیلئے ایک غسل کر لے اور نماز فجر کیلئے الگ سے ایک غسل کرلے اور ان کے درمیان میں وضو کرلے۔

لغوی تشریح: (باب الحیض) حیض اس خون کو کہتے ہیں جو بالغ ہونے پر عورت کے رحم سے ہر مہینہ خارج ہوتا ہے۔ یہ چند مخصوص دن میں ہوتا ہے' نا امیدی کی زندگی تک یہ آتا رہتا ہے۔ یعنی زیادہ عمر ہونے سے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کسی بیماری ی ولادت کی وجہ سے نہیں ہوتا ﴿ یعرف ﴾ معرفت سے ماخوذ ہے۔ صیغۂ مجہول۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ خواتین اسے جانتی اور پہچانتی ہیں کہ کون سا خون ہے؟ یہ بھی ایک رائے ہے کہ ﴿ یعرف ﴾ باب افعال سے ہے۔ اس صورت میں "یاء" پر ضمہ اور "راء" مکسور ہوگی۔ معنی یہ ہوں گے کہ خون کی بو ہی بتا دے گی کہ کونسا خون ہے؟ ﴿ فاذا کان ذلک ﴾ کاف کے نیچے کسرہ۔ یعنی جب تیری حالت ایسی ہو۔ ﴿ فامسکی ﴾ امر کا صیغہ ہے۔ واحد مونث۔ معنی نماز سے رک جا۔ ﴿ فاذا کان الاخر ﴾ جب خون کا وصف مذکورہ بالا نہ ہو۔ ﴿ واستنکر ﴾ اسے منکر قرار دیا۔ اس کے منکر ہونے کی وجہ اس حدیث کی سند میں عدی بن ثابت عن ابیہ عن جدہ ہے۔ اس کا دادا غیر معروف آدمی ہے۔ ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ﴿ مرکن ﴾ بہت بڑا پیالہ نما برتن (ٹب کی قسم کا) اس میں "میم" پر کسرہ اور "کاف" پر فتحہ ہے۔ ﴿ فاذا رات صفرۃ فوق الماء ﴾ جب وہ پانی پر زردی دیکھے تو اسے جان لینا چاہئے کہ یہ حیض کے جانے اور اس کے اختتام کی علامت ہے۔ ﴿ فلتغتسل للظھر والعصر غسلا واحدا ﴾ تو اسے ظہر اور عصر کی نمازوں کیلئے ایک ہی غسل کر لینا چاہئے۔ اس کی عملی صورت اس طرح ہوگی کہ ظہر کے وقت کو مؤخر کرے اور عصر کے وقت کو ذرا مقدم کرے اس طرح دونوں نمازیں اپنے اصلی وقت میں ادا بھی ہو جائیں گی اور جمع صوری بھی بن جائے گی اور اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کیلئے کر لے۔ ﴿ وتتوضا فیما بین ذلک ﴾ ان دونوں (ظہر اور عصر) اور مغرب و عشاء کے درمیان وضو کر لے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صلاۃ ظہر کے وضو سے نماز عصر ادا نہیں کر سکتی اور اسی طرح مغرب کی نماز کے وضو سے عشاء کی نماز نہیں پڑھ سکتی۔ یہ مستحاضہ عورت کیلئے ہے۔ اگر دو نمازیں مستحاضہ اکٹھی پڑھنا چاہے تو وہ ایک وضو کے ساتھ صرف ایک فرض نماز ہی ادا کرے گی۔

حاصل کلام: نوجوان عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض (ایام ماہواری) دوسرا دم نفاس جو بچے کی پیدائش سے لے کر چالیس ایام یا کم و بیش جاری رہتا ہے اور تیسرا دم استحاضہ۔ استحاضہ کا خون اسے کہتے ہیں جو ایام ماہواری اور نفاس کے چالیس یوم کے علاوہ جاری رہے۔ حیض کی اقل مدت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک دن اور زیادہ سے زیادہ پندرہ دن تک ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں

کہ تین روز سے لے کر دس روز تک ہو سکتا ہے۔ ملکی' موسمی اور عورتوں کی طبائع کے اعتبار سے دونوں ائمہ کی رائے اپنی اپنی جگہ صائب ہو سکتی ہے۔ ویسے ہر عورت کو اپنی طبیعت اور عادت کی روشنی میں علم ہوتا ہے کہ اس کے ایام کی تعداد کتنی ہے۔ اس تعداد سے زیادہ خون جاری رہے تو اسے استحاضہ قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ﴾ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت حبشہ کی۔ وہاں انہیں اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا' جن سے ایک عبداللہ ہے۔ غزوہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اب ان کے بطن سے محمد نے جنم لیا جو محمد بن ابی بکر کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے بطن سے یحییٰ پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے خوابوں کی تعبیر دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ان کی وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی۔ (ذہن نشین رہے کہ عمیس عربی قوائد کی رو سے تصغیر ہے)

(١١٩) وَعَنْ حَمْنَةَ بِنْتِ جَحْشٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيرَةً شَدِيدَةً، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَفْتِيهِ، فَقَالَ: «إِنَّمَا هِيَ رَكْضَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَتَحَيَّضِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ اغْتَسِلِي، فَإِذَا اسْتَنْقَأْتِ فَصَلِّي أَرْبَعَةً وَعِشْرِينَ أَوْ ثَلَاثَةً وَعِشْرِينَ، وَصُومِي وَصَلِّي، فَإِنَّ ذَلِكَ يُجْزِئُكِ، وَكَذَلِكَ فَافْعَلِي كُلَّ شَهْرٍ، كَمَا تَحِيضُ النِّسَاءُ، فَإِنْ قَوِيتِ عَلَى أَنْ تُؤَخِّرِي الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِي الْعَصْرَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِي حِينَ تَطْهُرِينَ، وَتُصَلِّينَ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعاً، ثُمَّ تُؤَخِّرِينَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِينَ الْعِشَاءَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِينَ وَتَجْمَعِينَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ،

حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سخت قسم کے عارضہ استحاضہ میں مبتلا رہتی تھی۔ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں استفسار کیلئے حاضر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا "یہ تو شیطان کی چوک (مار) ہے۔ لہٰذا تو چھ یا سات روز ایام حیض شمار کر کے پھر نہا لے' جب تو اچھی طرح پاک و صاف ہو جائے تو پھر چوبیس یا تیئس روز نماز پڑھ اور روزہ بھی رکھ۔ یقیناً یہ تیرے لئے کافی ہے پس ہر ماہ اسی طرح کر لیا کر جیسا کہ حیض والی خواتین کرتی ہیں۔ پھر اگر تم میں ظہر کو ذرا مؤخر کرنے اور عصر کو ذرا مقدم کرنے کی ہمت و طاقت ہے تو پھر غسل کر لے جب پاک و صاف ہو جائے تو ظہر اور عصر دونوں کو اکٹھا لا کر پڑھ لے۔ پھر مغرب کو مؤخر اور عشاء کو ذرا مقدم کر کے غسل کر لے اور جمع صلاتین کر لے۔ تو ایسا کر لے (یعنی ایسا کرنے کی اجازت ہے) اور صبح کی نماز کیلئے الگ غسل کر لے اور نماز پڑھ لے۔" پھر فرمایا "دونوں

فَافْعَلِي، وَتَغْتَسِلِينَ مَعَ الصُّبْحِ وَتُصَلِّينَ، قَالَ: وَهُوَ أَعْجَبُ الأَمْرَيْنِ إِلَيَّ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ البُخَارِيُّ.

باتوں میں سے مجھے یہ زیادہ پسند اور محبوب ہے۔" (اس کو نسائی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے حسن کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ استفتیہ ﴾ میں نے آپ ؐ سے فتویٰ پوچھا۔ ﴿ رکضہ ﴾ چوک مارنا وغیرہ۔ ﴿ فتحیضی ستۃ ایام او سبعۃ ایام ﴾ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ کچھ عورتوں کو حیض چھ روز آتا ہے اور کسی کو سات روز۔ اس میں عمر اور مزاج کو بھی دخل ہے۔ ﴿ فاذا استنقات ﴾ جب تو پاک صاف ہو جائے۔ ﴿ صومی وصلی ﴾ روزہ رکھ' نماز پڑھ' فرض ہو یا نفلی جو جی میں آئے ﴿ وھو اعجب الامرین الی ﴾ الامرین سے مراد ہر نماز کیلئے الگ الگ وضو کرنا اور دن رات میں تین مرتبہ نہانا اور غسل کرنا (یعنی میرے نزدیک پسندیدہ عمل شب و روز میں تین مرتبہ غسل کرنا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کو دن رات میں تین مرتبہ غسل کرنے کا حکم دیا۔ ایک ظہر اور عصر کیلئے دوسرا مغرب اور عشاء کیلئے اور تیسرا نماز فجر کیلئے۔ اس سے پہلی حدیث میں فاطمہ بنت ابی حبیش کو ہر نماز کیلئے وضو کا حکم دیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استحاضہ کے مرض میں مبتلا عورت پر غسل واجب نہیں ہے البتہ ہر نماز کیلئے از سرنو وضو فرض ضرور ہے۔ غسل بس مستحب ہے وہ بھی صحت اور موسم اگر ساتھ دیں ورنہ چنداں ضرورت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ حمنہ بنت جحش ﴾ حمنہ میں "حا" اور جحش کی جیم دونوں پر فتح ہے اور "میم" اور "حا" دونوں ساکن ہیں۔ یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کی بہن تھیں۔ پہلے یہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ غزوۂ احد میں مصعب شہید ہو گئے تو یہ طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آگئیں۔

(١٢٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ حَبِيبَةَ بِنْتَ جَحْشٍ شَكَتْ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ الدَّمَ، فَقَالَ: «اُمْكُثِي قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكِ حَيْضَتُكِ، ثُمَّ اغْتَسِلِي»، وَكَانَتْ تَغْتَسِلُ لِكُلِّ صَلاَةٍ. رواه مسلم.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے دم استحاضہ کا شکوہ کیا۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ "تمہارے ماہواری کے ایام جس قدر پہلے سے متعین ہیں اتنے ایام میں (نماز' روزہ) چھوڑ دے۔ اس کے بعد نہا دھو کر نماز ادا کرو۔" ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اس کے بعد ہر نماز کیلئے تازہ غسل کیا کرتی تھیں۔ (مسلم)

وَفِي رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ «وَتَوَضَّئِي

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ "پھر ہر نماز کیلئے

لِكُلِّ صَلاَةٍ». وَهِيَ لأَبِيْ دَاوُدَ وَغَيْرِهِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ. ازسرنو وضو کر لیا کر۔" ابوداؤد وغیرہ محدثین نے اس حدیث کو دوسرے طریقے سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تحبسک ﴾ تیری ادائیگی نماز میں مانع ہو۔ رکاوٹ کا باعث بنے۔ چنانچہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ہر نماز کیلئے غسل سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا کرنے کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث اور اس باب میں بیان شدہ احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ مستحاضہ' استحاضہ کے خون اور حیض کے خون کو ان کی تین علامات میں سے کسی کی بنیاد پر دونوں میں فرق کرے گی۔ جہاں تک دونوں خونوں میں تمیز کا تعلق ہے تو اس طرح ہے کہ ایام ماہواری کا خون سیاہ رنگت کا اور گاڑھا ہوتا ہے اس کی بو بھی بڑی کریہہ ہوتی ہے اور استحاضہ کے خون کی رنگت سرخ ہوتی ہے اور وہ رقیق یعنی پتلا ہوتا ہے یا پھر خون استحاضہ کے جاری ہونے سے پہلے اس عورت کی معمول بہ عادت کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ کتنے روز تک ایام ماہواری جاری رہتے تھے یا پھر دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی ہم عمر اور ہم مزاج خواتین پر اس کو قیاس کیا جائے گا کہ ایسے مزاج اور اتنی عمر کی خواتین کو کتنے دن ایام ماہواری آسکتے ہیں یا آیا کرتے ہیں اور اگر مستحاضہ میں ایک سے زائد علامات جمع ہو جائیں تو پھر زیادہ قوی طریقے اور واضح دلیل سے اس کا تعین ہو سکے گا۔ دو یا تین علامات اگر باہم متعارض ہوں تو پھر بغیر تردد و شک کے حیض کے خون کے سیاہ رنگ کو مقدم رکھا جائے گا اور عقل بھی اس کو مقدم رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر عادت کا لحاظ رکھا جائے گا پھر ہم عمر اور ہم مزاج عورتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ مندرجہ بالا مذکورہ علامتوں میں امتیاز و فرق کرنا نہایت آسان اور سہل ہے۔ عقلمند اور کند ذہن عورت اس فرق کو بآسانی اخذ کر سکتی ہے اور جس کی طرف فقہاء کی جماعت بالخصوص احناف گئے ہیں وہ بحث بڑی دقیق' گنجلک اور مغلق ہے۔ وہ عورتوں کے فہم و عقل سے بعید ہے بلکہ بہت ہی دور ہے اور یہ احادیث بھی اس مفہوم کا انکار کرتی ہیں۔ شریعت بیضاء جو سہل الفہم ہے وہ بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتی۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہر نماز کیلئے غسل فرمایا کرتی تھیں۔ اس غسل کی نوعیت جمہور کے نزدیک تطوع کی ہے۔ ورنہ شریعت نے مستحاضہ پر ہر نماز کیلئے ازسرنو غسل کرنا فرض و واجب قرار نہیں دیا۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی اسی رائے کی تائید کی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی صحیح حدیث سے مستحاضہ کیلئے ہر نماز کے وقت نیا غسل کرنا ثابت نہیں۔ مستحاضہ اپنے مقرر ایام ماہواری پورے ہونے کے بعد غسل کرے۔ اس کے بعد ہر نماز کیلئے استنجا کر کے وضو کرے اور نماز ادا کرے۔ مذکورہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ مستحاضہ کو کسی نہ کسی شناخت کرانے والی علامت کی جانب توجہ کرنا چاہئے۔ پھر جس علامت سے اس کو پہچان ہو جائے' اسی پر کاربند ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ﴾ بعض کا خیال ہے اس سے حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ہی مراد ہے۔ ایسا نہیں

بلکہ صحیح اور درست یہ ہے کہ یہ ان کی بہن تھیں۔ یہ عبدالرحمٰن بن عوف کے نکاح میں تھیں۔ مسلم کی روایت کی رو سے انہیں مسلسل سات سال تک استحاضہ کا مرض لاحق رہا۔ ۴۴ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہا بعض نے کہا کہ جحش کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں عارضہ استحاضہ کا شکار تھیں۔ ایک ام المومنین زینب' دوسری حمنہ اور تیسری ام حبیبہ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس عارضہ سے محفوظ تھیں۔ کہتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں دس خواتین ایسی تھیں جو مستحاضہ کے عارضہ میں مبتلا رہتی تھیں۔

(۱۲۱) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنَّا لاَ نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ بَعْدَ الطُّهْرِ شَيْئاً. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم (ایام ماہواری کے اختتام پر) نہا دھو کر پاک و صاف ہونے کے بعد گدلے اور زرد رنگ کی چیز کو (اس چیز کے خارج ہونے کو) کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں (یعنی ایسے مادہ کے خروج کو حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔)

(بخاری' ابوداؤد۔ متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ الكدرة ﴾ میل کچیل سے آلودہ رنگت والا پانی۔ ﴿ والصفرة ﴾ زنگ والی رنگت۔ جس پر زردی غالب ہو۔ ﴿ بعد الطهر ﴾ ایام حیض سے پاک و صاف ہونے کے بعد۔ ﴿ شيئا ﴾ یعنی ہم اسے حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔ حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ حیض کے خون کے بعد جاری رہنے والے پانی کو جبکہ ایام ماہواری کی مدت پوری ہو جاتی تو ہم حیض شمار نہیں کرتے تھے۔

حاصل کلام: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زرد اور گدلے رنگ کے پانی کو حیض سمجھا اور شمار کیا جاتا تھا اور حدیث مذکور میں ہے کہ ہمارے نزدیک ایسے پانی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بظاہر ان احادیث میں اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ذرا سا غور کرنے سے یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے اگر مذکورہ بالا رنگت کا پانی دوران ایام حیض میں خارج ہو تو اسے حیض شمار کیا جائے اور مدت ایام کے بعد اس قسم کے پانی کی کوئی اہمیت نہیں۔ حدیث میں مذکور ﴿ بعد الطهر ﴾ کے الفاظ بھی اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں ایام ماہواری کے بعد حصول طہارت کے بعد رحم وغیرہ سے گدلے یا زرد رنگ کے پانی کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں اور نہ اسے شمار کرتی تھیں۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا۔ آپؐ کی اس پر خاموشی' تقریری حدیث کہلاتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ام عطیہ رضی اللہ عنہا ﴾ ان کا اسم گرامی نسیبہ تھا۔ کعب کی بیٹی تھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حارث کی بیٹی تھیں۔ یہ بزرگ ترین مرتبہ کی صحابیات میں سے تھیں۔ غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مریضوں کی تیمار داری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ غزوۂ احد میں بہادر مردوں کی طرح لڑیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے غسل کے وقت یہ موجود تھیں۔ انہوں نے بڑی صفائی سے ان کو

نہلایا۔ بصرہ کے ایام مقام میں ان سے علماء و تابعین کی کثیر تعداد نے احادیث اخذ کیں۔ ان کی اصل حدیث غسل میت کے بارے میں ہے اور ان کا شمار بصریوں میں ہوتا ہے۔

(۱۲۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ الْيَهُودَ كَانُوا إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ فِيهِمْ لَمْ يُؤَاكِلُوهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلاَّ النِّكَاحَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کے ہاں جب کسی عورت کو حیض آتا تو وہ اس عورت کے ساتھ کھانا پینا ترک کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(اے مسلمانو!) تم ہم بستری کے علاوہ ہر قسم کا فعل عورت کے ساتھ کر سکتے ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لم یواکلوھا﴾ یعنی اس (ایام ماہواری میں مبتلا) عورت کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے نہ تھے۔ ﴿الا النکاح﴾ نکاح یہاں جماع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: نبی آخر الزماں ﷺ کے ارشاد کی روشنی سے مسلمانوں کیلئے حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا' لیٹنا' کھانا اور پینا سب جائز ہے صرف تعلق زن و شو سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ یہ چھوت چھات کی بیماری ہنود و یہود کے ہاں ہے مسلمانوں کیلئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

(۱۲۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُنِي فَأَتَّزِرُ، فَيُبَاشِرُنِي وَأَنَا حَائِضٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھے تہبند مضبوطی سے باندھنے کا حکم فرماتے پھر میرے ساتھ چمٹ کر لیٹ جاتے حالانکہ میں اس وقت حالت حیض میں ہوتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاتزر﴾ باب افتعال سے صیغہ واحد متکلم ہے جس کے معنی ہیں میں ازار پہن لیتی۔ ﴿فیباشرنی﴾ میرے ساتھ اپنا جسم لگاتے اور یہ جماع کے علاوہ ہوتا تھا۔ یعنی مباشرت جماع کے معنی میں نہیں ہے۔

حاصل کلام: ﴿باشر یباشر مباشرۃ﴾ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جسم لگانا۔ یہ اس کے لغوی معنی ہیں مجازی طور پر اس سے جماع کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے منکرین حدیث کی کہ انہوں نے عوام کو احادیث نبویہؐ سے بدظن اور متنفر کرنے کیلئے اس کا معنی کیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضور ﷺ حالت حیض میں اپنی بیویوں سے مباشرت (جماع) کر لیتے تھے جب کہ قرآن مجید میں اس کی صریحاً ممانعت ہے۔ نتیجہ اس سے یہ برآمد کرتے ہیں کہ احادیث جھوٹی ہیں' یہ قابل اعتبار نہیں حالانکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ مباشرت کے معنی جسم کے ساتھ جسم لگانا ہے تو اس سے جماع کے معنی کرنا بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے۔ شریعت نے زیر ناف کے علاوہ عورت کے جسم سے لذت حاصل کرنا جائز قرار دیا ہے۔

(۱۲٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایسے آدمی کے بارے میں بیان کیا ہے جو

ﷺ، فِيْ الَّذِيْ يَأْتِي امْرَأَتَهُ وَهِيَ حَائِضٌ، قَالَ: «يَتَصَدَّقُ بِدِيْنَارٍ أَوْ بِنِصْفِ دِيْنَارٍ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ وَابْنُ القَطَّانِ، وَرَجَّحَ غَيرُهُمَا وَقْفَهُ.

اپنی بیوی کے پاس ایسی حالت میں جائے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو "وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ و خیرات کرے۔" (اس حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے۔ حاکم اور ابن قطان دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے اسے موقوف کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یاتی امراتہ ﴾ کا معنی ہے کہ اپنی بیوی سے جماع کرے اور جہاں تک دینار یا نصف دینار خیرات کرنے کا تعلق ہے تو ایک گروہ نے اسے جائز رکھا ہے جبکہ دوسروں نے حدیث میں اضطراب اور عدم صحت کی وجہ سے کفارے کا حکم نہیں دیا۔ پھر جو لوگ کفارہ کے قائل ہیں ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ دینار یا نصف بیان کرنا راوی کا تردد ہے اور ان میں سے کسی نے یہ تاویل کی ہے کہ یہاں نوعیت بتانا مقصود ہے کہ اگر حیض کا آغاز ہو تو ایسی حالت میں جماع کرنے والا ایک دینار صدقہ کرے اور دوسری کوئی نوعیت ہو تو نصف دینار خیرات کرے۔ ان میں سے کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں اختیار دیا گیا ہے خواہ دینار صدقہ کرے خواہ نصف دینار۔ بہرحال یہاں امر وجوب کیلئے نہیں ہے بلکہ مندوب و مستحب ہے۔ باعتبار دلیل یہی رائے قابل ترجیح ہے۔

(۱۲۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتِ المَرْأَةُ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "کیا عورت جب حالت حیض میں ہوتی ہے تو نماز اور روزہ چھوڑ نہیں دیتی؟" (بخاری، مسلم۔ یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الیس ﴾ اس میں ہمزہ انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جب نفی کا انکار ہو تو اثبات ثابت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوئے کہ شریعت میں تو ایسی عورت کیلئے ترک صلاۃ و صوم ثابت ہے (البتہ روزے دوسرے ایام میں قضا کرے گی۔ (دلائل سے یہ ثابت ہے) جبکہ نماز کی قضا نہیں۔ اس لئے اس کا قضا کرنا عورت کے بس میں نہیں ہے۔

(۱۲۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا جِئْنَا سَرِفَ حِضْتُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «افْعَلِي مَا يَفْعَلُ الحَاجُّ، غَيْرَ أَنْ لاَ تَطُوْفِي

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مقام سرف میں آئے تو مجھے ایام ماہواری شروع ہو گئے (میرے بتانے پر) نبی ﷺ نے فرمایا "مناسک حج تم بھی اسی طرح ادا کرو جس طرح دوسرے حاجی کرتے ہیں

بِالبَيْتِ حَتَّى تَطْهُرِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ.

البتہ طواف بیت اللہ ایام سے فارغ ہو کر نہا دھو کر کرنا۔" (بخاری و مسلم یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لما جئنا ﴾ جب ہم آئے۔ یہ دراصل حجۃ الوداع کے دوران سفر کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالت احرام میں تھیں۔ ﴿ سرف ﴾ سین پر فتحہ اور "راء" پر کسرہ۔ غیر منصرف ہے دو اسباب کی وجہ سے ایک علمیت یعنی جگہ کا نام اور دوسرے تانیث کی وجہ سے۔ مکہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ تقریباً دس میل کے فاصلہ پر۔ ﴿ حضت ﴾ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ مجھے ایام ماہواری شروع ہو گئے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے حائضہ عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ طواف کیلئے پاکیزگی شرط ہے۔ حالت حیض میں عورت چونکہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ ناپاک عورت تو مسجد میں داخل بھی نہیں ہو سکتی خانہ کعبہ تو افضل المساجد ہے۔ اس لئے طواف بدرجہ اولیٰ نہیں کر سکتی۔ بلکہ ایسی حالت میں تو وہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ اسی لئے مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا ہے۔

(۱۲۷) وَعَنْ مُعَاذِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، مَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ مِنَ امْرَأَتِهِ وَهِيَ حَائِضٌ؟ فَقَالَ: «مَا فَوْقَ الإِزَارِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ جب عورت ایام ماہواری میں ہو تو عورت کی اپنے شوہر کیلئے کیا کیا چیز حلال ہے؟ آپؐ نے فرمایا "پاجامہ یا تہ بند میں جسم کا جتنا حصہ ہے اسے چھوڑ کر باقی حصہ اس کیلئے حلال ہے۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الازار ﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو ازار سے مراد جماع و باہم ہم بستری یعنی شوہر کیلئے جماع کے علاوہ باقی سب کچھ کر گزرنا جائز ہے اور دوسرا معنی پاجامہ و تہ بند کی جگہ یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھوڑ کر باقی حصہ جسم سے مباشرت حلال ہے اور دوسرے معنی کی رو سے تو یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ۱۴۱ کے الفاظ ﴿ اصنعوا کل شئی الا النکاح ﴾ کہ جماع کے علاوہ ہر قسم کا کام اس سے کرو۔ کیونکہ سابقہ حدیث سے صرف جماع کی ممانعت ہے اور اس میں ناف سے گھٹنے تک کے سارے حصہ سے استمتاع کی ممانعت ہے مگر اولاً تو یہ روایت ضعیف ہے۔ ثانیاً اس سے مراد صرف جماع اور وطی ہے جس سے یہ پہلی روایت کے معارض نہیں رہتی۔

(۱۲۸) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَتِ النُّفَسَاءُ تَقْعُدُ على عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں عورتیں بچے کی ولادت کے بعد چالیس روز تک ناپاک بیٹھی رہتی تھیں۔ (نسائی

نِفَاسِهَا أَرْبَعِيْنَ يَوْماً. رَوَاهُ الخَمسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَاللَّفْظُ لِأَبِي دَاوُدَ.

کے علاوہ پانچوں نے اسے روایت کیا ہے اور متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔)

وَفِيْ لَفْظٍ لَهُ: وَلَمْ يَأْمُرْهَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَضَاءِ صَلاَةِ النِّفَاسِ. وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

اور اس کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایام نفاس میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا حکم نہیں دیا۔ (اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ نفساء ﴾ نون پر ضمہ' فا اور سین پر فتحہ۔ ان عورتوں کو کہتے ہیں جنہوں نے بچے کو جنم دیا ہو۔ نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورت کے رحم سے عموماً چالیس روز تک خارج ہوتا رہتا ہے۔ ﴿ اربعین یوما ﴾ چالیس روز نفاس کی کثیر مدت ہے۔ ابن ماجہ میں ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بایں الفاظ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حالت نفاس میں مبتلا عورتوں کیلئے مدت نفاس چالیس روز مقرر فرمائی' البتہ اگر وہ چالیس روز سے پہلے پاک ہو جائے تو (اس کی مدت یہی شمار ہوگی)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفاس والی خواتین کی اکثر مدت چالیس روز ہے۔ اس کی کم از کم مدت کوئی نہیں' ہاں اگر چالیس روز سے تجاوز کر جائے تو پھر وہ حالت استحاضہ شمار ہوگی۔ اس حالت میں نماز' روزہ ترک نہ کئے جائیں گے۔ تعلق زن و شو بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ البتہ نفاس کا حکم تو حیض کی طرح ہے۔ نفاس والی عورت' نماز روزہ ترک کر سکتی' مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ طواف کعبہ بھی نہیں کر سکتی۔ تلاوت قرآن اور قرآن کو چھونے سے اجتناب کرے گی۔ اس دوران جتنے روزے چھوٹ گئے تھے ان کی دوسرے ایام میں قضا ضرور دے گی۔ نماز کی قضا نہیں دے گی۔

٢ـ كِتَابُ الصَّلاَةِ

نماز کے احکام

١ - بَابُ المَوَاقِيتِ

اوقات نماز کا بیان

(١٢٩) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُولِهِ، مَا لَمْ يَحْضُرِ العَصْرُ، وَوَقْتُ العَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلاَةِ المَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلاَةِ العِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الأَوْسَطِ، وَوَقْتُ صَلاَةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور نماز عصر کے وقت کے آغاز تک رہتا ہے‘ اور عصر کا وقت جب آدمی کا اصل سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے (تب شروع ہوتا ہے) اور نماز عصر کا آخری وقت سورج کی رنگت زرد ہو جانے تک رہتا ہے اور نماز مغرب کا وقت (غروب آفتاب کے ساتھ ہی شروع ہوتا اور) شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ عشاء کی نماز کا وقت رات کے درمیانے نصف تک ہے اور نماز فجر کا وقت صبح صادق کے آغاز سے شروع ہو کر طلوع شمس تک رہتا ہے۔“ (مسلم)

وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ بُرَيْدَةَ فِي العَصْرِ: «وَالشَّمْسُ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ» وَمِنْ حَدِيْثِ أَبِي مُوسَى: «وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ».

اور اسی (یعنی مسلم) میں بریدہ رضی اللہ عنہ سے عصر کے بارے میں مروی ہے کہ ”سورج سفید اور بالکل صاف حالت میں ہو“ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”آفتاب بلند ہو۔“

لغوی تشریح: ﴿ کتاب الصلاة ﴾ صلاة کے لغوی معنی دعا کے ہیں اور اصطلاح شرع میں معروف

عبادت کو کہتے ہیں۔ ﴿ باب المواقیت ﴾ مواقیت' میقات کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ وقت محدود ہے جو کسی کام کیلئے مقرر کیا گیا ہو۔ بلحاظ زمانہ یا مکان۔ یہاں اس سے مراد نمازوں کی ادائیگی کیلئے اللہ تعالیٰ کا مقرر و متعین فرمایا ہوا وقت ہے۔ ﴿ اذا زالت الشمس ﴾ جب سورج زوال پزیر ہو۔ یعنی آسمان کے عین درمیان سے جب بجانب مغرب سورج ڈھل جائے۔ ﴿ وکان ظل الرجل کطوله ﴾ اور انسان کا سایہ اپنے قد کے برابر ہو۔ یعنی عصر کا وقت تب تک رہتا ہے جب تک کہ ہر چیز کا سایہ اصل چیز کے قد کے برابر ہو جائے۔ ﴿ مالم یحضر العصر ﴾ تاوقتیکہ نماز عصر کا وقت آجائے۔ یعنی آدمی کا (اصلی) سایہ اس کے قد کے برابر ہونا۔ ﴿ الشفق ﴾ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر جو سرخی نمودار ہوتی ہے۔ ﴿ الی نصف اللیل الاوسط ﴾ یہاں لفظ اوسط نصف کی صفت بن رہی ہے اور اس سے مراد رات کا پہلا حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو دو حصوں میں تقسیم کریں تو پہلا نصف حصہ اوسط کہلائے گا' اب پہلے نصف حصہ رات تک نماز عشاء کا وقت رہتا ہے۔ ﴿ نقیۃ ﴾ فعیلۃ کے وزن پر آیا ہے۔ صاف ستھرا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسا صاف و شفاف جس میں زرد رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ ﴿ مرتفعۃ ﴾ آسمان میں بلند و بالا ہو اور مغرب کی جانب مائل نہ ہو۔ حدیث بالا میں نماز کی ادائیگی کے اوقات بیان کئے گئے ہیں۔ نماز عشاء کا آخری وقت کون سا ہے؟ اس میں مختلف آراء ہیں۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ طلوع فجر تک ہے۔ اس حدیث میں جو بیان ہوا ہے اس سے مراد مختار وقت ہے اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ آدھی رات کو عشاء کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کا وقت ایک مثل تک ثابت ہوتا ہے اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے' ایک روایت کی رو سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی اسی طرح ہے لیکن ان کی طرف جو مشہور روایت منسوب ہے وہ دو مثل کی ہے۔ علمائے احناف نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ کسی صحیح مرفوع حدیث سے بھی دو مثل تک ظہر کا وقت ثابت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ نماز ظہر ایک مثل کے درمیان ہی میں ادا کر لی جائے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے دونوں شاگرد قاضی ابویوسف اور امام محمد کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ اس حدیث سے ایک مسئلہ شفق کا بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر سرخی نمودار ہوتی ہے اس کے معاً بعد جو سفیدی ظاہری ہوتی ہے شفق سے وہ سفیدی مراد ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب شمس کے ساتھ افق آسمان پر نمایاں ہوتی ہے۔ قرین قیاس بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

اس حدیث میں طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے یعنی جب سورج طلوع ہونے لگے تو نماز بند کر دینی چاہئے۔ اس لئے کہ اس وقت سورج شیطان کے دو سینگوں میں طلوع ہوتا ہے اور وہ آفتاب پرستوں کا مخصوص وقت ہے۔ اس لئے عین غروب شمس کے وقت نماز پڑھنی شروع

نہیں کرنی چاہئے۔ اس حدیث سے اوقات صلاۃ خمسہ بھی معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کیلئے اول اور آخر وقت یہی ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ دھوپ کے زردی مائل ہو جانے اور دو مثل سایہ کے بعد عصر کا وقت اور آدھی رات کے بعد عشاء کا وقت رہتا بھی ہے یا نہیں۔ اس حدیث سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ نہیں رہتا۔ البتہ کسی خاص مجبوری اور عذر کی حالت میں دھوپ کے زرد ہونے کے بعد عصر کا وقت اور نصف شب کے بعد عشاء کا وقت ہوتا ہے' بہرحال مختار وقت تو نہیں رہے گا۔ نیز بغیر عذر معقول کے سورج کے زرد ہونے کے بعد نماز پڑھنے والے کو حدیث میں منافق شمار کیا گیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ بریدہ ﵁ ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ اور بریدہ بن حصیب ﵁ نام ہے۔ بریدہ اور حصیب دونوں تصغیر ہیں۔ قبیلہ اسلم سے ہونے کی وجہ سے اسلمی کہلائے۔ جب نبی ﷺ ہجرت مدینہ کے دوران اس کے پاس سے گزرے تو اس موقع پر جو اسی آدمی مسلمان ہوئے ان میں یہ بھی شامل تھے۔ غزوۂ احد کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ بیعت رضوان میں حاضر تھے۔ بصرہ کی طرف چلے گئے تھے پھر وہاں سے خراسان کی جانب جہاد کیلئے نکل گئے اور مرو میں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

﴿ ابو موسی اشعری ﵁ ﴾ اس سے مراد عبداللہ بن قیس اشعری ﵁ ہیں۔ جلیل القدر صحابہ ؓ میں ان کا شمار ہے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبید اور عدن پر عامل مقرر ہوئے۔ حضرت عمر ﵁ کے دور خلافت میں یہ کوفہ اور بصرہ کے والی مقرر ہوئے۔ ان کے ہاتھوں تستر فتح ہوا اور دیگر بہت سے شہر بھی انہوں نے فتح کئے۔ ۴۲ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۰) وَعَنْ أَبِيْ بَرْزَةَ الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي العَصْرَ، ثُمَّ يَرْجِعُ أَحَدُنَا إِلَى رَحْلِهِ فِي أَقْصَى المَدِيْنَةِ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ، وَكَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخِّرَ مِنَ العِشَآءِ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالحَدِيْثَ بَعْدَهَا، وَكَانَ يَنْفَتِلُ مِنْ صَلَاةِ الغَدَاةِ حِيْنَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيْسَهُ، وَكَانَ يَقْرَأُ بِالسِّتِّيْنَ إِلَى المَائَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبرزہ اسلمی ﵁ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر (ایسے وقت) میں پڑھتے کہ ہم میں سے کوئی ایک مدینہ کی آخری حدود تک چلا جاتا پھر آفتاب زندہ (روشن' صاف) ہوتا اور آپ ؐ نماز عشاء کو تاخیر سے پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ نماز عشاء سے پہلے سونے اور بعد از نماز عشاء (غیر ضروری) باتیں کرنے کو ناپسند اور مکروہ خیال فرماتے اور نماز فجر سے ایسے وقت فارغ ہوتے جب نمازی اپنے ساتھ والے شخص کو پہچان لیتا (عموماً) ساٹھ سے سو آیات کی تعداد تک تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

وَعِنْدَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ: «وَالعِشَآءُ أَحْيَاناً يُقَدِّمُهَا، وَأَحْيَاناً يُؤَخِّرُهَا، إِذَا رَآهُمُ اجْتَمَعُوا عَجَّلَ وَإِذَا رَآهُمْ أَبْطَؤُوا أَخَّرَ، وَالصُّبْحُ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْهَا بِغَلَسٍ.

اور جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے' کہ آپؐ نماز عشاء کبھی جلدی پڑھ لیتے اور کبھی تاخیر سے۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ آپؐ دیکھتے کہ نمازی جمع ہو چکے ہیں تو جلد پڑھا دیتے اور اگر دیکھتے کہ نمازی دیر سے آتے ہیں تو تاخیر کرتے (البتہ صبح کی نماز آپؐ اندھیرے ہی میں پڑھتے) (بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي مُوْسَى: «فَأَقَامَ الفَجْرَ حِيْنَ انْشَقَّ الفَجْرُ، وَالنَّاسُ لاَ يَكَادُ يَعْرِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً».

مسلم میں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صبح کی نماز صبح صادق طلوع ہوتے ہی شروع فرما دیتے یہاں تک کہ اندھیرے کی وجہ سے صحابہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے۔

لغوی تشریح : ﴿ رحلہ ﴾ "راء" پر فتحہ "حاء" ساکن' جائے سکونت۔ ﴿ فی اقصی المدینہ ﴾ گرائمر کے اعتبار سے یہ رحل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ مدینہ کی انتہائی اور دور ترین جگہ۔ ﴿ والشمس حیۃ ﴾ اس میں "واؤ" ﴿ یرجع ﴾ کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ معنی یہ ہیں' نماز سے فراغت کے بعد جانے والا آدمی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اپنی جائے رہائش پر پہنچ جاتا (یعنی عصر کی نماز اتنی جلدی ادا کی جاتی تھی) اور سورج کے زندہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی سورج کی سفیدی باقی ہوتی تھی۔ اور ﴿ من العشاء ﴾ میں من تبعیضیہ ہے مطلب یہ ہے عشاء میں تھوڑی بہت تاخیر آپؐ کو پسند تھی۔ ﴿ ینفتل ﴾ ینصرف کے معنی' میں فارغ ہوتے' پھرتے ﴿ الغداۃ ﴾ فجر' صبح ﴿ بالستین ﴾ ساٹھ آیات سے۔ ﴿ الی المائۃ ﴾ سو تک۔ یعنی آیات اگر لمبی ہوتیں تو ساٹھ تک تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر میں ساٹھ آیات تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر ایسے وقت میں پڑھتے کہ ایک ساتھی بھی دوسرے ساتھی کو (اچھی طرح) پہچان نہ سکتا تھا۔ اتنی طویل قرأت اس بات کی دلیل ہے کہ نماز فجر اول وقت میں پڑھتے تھے ﴿ الغلس ﴾ اول وقت ہوتی ہے اسے غلس کہتے ہیں۔ ﴿ انشق ﴾ پھٹنا' تاریکی شب سے سپیدۂ صبح کا ظہور ہونا۔

حاصل کلام : اس حدیث میں لفظ "غلس" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھتے تھے اور صبح کی نماز میں آپؐ ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرمایا کرتے تھے اور وہ بھی ترتیل سے ٹھہر ٹھہر کر۔ اس سے بھی اندازہ کر لیجئے کہ آپؐ نماز کا آغاز کس وقت میں کرتے ہوں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھنی چاہئے مگر صبح صادق کا اچھی طرح نمایاں ہونا ضروری ہے' اس لئے کہ اس سے پہلے تو نماز کا وقت ہی نہیں ہوتا۔

راوی حدیث : ﴿ ابوبرزہ اسلمی رضی اللہ عنہ ﴾ ابو برزہ ان کی کنیت ہے۔ نفلہ بن عبید نام ہے۔ قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ فتح مکہ اور بعد والے غزوات میں شریک رہے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی پھر بعد میں خراسان میں چلے گئے اور ایک قول کے مطابق مرو میں ۶۰ھ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا سن وفات ۶۴ھ ہے۔

(۱۳۱) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي المَغْرِبَ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَيَنْصَرِفُ أَحَدُنَا وَإِنَّهُ لَيُبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نماز مغرب نبی کریم ﷺ کے ساتھ پڑھتے پھر ہم میں سے کوئی نماز سے فارغ ہو کر واپس ہوتا (تو اتنی روشنی ابھی باقی ہوتی تھی) کہ تیر کے گرنے کی جگہ دیکھ لیتا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ مواقع نبلہ ﴾ موقع کی جمع۔ تیروں کے گرنے کی جگہیں۔ ﴿ والنبل ﴾ نون پر فتحہ اور "با" ساکن۔ ان لفظوں میں اس کا واحد استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے معنی ہیں تیر۔

حاصل کلام : نماز مغرب میں زیادہ تاخیر جائز نہیں۔ اس کے ادا کرنے میں جلدی ہی بہتر ہے جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

راوی حدیث : ﴿ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ کم عمری و صغر سنی کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ غزوۂ احد اور بعد کے غزوات میں برابر شریک رہے۔ ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں ۸۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۱۳۲) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ بِالعِشَآءِ، حَتَّى ذَهَبَتْ عَامَّةُ اللَّيْلِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّى، وَقَالَ: «إِنَّهُ لَوَقْتُهَا، لَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي»، رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شب نماز عشاء اتنی تاخیر سے پڑھی کی رات کا اول حصہ زیادہ تر گزر گیا تھا۔ آپؐ نماز کیلئے تشریف لائے اور نماز پڑھی اور فرمایا کہ اگر میری امت پر (یہ وقت) گراں نہ ہوتا تو میں نماز عشاء کا یہی وقت مقرر کرتا۔" (مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ اعتم ﴾ تاخیر کی' دیر کی اعتام سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ ﴿ عتمہ ﴾ میں داخل ہوئے۔ عتمہ ' شفق کے غائب ہونے کے بعد' یا مطلق تاریکی کے غائب ہونے کے بعد رات کے تیسرے حصے کے گزر جانے کو کہتے ہیں اور ایک قول کے مطابق یہ ﴿ العتم ﴾ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی تاخیر اور دیر کے ہیں۔ ﴿ عامۃ اللیل ﴾ رات کا اکثر حصہ۔ ﴿ انہ لوقتھا ﴾ اس سے مختار وقت بھی مراد ہو سکتا ہے اور افضل وقت بھی۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نماز عشاء تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔ تاخیر سے

ادائیگی کی صورت میں افضلیت کا ثواب صرف اسی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی نماز کے ساتھ نہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس نماز کیلئے کبھی نمازیوں کی آمد کا انتظار بھی کر لیا کرتے تھے اگر دیر سے جمع ہوتے تو نماز میں بھی تاخیر فرما لیتے اور اگر نمازی جلد جمع ہو جاتے تو جلدی جماعت کرا دیتے۔ تو گویا آنحضور ﷺ اپنی امت کا خیال رکھتے جو چیز افراد امت کیلئے مشقت اور دشواری کا باعث ہوتی اسے آسان اور سہل بنانے کی کوشش فرماتے۔

(۱۳۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا اشْتَدَّ الحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ، فَإِنَّ شِدَّةَ الحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب گرمی کی شدت ہو تو اس وقت (ٹھنڈے وقت میں) نماز پڑھو (یعنی ذرا انتظار کر لو کہ وقت ذرا ٹھنڈا ہو جائے) کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس کی لپیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فابردوا ﴾ ابراد سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھنڈے وقت میں داخل ہو جاؤ۔ ﴿ بالصلاۃ ﴾ سے مراد نماز ظہر ہے یعنی نماز ظہر کو ٹھنڈے اور سرد وقت میں ادا کرو۔ ﴿ من فیح جھنم ﴾ فیح کی "فا" پر فتحہ اور "یا" ساکن ہے۔ جہنم کی گرمی و حرارت کی لپیٹ اور اس کے پھیلاؤ کی وسعت اور جہنم کے سانس کو بھی فیح کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی چاہئے۔ مگر اس تاخیر کی حد کیا ہونی چاہئے' اس بارے میں ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ موسم گرما میں اتنی تاخیر کرتے کہ سایہ تین قدم سے لے کر پانچ قدم تک ہو جاتا۔ مگر علامہ خطابی نے کہا کہ یہ بھی تمام ممالک کیلئے قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ طول بلد و عرض بلد کے اعتبار سے اس کا حساب بھی مختلف ہوگا۔ بہرحال موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی مستحب ہے یہی جمہور اہل علم کی رائے ہے۔

(۱۳٤) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَصْبِحُوا بِالصُّبْحِ، فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِأُجُورِكُمْ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز فجر صبح کے خوب واضح ہونے پر پڑھا کرو۔ یہ تمہارے اجر میں اضافہ کا موجب ہوگی۔" (اس کو پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اصبحوا بالصبح ﴾ اور ایک دوسری روایت میں ﴿ اصبحوا بالصبح ﴾ کے بجائے ﴿ اسفروا بالفجر ﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ نماز فجر

اس وقت پڑھو جب صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ مگر اس معنی کے اعتبار سے یہ حدیث غلس والی حدیث کے معارض ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ نماز کا آغاز تاریکی اور اندھیرے میں کیا جائے اور قرأت لمبی کی جائے کہ صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے "اسفار" کا مفہوم یہ بتلایا ہے کہ فجر واضح ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔

حاصل کلام: احناف نے اسی حدیث کی روشنی میں اسفار کو افضل قرار دیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی عمل، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے عمل کی بناء پر یہ استدلال وزنی نہیں رہتا۔ ابوداؤد میں حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بار نماز فجر غلس (تاریکی) میں پڑھی اور ایک بار اسفار میں بھی پڑھی۔ بعد ازاں وفات تک ہمیشہ غلس ہی میں پڑھتے رہے۔ حدیث کا مطلب صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صبح واضح اور صاف طور پر معلوم ہونے لگے۔ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا ہے۔

(١٣٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ، وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "طلوع آفتاب سے پہلے جس نے نماز فجر کی ایک رکعت پالی اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے غروب آفتاب سے قبل نماز عصر کی ایک رکعت پالی اس نے عصر کی نماز پالی۔"

(بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوُهُ، وَقَالَ: «سَجْدَةً» بَدَلَ «رَكْعَةً» ثُمَّ قَالَ: وَالسَّجْدَةُ إِنَّمَا هِيَ الرَّكْعَةُ.

مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بھی اسی طرح بیان ہے مگر اس میں رکعۃ کی جگہ (سجدۃ) کا لفظ ہے پھر کہا کہ (سجدۃ) سے مراد تو رکعت ہی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا صلاۃ ﴾ یعنی کوئی نماز۔ اس سے نفل نماز مراد ہے۔ ﴿ بعد الصبح ﴾ یعنی نماز فجر کے بعد کوئی نفلی نماز جائز نہیں۔ ﴿ من ادرک رکعۃ ﴾ جس نے ایک رکعت پالی۔ یعنی مکمل ایک رکعت، قیام، قراءۃ فاتحہ اور رکوع و سجود پالئے۔ ﴿ قبل ان تطلع الشمس ﴾ یعنی آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے ﴿ فقد ادرک الصبح ﴾ تو اس نے صبح پالی۔ یعنی اس کی نماز ادا ہوگئی۔ (قضاء نہیں ہوئی)

حاصل کلام: عین طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز کا آغاز ممنوع ہے لیکن اگر کسی نے نماز پہلے شروع کرلی پھر طلوع یا غروب آفتاب کا موقع آگیا تو نمازی کو چاہیئے کہ دوسری رکعت پوری کرلے

اس کی نماز ہو جائے گی۔

(١٣٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: «لاَ صَلاَةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَلاَ صَلاَةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغِيبَ الشَّمْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَفْظُ مُسْلِمٍ: «لاَ صَلاَةَ بَعْدَ صَلاةِ الْفَجْرِ».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ "صبح کی نماز ادا کر لینے کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی نماز (جائز) نہیں اور اسی طرح نماز عصر ادا کر چکنے کے بعد غروب آفتاب تک کوئی دوسری نماز (جائز) نہیں۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کے الفاظ ہیں کوئی نماز' نماز فجر کے بعد نہیں۔

وَلَهُ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ: ثَلاَثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنْهَانَا أَنْ نُصَلِّيَ فِيْهِنَّ وَأَنْ نَقْبُرَ فِيْهِنَّ مَوْتَانَا: حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حَتَّى تَرْتَفِعَ، وَحِيْنَ يَقُوْمُ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ حَتَّى تَزُوْلَ الشَّمْسُ، وَحِيْنَ تَتَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوبِ.

اور مسلم میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنے اور میت کی تدفین سے رسول اللہ ﷺ ہمیں منع فرمایا کرتے تھے۔ اول یہ کہ جب آفتاب طلوع ہو رہا ہو تاآنکہ وہ بلند ہو جائے۔ دوم جب سورج نصف آسمان پر ہو تاوقتیکہ وہ ڈھل نہ جائے اور سوم جس وقت سورج غروب ہونا شروع ہو۔

وَالْحُكْمُ الثَّانِيْ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ وَزَادَ: «إِلاَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ» وَكَذَا لِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ نَحْوُهُ.

دوسرا حکم (یعنی نصف النہار کے وقت نماز کی ادائیگی ممنوع ہونا) امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف سند سے روایت کیا ہے' مگر اس میں (الا یوم الجمعة) کے الفاظ زیادہ ہیں۔ (یعنی نصف النہار کے وقت نماز نہ پڑھو مگر جمعہ کے روز پڑھ سکتے ہو) اور ابوداؤد نے بھی حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مانند روایت نقل کی ہے (جس میں جمعہ کے دن کا استثناء ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاصلاة ﴾ یعنی نفلی نماز نہیں ﴿ بعد الصبح ﴾ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اور اس سے صبح کی سنتوں کے علاوہ نماز مراد ہے کیونکہ ان دونوں کی قضا جائز ہے یہ نہی مطلق نفل نماز کی ہے۔ ﴿ نقبر ﴾ "با" پر ضمہ اور کسرہ۔ دونوں درست ہیں۔ معنی ہیں کہ ہم تدفین عمل میں لائیں ﴿ موتانا ﴾ موتی میت کی جمع ہے۔ اپنے مرنے والوں کو۔۔ ﴿ بازغة ﴾ چمکتے ہوئے۔ روشن ﴿ الظهيرة ﴾ نصف

النہار یعنی آدھے دن کا وقت۔ جب سورج چند ساعت کیلئے سیدھا قائم ہوتا۔ اس وقت ہر چیز کا سایہ بالکل اس چیز کی سیدھ میں ہوتا ہے۔ ادھر' ادھر' مشرق اور مغرب کی جانب جھکا ہوا نہیں ہوتا۔ ﴿ تزول ﴾ آسمان کے وسط (درمیان) سے دوسری جانب مائل ہونا۔ ﴿ تتضیف ﴾ بھی مائل کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿ والحکم الثانی ﴾ سے مراد عین نصف النہار کا وقت ہے کیونکہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ حکم دوسرے نمبر پر آیا ہے۔ ﴿ وکذا لابی داود ﴾ ابوداؤد میں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ہے کہ بروز جمعہ نصف النہار کے وقت نماز کی اجازت ہے۔ جس طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ممنوع اوقات میں جو کام ممنوع ہیں ان کا ذکر ہے۔ ان میں پہلا یہ کہ ہم میت کو ان تین اوقات میں دفن نہ کریں۔ یہاں تدفین سے مراد نماز جنازہ بھی ہے کہ اس ممنوع وقت میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ میت کو دفن کیا جائے۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ اور دوسرا حکم یہ کہ دوپہر کا وقت ہے۔ جب سورج عین وسط آسمان پر قائم ہو' مغرب کی جانب زوال پذیر نہ ہوا ہو تو ایسے وقت میں بھی نماز پڑھنا یا نماز جنازہ پڑھنا اور میت کو دفن کرنا ممنوع ہے۔ لیکن جمعہ کا دن ایسا ہے کہ جس میں زوال کے وقت نوافل ادا کئے جاسکتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ جمعہ کے روز زوال کے وقت نماز جمعہ بھی ادا کی جاسکتی ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جمعہ کے دن کا استثناء صراحت کے ساتھ منقول ہے اور تیسرا حکم یہ ہے کہ غروب آفتاب کے وقت بھی نماز جنازہ یا میت کو دفن کرنا ممنوع ہے اور حدیث میں جو طلوع آفتاب کے بعد "ترتفع" کا ذکر ہے کہ وہ بلند ہو جائے تو' اس بلندی سے کیا مراد ہے؟ ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کی روایت میں اس اونچائی کا اندازہ ایک نیزہ یا دو نیزہ مذکور ہے جب سورج مشرق کے افق پر ایک نیزہ یا دو نیزہ برابر اونچا ہو جائے تو پھر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عقبہ بن عامر جھنی رضی اللہ عنہ ﴾ عین پر ضمہ اور "قاف" ساکن۔ ان کی کنیت ابوحماد یا ابوعامر ہے۔ قدیم الہجرت تھے۔ صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ کتاب اللہ کے قاری اور علم میراث اور فقہ کے مشہور عالم تھے۔ فقیہہ ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ معرکہ صفین میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ تین سال مصر کے والی رہے۔ نیز غزوۃ البحر کے امیر رہے۔ مصر میں ۵۸ھ میں وفات پائی۔ اور مقطم میں دفن ہوئے۔

(۱۳۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ لاَ تَمْنَعُوا أَحَداً طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ، وَصَلَّى أَيَّةَ سَاعَةٍ شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے عبد مناف کی اولاد! بیت اللہ کا طواف کرنے والے کسی کو مت منع کرو (کہ وہ طواف نہ کرے) اور نہ کسی نماز پڑھنے والے کو (نماز پڑھنے سے منع کرو) خواہ وہ شب و روز کی

نَهَارٍ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ. کسی گھڑی میں یہ کام کرے۔" (اسے پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یا بنی عبد مناف ﴾ عبد مناف کی اولاد کو مخاطب اس لئے کیا ہے کہ یہ اس وقت کعبہ کے متولی تھے۔ ﴿ وصلی ایة ساعة شاء ...... الخ ﴾ یہ الفاظ ممنوعہ تین اوقات میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت پر دلالت کرتے ہیں۔ جن احادیث میں ممانعت ہے یہ حدیث اس عام حکم کو بیت اللہ کی وجہ سے خاص قرار دیتی ہے کہ بیت اللہ میں یہ ممانعت نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مذکورہ کونسی نماز ہے جسے ادا کرنے کی اجازت حکماً دی جا رہی ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد طواف کعبہ کے بعد پڑھے جانے والے نوافل ہیں۔ عام نوافل اس سے مراد نہیں مگر ابوداؤد میں مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عام نوافل مراد ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔ جن تین اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے جمہور علماء اسے خانہ کعبہ میں پڑھے جانے والے نوافل پر منطبق نہیں کرتے۔ وہ اس حدیث سے ان اوقات میں بھی بیت اللہ شریف میں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو امیہ تھی۔ جبیر تصغیر ہے جابر سے۔ پورا نام جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل قرشی تھا۔ بڑے حلیم الطبع اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ خاندان قریش کے نسب نامے کو جانتے تھے۔ فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ۵۴ھ' ۵۷ھ یا ۵۹ھ کو فوت ہوئے۔

﴿ عبد مناف ﴾ مناف کا غلام۔ مناف مشہور بت تھا۔ والدہ نے اس کا خادم بنا دیا تھا اس وجہ سے عبد مناف کہلائے۔ ورنہ ان کا نام تو مغیرہ تھا' کنیت ابوعبد شمس تھی۔ بنو مخزوم اور بنو عبد مناف دونوں سے تعلق تھا۔ یاد رہے یہ عبد مناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ قریش کے ذی وقار سردار شمار ہوتے تھے۔

(۱۳۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الشَّفَقُ الحُمْرَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَغَيْرُهُ وَقْفَهُ. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "شفق سے مراد سرخی ہے۔" (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ وغیرہ نے کہا ہے صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الشفق الحمرة ﴾ شفق سے مراد سرخی ہے (جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق آسمان پر نمودار ہوتی ہے) بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں ہے کہ لغوی بحث کیلئے اہل لغت کی طرف رجوع کیا جائے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اہل لغت میں سے ہیں۔ ان کی بات دلیل و حجت ہے خواہ موقوف ہی

کیوں نہ ہو۔ لغت کی مشہور کتاب "القاموس" میں شفق کا معنی وہ سرخی ہے جو غروب آفتاب سے لے کر عشاء تک یا اس کے قریب تک آسمان پر نمودار رہتی ہے۔

حاصل کلام: شفق سے وہ سرخی مراد ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ اس تعریف پر تمام آئمہ اور اہل لغت متفق ہیں مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تنہا اس کے خلاف شفق سے وہ سفیدی مراد لیتے ہیں جو سرخی کے غائب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دو شاگردان رشیدان نے بھی سرخی ہی مراد لی ہے۔ موجودہ احناف کا فتویٰ بھی غالباً صاحبین کے قول پر ہے۔

(١٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:

«الفَجْرُ فَجْرَانِ، فَجْرٌ يُحَرِّمُ الطَّعَامَ وَتَحِلُّ فِيهِ الصَّلاَةُ، وَفَجْرٌ تَحْرُمُ فِيهِ الصَّلاَةُ، أَيْ صَلاَةُ الصُّبْحِ، **وَيَحِلُّ فِيهِ الطَّعَامُ»**. رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ، وَلِلْحَاكِمِ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ نَحْوُهُ، وَزَادَ فِي الَّذِي يُحَرِّمُ الطَّعَامَ: إِنَّه يَذْهَبُ مُسْتَطِيلاً فِي الأُفُقِ. وَفِي الآخَرِ: «إِنَّهُ كَذَنَبِ السِّرْحَانِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فجر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ فجر جس میں کھانا حرام ہے اور نماز ادا کرنا جائز و حلال اور ایک وہ فجر ہے جس میں نماز پڑھنا حرام ہے اور کھانا جائز و حلال۔" (اسے ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے) اور مستدرک حاکم میں جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اس میں اتنا اضافہ ہے کہ "جس صبح میں کھانا حرام ہے وہ آسمان کے کناروں اور اطراف میں پھیل جاتی ہے اور دوسری بھیڑیئے کی دم کی طرح اونچی چلی جاتی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ يحرم الطعام ﴾ کھانا حرام کرتی ہے روزے دار کیلئے ﴿ وتحل فيه الصلوة ﴾ اور اس میں نماز جائز و حلال ہے یعنی نماز فجر۔ اس سے مراد صبح صادق ہے۔ ﴿ زاد ﴾ یعنی حاکم نے یہ بات زائد ذکر کی ہے۔ ﴿ فی الذی ﴾ اس فجر میں جس میں کھانا حرام ہو جاتا ہے (اس کی نشانی اور علامت یہ ہے) کہ وہ آسمان پر پھیل جاتی ہے یعنی مشرقی کنارے پر اور "افق" آسمان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو زمین کے ساتھ ملتا ہوا محسوس و معلوم ہوتا ہے اور بخاری کی ایک روایت میں تو اس طرح بھی منقول ہے کہ آپؐ نے اپنے دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر سمجھایا۔ ﴿ وفی الاخر ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس سے وہ فجر مراد ہے جس میں صبح کی نماز ادا کرنا حرام ہے اور روزے دار کیلئے کھانا حلال ہے۔ یہ وہی صبح ہے جسے صبح کاذب کہا جاتا ہے۔ ﴿ كذنب السرحان ﴾ کاف برائے تشبیہ اور ذنب میں ذال اور نون پر فتحہ۔ معنی بھیڑیئے کی دم۔ ﴿ والسرحان ﴾ سین پر کسرہ اور "راء" ساکن۔ بھیڑیے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ فجر جب نمودار ہوتی ہے تو یہ ستون کی طرح بالکل سیدھی آسمان میں اوپر چڑھتی معلوم ہوتی

ہے۔ اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی۔ صبح صادق اور صبح کاذب۔ دونوں کے مابین کچھ وقفہ اور فاصلہ ہوتا ہے۔

(١٤٠) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الأَعْمَالِ الصَّلاَةُ فِي أَوَّلِ وَقْتِهَا». رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ، وَأَصْلُه فِي الصَّحِيحَيْنِ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اول وقت نماز پڑھنا سب اعمال سے افضل ہے۔" (اسے ترمذی اور حاکم نے روایت کیاہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز کو اول وقت پر پڑھنا تمام اعمال سے افضل بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری احادیث میں ایمان' صدقہ اور جہاد کو افضل اعمال بتایا گیا ہے۔ ساری احادیث اپنے اپنے مفہوم میں صحیح ہیں' ان میں موافقت اور تطابق اس طرح ہوگا۔ ایمان کا تعلق قلب و ضمیر سے ہے لہٰذا ایمان قلبی اعمال میں سب سے افضل ہے اور نماز کا تعلق بدنی عبادت سے ہے' یہ بدنی اعمال میں سب سے افضل ہے اور صدقہ کا تعلق مالیات سے ہے' مالی اعمال میں سب سے افضل صدقہ ہے اور جہاد جوانی و توانائی' صحت کا سب سے بہترین اور افضل عمل ہے۔ اس طرح ان میں باہمی منافات نہیں رہتی۔ یہ حدیث عام ہے مگر اس سے عشاء کی نماز خارج ہے کہ اسے تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔

(١٤١) وَعَنْ أَبِي مَحْذُورَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَوَّلُ الوَقْتِ رِضْوَانُ اللهِ، وَأَوْسَطُهُ رَحْمَةُ اللهِ، وَآخِرُهُ عَفْوُ اللهِ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ جِدًّا وَلِلتِّرمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوُهُ دُونَ الأَوْسَطِ وَهُوَ ضَعِيفٌ أَيْضاً.

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اول وقت میں (نماز پڑھنا) رضاء الٰہی کا موجب ہے اور درمیانی وقت میں (ادائیگی نماز) رحمت الٰہی کا سبب ہے اور اس کو آخر وقت میں ادا کرنا اللہ تعالیٰ سے معافی کا موجب ہے۔" (دار قطنی نے اسے نہایت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی طرح ہے لیکن اس میں لفظ وسط مذکور نہیں اور وہ ضعیف بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ دون الاوسط ﴾ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں درمیانی وقت کا ذکر نہیں۔ اس میں تو صرف اول اور آخر کا ذکر ہے۔ یہ دونوں احادیث انتہائی ضعیف ہیں۔ ان پر اعتماد مناسب نہیں۔ جہاں تک دار قطنی کی روایت کا تعلق ہے تو وہ روایت یعقوب بن ولید کے واسطہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ان کے بارے میں قول ہے کہ بڑے بڑے دروغ گو لوگوں میں سے ہے اور ابن معین نے بھی اسے جھوٹا اور کذاب قرار دیا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے تو اسے نظرانداز ہی کر دیا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیث

وضع کیا کرتا تھا اور اس کی سند میں ابراہیم بن زکریا بجلی بھی موجود ہے' جسے متہم قرار دیا گیا ہے۔ رہی ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت تو اس میں بھی یعقوب بن ولید موجود ہے۔ محدثین ناقدین کی نقد و جرح کے بعد حدیث قابل اعتنا ہی نہیں رہتی۔

راوی حدیث: ﴿ابومحذورہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام سمرہ یا اوس تھا۔ مؤذن رسول تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ مکہ میں قیام پذیر ہوگئے۔ نماز پنج گانہ کی اذان دیتے تھے۔ ۵۹ھ میں وفات پائی۔

(١٤٢) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ صَلاَةَ بَعْدَ الفَجْرِ إِلاَّ سَجْدَتَيْنِ». أَخرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "فجر کی (فرض نماز) کے بعد صرف دو سنتوں کے علاوہ اور کوئی (نفل) نماز نہیں۔" (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے)

وَفِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ: «لاَ صَلاَةَ بَعْدَ طُلُوعِ الفَجْرِ إِلاَّ رَكْعَتَيِ الفَجْرِ» وَمِثْلُهُ لِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنِ ابْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ.

اور عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ "طلوع فجر کے بعد صرف فجر کی دو رکعات ہیں اور دارقطنی میں ابن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿لا صلوۃ بعد الفجر﴾ بعد الفجر سے مراد طلوع فجر ہے۔ ﴿الا سجدتین﴾ یہاں سجدتین کا معنی رکعتیں ہے (دو رکعتیں) اور ایک نسخہ میں رکعتین ہے سجدتین کی جگہ۔ ان دو رکعتوں سے فجر کی دو سنتیں مراد ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی بناء پر طلوع فجر کے بعد صبح کی دو سنتوں کے علاوہ نوافل پڑھنا ممنوع و مکروہ ہے۔

(١٤٣) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ العَصْرَ، ثُمَّ دَخَلَ بَيْتِي، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ: شُغِلْتُ عَنْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الظُّهرِ فَصَلَّيْتُهُمَا الآنَ. قُلْتُ: أَفَنَقْضِيهِمَا إِذَا فَاتَتَا قَالَ: «لاَ». أَخرَجَهُ أَحْمَدُ، وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا بِمَعْنَاهُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر پڑھ کر میرے حجرے میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ میں نے عرض کیا یہ دو رکعت کیسی ہیں؟ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا "ظہر کے فرائض کے بعد کی دو سنتیں پڑھ نہیں سکا تھا وہ اب میں نے پڑھی ہیں"۔ میں نے پھر عرض کیا کہ اگر یہ دو سنتیں قضا ہو جائیں تو کیا ہم بھی ان کی قضاء دیا کریں۔ فرمایا "نہیں۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی

طرح کی روایت ہے)

لغوی تشریح: ﴿شغلت﴾ صیغہ مجہول۔ اس کا معنی ہے کہ مجھے روک دیا گیا۔ اس طرف سے توجہ پھیر دی گئی۔ مانع یہ تھا کہ قبیلہ عبدالقیس کے کچھ لوگوں کی آمد نیز صدقہ کا مال بھی پہنچ گیا تھا۔ تقسیم مال اور ان سے گفتگو کرتے رہنے کی وجہ سے ظہر کی دو سنتیں رہ گئی تھیں وہ میں نے ابھی پڑھی ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ہم بھی چھوٹ جانے کی صورت میں اس وقت قضا کریں؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ "تم اس وقت انہیں قضا ہونے کی صورت میں ادا نہ کرو"۔ علامہ الیمانی نے کہا ہے کہ اس سے ثابت ہوا نماز عصر کے بعد ان سنتوں کی قضا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کسی بھی دوسرے کیلئے یہ جائز نہیں ہے اور ایک دن کے عمل کے بعد ہمیشہ انہیں نماز عصر کے بعد ادا کرتے رہنا اس بنا پر تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب ایک عمل ایک مرتبہ کر لیا تو اسے ہمیشہ انجام دیتے تھے۔ تو گویا یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے بعد ظہر کی چھوٹی ہوئی سنتوں کی قضا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ اور امتیاز تھا جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ اور علامہ الیمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر امام بیہقی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس روایت کا آخری حصہ "افنقضیهما اذا فاتتا لم قال لا" کہ کیا جب رہ جائیں تو ہم ان کی قضاء دیں؟ تو آپ نے فرمایا "نہیں" ضعیف اور غیر محفوظ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عصر کے بعد قضاء نماز فرض ہو یا سنت ادا ہو سکتی ہے۔ جس کی تفصیل "اعلام اهل العصر" میں شارح ابوداؤد شیخ شمس الحق محدث ڈیانوی نے خوب بیان کی ہے۔

٢ - بَابُ الأَذَانِ

اذان کا بیان

(١٤٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ رَبِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ بِي - وَأَنَا نَائِمٌ - رَجُلٌ، فَقَالَ: تَقُولُ «اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ» فَذَكَرَ الأَذَانَ بِتَرْبِيعِ التَّكْبِيرِ بِغَيْرِ تَرْجِيعٍ، وَالإِقَامَةَ فُرَادَى، إِلاَّ «قَدْ قَامَتِ الصَّلاَةُ» قَالَ: فَلَمَّا أَصْبَحْتُ أَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، فقال: «إِنَّهَا لَرُؤْيَا حق»، الحديث. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خواب میں مجھے ایک آدمی ملا جس نے مجھے کہا کہ کہو اللہ اکبر، اللہ اکبر پھر اس نے ساری اذان کہی، چار مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ بغیر ترجیع کے اور اقامت میں صرف ایک ایک مرتبہ کہا، مگر (قد قامت الصلاۃ) کو دو مرتبہ کہا۔ صبح جب بیدار ہوا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا (اور اپنا خواب آپ کو سنایا) آپ نے فرمایا "یقیناً یہ خواب سچا ہے۔" (اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَزَادَ أَحْمَدُ فِي آخِرِهِ قِصَّةَ قَوْلِ بِلاَلٍ فِيْ أَذَانِ الفَجْرِ «الصَّلاَةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ».

وَلابْنِ خُزَيْمَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ إِذَا قَالَ المُؤَذِّنُ فِي الفَجْرِ «حَيَّ عَلَى الفَلاَحِ» قَالَ: «الصَّلاَةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ».

احمد نے اس روایت کے آخر میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی فجر کی اذان میں (الصلاہ خیر من النوم) کا قصہ بھی مزید بیان کیا ہے اور ابن خزیمہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہے کہ انہوں نے فرمایا سنت ہے کہ جب موذن صبح کی اذان میں حی علی الفلاح کہے تو وہ کہے (الصلاۃ خیر من النوم)

لغوی تشریح: ﴿ بتربیع التکبیر ﴾ اللہ اکبر کی تکبیر کو چار مرتبہ کہنا۔ ﴿ بغیر ترجیع ﴾ ترجیع کا معنی ہے کہ اذان میں ﴿ اشہد ان لا الہ الا اللہ ﴾ کو پہلے پست آواز (آہستہ آواز) سے ادا کرنا' دوبارہ دو مرتبہ بآواز بلند ادا کرنا ﴿ والاقامۃ ﴾ اس سے مراد کلمات اقامت ہیں ﴿ فرادی ﴾ اقامت میں ہر کلمہ صرف ایک ایک مرتبہ ادا کرنا البتہ ﴿ قد قامت الصلاۃ ﴾ دو مرتبہ ﴿ لرئویا حق ﴾ "لام" اس میں برائے تاکید ہے اور رؤیا حق کی طرف مضاف ہے یا مراد ہے وہ خواب جو عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے دیکھا حق ہے۔ اس کی تین حالتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اسے مرفوع پڑھا جائے تو اس صورت میں یہ مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف تصور ہوگی اور وہ لفظ ﴿ بتمامہ ﴾ ہو سکتا ہے یا پھر دوسری صورت میں اسے منصوب پڑھا جائے (الحدیث) تو اس صورت میں "اقرا الحدیث وتممہ" ہوگا اور تیسری صورت میں اسے مجرور بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ﴿ الی آخر الحدیث ﴾ ہوگا۔ ﴿ زاد احمد فی آخرہ ﴾ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ احمد نے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اضافہ حدیث بلال (رضی اللہ عنہ) میں ہے' تا کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مراد یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اذان کے بارے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرتے ہوئے صبح کی اذان میں ﴿ الصلاۃ خیر من النوم ﴾ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: مدینہ طیبہ میں ہجرت کے پہلے سال آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ نماز باجماعت کیلئے بلانے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔ بعض نے کہا نماز کیلئے ناقوس (گھڑیال) بجایا جائے۔ بعض نے بلندی پر آگ روشن کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض نے "بوق" (بگل) سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ نمازوں کی طرف بلانے کیلئے اذان دی جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو باواز بلند "الصلاۃ جامعۃ" کہنے کا حکم دیا۔ اسی اثناء میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ جو مذکورہ بالاحدیث کے راوی ہیں' نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ناقوس اٹھائے ہوئے ہے۔ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس سے دریافت کیا اللہ کے بندے کیا ناقوس فروخت کرتے ہو؟ اس نے پوچھا تم اس سے کیا کرو گے؟ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا ہم اس کے ذریعہ (لوگوں کو) نماز باجماعت کیلئے بلائیں گے۔ اس شخص نے کہا میں

تمہیں اس سے کہیں بہتر طریقہ سے آگاہ نہ کر دوں؟ عبداللہ بن زید عنھما نے کہا ہاں (ضرور بتائیں) تو اس نے (موجودہ) اذان اور اقامت کے الفاظ انہیں سکھائے۔ یہی خواب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا جسے آپ ؐ نے سچا اور صادق قرار دیا۔ اذان میں ترجیع مسنون ہے یا نہیں۔ اس بارے میں ائمہ کی آراء مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع ثابت ہے‘ اہلحدیث حضرات کی رائے یہی ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع جس صحابی سے ثابت کی جاتی ہے اس صحابی کو تعلیم دینا مقصود تھا اس لئے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ جنہیں آپ ؐ نے یہ تعلیم دی‘ نے پہلی مرتبہ اذان میں شہادتین "اشھد ان لا الہ الا اللہ" "اشھد ان محمدا رسول اللہ" کو دھیمی اور پست آواز میں ادا کیا تھا‘ حالانکہ یہ درست نہیں۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بھی مکہ مکرمہ میں اذان ترجیع سے ہوتی رہی۔ اس لئے اس کا انکار محض مجادلہ ہے‘ البتہ اذان ترجیع اور بغیر ترجیع دونوں طرح جائز ہے مگر صحیحین کی روایات کی بناء پر راجح یہ ہے کہ ترجیع کے ساتھ اقامت اکہری کہی جائے۔

راوی حدیث : ﴿ عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابو محمد ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق کی وجہ سے انصاری خزرجی کہلائے۔ غزوۂ بدر کے علاوہ باقی غزوات میں بھی شریک رہے۔ ہجرت مدینہ کے پہلے سال میں انہوں نے خواب میں موجودہ اذان کی کیفیت دیکھی تھی اور یہ واقعہ مسجد نبوی ؐ کی تعمیر کے بعد کا ہے۔ انہوں نے ۳۲ھ میں ۶۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔

﴿ بلال رضی اللہ عنہ ﴾ یہ قبیلہ تیم کے آزاد کردہ غلام بلال بن رباح تھے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کو راہ حق میں بہت اذیتیں اور تکالیف دی گئیں۔ ان کو بھی غزوات بدر و احد‘ احزاب وغیرہ سبھی میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے اذان کہنا بند کر دی تھی اور مدینہ طیبہ چھوڑ کر دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۷ھ یا ۱۸ھ میں ساٹھ سال سے اوپر عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

(۱٤٥) وَعَنْ أَبِي مَحْذُورَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ الأَذَانَ، فَذَكَرَ فِيهِ التَّرْجِيعَ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلٰكِن ذَكَرَ التَّكْبِيرَ فِي أَوَّلِهِ مَرَّتَيْنِ فَقَطْ، وَرَوَاهُ الخَمْسَةُ فَذَكَرُوهُ مُرَبَّعاً.

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان سکھائی۔ اس میں انہوں نے ترجیع کا ذکر کیا ہے۔ (مسلم نے روایت کیا ہے لیکن اس میں پہلی دفعہ اللہ اکبر کو صرف دو مرتبہ کہنے کا ذکر ہے۔ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اللہ اکبر کو پہلی دفعہ چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ علمہ الاذان ﴾ علم‘ تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ذکر ہے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اذان کی تعلیم دی جیسا کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے کیلئے ہم نو ساتھی مکہ سے نکلے۔ جب ان نوجوانوں نے اذان سنی تو

مسلمانوں کا مذاق اور استہزاء اڑانے کیلئے انہوں نے اذان کہنا شروع کر دی۔ نبی ﷺ نے فرمایا "میں نے ان لوگوں میں ایک خوش الحان آدمی کی اذان سنی ہے۔" پھر ہماری طرف کسی کو بھیج کر ہمیں اپنے پاس بلایا اور ہم میں سے فرداً فرداً اذان کہلوا کر سنی۔ میں سب سے آخری آدمی تھا جس نے اذان کہی۔ میری اذان سن کر آپؐ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنے روبرو بٹھا کر میری پیشانی پر دست مبارک پھیرا اور تین مرتبہ برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا "جاؤ اور مسجد حرام کے پاس کھڑے ہو کر اذان کہو۔" میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مجھے پہلے اذان تو سکھائیں۔ پھر انہوں نے حدیث اذان بیان کی۔ ﴿ فذكر الترجيع ﴾ اس میں ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے ترجیع کا بھی ذکر کیا' یعنی کلمہ شہادتین کو دو' دو مرتبہ دہرایا۔ جمہور علماء نے اس سے ترجیع اذان (دوہری آذان) کی مشروعیت پر استدلال کیا ہے اور یہ ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے انکار کی مجال نہیں۔ ﴿ فذكروه ﴾ انہوں (پانچوں) نے اذان کے آغاز میں تکبیر (مربعاً) کو چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے۔ "مربعا" تربیع سے ہے۔ جس کے معنی ہیں چار مرتبہ۔ صاحب السبل شارح بلوغ المرام نے کہا ہے یہ جملہ (یعنی چار بار تکبیر) ثقہ راویوں سے محفوظ ہے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور اس بات کی دلیل ہے کہ اذان کے آغاز میں اللہ اکبر دو دفعہ نہیں بلکہ چار مرتبہ کہنا ہی صحیح ہے اور اذان کیلئے مؤذن ایسا منتخب اور مقرر کیا جائے جس کی آواز اچھی اور بلند ہو۔ اس سلسلہ میں انتخاب کیلئے مقابلہ اذان کا ثبوت ملتا ہے۔

(١٤٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُمِرَ بِلاَلٌ أَن يَشْفَعَ الأَذَانَ، وَيُوتِرَ الإِقَامَةَ إِلاَّ الإِقَامَةَ. يَعْنِيْ إِلاَّ قَوْلَهُ. قَدْ قَامَتِ الصَّلاَةُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَذْكُرْ مُسْلِمٌ الاسْتِثْنَاءَ، وَلِلنَّسَائِيِّ: أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِلاَلاً.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کے کلمات دو' دو مرتبہ اور تکبیر (قد قامت الصلاۃ) کے علاوہ باقی جملہ کلمات کو ایک ایک مرتبہ کہنے کا حکم دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

البتہ مسلم نے (قد قامت الصلاۃ) کے استثناء کا ذکر نہیں کیا اور نسائی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ امر ﴾ صیغہ مجہول ہے۔ اس میں حکم صادر فرمانے والے خود نبی کریم ﷺ ہیں۔ نسائی میں اس کی صراحت موجود ہے۔ ﴿ ان يشفع الاذان ﴾ یعنی ہر کلمہ کو دو' دو مرتبہ ادا کرنا۔ ﴿ ويوتر الاقامة ﴾ اقامت میں ہر کلمہ ایک ایک مرتبہ کہنا ﴿ الا الاقامه ﴾ بجز اقامت کے یعنی ﴿ قد قامت الصلاة ﴾ کے۔ اسے دو' دو مرتبہ کہنا ہے۔ ﴿ ولم يذكر مسلم الاستثناء ﴾ اور مسلم نے الا الاقامہ کا استثناء نقل نہیں کیا۔

(١٤٧) وَعَنْ أَبِيْ جُحَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ بِلاَلاً

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دیتے دیکھا کہ وہ اپنا چہرہ' ادھر ادھر

يُؤَذِّنُ، وَأَتَتَبَّعُ فَاهُ هٰهُنَا وَهٰهُنَا، وَإِصْبَعَاهُ فِيْ أُذُنَيْهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

پھیرتے تھے۔ اس وقت ان کی دونوں انگلیاں (انگشت ہائے شہادت) ان کے کانوں میں تھیں۔ (احمد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَلِابْنِ مَاجَهْ: وَجَعَلَ إِصْبَعَيْهِ فِي أُذُنَيْهِ. وِلِأَبِي دَاوُدَ: لَوَى عُنُقَهُ لَمَّا بَلَغَ «حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ» يَمِيْناً وَشِمَالاً، وَلَمْ يَسْتَدِرْ. وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ.

ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں داخل کرلیں اور ابوداؤد میں ہے کہ جب (حی علی الصلاۃ) کہتے تو اپنے دائیں بائیں ذرا رخ موڑ لیتے بالکل گھومتے نہیں تھے۔ اس کی اصل صحیحین میں ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ اتتبع فاہ ﴾ تتبع باب تفعل سے ہے۔ مطلب ہے کہ میں ان کے چہرے کی طرف نظریں لگائے ہوئے تھا اور ان کے منہ کو بغور ملاحظہ کر رہا تھا ﴿ ھھنا ﴾ دائیں جانب ﴿ وھھنا ﴾ اور بائیں جانب۔

حاصل کلام: اذان قبلہ رخ کھڑے ہو کر کہنا مسنون ہے۔ اسی طرح حی (علی الصلاۃ' حی علی الفلاح) کہتے وقت دائیں' بائیں اپنے چہرے کی حد تک پھیرنا مسنون ہے۔ اذان کہتے ہوئے کانوں میں انگلیاں داخل کرنے کے دو فائدے ہیں۔ کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔ کوئی بہرہ آدمی مؤذن کو ایسی حالت میں دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ نماز کیلئے اذان کہی جا رہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابوجحیفہ کنیت ہے۔ وھب بن عبداللہ سوائی نام ہے۔ جحیفہ میں جیم پر ضمہ ہے اور تصغیر ہے۔ سوائی میں سین پر ضمہ ہے۔ سوائی عامری مشہور ہیں۔ صغار صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار کئے گئے ہیں۔ کوفہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال پر عامل مقرر کیا۔ تمام مشاھد و غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(١٤٨) وَعَنْ أَبِي مَحْذُوْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَعْجَبَهُ صَوْتُه فَعَلَّمَهُ الأَذَانَ. رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ان کی آواز بہت پسند آئی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اسے (ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو) اذان کی تعلیم خود دی۔ (اذان سکھائی) (ابن خزیمہ)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ مؤذن کے انتخاب اور چناؤ اور تقرر میں آواز کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اچھی آواز دلوں پر جادو کا اثر رکھتی ہے۔ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(١٤٩) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ العِيْدَيْنِ، مِنْ غَيْرِ مَرَّةٍ وَلاَ مَرَّتَيْنِ، بِغَيْرِ أَذَانٍ وَلاَ إِقَامَةٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَنَحْوُهُ فِي المُتَّفَقِ عَلَيْهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَغَيْرِهِ.

ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ نبی ﷺ کے ساتھ نماز عیدین پڑھی ہے۔ اس کیلئے نہ اذان کہی جاتی تھی اور نہ ہی اقامت۔ (اس روایت کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دور رسالت مآب ﷺ میں نماز عیدین باجماعت ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود نہ ان کیلئے اذان کہی جاتی تھی اور نہ اقامت اور امت کا بھی اس پر عمل ہے۔

(۱۵۰) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي الحَدِيْثِ الطَّوِيْلِ فِيْ نَوْمِهِمْ عَنِ الصَّلاَةِ: ثُمَّ أَذَّنَ بِلاَلٌ، فَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ كَمَا كَانَ يَصْنَعُ كُلَّ يَوْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ (ایک لمبی حدیث جس میں دوران سفر غلبہ نیند اور تھکاوٹ سفر کی وجہ سے سو جانے کا ذکر ہے) سے مروی ہے، جب نیند سے بیداری ہوئی تو پھر بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور نبی ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی جس طرح روزانہ پڑھتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى المُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا المَغْرِبَ وَالعِشَآءَ بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ.

اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ مزدلفہ میں پہنچے تو وہاں آپ ؐ نے مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھی

وَلَهُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ المَغْرِبِ وَالعِشَآءِ بِإِقَامَةٍ وَاحِدَةٍ. وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ: «لِكُلِّ صَلاَةٍ» وَفِي رِوَايَةٍ لَه: وَلَمْ يُنَادِ فِي وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا.

اور مسلم ہی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے ایک ہی اقامت کے ساتھ ادا فرمائیں اور ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہر نماز کیلئے تکبیر کہی گئی اور اسی کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ان دونوں نمازوں میں سے کسی کے لئے بھی اذان نہیں کہی گئی۔

لغوی تشریح: ﴿ فی نومھم عن الصلاۃ ﴾ سونے کا واقعہ نماز فجر کا ہے۔ واقعہ کی نوعیت کچھ اس طرح آئی ہے کہ آپ ؐ خیبر سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ رات کے آخری حصہ میں کہیں پڑاؤ کیا۔ نبی ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بیدار رہنے کا حکم ارشاد فرمایا کہ جب طلوع فجر ہو تو وہ انہیں جگا دیں۔ نبی کریم ﷺ سو گئے اور بلال رضی اللہ عنہ پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ بھی سو گئے۔ پس طلوع آفتاب کے بعد آنکھ کھلی تو

(یہ صورتحال ملاحظہ فرما کر) نبی ﷺ نے اس وادی سے نکلنے کا حکم دیا (تعمیل حکم میں) سب صحابہؓ اس وادی سے نکل گئے (اور آگے دوسری جگہ پڑاؤ ڈالا) تو نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور آپؐ نے نماز پڑھائی۔ ﴿مزدلفۃ﴾ یہ ایک مقام کا نام ہے جو منیٰ اور عرفات کے مابین واقع ہے۔ یہ حج کے مشہور شعائر میں سے ہے۔ عرفات میں وقوف کے بعد دسویں ذی الحجہ کی شروع رات کو حجاج کرام اس جگہ آتے ہیں۔ ﴿ولم ینادفی واحد منھما﴾ ان دونوں میں سے کسی کیلئے بھی منادی (اذان) نہیں کہی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی وجہ سے نماز کا وقت فوت ہو جائے اور نماز باجماعت کا ارادہ ہو تو پھر نماز کیلئے اذان کہنی چاہئے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اور جابر رضی اللہ عنہ سے مروی پہلی حدیث باہم متعارض معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ حدیث مزدلفہ کے قیام میں مغرب و عشاء دونوں کو جمع کر کے پڑھنے کی صورت میں اذان کہنے کی نفی کرتی ہے جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ "ایک اذان اور دو اقامتیں کہی گئیں۔ مگر یہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ اولیٰ ہے کیونکہ مثبت کو منفی پر مقدم تسلیم کیا گیا۔

(۱۵۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمْ، قَالاَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ «إِنَّ بِلاَلاً يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، وَكَانَ رَجُلاً أَعْمَى لاَ يُنَادِي حَتَّى يُقَالَ لَهُ: أَصْبَحْتَ أَصْبَحْتَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي آخِرِهِ إِدْرَاجٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بلال (رضی اللہ عنہ) رات کو اذان کہتا ہے تم لوگ ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) کی اذان تک کھا پی لیا کرو۔" ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) نابینا آدمی تھے جب تک لوگ انہیں یہ نہ کہتے کہ (صبح ہوگئی' صبح ہوگئی) وہ اذان نہ کہتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یوذن بلیل﴾ رات کو اذان کہنے کا مطلب ہے کہ طلوع فجر سے قبل اذان کہتا ہے۔ ﴿فکلوا واشربوا﴾ کھاؤ پیو سے مراد ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتے ہو تو سحری کا وقت باقی ہے کھا پی سکتے ہو۔ ﴿ادراج﴾ راوی کا اپنی طرف سے اضافہ (تشریح و توضیح) کی صورت میں داخل کرنا۔ ادراج سے مراد یہاں ﴿وکان رجلا اعمی﴾ کا فقرہ ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما یا زہری کی طرف سے اضافہ شدہ ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ اول وقت سے اذان کو مؤخر کیا جائے' کیونکہ اطلاع دینے والا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو یا تو فجر کے طلوع ہونے کے قریب وقت اطلاع دیتا (کہ فجر ہوگئی ہے) یا جب فجر کا کچھ حصہ نمودار ہو جاتا (اس وقت اسے مطلع کرتا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلوع فجر سے پہلے بھی اذان کہنا مشروع ہے۔ لیکن یہ اذان اس غرض کیلئے نہیں ہوتی جس غرض کیلئے معمول کی اذان دی جاتی ہے بلکہ اس سے مقصود سوئے ہوئے

لوگوں کو بیدار کرنا کہ وہ اٹھیں اور نماز کی تیاری کریں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مسجد میں نماز کی اذان دینے کیلئے دو موذن رکھنا درست ہے۔

(١٥٢) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما: أَنَّ بِلَالاً أَذَّنَ قَبْلَ الفَجْرِ، فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْجِعَ فَيُنَادِيْ: **أَلاَ إِنَّ العَبْدَ نَامَ**. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ایک روز) بلال رضی اللہ عنہ نے طلوع فجر سے پہلے ہی اذان کہہ دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوبارہ اذان کہنے کا حکم دیا (تو بلال رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ کہہ کر منادی کی) ”خبردار! سنو بندہ کو نیند آگئی تھی۔“ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذن قبل الفجر ﴾ طلوع فجر سے قبل اذان کہی' اس گمان کی بنا پر کہ فجر طلوع ہو چکی ہے (حالانکہ طلوع نہیں ہوئی تھی) یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ قبل طلوع فجر اذان دینا مشروع نہیں تھا۔ ﴿ وضعفه ﴾ ابو داؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو یہ کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے کہ ایوب سے صرف حماد بن سلمہ ہی روایت کرتا ہے اور امام ابن مدینی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے اور حماد بن سلمہ نے اس میں خطا کھائی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ضعیف ہے لیکن تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ روایت اس موقع پر محمول ہو گی جب ابتداء میں صرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی اذان کہتے تھے۔ پھر جب ان کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی مقرر کیا گیا تو بلال رضی اللہ عنہ پہلی اذان صبح سے پہلے دیتے اور ابن مکتوم رضی اللہ عنہ صبح ہونے کے بعد' جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عمرو یا عبد اللہ بن قیس قرشی عامری تھا' جن کا ذکر سورہ عبس کے شان نزول کے سلسلہ میں مفسرین نے بیان کیا ہے۔ قدیم الاسلام تھے۔ ہجرت بھی کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو تیرہ مرتبہ مدینہ میں اپنا نائب (قائم مقام) مقرر فرمایا کہ لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دے۔ جنگ قادسیہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اس روز جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔

(١٥٣) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا سَمِعْتُمُ النِّدَاءَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ المُؤَذِّنُ**» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب تم اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہتے جاؤ جس طرح مؤذن کہہ رہا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُهُ.

بخاری میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔

اور مسلم نے عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے جو

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فِي فَضْلِ الْقَوْلِ كَمَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ كَلِمَةً كَلِمَةً سِوَى الْحَيْعَلَتَيْنِ، فَيَقُولُ: لاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ.

مؤذن کے جواب میں اسی طرح ایک ایک کلمہ کہنے کی فضیلت کے بارے میں ہے بجز (حی علی الصلاۃ) اور (حی علی الفلاح) کے کہ ان کلمات کی جگہ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے جس طرح مؤذن کلمات اذان کہے' سننے والا اسی طرح کہتا جائے اور یہ جواب ہر حالت میں مشروع ہیں خواہ انسان پاک ہو یا ناپاک۔ البتہ بول و براز وغیرہ میں مصروف ہو تو جواب دینا جائز نہیں اور (حی علی الصلاۃ' حی علی الفلاح) کے جواب میں (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہا جائے اور جس روایت میں یہ آیا ہے کہ جس طرح مؤذن کہے تم بھی اسی طرح کہو۔ تو یہ حکم عام ہے' (حی علی الصلاۃ) اور (حی علی الفلاح) کے جواب میں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کہنے کا حکم خاص ہے اور یہ طے شدہ اصول ہے کہ خاص کو عام پر اور مقید کو مطلق پر ترجیح دی جائے گی۔ جمہور علماء کے نزدیک یہی مسنون ہے۔

(١٥٤) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! اجْعَلْنِيْ إِمَامَ قَوْمِي، فَقَالَ: «**أَنْتَ إِمَامُهُمْ وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ، وَاتَّخِذْ مُؤَذِّناً لاَ يَأْخُذُ عَلَى أَذَانِهِ أَجْرًا**». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ وَحَسَّنَهُ التِّرمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! مجھے میری قوم کا امام مقرر فرمادیں۔ ارشاد ہوا "تم ان کے امام ہو (تمہیں تمہاری قوم کا امام مقرر کر دیا گیا) ان میں کمزور و ضعیف لوگوں کا خیال رکھو اور مؤذن ایسے آدمی کو مقرر کرو جو اذان کہنے کی اجرت نہ طلب کرے۔" (اس کو احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿واقتد باضعفھم﴾ اقتداء سے فعل امر ہے۔ یعنی اپنے نمازیوں میں سے ضعیف و کمزور نمازیوں کا خیال رکھنا' ان کی منشاء کا' ان کے احوال کا خیال رکھنا گویا کہ تم انہی کو نماز پڑھا رہے ہو۔

حاصل کلام: مؤذن کا اذان کی اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا ناجائز۔ اس بارے میں اختلاف ہے۔ اس حدیث سے معاوضہ کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر معاوضہ لئے اذان کہنا مندوب و مستحسن ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر حال میں نمازیوں کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہئے اور دیگر ارکان و واجبات کو اتنا لمبا نہ کرے کہ کمزور و ناتواں لوگ اکتا جائیں اور نماز باجماعت سے محروم رہ جائیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤذن کو اذان کی اجرت نہ لینی چاہئے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک یہ مکروہ ہے حرام نہیں بلکہ متاخرین علماء نے ناگزیر وجوہ کی بناء پر معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھلائی اور نیکی کے کام میں امامت کی طلب جائز ہے۔ اس کے آداب و شرائط کماحقہ پورا کرنے کی صورت میں اس کا حاصل کرنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ﴾ ابوعبداللہ ان کی کنیت تھی۔ طائف سے جو وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا یہ ان میں سب سے کم عمر تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وفد پر عامل مقرر فرمایا۔ انہوں نے اپنی قوم کو مرتد ہونے سے بچایا اور وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو بحرین اور عمان پر عامل مقرر فرمایا۔ بصرہ میں ۵۱ھ میں فوت ہوئے۔

(١٥٥) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لَنَا النَّبِيُّ ﷺ: «**إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ**» الحَدِيثَ، أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ "جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی ایک آدمی تمہیں بلانے کیلئے اذان کہے" پھر پوری حدیث بیان کی۔ (اسے ساتوں احمد، بخاری و مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

راوی حدیث ﴿ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوسلمان تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حصول تعلیم دین کیلئے آئے تھے۔ بیس روز تک آپ کے پاس قیام کیا جب واپس جانے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "راستہ میں جب وقت نماز آجائے تو تم میں سے کوئی اذان کہے اور جو تم میں سے عمر میں بڑا ہو وہ جماعت کرائے۔" اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مسافروں کو بھی اذان اور جماعت کا اہتمام کرنا چاہئے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ ۷۴ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔

(١٥٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لِبِلَالٍ: «**إِذَا أَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ، وَإِذَا أَقَمْتَ فَاحْدُرْ، وَاجْعَلْ بَيْنَ أَذَانِكَ وَإِقَامَتِكَ قَدْرَ مَا يَفْرُغُ الآكِلُ مِنْ أَكْلِهِ،**» الحديث. رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا "جب اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر کہو اور تکبیر ذرا جلدی جلدی کہو۔ اذان اور اقامت کے مابین اتنا وقفہ ہونا چاہئے کہ کھانا کھانے والا اپنے کھانے سے فارغ ہو کر جماعت میں شریک ہو سکے۔" (پھر حدیث پوری بیان کی۔ اسے ترمذی نے روایت

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ يُؤَذِّنُ إِلاَّ مُتَوَضِّئٌ». وَضَعَّفَهُ أَيْضاً.

کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)
اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وضو کے بغیر کوئی اذان نہ کہے" (ترمذی نے اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ زِيَادِ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «وَمَنْ أَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ». وَضَعَّفَهُ أَيْضاً.

اور ترمذی نے زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔ اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے

وَلأَبِي دَاوُدَ من حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ، أَنَّهُ قَالَ: أَنَا رَأَيْتُهُ، يَعْنِي الأَذَانَ، وَأَنَا كُنْتُ أُرِيْدُه، قَالَ: فَأَقِمْ أَنْتَ. وَفِيهِ ضَعْفٌ أَيْضاً.

اور ابوداؤد میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ میں نے اذان کو خواب میں دیکھا تھا۔ میری تمنا تھی کہ مجھے مؤذن مقرر کیا جائے آپؐ نے فرمایا "تو تکبیر کہا کر۔" اس میں بھی ضعف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ فترسل ﴾ ترسل سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی ٹھہر ٹھہر کر آرام سے کلمات اذان ادا کر۔ جلدی اور تیزی نہ کر۔ ﴿ فاحدر ﴾ نصر ینصر باب سے امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی جلدی جلدی ادا کرنا۔ اس حدیث کی سند میں عبدالمنعم نامی راوی ہے۔ جسے محدثین نے متروک کہا ہے۔ ﴿ وضعفه ایضا اس کو بھی اس نے ضعیف قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاویہ بن یحیٰی یہ حدیث زھری سے روایت کرتے ہیں اور زھری حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور معاویہ ضعیف ہے اور زھری کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس اعتبار سے یہ روایت منقطع ہے اور اس لئے بھی کہ معاویہ بن یحیٰی راوی زھری کے حوالہ سے ضعیف ہے۔ ﴿ ومن اذن ﴾ ماقبل پر عطف ہے اور وہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے ﴿ ان اخاصداء اذن ﴾ یعنی صداء قبیلہ کے ایک شخص نے اذان کہی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا (ومن اذن فھو یقیم) کہ "جو اذان کہے وہی اقامت کہے"۔ اس حدیث سے مصنف رحمہ اللہ نے یہ ٹکڑا حذف کر دیا۔ مکمل حدیث اس طرح ہے کہ زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے قبیلہ صداء کے آدمی! اذان کہو۔" میں نے اذان کہی۔ جب آپؐ نماز پڑھانے لگے تو بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہنا چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدائی بھائی نے اذان کہی ہے اور جو اذان کہے وہی اقامت کہے گا۔" ﴿ صداء ﴾ کے "صاد" پر ضمہ ہے۔ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس کا ضعف اس وجہ سے ہے کہ اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم افریقی ہے' امام قطان وغیرہ نے اسے ضعیف کہا لیکن ثوری رحمہ اللہ نے اسے اچھا کہا ہے اور بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ حدیث کے قریب رہنے والا ہے۔ ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے اور درست بات بھی یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ طبرانی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں اس کی تائید ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں۔ اقامت کہنا اسی کا حق ہے جس

نے اذان کہی لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اہل علم کی اکثریت کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ جو اذان کہے وہی اقامت کا حقدار ہے۔ ہاں یہ حدیث عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے معارض ہے جو ۱۹۸ نمبر پر ہے۔ احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وسعت ہے دوسرا بھی تکبیر کہہ سکتا ہے۔ ﴿ وفیہ ضعف ایضا ﴾ بیہقی نے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی سند اور متن میں اختلاف پایا جاتا ہے اور فرمایا ہے کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور "الصدائی" رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں احادیث اگر صحیح ہوں تو صدائی کی حدیث راجح ہے کیونکہ وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بعد کی ہے۔

راوی حدیث : ﴿ زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ صداء قبیلہ کے فرد تھے۔ یہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہوئی تھی۔ آپؐ کے روبرو اذان دی۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۵۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**الْمُؤَذِّنُ أَمْلَكُ بِالأَذَانِ، وَالإِمَامُ أَمْلَكُ بِالإِقَامَةِ**». رَوَاهُ ابْنُ عَدِيٍّ، وَضَعَّفَهُ، وَلِلْبَيْهَقِيِّ نَحْوُهُ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْ قَوْلِهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مؤذن اذان کا زیادہ حقدار ہے اور امام تکبیر کہنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔" (اسے ابن عدی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے اور بیہقی میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح منقول ہے)

لغوی تشریح : ﴿ رواہ ابن عدی و ضعفہ ﴾ ابن عدی نے اسے ضعیف اس بناء پر قرار دیا ہے کہ شریک قاضی تنہا اسے روایت کرتا ہے لیکن ابن معین نے کہا شریک صدوق' ثقہ ہے۔ البتہ اگر اس کی مخالفت ہو تو پھر ہمیں دوسرا محبوب ہے اور نسائی نے کہا ﴿ لیس بہ باس ﴾ (اس میں کوئی حرج نہیں۔) اور احمد نے کہا کہ وہ عاقل اور صدوق ہے۔ امام مسلم نے اس سے متابعتاً روایت لی ہے۔ **حاصل کلام :** مؤذن اذان کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے کیونکہ اس کو اذان کے وقت کا محافظ بنایا گیا ہے لہٰذا مؤذن کو اذان دینے میں تاخیر یا تقدیم پر مجبور کرنے کا کوئی بھی مجاز نہیں اور امام' تکبیر کہلانے میں حقدار ہے' یعنی اس کے اشارہ و اجازت کے بغیر تکبیر نہ کہی جائے۔

(۱۵۸) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الأَذَانِ وَالإِقَامَةِ**». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "اذان اور اقامت کے درمیانی وقفہ میں دعا مسترد نہیں کی جاتی۔" (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : ترمذی میں حدیث کے آخر میں اتنا اضافہ بھی منقول ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! تو پھر ہم (اس وقت) کیا دعا کریں؟ فرمایا "سلوا اللہ العفو و العافیۃ فی الدنیا والاخرۃ

کہ اللہ تعالیٰ سے عفو و بخشش اور دنیا و آخرت میں عافیت کا سوال کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقبولیت دعا کیلئے یہ وقت نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

(١٥٩) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَالَ حِينَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ: اللَّهُمَّ رَبَّ هَذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَةِ، وَالصَّلاَةِ القَائِمَةِ، آتِ مُحَمَّداً الوَسِيْلَةَ وَالفَضِيْلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَحْمُوداً الَّذِيْ وَعَدتَّهُ حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ القِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس آدمی نے اذان سن کر یہ دعا کی تو اس کے لئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہو گئی۔ "اے اللہ! اے اس کامل دعا و پکار اور قائم ہونے والی نماز کے مالک! محمد ﷺ کو وسیلہ (مقام محمود) اور فضیلت عطا فرما اور مقام محمود پر جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے پہنچا دے (کھڑا فرما دے) تو اس کیلئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہو گئی۔"
(اس کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ نداء ﴾ بمعنی اذان۔ رب منصوب ہے منادی سے بدل ہونے کی وجہ سے یا پھر دوسرے منادی سے اور وہ مضاف ہے۔ ﴿ هذه الدعوة التامة ﴾ کے قول کی طرف۔ اس دعوت سے مراد توحید کی دعوت ہے۔ اس کے مکمل ہونے کی وجہ سے اسے ﴿ تامة ﴾ کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ رب ہی توحید کاملیت اور تمامیت کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ نقص اور فساد کی زد میں ہے ﴿ والصلوة القائمة ﴿ قیامت تک باقی رہنے والی۔ ﴿ الوسيلة ﴾ اس کی وضاحت خود نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرما دی ہے کہ وہ جنت میں ایک مقام ہے۔ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو وہ لائق ہے اور مجھے توقع ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا ﴿ والفضيلة ﴾ اس مرتبہ کو کہتے ہیں جو ساری مخلوق سے برتر ہو ﴿ وابعثه ﴾ اس کو وہاں پہنچا دے' بھیج دے ﴿ مقاما محمودا ﴾ یہ وہ مقام ہے جہاں نبی کریم ﷺ رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی ان کلمات کے ساتھ حمد و ستائش کریں گے جو اس موقع پر انہیں الہام کئے جائیں گے۔ اس سے پہلے ان کا علم آپؐ کو نہیں ہوگا اور اسی دعا و درخواست کی وجہ سے آپؐ کو شفاعت کبریٰ کی اجازت ہوگی۔ ﴿ حلت ﴾ واجب ہو جائے گی۔ میری شفاعت کا مستحق قرار پائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اذان سننے کے بعد اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے اور اس کی فضیلت بھی بڑی ہے۔ اس سے بڑا شرف اور فضل کیا ہوگا کہ پڑھنے والے کیلئے نبی کریم ﷺ کی بروز قیامت شفاعت ہوگی۔ جس کی آپؐ نے سفارش فرمائی وہ بالآخر جنت میں چلا ہی جائے گا۔ "مقام محمود" کا ذکر قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ ﴿ عسى ان يبعثك ربك مقاما محمودا ﴾ یعنی امید

ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر پہنچا دے گا۔

٣ - بَابُ شُرُوطِ الصَّلَاةِ

شرائط نماز کا بیان

(١٦٠) عَنْ عَلِيِّ بْنِ طَلْقٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ ﷺ: «إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ، فَلْيَنْصَرِفْ، وَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُعِدِ الصَّلَاةَ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت علی بن طلق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دوران نماز جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو جائے تو وہ واپس جائے' از سر نو وضو کرے اور نماز دوبارہ پڑھے۔" (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب شروط الصلاۃ﴾ شرط اسے کہتے ہیں جو اصل چیز سے خارج ہو اور اس حیثیت سے اس کیلئے لازمی اور ضروری ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ بھی نہیں رہتی۔ یعنی اس کا ہونا اس چیز کے ساتھ لازم ہے۔ بالفاظ دیگر شرط اس کام کو کہتے ہیں کہ جس کے نہ ہونے سے شرط والا کام نہ ہو۔ "اذافات الشرط فات المشروط" جب شرط نہ رہے تو مشروط بھی معدوم ہو جاتا ہے۔ ﴿فسا﴾ فسو سے ماضی کا صیغہ ہے۔ مقعد سے بغیر آواز کے جو ہوا خارج ہوتی ہے۔ ﴿ولیعد الصلاۃ﴾ ولیعد میں یعد اعادہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی لوٹانا' دوبارہ ادا کرنا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں جس کا وضو ٹوٹ جائے اسے از سر نو دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے۔ پہلی نماز پر بنا کسی صورت بھی صحیح نہیں۔ یہ اس حدیث کے معارض ہے جو حضرت عائشہ ؓ سے نواقض الوضو کے باب میں پہلے گزر چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حالت نماز میں بے وضو آدمی نیا وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے۔ لیکن جیسا پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا باب مذکور کی حدیث سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا راجح اور قابل ترجیح یہی بات ہے کہ غیر مشروط طور پر نماز نئے سرے سے پڑھی جائے۔

راوی حدیث: ﴿علی بن طلق رضی اللہ عنہ﴾ پورا نام علی بن طلق (طاء پر فتحہ' لام ساکن) بن المنذر بن قیس سحمی' یمامی حنفی' بنو حنیفہ کی طرف نسبت کی وجہ سے حنفی ہیں' صحابی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ طلق بن علی کے والد ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہے۔

(١٦١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جسے حیض آتا ہے (یعنی وہ عورت جو بالغہ ہے) اللہ تعالیٰ اس کی نماز دوپٹہ کے بغیر قبول نہیں کرتا۔" (اسے بجز نسائی کے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ حائض ﴾ اس سے بالغ و نوجوان عورت مراد ہے۔ ﴿ الخمار ﴾ "خاء" کے نیچے کسرہ' اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے عورت اپنا سر اور گردن ڈھانپتی اور چھپاتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ نماز کے وقت بالغ و نوجوان عورت کا سارا جسم چھپا ہوا ہونا چاہئے حتیٰ کہ سر کے بال بھی چھپے ہوئے ہوں۔

(١٦٢) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ: «**إِنْ كَانَ الثَّوْبُ وَاسِعاً فَالتَحِفْ بِهِ،** يَعْنِي **فِي الصَّلَاةِ**». وَلِمُسْلِمٍ: **فَخَالِفْ بَيْنَ طَرَفَيْهِ، وَإِنْ كَانَ ضَيِّقاً فَاتَّزِرْ بِهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا "جب کپڑا بڑا اور فراخ ہو تو (نماز میں) کپڑا خوب (جسم پر) لپیٹ لو" اور مسلم کی روایت میں ہے کہ کپڑا کشادہ ہو تو کپڑے کے دونوں کناروں کو کندھوں پر دونوں طرف ڈال لو اور اگر کپڑا تنگ اور چھوٹا ہو تو اسے تہبند کی صورت میں باندھ لو۔ (بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: «**لَا يُصَلِّي أَحَدُكُمْ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ، لَيْسَ عَلَى عَاتِقِهِ مِنْهُ شَيْءٌ**».

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے جب تک کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے کندھوں پر نہ ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿ فالتحف ﴾ التحاف سے امر کا صیغہ ہے۔ چادر کے اوڑھنے یا پہننے کو کہتے ہیں۔ جس کی وضاحت اگلا جملہ کر رہا ہے۔ ﴿ فخالف بین طرفیه ﴾ اس کی صورت یہ ہوگی کہ دونوں بغلوں کے نیچے سے کپڑا نکال کر کندھوں پر ڈال دے۔ دائیں طرف کا بائیں کندھے پر اور بائیں طرف کا دائیں کندھے پر اور گدی کے پاس دونوں کونوں کو گانٹھ دے لے (یعنی گرہ لگا لے۔) ﴿ فاتزر ﴾ باب افتعال سے اتزر امر کا صیغہ ہے اور تہبند باندھنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازی کے کندھے بھی نماز میں ننگے نہیں ہونے چاہئیں۔

(١٦٣) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّهَا سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ: أَتُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِي دِرْعٍ وَخِمَارٍ بِغَيْرِ إِزَارٍ؟ قَالَ: «**إِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغاً يُغَطِّي ظُهُورَ قَدَمَيْهَا**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ،

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا کوئی عورت تہبند کے بغیر محض کرتے اور اوڑھنی میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "کرتا اگر اتنا لمبا ہو کہ قدم کی پشت تک پہنچ جاتا ہے تو جائز ہے۔" (اسے ابوداؤد

وَصَحَّحَ الأَئِمَّةُ وَقْفَهُ.

نے روایت کیا ہے اور ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ درع ﴾ دال پر کسرہ "راء" ساکن۔ قمیص ﴿ سابغا ﴾ اتنی لمبی چوڑی اور فراخ کہ پورے جسم کو ڈھانپ لے ﴿ یغطی ﴾ تغطیۃ سے ماخوذ ہے۔ پردہ پوشی کرتا ہے' ڈھانپتا ہے ﴿ ظھور قدمیہ ﴾ پاؤں کا اوپر والا حصہ۔ پاؤں کی بالائی سطح۔

حاصل کلام: عورت کو نماز کی ادائیگی کیلئے سارا جسم مستور کرنا ضروری ہے۔ ایک لمبے چوڑے کرتے اور ایک سربند یعنی دوپٹہ کے ساتھ بھی نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ کرتہ اتنا دراز ہو کہ پاؤں کی بالائی سطح بھی چھپ جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو اپنے پاؤں چھپانے ضروری ہیں گویا پاؤں کا ڈھانپنا بھی عورت کیلئے شرط ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں بعض علماء نے عورت کے پاؤں کو بھی ستر میں شمار کیا ہے۔ اس حدیث کے موقوف ہونے کو ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے مگر امام حاکم نے اس کا مرفوع ہونا بخاری کی شرائط کے مطابق کہا ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ ایک ایسی حدیث جو موقوف ہے اور اس کے مضمون میں اجتہاد کا دخل نہ ہو تو ایسی حدیث محدثین کے نزدیک مرفوع کے حکم میں شمار ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اسے موقوف تسلیم کر لیا جائے تو یہ حکماً مرفوع ہے۔

(١٦٤) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي لَيْلَةٍ مُظْلِمَةٍ، فَأَشْكَلَتْ عَلَيْنَا الْقِبْلَةُ، فَصَلَّيْنَا، فَلَمَّا طَلَعَتِ الشَّمْسُ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا إِلَى غَيْرِ الْقِبْلَةِ، فَنَزَلَتِ الآيَةُ ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک تاریک و اندھیری رات میں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے' قبلہ کا رخ شناخت کرنا ہم پر دشوار و مشکل ہوگیا۔ ہم نے (اندازاً قبلہ کا رخ متعین کر کے) نماز پڑھ لی۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو معلوم ہوا کہ ہم نے تو غیر قبلہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی تھی۔ پس پھر یہ آیت نازل ہوئی "فاینما تولوا فثم وجہ اللہ" "پس جدھر تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کی ذات موجود ہے۔" (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مظلمۃ ﴾ میم پر ضمہ اور لام پر کسرہ۔ تاریک رات ﴿ فاشکلت ﴾ مشتبہ ہوگئی ﴿ تولوا ﴾ رخ کرو گے۔ ﴿ فثم ﴾ "ثا" پر فتحہ اور میم پر تشدید اور فتحہ۔ یہاں کے معنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدم واقفیت' ابر آلودگی یا دیگر کسی سبب کے باعث سمت قبلہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکے اور آدمی اپنی دانست کے مطابق غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کر کے نماز پڑھ لے کہ قبلہ اس جانب ہوگا مگر دراصل قبلہ اس رخ پر نہ ہو تو صحیح سمت قبلہ معلوم

ہونے پر اس نماز کا اعادہ ضروری نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقت نکلنے سے پہلے اور بعد میں ہر صورت میں اعادہ واجب ہے کیونکہ قبلہ رخ ہونا فرض ہے۔ اس حدیث کو وہ ضعیف کہتے ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو اس بنا پر ضعیف کہا ہے کہ اس روایت کی سند میں اشعث بن سعید راوی ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کی تائید حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے اکثر علماء کے نزدیک اعادہ کی ضرورت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ﴾ قبیلہ عنز بن وائل میں سے تھے۔ بکر اور تغلب جو وائل کے بیٹے تھے ان کے بھائی تھے۔ قدیم الاسلام صحابی تھے۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں سے شرف یاب ہوئے۔ غزوۂ بدر اور دیگر تمام معرکوں میں داد شجاعت دیتے رہے۔ ان کی سن وفات میں اختلاف ہے۔ ۳۲ھ' ۳۳ھ یا ۳۵ھ میں سے کسی سن میں وفات پائی۔

(١٦٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا بَيْنَ المَشْرِقِ وَالمَغْرِبِ قِبْلَةٌ». أَخْرَجَهُ التِّرمِذِيُّ، وَقَوَّاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مشرق اور مغرب کے مابین قبلہ ہے۔" (ترمذی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے قوی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مابین المشرق والمغرب قبلۃ﴾ یہ اہل مدینہ اور اسی سمت پر واقع دوسرے لوگوں کیلئے ہے۔ اس لئے کہ مدینہ مکہ کے شمال میں واقع ہے۔ جب مدینہ والے اپنا رخ جنوب کی جانب کرتے ہیں تو اس صورت میں مغرب ان کے دائیں طرف اور مشرق بائیں طرف پڑتا ہے لہٰذا ان کا قبلہ ان دونوں سمتوں کے درمیان ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ جب نمازی قبلہ سے دور دراز فاصلہ پر ہو تو اس کیلئے عین قبلہ رخ ہونا لازمی نہیں کیونکہ ایسا اس کیلئے بڑا مشکل اور دشوار ہے۔ بس اس کیلئے اپنا چہرہ اور رخ ادھر کرنا کافی ہے۔ دیگر شہروں کیلئے بھی یہ وسعت اسی طرح ہے جس طرح اہل مدینہ کیلئے ہے۔

(١٦٦) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي عَلَى رَاحِلَتِهِ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ البُخَارِيُّ: يُوْمِىءُ بِرَأْسِهِ، وَلَمْ يَكُنْ يَصْنَعُهُ فِي المَكْتُوبَةِ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی اونٹنی پر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اونٹنی جس طرف بھی رخ کرتی آپؐ نماز پڑھتے رہتے۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ آپؐ اپنے سر مبارک سے اشارہ کے ساتھ (نماز ادا) فرما رہے تھے۔ فرض نماز میں ایسا نہ کرتے تھے

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ: وَكَانَ إِذَا سَافَرَ فَأَرَادَ أَنْ يَتَطَوَّعَ

اور ابوداؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپؐ سفر کرتے اور نماز نفل پڑھنا چاہتے تو (ایک مرتبہ) اپنی

اسْتَقْبَلَ بِنَاقَتِهِ القِبْلَةَ، فَكَبَّرَ ثُمَّ صَلَّى حَيْثُ كَانَ وَجْهُ رِكَابِهِ. وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

اونٹنی کا رخ قبلہ کی طرف موڑ دیتے' اس کے بعد پھر سواری کا رخ جس جانب بھی ہو جاتا' نماز پڑھتے رہتے۔ (اس حدیث کی سند حسن ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یومی براسہ ﴾ اپنے سر سے رکوع و سجود کیلئے اشارہ کرتے اور سجدہ کیلئے رکوع کے بہ نسبت ذرا زیادہ جھکتے ﴿ المکتوبۃ ﴾ مکتوب لکھی ہوئی یعنی فرض نماز ﴿ الرکاب ﴾ "را" کے نیچے کسرہ اور کاف مخففہ۔ سواری' اونٹنی یا پھر ہر وہ چیز جس سے سواری کا کام لیا جائے۔ یہاں مراد سواری اور اونٹنی ہی ہے۔

حاصل کلام: حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ سفر کی حالت میں نفلی نماز سواری پر ادا کی جا سکتی ہے۔ ایک دفعہ سواری کا رخ یا اپنا رخ قبلہ رو کر کے شروع کر لے پھر اگر سواری کا رخ کسی دوسری جانب ہو جائے تب بھی نماز درست ہے۔ اسی طرح دور حاضر میں ریل گاڑی' ہوائی جہاز اور بحری جہاز پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ ان کا حکم کشتی کا ہوگا۔ کشتی میں نماز پڑھنا ثابت ہے اور تمام فقہاء بھی اس کے جواز پر متفق ہیں۔

(١٦٧) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**الأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلاَّ المَقْبَرَةَ وَالحَمَّامَ**». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَلَهُ عِلَّةٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ **سے مروی ہے کہ نبی کریم** ﷺ **نے فرمایا "قبرستان اور حمام کے ماسوا ساری زمین مسجد ہے** (جہاں چاہے نماز پڑھ لے)" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿ ولہ علۃ ﴾ وہ علت یہ ہے کہ حماد نے اسے موصول روایت کیا ہے جبکہ ثوری رحمہ اللہ نے اسے مرسل روایت کیا ہے اور امام ثوری کی روایت صحیح ہے۔ امام دارقطنی اور بیہقی نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل سند سے ہی محفوظ ہے۔ بعض حضرات نے اس کا موصول ہونا صحیح قرار دیا ہے اور اس کی تائید دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان اور حمام میں نماز پڑھنی درست نہیں۔ حمام میں اس لئے کہ وہ جگہ ناپاک ہے اور قبرستان میں ممانعت کا سبب سد ذرائع کے طور پر شرک سے بچنے کیلئے ہے۔

(١٦٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن يُصَلَّى فِي سَبْعَةِ مَوَاطِنَ: المَزْبَلَةِ، وَالمَجْزَرَةِ، وَالمَقْبَرَةِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، وَالحَمَّامِ،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما **روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ** ﷺ **نے سات مقامات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔** کوڑا کرکٹ (ڈالنے) کی جگہ' ذبح خانہ' **قبرستان' شارع عام' حمام' اونٹ باندھنے کی جگہ (باڑا) اور بیت اللہ کی چھت پر۔** (ترمذی نے اسے

وَمَعَاطِنِ الإِبِلِ، وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللهِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿المزبلة﴾ "میم" اور "با" پر فتحہ۔ وہ جگہ جہاں گوبر اور لید وغیرہ ڈالے جاتے ہوں۔ ﴿المجزرة﴾ "جیم" اور "زا" پر فتحہ جہاں جانور کو ذبح اور نحر کیا جاتا ہے ﴿معاطن﴾ معطن کی جمع ہے۔ میم پر فتحہ اور "طاء" کے نیچے کسرہ اونٹوں کے باندھنے کی جگہ (باڑا) یعنی حوض کے اردگرد ان کے بیٹھنے کی جگہ ﴿وضعفه﴾ اس روایت کی سند میں ایک راوی زید بن جبیرہ ہے' اس کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں روئے زمین کو مسجد قرار دینے کے باوجود کچھ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں نماز پڑھنا شرعاً ممنوع ہے۔ جہاں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں' ظاہر ہے وہ جگہ پاک تو نہیں رہ سکتی۔ اس لئے جگہ ہی جب ناپاک ہوگئی تو نماز کیسے ہوگی کیونکہ جگہ کا پاک ہونا نماز کیلئے شرط ہے۔ اسی طرح مذبح خانہ جہاں جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ خون اور دوسری گندگیاں اس جگہ کو پاک نہیں رہنے دیتیں اس لئے یہ جگہ بھی نماز کی ادائیگی کیلئے درست نہیں۔ شارع عام جو عام لوگوں کی گزرگاہ ہو۔ جو راستہ تنگ ہوگا جہاں گزرنے کی پہلے ہی 'دقت اور دشواری ہو وہاں نماز پڑھنا لوگوں کیلئے موجب اذیت ہے' توجہ اور خشوع و خضوع بھی نہیں رہ سکتا۔ خانہ کعبہ کی چھت پر نماز اس لئے ممنوع ہے کہ نماز میں بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونا بھی شرط ہے۔ چھت پر نماز پڑھنے کی صورت میں ایسا ناممکن ہے۔ جب شرط ہی نہ پائی گئی تو نماز کیسے ہوگی۔

(١٦٩) وَعَنْ أَبِي مَرْثَدِ الغَنَوِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لاَ تُصَلُّوا إِلَى القُبُورِ، وَلاَ تَجْلِسُوا عَلَيْهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قبروں کو سامنے (رکھ کر) نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ بعض حضرات بزرگوں کی قبروں کے پاس اس لئے مسجدیں تعمیر کرتے ہیں کہ بزرگوں کی ارواح سے فیض حاصل ہوگا۔ اس کی بھی ممانعت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بالکل واضح طور پر یہ ارشاد نبوی ہے کہ اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ ان لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ (مسجد) بنا لیا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو افعال مساجد میں اللہ تعالیٰ کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں انہیں قبروں پر نہ کرے اور ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبروں کو سامنے رکھ کر نماز نہ پڑھی جائے۔ اس سے شرک کا شبہ پڑ سکتا ہے۔

اور قبروں پر بیٹھنے کے بھی دو مفہوم ممکن ہیں' ایک تو یہ کہ قبر کو بطور تکیہ استعمال کیا جائے جس طرح تکیہ پر ٹیک لگاتے ہیں اسی طرح قبر کو تکیہ بنانا ممنوع ہے اور دوسرا یہ کہ قبروں پر مجاور بن کر بیٹھنا نیز قبروں پر قضاء حاجت کیلئے بیٹھنا بھی ممنوع و حرام ہے۔

راوی حدیث : ﴿ ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ ﴾ ابو مرثد کنیت ہے۔ کناز نام ہے۔ کاف پر فتحہ اور نون پر تشدید۔ کناز بن حصین بن یربوع الغنوی۔ غنوی غین اور نون دونوں پر فتحہ۔ قبیلہ غطفان کے ایک شخص غنی بن یعصر کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر غنوی کہلائے۔ بدری صحابی ہیں۔ حمزہ بن عبدالمطلب کے حلیف تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۲ھ میں ۶۶ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ مرثد میم پر فتحہ' "راء" ساکن "ثا" پر فتحہ "دال" ساکن۔

(١٧٠) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ رَأَى فِي نَعْلَيْهِ أَذًى أَوْ قَذَراً فَلْيَمْسَحْهُ، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے جب کوئی مسجد میں آئے تو (مسجد میں داخل ہونے سے پہلے) اسے چاہئے کہ (اپنی جوتی) دیکھ لے۔ اگر اپنی جوتی میں گندگی یا ناپاک چیز لگی ہوئی دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے صاف کرے اور اس میں نماز پڑھ لے"۔ (ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ اذی ﴾ طبائع جس سے اذیت محسوس کریں۔ ﴿ قذر ﴾ طبائع جسے گندہ تصور کریں اور اس سے نفرت کریں۔ مراد اس سے نجاست و گندگی ہے ﴿ اذی او قذر ﴾ بول کر' راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے پاک و صاف ہوں۔ نیز یہ کہ جوتے پر لگی ہوئی نجاست کو رگڑ کر صاف کرنے سے جوتا پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ حدیث کے بظاہر ہر لفظ سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر دونوں کا حکم یکساں ہے۔ اس ارشاد نبویؐ کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے جوتا پہنے ہوئے نماز ادا فرمائی۔ آپؐ کو اس کا علم نہیں تھا کہ جوتا ناپاک ہے اور اس کے نیچے گندگی اور نجاست لگی ہوئی ہے' دوران نماز ہی جبریل امینؑ نے آپؐ کو مطلع فرمایا کہ آپؐ کے جوتے نجاست آلودہ ہیں۔ آپؐ نے نماز ہی میں جوتے اتار دیئے اور نماز جاری رکھی۔ مقتدیوں نے امتثال فعل نبویؐ میں اپنے جوتے بھی اتار دیئے اور نماز پڑھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے صحابہؓ سے جوتے اتارنے کی وجہ دریافت فرمائی' انہوں نے جواب میں عرض کیا ہم نے آپؐ کی اتباع میں جوتے اتارے ہیں۔ پھر آپؐ نے اپنا جوتا اتارنے کی وجہ بتائی۔ اس حدیث

سے یہ معلوم ہوا کہ نمازی کو اگر نماز کے آغاز کے وقت اس کا علم نہ ہو سکا ہو کہ اس کے کپڑے یا جوتے وغیرہ پر نجاست لگی ہوئی ہے اور دوران نماز کسی طرح علم ہو جائے تو وہ نمازی اس ناپاک چیز کو اسی حالت میں اتار کر نماز کو پورا کرلے۔ نماز بالکل صحیح ہوگی۔

(۱۷۱) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا وَطِىءَ أَحَدُكُمُ الأَذَى بِخُفَّيْهِ فَطَهُورُهُمَا التُّرَابُ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی ایک اپنے موزوں سے گندگی پر چلے تو بے شک مٹی اسے پاک و صاف کرنے والی ہے۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿وطئی احدکم الاذی﴾ نجاست کو اپنے پاؤں سے پامال کرے اور اس پر سے گزرے اور چلے وطئی باب سمع یسمع سے ہے۔ ﴿بخفیه﴾ خف کا تثنیہ ہے۔ ضمیر کی طرف مضاف ہے۔ اس میں "باء" حرف جر ہے۔ یہ اور پہلے گزری ہوئی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جوتے' موزے اور ایسی دوسری چیزیں مٹی سے رگڑنے سے پاک ہو جاتے ہیں' خواہ نجاست خشک ہو یا تر۔

حاصل کلام: جوتوں اور موزوں پر اگر کسی قسم کی نجاست خواہ وہ خشک ہو یا تر' مرئی ہو یا غیر مرئی' خفیف ہو یا غلیظ' لگ جائے تو وہ پاک مٹی پر اچھی طرح رگڑنے سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ دھونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اس کے برعکس ہے البتہ احناف نے امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کو صحیح مانا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کی رو سے' امام احمد رحمہ اللہ نے بھی یہی رائے دی ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر صرف زمین پر جوتا یا موزہ اچھی طرح رگڑنے سے پاک و صاف ہو جاتا ہے' پانی سے دھو کر پاک و صاف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۷۲) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الحَكَمِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ هَذِهِ الصَّلاَةَ لاَ يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ كَلاَمِ النَّاسِ إِنَّمَا هو التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِراءَةُ القُرْآنِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز میں انسانی گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں۔ نماز میں تو صرف تسبیح (سبحان اللہ) تکبیر (اللہ اکبر) اور تلاوت قرآن ہونی چاہئے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ دوران نماز ایک نمازی نے چھینک ماری اس نے (الحمد لله) کہا اس کے جواب میں نماز ہی میں ہوتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ نے (یرحمك الله) کہہ دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ؐ نے مندرجہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں دوسرے کو مخاطب کر کے بات کرنا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ مدینہ میں سکونت اختیار کی اور بنی سلیم میں رہنے لگے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔

(١٧٣) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: إِنْ كُنَّا لَنَتَكَلَّمُ فِي الصَّلاَةِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: يُكَلِّمُ أَحَدُنَا صَاحِبَهُ بِحَاجَتِهِ، حَتَّى نَزَلَتْ ﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلاَةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا للهِ قَانِتِينَ﴾ فَأُمِرْنَا بِالسُّكُوتِ، وَنُهِينَا عَنِ الْكَلاَمِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں دوران نماز ہم ایک دوسرے سے بات چیت کر لیا کرتے اور اپنی ضرورت و حاجت آیک دوسرے سے بیان کر دیتے تھے تاآنکہ "حافظوا علی الصلوات والصلوہ الوسطی وقوموا للہ قانتین" آیت نازل ہوئی تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور نماز میں گفتگو اور کلام کرنے سے منع کر دیا گیا۔ (بخاری و مسلم۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ وان کنا ﴾ ان ۔ یہ نون ثقیلہ ہے جو اس جگہ نون مخففہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کا اسم محذوف ہے یعنی انا یا انہ اور کنا اس کی خبر ہے۔ ﴿ والصلاۃ الوسطی ﴾ "واؤ" اس جگہ تخصیص کیلئے ہے یعنی خاص طور پر صلاۃ وسطی پر محافظت کرو اور صحیح احادیث کی روشنی میں اس سے نماز عصر مراد ہے۔ ﴿ قانتین ﴾ ڈرتے' سہمے اور خاموش رہتے ہوئے۔ قنوت کے معنی متعدد ہیں اور صحابہ کرامؓ نے سکوت کا معنی یہی لیا ہے۔ یہ یا تو انہوں نے قرائن کی بنا پر اخذ کیا ہے یا نبی ﷺ کی تفسیر کی روشنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں کسی قسم کی گفتگو اور بات چیت ممنوع ہے۔ آغاز اسلام میں کلام کی اجازت تھی جسے بعد میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

راوی حدیث: ﴿ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ ابو عمرو ان کی کنیت ہے۔ غزوۂ خندق میں پہلی مرتبہ شامل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سترہ غزوات میں شریک ہوئے۔ معرکہ صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں تھے بلکہ ان کے مخصوص اصحابؓ میں شامل تھے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ٦٦ھ میں فوت ہوئے۔

(١٧٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «التَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيقُ لِلنِّسَاءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ مُسْلِمٌ: «فِي

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(نماز میں ضرورت کے وقت) مردوں کیلئے تسبیح (سبحان اللہ کہہ کر امام کو مطلع کرنا) اور عورتوں کیلئے تالی بجانا ہے۔) (بخاری و مسلم نے

الصَّلاَةِ». اسے روایت کیا ہے اور مسلم نے "فی الصلاۃ" یعنی نماز میں کا اضافہ کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿التسبیح للرجال﴾ جب نمازی امام کو درپیش ناگہانی صورتحال سے مطلع اور متنبہ کرنا چاہے تو وہ سبحان اللہ کہہ کر امام کو اس کی غلطی پر مطلع کرے اور اگر عورت ہو تو وہ تالی بجائے' بایں صورت کہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کے اوپر (الٹی جانب پر) مارے۔

حاصل کلام: جب امام نماز میں بھول جائے تو اسے متوجہ کرنے کیلئے مرد مقتدی سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی پر خبردار کرے اور اگر مقتدی عورت ہو تو وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر مطلع کرے گی۔ زبان سے سبحان اللہ وغیرہ کچھ نہیں کہے گی۔ عیسیٰ بن ایوب نے تالی پیٹنے کی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں اپنے بائیں ہاتھ کے باطن یعنی الٹی جانب پر مارے۔ عورت کو تالی بجا کر مطلع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کی آواز غیر مرد نہ سنیں گویا عورت کی آواز بھی پردہ ہے۔ اس پر دور حاضر کی آزاد منش خواتین کو صد بار غور کرنا چاہئے۔ نیز اس میں اس کی بھی تردید ہے کہ بعض نادان لوگ سبحان اللہ کی بجائے اللہ اکبر کہہ کر امام کو متوجہ کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سنت سے یہ ثابت نہیں ہے۔

(١٧٥) وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الشِّخِّيرِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي وَفِي صَدْرِهِ أَزِيزٌ كَأَزِيزِ الْمِرْجَلِ، مِنَ الْبُكَاءِ. أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ ابْنَ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت مطرف اپنے باپ عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اس وقت آپ کے سینہ مبارک سے گریہ و زاری کی وجہ سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے جوش کھاتی ہوئی ہنڈیا سے آواز آتی ہے۔ (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ازیز﴾ ہمزہ پر فتحہ اور زا پر کسرہ۔ جوش مارتے وقت ہنڈیا سے جو آواز آتی ہے۔ ﴿المرجل﴾ میم کے نیچے کسرہ "راء" ساکن اور جیم پر فتحہ۔ ہنڈیا کے معنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوران نماز خوف الٰہی سے رونا نماز کیلئے موجب فساد نہیں ہے۔ اس سے نماز میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿مطرف﴾ میم پر ضمہ اور را پر تشدید اور کسرہ۔ بن عبداللہ بن شخیر۔ شخیر۔ شین پر کسرہ اور "خاء" پر تشدید حرشی عامری بصری مشہور ہیں۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ثقہ ہیں' عبادت گزار اور فاضل آدمی تھے۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ ۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

﴿عن ابیہ﴾ اس سے مراد ہے عبداللہ بن شخیر بن عوف بن کعب الحرشی العامری رضی اللہ عنہ شرف صحابیت

سے سرفراز ہیں۔ بنی عامر کا جو وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ان میں یہ بھی نمایاں فرد تھے۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۷۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ لِيْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَدْخَلاَنِ ، فَكُنْتُ إِذَا أَتَيْتُهُ وَهُوَ يُصَلِّي، تَنَحْنَحَ لِيْ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے میرے دو اوقات تھے۔ جب میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپؐ نماز ادا فرما رہے ہوتے تو مجھے مطلع کرنے کیلئے کھنکار دیتے۔ (نسائی' ابن ماجہ)

لغوی تشریح: ﴿ مدخلان ﴾ "میم" اور "خاء" دونوں پر فتحہ اور درمیان میں واقع دال ساکن ہے۔ آپؐ کی خدمت میں حاضری کے دو اوقات۔ ﴿ تنحنح ﴾ حلق میں آواز کو گردش دینا۔ کھنکھارنا (اخ' اخ کرنا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران نماز ضرورت کے وقت ایسی آواز نکالنا جس میں حروف کی ادائیگی نہ ہو نماز کیلئے موجب فساد نہیں۔

(۱۷۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قُلْتُ لِبِلاَلٍ: كَيْفَ رَأَيْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَرُدُّ عَلَيْهِمْ حِيْنَ يُسَلِّمُوْنَ عَلَيْهِ، وَهُوَ يُصَلِّي؟ قَالَ: يَقُوْلُ هٰكَذَا وَبَسَطَ كَفَّهُ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت (عبداللہ) ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ نماز پڑھتے وقت جب لوگ نبی ﷺ کو سلام کرتے تو آپؐ ان کو کیسے جواب دیتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس طرح کرتے اور اپنا ہاتھ پھیلایا۔ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یرد علیهم ﴾ علیهم میں هم ضمیر سے اہل قباء مراد ہیں ﴿ یقول هکذا ﴾ عملاً کرتے یا اشارہ فرماتے۔ قول یہاں فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں ایسا اکثر اوقات ہوتا ہے۔ ﴿ وبسط کفه ﴾ دراز کیا' پھیلایا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ نماز میں سلام کا جواب اشارے سے دینا مشروع ہے۔ بہت سے لوگوں کی یہی رائے ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نماز میں سلام کا جواب دینا ممنوع سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب نماز میں جواب دینا جائز تھا۔ جب بعد میں نماز کی حالت میں گفتگو اور کلام کرنا حرام کر دیا گیا تو اسی وقت سے سلام کا جواب بھی حرام ہوگیا۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تو اس موقع کی بات ہے جبکہ نماز میں سلام کا جواب جائز تھا تو پھر اشارہ سے سلام کے جواب کی کیا ضرورت و حاجت رہ جاتی ہے۔ گفتگو کی ممانعت اور اشارہ سے سلام کا جواب تو اس بات کی دلیل ہے کہ

جب نماز میں بات چیت کرنا حرام تھا اس وقت اشارہ سے جواب جائز تھا۔ صحیح بات یہی ہے کہ بلاریب و تردد نماز کی حالت میں اشارہ سے سلام کا جواب جائز ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے نمازی کو سلام کہنا درست اور جائز ہے۔ البتہ جواب کلام سے نہیں بلکہ اشارہ سے دینا جائز ہے۔ اس اشارہ کی نوعیت کیا تھی تو اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ مسند احمد میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ جعفر بن عون نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپؐ نے اپنا ہاتھ لمبا کیا یعنی ہاتھ اوپر اٹھایا کہ ہاتھ کی پشت اوپر اور پیٹ نیچے تھا اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قصہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ آپؐ نے اپنے سر مبارک سے اشارہ فرمایا تھا۔ ان احادیث سے مترشح ہوا کہ سر سے اشارہ کرے یا ہاتھ پھیلا کر یا انگشت سے اشارہ کرے۔ تینوں صورتوں میں جواب دینا جائز ہے۔

(١٧٨) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي، وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا، وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «وَهُوَ يَؤُمُّ النَّاسَ فِي الْمَسْجِدِ».

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے (اپنی نواسی) امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو گود میں لیے رہتے' جب سجدہ میں جاتے تو اسے گود سے نیچے اتار دیتے اور سجدہ کر کے کھڑے ہوتے تو اسے (دوبارہ) گود میں اٹھا لیتے۔ (بخاری و مسلم) مسلم میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ لوگوں کو نماز پڑھاتے ہوئے یہ عمل کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ حامل ﴾ مرفوع اور تنوین کے ساتھ ہے۔ ﴿ امامۃ ﴾ حامل کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ وھو یوم الناس ﴾ ام یوم نصر ینصر' لوگوں کی امامت کراتے۔ یہ الفاظ ولالت کرتے ہیں کہ وہ نماز فرضی نماز تھی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل ضرورت کے وقت نمازی بچے کو گود میں اٹھا سکتا ہے اور یہ "عمل کثیر" ایسا نہیں کہ اس سے نماز باطل ہو جائے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا نماز میں اگر سر سے پگڑی (یا ٹوپی وغیرہ) گر جائے تو اسے اٹھا کر سر پر رکھ سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے تین سال کی بچی امامہ بنت زینب کو اٹھا لیا تھا تو پگڑی یا ٹوپی وغیرہ گرنے کی صورت میں اٹھا لینے میں آخر کیا مضائقہ ہے۔ یعنی اٹھا لینا جائز ہے۔ اتنا عمل' عمل کثیر نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا ﴾ امامہ حضور ﷺ کی لخت جگر زینب رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد کا نام ابوالعاص بن ربیع تھا۔ فاطمہؓ کی وصیت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے ہاں ہی انہوں نے وفات پائی۔

(۱۷۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اُقْتُلُوا الأَسْوَدَيْنِ فِي الصَّلاَةِ: الحَيَّةَ وَالعَقْرَبَ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”نماز میں دو سیاہ فام جانوروں سانپ اور بچھو کو مار دیا کرو۔“ (اس حدیث کو چاروں ابوداؤد‘ ترمذی‘ نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الحیۃ ﴾ سانپ‘ ﴿ العقرب ﴾ بچھو۔ دونوں اسودین کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ اسودین سے مراد سانپ اور بچھو دونوں ہیں۔ خواہ ان کا رنگ کوئی سا بھی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ لازماً ان کی رنگت سیاہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نماز کی حالت میں سانپ‘ بچھو کو مارنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں موذی جانوروں کا مارنا بھی ضروری ہے۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے کہ نماز کے دوران سانپ‘ بچھو کو مارنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض لوگوں سے اس کی کراہت بھی نقل کی ہے مگر دلائل کی روشنی میں جمہور کا فیصلہ ہی صحیح ہے۔

٤ - بَابُ سُتْرَةِ المُصَلِّي

نمازی کے سترے کا بیان

(۱۸۰) عَنْ أَبِي جُهَيْمِ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَوْ يَعْلَمُ المَارُّ بَيْنَ يَدَيِ المصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ مِنَ الإِثْمِ، لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْراً لَهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَوَقَعَ فِي البَزَّارِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ: «أَرْبَعِينَ خَرِيفاً».

حضرت ابو جہیم بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کرنے کا کتنا گناہ ہے تو اس کو نمازی کے آگے سے گزرنے کے مقابلے میں چالیس (برس) تک وہاں کھڑا رہنا زیادہ پسند ہو۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ یہ حدیث (مسند) بزار میں ایک دوسری سند سے ہے اس میں چالیس سال کا ذکر ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب سترۃ المصلی ﴾ سترہ۔ سین پر ضمہ اور ”تاء“ ساکن۔ جسے نمازی اپنی سجدہ گاہ کے آگے نصب کر لے یا کھڑا کرے خواہ دیوار ہو‘ ستون ہو‘ نیزہ ہو یا لکڑی وغیرہ‘ تاکہ یہ سترہ گزرنے والے اور اس نمازی کے درمیان حائل رہے۔ ﴿ المار ﴾ مرور سے اسم فاعل ہے۔ گزرنے والا ﴿ خریفا ﴾ سال کو کہتے ہیں نیز خریف ربیع کے بالمقابل ایک فصل کا بھی نام ہے اور یہ سال بھر میں ایک ہی مرتبہ وصول ہوتی ہے۔ یہاں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ یہ مجاز مرسل ہے اور یہی مجاز مرسل کی شان ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوجھیم بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ کہا گیا ہے کہ ان کا نام عبداللہ تھا۔ حارث بن صمہ انصاری کے بیٹے تھے جو خزرج قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور و معروف صحابی تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تک زندہ رہے۔ جھیم جھم سے تصغیر ہے اور (الصمۃ) صاد کے نیچے کسرہ اور میم پر تشدید ہے۔

(١٨١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سُئِلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَنْ سُتْرَةِ الْمُصَلِّي، فَقَالَ: «مثل مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے سترہ کے متعلق پوچھا گیا (کہ اس کی لمبائی کتنی ہونی چاہیے؟) تو آپ نے فرمایا "اونٹ کے پالان کے پچھلے حصہ کی اونچائی کے برابر ہونا چاہیے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی غزوۃ تبوک ﴾ ۹ھ رجب کے مہینہ میں رومیوں کے خلاف یہ غزوہ واقع ہوا مگر لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ تبوک حجاز کے شمال میں فلسطین کے قریب ایک جگہ ہے ﴿ موخرۃ ﴾ میم پر ضمہ واو ساکن "خاء" پر فتحہ اور نیچے کسرہ بھی ہو سکتا ہے اور ھمزہ پر فتحہ اور "خاء" پر تشدید اور فتحہ اور کسرہ دونوں اور میم پر فتحہ اور واؤ پر سکون بھی جائز ہے اور ھمزہ کے بغیر بھی ہے اور "خا" کے نیچے کسرہ۔ یہ وہ لکڑی ہوتی ہے جس پر سوار ٹیک لگاتا ہے ﴿ الرحل ﴾ کجاوے وغیرہ کا وہ حصہ جو اونٹ کی پشت پر رکھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگل میں سترہ کھڑا کرنا چاہیے۔ سترہ اتنا بلند اور لمبا ہونا چاہیے جتنی اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی ہوتی ہے۔

(١٨٢) وَعَنْ سَبْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لِيَسْتَتِرْ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلاَةِ وَلَوْ بِسَهْمٍ». أَخرَجَهُ الحَاكِمُ.

حضرت سبرہ بن معبد جھنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز (ادا کرتے وقت) تم میں سے ہر ایک کو سترہ ضرور ہی قائم کرنا چاہیے اگرچہ تیر ہی سہی۔" (مستدرک حاکم)

لغوی تشریح: ﴿ ولو بسھم ﴾ اگرچہ تیر ہی سہی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سترہ خواہ موٹا ہو یا باریک و پتلا۔ بس اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصہ کی لکڑی کی اونچائی اور لمبائی جتنا ہو۔

راوی حدیث: ﴿ سبرہ بن معبد جھنی رضی اللہ عنہ ﴾ مدنی صحابی ہیں۔ ذی المروۃ میں رہائش اختیار کی۔ ان کی کنیت ابوثریہ تھی (ثاء) پر ضمہ (راء) پر فتحہ اور "یاء" پر تشدید۔ پہلا غزوہ جس میں شامل ہوئے غزوۂ خندق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اہل شام سے بیعت لینے کیلئے بھیجا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخر دور حکومت میں وفات

پائی۔

(١٨٣) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَقْطَعُ صَلَاةَ المَرْءِ المُسْلِمِ - إِذَا لَمْ يَكُنْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلُ مُؤَخِّرَةِ الرَّحْلِ - الْمَرْأَةُ وَالحِمَارُ وَالكَلْبُ الأَسْوَدُ». الحَدِيْثَ. وَفِيهِ: «الكَلْبُ الأَسْوَدُ شَيْطَانٌ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مسلمان مرد کی نماز کو جب کہ اس کے آگے پالان کے پچھلے حصہ کے برابر سترہ نہ ہو عورت، گدھا اور کالا کتا توڑ دیتا ہے۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ ”کالا کتا شیطان ہوتا ہے“ (مسلم)

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ نَحْوَهُ دُوْنَ الكَلْبِ، وِلأَبِيْ، دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ نَحْوُهُ دُوْنَ آخِرِهِ، وَقَيَّدَ المَرْأَةَ بِالحَائِضِ.

اور اس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ہے مگر اس میں کتے کا ذکر نہیں ہے۔ نیز ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے مگر اس میں حدیث کا آخری حصہ نہیں ہے اور عورت کے متعلق حائضہ ہونے کی قید لگائی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ یقطع صلاۃ المرء ﴾ اس فقرے کا مطلب ہے کہ نماز کی برکت کم ہو جاتی ہے المراۃ فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے عورت کا نمازی کے سامنے سے گزرنا نماز کو توڑ دیتا ہے۔ ﴿ وفیہ ﴾ یعنی اس حدیث کا آخری حصہ۔ ﴿ الکلب الاسود شیطان ﴾ کالے کتے کو شیطان قرار دینے کی وجہ سے اس کی خباثت اور انتہائی برے منظر والا ہونا۔ ﴿ ولہ ﴾ میں ہ ضمیر راجع ہے۔ مسلم کی طرف یعنی مسلم میں۔ ﴿ عن ابی ھریرۃ نحوہ دون الکلب ﴾ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں کلب کا لفظ نہیں ہے۔ اس میں صرف عورت اور گدھے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن مسلم کے تمام نسخوں میں لفظ کلب موجود ہے تو پھر مصنف کا یہ کہنا کہ دون الکلب کے علاوہ باقی روایت اسی طرح ہے اور ﴿ دون الکلب ﴾ کے معنی مصنف کی نظر میں یہ ہیں کہ اس روایت میں کتے کی صفت کا ذکر نہیں ہے مطلق کتے کا ذکر ہے یعنی الکلب الاسود شیطان کا ذکر نہیں ہے۔ ﴿ ولابی داود .... نحوہ ﴾ ابوداؤد اور نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے (دون آخرہ) سوائے آخری حصہ کے یعنی حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر میں جو ﴿ الاسود الکلب شیطان ﴾ ہے وہ ابوداؤد، نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں نہیں۔ نحوہ اور آخرہ دونوں میں ”ضمیر“ کا مرجع حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے باوجودیکہ ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت دور ہے اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت قریب ہے کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کتاب میں اصالۃ ذکر کی گئی ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی متابعت کے طور پر۔ پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا آخری حصہ مذکور نہیں۔ ﴿ قید ﴾ تقید سے ماضی کا صیغہ ہے۔ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ میں کہ حائضہ عورت اور کتا نماز کو توڑ دیتے ہیں۔ (عون المعبود مطبوعہ ھند۔ ج ۱، ص: ۲۵۹)

حاصل کلام: سترہ کی مشروعیت کی حکمت کیا ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ جب بندہ نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو رحمت الٰہی اس کے سامنے ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ جب نمازی سترہ اپنے سامنے قائم کر لیتا ہے تو یہ سترہ حد فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس کی حدود میں داخل ہونے والے کے بالمقابل ہو جاتا ہے، کیونکہ پس پردہ مقابل کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر سترہ کے آگے سے کوئی گزرتا ہے تو رحمت اس کے مزاحم نہیں ہوتی۔ تو پھر کسی قسم کا نماز میں خلل اور نقص واقع نہیں ہوتا اور جب نمازی اپنے آگے کوئی سترہ قائم نہیں کرتا تو کوئی معین حد مقابلے میں نہیں ہوتی۔ پھر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ رحمت سجدہ کی جگہ تک دراز ہوتی ہے کہ اب اگر کوئی ان جگہوں میں گزرتا ہے تو رحمت اس سے مزاحمت کرتی ہے تو یہ نماز کی برکت میں نقص اور چہرے کے سامنے رحمت کے نزول کے انقطاع کا سبب بن جاتی ہے۔ جونہی آپ اس حکمت میں ذرا تامل سے کام لیں گے اور غور کریں گے تو حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور حق واضح ہو جائے گا۔ سترہ کے مسائل۔ ان بڑے بڑے مسائل میں سے ہیں جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ پس اتنی گفتگو اور بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ نماز کے ٹوٹنے سے مراد، نماز سرے سے باطل ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ نماز کی برکت اور ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور جس آدمی نے سترہ قائم کئے بغیر نماز پڑھی اور اس کے آگے سے اتنے فاصلہ سے کوئی گزر گیا جتنا فاصلہ ایک چٹکی کے ذریعہ پھینکے ہوئے سنگریزے کا ہوتا ہے تو گزرنے والا نماز کی برکت اور ثواب کو قطع کرنے کا موجب و باعث نہیں بن سکتا اور نہ وہ گناہ گار ہی ہوگا اس لئے کہ وہ رحمت کے نزول کے مقامات اور مواقع کے درمیان خلل انداز نہیں ہوا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ امام غیر مشروط طور پر مقتدی کیلئے سترہ کا کام دیتا ہے خواہ اس کے آگے سترہ ہو یا نہ ہو کیونکہ رحمت الٰہی کے متوجہ ہونے کی جگہ ان کیلئے ہے اور وہ ان مقتدیوں اور امام کے درمیان ہے اور یہ بات کہ عورت، کتا اور گدھا کا خاص کر ذکر کیوں کیا گیا؟ کیا ان کے علاوہ اور کسی چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی؟ ایسا نہیں ہے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز نماز کی برکت کو قطع نہیں کرتی۔ اگر یہ بات ہوتی تو پھر نمازی کے آگے سے گزرنے والے مرد کیلئے گناہ گار ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آگے سے گزرنے کے گناہ والی حدیث پہلی گزر چکی ہے۔ درحقیقت بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تینوں چیزیں وجود شیطان اور اس کی فتنہ انگیزی کی جگہیں گمان کی جاتی ہیں۔ دوسروں کی بہ نسبت ان سے نماز کے فاسد ہونے کی وجہ سے زیادہ شدید، زیادہ گھناؤنی ہے۔ ترمذی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ عورت چھپائے جانے والی چیز ہے۔ پس جب یہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس پر جھانکتا اور تاکتا ہے اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ عورت آتی ہے تو بصورت شیطان آتی ہے اور جب واپس جاتی ہے تب بھی شیطان کی صورت میں جاتی ہے اور گدھے کی آواز کے متعلق وارد ہے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے اور جہاں تک

کتے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو حدیث میں الکلب الاسود شیطان کی وضاحت موجود ہے۔ مطلق کتے کی خباثت بھی جانی پہچانی ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے اور جس شخص نے کتا پالا جب کہ شرع میں دی گئی اجازت کے مطابق نہ ہو تو اس نے ہر روز اپنے اجر و ثواب میں دو قیراط کی کمی واقع کر لی۔

(١٨٤) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: **إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُه مِنَ النَّاسِ، فَأَرَادَ أَحَدٌ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَلْيَدْفَعْهُ، فَإِنْ أَبَى فَلْيُقَاتِلْهُ، فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِيْ رِوَايَةٍ: فَإِنَّ مَعَهُ القَرِيْنَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی سترہ قائم کر کے نماز پڑھنے لگے اور کوئی آدمی اس کے سامنے (یعنی سترہ اور نمازی کے درمیان فاصلہ) سے گزرنے لگے تو (نمازی کو چاہئے کہ) وہ اسے روکنے کی کوشش کرے اگر وہ (گزرنے والا پھر بھی) باز نہ آئے تو اس سے لڑائی کرے کیونکہ وہ شیطان (بصورت انسان) ہے۔" (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے ساتھ اس کا ساتھی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ یجتاز ﴾ گزرتا ہے ﴿ بین یدیہ ﴾ اس کے آگے سے' سامنے سے۔ یعنی نمازی اور قائم شدہ سترہ کے درمیانی جگہ سے گزرتا ہے۔ بظاہر دونوں حکم یعنی دفع کرنا اور لڑنا وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واجب نہیں مندوب ہے ﴿ فانما ھو شیطان ﴾ اس کا یہ عمل شیطانی اکساہٹ کی وجہ سے ہے ﴿ القرین ﴾ ساتھی' مراد وہ شیطان ہے جو ہر لمحہ انسان کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیطان اس گزرنے والے کو اکساتا اور ابھارتا رہتا ہے' تاکہ نمازی حصول برکت اور رحمت سے محروم رہ جائے۔

حاصل کلام: نمازی کے سامنے سے گزرنا جب کہ اس نے سترہ قائم کیا ہو مکروہ ہے اور گزرنے والے کو روکنا واجب ہے یا مستحب و مندوب۔ ظاہر ہے کہ نزدیک تو بزور اسے روکنا واجب ہے۔ انہوں نے حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہی حدیث ان کی دلیل ہے۔ باقی سب کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ نمازی گزرنے والے کو اشارہ سے روکنے کی کوشش کرے' اس کے باوجود اگر وہ گزرنے پر بضد ہو تو ذرا سختی سے دھکا دے کر روکے پھر بھی وہ باز نہ آئے تو اسے مارے۔ بس اتنی لڑائی اس سے مراد ہے' دھینگا مشتی مراد نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہے جبکہ نمازی نے اپنے سامنے سترہ قائم کر رکھا ہو۔ اگر سترہ قائم نہیں تو پھر اس نمازی کا قصور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز اتنے عمل سے بھی نماز نہیں ٹوٹتی۔

(١٨٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاء وَجْهِهِ شَيْئاً، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَنصِبْ عَصاً، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَلْيَخُطَّ خَطاً، ثُمَّ لاَ يَضُرُّهُ مَنْ مَرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». أَخرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّان، وَلَمْ يُصِبْ مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ مُضطَرِبٌ بَلْ هُوَ حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے لگے تو اپنے سامنے کوئی چیز گاڑ لے یا قائم کر لے اگر کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو اپنی لاٹھی ہی کھڑی کر لے۔ اگر لاٹھی بھی ممکن نہ ہو سکے تو (زمین پر) خط ہی کھینچ لے۔ اب آگے سے گزرنے والا نمازی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور جس کسی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے اس نے صحیح نہیں کہا (وہ غلطی پر ہے) بلکہ یہ حدیث حسن کے مرتبہ کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ فلینصب ﴾ نصب سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ زمین میں کسی چیز کو گاڑنا' قائم کرنا' کھڑا کرنا وغیرہ۔ ﴿ لم یصب ﴾ اصابۃ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ صواب کو بھی نہیں پہنچ سکا' نہیں پا سکا' حاصل نہیں کر سکا۔ سترہ قائم کرنے کی بجائے صرف خط کھینچنے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ تو اسے منع کرتا ہے اور ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ سترہ کیلئے جب کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں خط کھینچنے کو کافی سمجھا ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف رائے ہے کہ سترہ کی کیفیت کیسی ہو؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ ہلالی صورت کا ہونا چاہئے (چاند کی شکل کا) یعنی محراب کی طرح قوس دار اور بعض نے کہا ہے قبلہ رخ لمبا خط کھینچا جائے اور یہ بھی رائے ہے دائیں' بائیں کھینچا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سترہ ہر چیز کا ہو سکتا ہے۔ کوئی چیز میسر نہ ہو تو خط بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کو مضطرب کہنے والے ابن الصلاح ہیں۔ مصنف نے النکت علی بن الصلاح میں تفصیل سے اس پر نقد کیا ہے۔

(١٨٦) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَيَقْطَعُ الصَّلاَةَ شَيْءٌ، وَادْرَءُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی (البتہ سامنے سے) گزرنے والے کو حتی الوسع روکنے کی کوشش کرو۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے' اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا یقطع الصلاۃ ﴾ اس کی نماز کو باطل نہیں کرتی ﴿ ادرءوا ﴾ دفع کرو' ہٹاؤ' دور کرو۔

اس کی سند میں "مجالد" نامی راوی ہے جس کے متعلق کلام کیا گیا ہے۔ یعنی اکثر ائمہ جرح و تعدیل نے ضعیف کہا ہے۔

٥ - بَابُ الحَثِّ عَلَى الخُشُوعِ فِي الصَّلاَةِ

نماز میں خشوع و خضوع کی ترغیب کا بیان

(١٨٧) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ مُخْتَصِراً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَمَعْنَاهُ أَنْ يَجْعَلَ يَدَهُ عَلَى خَاصِرَتِهِ.

وَفِي البُخَارِيِّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: «أَنَّ ذَلِكَ فِعْلُ اليَهُودِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں اپنے دونوں کولھوں (پہلوؤں) پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری اور مسلم۔ الفاظ حدیث مسلم کے ہیں)

اور بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ یہودیوں کی نماز کا طریقہ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿باب الحث﴾ حث یحث حثا ترغیب دلانا' ہمت دلانا' نشاط ابھارنا ﴿الخشوع﴾ تذلل اور سکون ظاہری اور باطنی طور پر۔ یعنی تمام اعضاء انسانی آنکھ' دل' ہاتھ' پاؤں وغیرہ کی ہر قسم کی حرکت صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہو۔ ﴿مختصرا﴾ اختصار سے اسم فاعل ہے۔ اس کی تفسیر خود مصنف نے بیان کی ہے یعنی کولھوں (پہلوؤں) پر اپنا ہاتھ رکھنا۔ خاصرہ انسان کے جسم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو سرین کے اوپر سے پسلیوں کے نیچے تک ہوتا ہے۔

حاصل کلام: نماز چونکہ خالص اللہ کیلئے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ ادا کرنی چاہئے۔ ایسی ہیئت' حرکت اور فعل سرزد نہیں ہونا چاہئے جو نماز کے اس وصف کے منافی ہو۔ دست بستہ کھڑا ہونا ہی ادب ہے۔ پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونا متکبرانہ فعل ہے جو عاجزی و انکساری کے خلاف ہے۔ نماز میں تو عجز و انکسار اور فروتنی و مسکین صورت و ہیئت ہونی چاہئے جو اللہ کو پسند ہے۔ تکبر و نخوت کی حالت ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے نماز میں "اختصار" کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ ہیئت یہود کی ہے اس لئے ان کے ساتھ مشابہت سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

(١٨٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ: قَالَ: «إِذَا قُدِّمَ العَشَاءُ فَابْدَءُوا بِهِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب شام کا کھانا پیش کیا گیا ہو تو مغرب کی نماز ادا کرنے سے پہلے کھانا' کھالو۔"

قَبْلَ أَنْ تُصَلُّوا الْمَغْرِبَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قدم ﴾ تقدیم سے مجہول کا صیغہ ہے۔ معنی ہے حاضر کیا گیا' پیش کیا گیا ﴿ العشاء ﴾ عین اور شین پر فتحہ اور مد رات کا کھانا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اگر کھانا تیار ہو چکا ہو (اور بھوک لگی ہو) تو پہلے کھانا تناول کر لینا چاہئے' تا کہ نماز کے خشوع میں نقص پیدا نہ ہو جائے کہ دھیان اور توجہ کھانے کی طرف رہے۔

(۱۸۹) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلاَةِ فَلاَ يَمْسَحِ الْحَصَى، فَإِنَّ الرَّحْمَةَ تُوَاجِهُهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، وَزَادَ أَحْمَدُ: «وَاحِدَةً أَوْدَعْ». وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ مُعَيْقِيبٍ نَحْوُهُ بِغَيْرِ تَعْلِيلٍ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی شخص نماز ادا کر رہا ہو تو (سجدہ گاہ) سے سنگریزوں (کنکریوں) کو اپنے ہاتھ سے نہ ہٹائے۔ کیونکہ (اس وقت) رحمت خداوندی نمازی کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔" (اسے پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

مسند احمد میں اتنا اضافہ ہے کہ اگر کنکریاں ہٹانا ہی ہیں تو ایک مرتبہ ہٹا دو یا چھوڑ دو اور صحیح بخاری میں حضرت معیقیب سے یہی روایت مروی ہے اس میں سبب کا بیان نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فلا یمسح ﴾ یعنی پیشانی رکھنے کی جگہ یا سجدہ کرنے کی جگہ (سے کنکریاں نہ ہٹائے) ﴿ والحصی ﴾ الحصبۃ چھوٹے سنگریزے' چھوٹی چھوٹی کنکریاں ﴿ زاد احمد فی روایتہ ﴾ احمد نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ اگر کنکریوں کے ہٹانے کی اشد ضرورت ہو تو پھر ایک مرتبہ ہٹا لے ورنہ چھوڑ دے ہاتھ بھی نہ لگائے۔ ﴿ بغیر تعلیل ﴾ یعنی اس میں علت بیان نہیں کی یعنی اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ہمیں راہ نمائی کرتی ہے کہ نماز میں سجدہ گاہ کو ہموار اور صاف نہیں کرنا چاہئے اگر ضرورت اس بات کی متقاضی ہو تو آغاز نماز سے پہلے یہ عمل کر لیا جائے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں' نماز کے ماسوا دوسری کسی چیز کا خیال نہ رہے۔ اگر سجدہ کی وجہ سے پیشانی خاک آلود ہو جائے تو دوران نماز اسے ہاتھ یا کپڑے سے صاف نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ اس موقع پر رحمت خداوندی نمازی کی جانب متوجہ ہوتی ہے' اگر نمازی ایسا فعل انجام دے گا تو رحمت سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہے البتہ شدید ضرورت کے لاحق ہونے کی صورت میں جائز ہے۔ **راوی حدیث:** ﴿ معیقیب رضی اللہ عنہ ﴾ میم پر ضمہ اور عین پر فتحہ۔ معیقیب بن ابی فاطمہ (ابوفاطمہ کے بیٹے) قبیلہ دوس سے تعلق رکھنے کی

وجہ سے دوسی کہلائے۔ مکہ میں قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ حبشہ کی ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ نبی ﷺ کی مہر نبوت پر متعین تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال کا عامل مقرر کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پائی۔

(١٩٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الالتِفَاتِ فِي الصَّلاَةِ، فَقَالَ: «هُوَ اخْتِلاَسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلاَةِ الْعَبْدِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے آنکھوں کے گوشوں سے نماز کے دوران ادھر ادھر دیکھنے کے بارے میں دریافت کیا۔ ارشاد فرمایا "یہ تو شیطان کا جھپٹا ہے جس کے ذریعہ شیطان انسان کی نماز کو جھپٹ لیتا ہے۔" (بخاری)

وَلِلتِّرمِذِيِّ عَنْ أَنَسٍ - وَصَحَّحَهُ - : «إِيَّاكَ وَالالتِفَاتَ فِي الصَّلاَةِ، فَإِنَّهُ هَلَكَةٌ، فَإِنْ كَانَ لاَ بُدَّ فَفِي التَّطَوُّعِ».

ترمذی کی حدیث (جسے اس نے صحیح قرار دیا ہے) میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نماز میں التفات (ادھر ادھر نظر دوڑانے) سے بچنے کی کوشش کرو یہ موجب ہلاکت ہے۔ اگر شدید اور ناگزیر مجبوری لاحق ہو تو نوافل میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿الالتفات﴾ دائیں بائیں نظر کرنا ﴿الاختلاس﴾ کسی چیز کو سلب کرنا۔ جلدی سے کسی سے چیز چھین لینا۔ ﴿ایاک﴾ کاف پر فتحہ۔ مرد کو خطاب ہے اور ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا بیٹے! نماز میں اپنے آپ کو التفات سے بچاؤ ایاک منصوب ہے تحذیر یعنی ڈرانے اور خوف دلانے کیلئے۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈرو اور التفات سے بچنے کی کوشش کرو۔ ﴿هلكه﴾ "ھاء" اور "لام" اور "کاف" تینوں پر فتحہ۔ معنی ہلاکت کے ہیں کیونکہ یہ تو شیطان کی اطاعت و فرمان برداری ہے اور وہی اس پر برانگیختہ کرتا ہے۔

حاصل کلام: شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے وہ کوئی موقع انسان کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا ضائع نہیں کرتا' حتیٰ کہ نماز میں بھی اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح نماز سے غافل کر دے اور کچھ نہیں تو کم از کم نمازی کی توجہ منتشر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر ادھر نظر پھیرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ نمازی نماز کے کسی نہ کسی جزء سے غافل اور بے پرواہ ہو جائے اور پورے ثواب سے محروم رہ جائے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے نمازی کو ہوشیار اور محتاط رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ شدید اور سخت ضرورت کے وقت التفات کی اجازت ہے بشرطیکہ گردن گھومنے اور گردش نہ کرنے پائے صرف آنکھوں کے کونوں سے دیکھا جائے۔

(١٩١) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز میں ہوتا

ﷺ: «إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلاَةِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ فَلاَ يَبْصُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلاَ عَنْ يَمِينِهِ، وَلَكِنْ عَنْ شِمَالِهِ تَحْتَ قَدَمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ: «أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ».

ہے تو اپنے آقا و پروردگار سے باتیں کر رہا ہوتا ہے (لہٰذا ایسی حالت میں) اپنے سامنے کی طرف اور دائیں جانب نہ تھوکے بلکہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے (تھوکے)" (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ بائیں طرف یا اپنے پاؤں کے نیچے۔

لغوی تشریح: ﴿ ینـاجی ﴾ مناجاۃ سے ماخوذ ہے۔ خفیہ طور پر گفتگو اور بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔ ﴿ فـلا یـبـصـقـن ﴾ پس مت تھوکے۔ یہ ممانعت تھوک وغیرہ کو شامل ہے ﴿ ولا عـن یـمـیـنـه ﴾ دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کا سبب دائیں جانب کی تعظیم و تکریم ہے اور حدیث میں اس کا سبب یہ بھی مذکور ہے کہ دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے دوران تھوک یا ناک وغیرہ آجائے تو سامنے اور دائیں جانب تھوکنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اگر نمازی مسجد میں ہو اور یہ ضرورت پیش آجائے تو کسی رومال یا کپڑے وغیرہ پر لے کر اسے مل دینا چاہئے۔ اگر کوئی چیز اس وقت دستیاب نہ ہو تو پھر تھوک وغیرہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے پھینک دے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب مسجد میں قالین وغیرہ نہ ہوں۔ پھر نماز سے فارغ ہوتے ہی اس جگہ کو صاف بھی کرے اور مزید برآں وہاں کوئی خوشبو چھڑک دے' تاکہ اثر زائل ہو جائے اور اس کی مجبوری کے گناہ کا کفارہ بھی بن جائے۔ بہرحال نماز میں قبلہ رو تھوکنا نہیں چاہئے۔ بعض صحابہؓ و تابعین رحمہم اللہ نماز سے باہر بھی اس کا اہتمام کرتے تھے۔ ادب و احترام اور پاکیزگی کا یہی تقاضا ہے۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک امام کو نماز کے دوران قبلہ رخ تھوکنے کی وجہ سے منصب امامت سے معزول فرما دیا تھا۔

(۱۹۲) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، سَتَرَتْ بِهِ جَانِبَ بَيْتِهَا، فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ ﷺ: «أَمِيطِي عَنَّا قِرَامَكِ هَذَا، فَإِنَّهُ لاَ تَزَالُ تَصَاوِيرُهُ تَعْرِضُ لِي فِي صَلاَتِي». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک زیبائشی چادر (برائے پردہ) تھی جو انہوں نے اپنے حجرے کے ایک طرف لٹکا رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "زیبائشی چادر کو ہمارے سامنے سے ہٹا دو کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں میرے سامنے (آکر) نماز میں خلل اندازی اور خرابی کا باعث بنتی ہیں۔" (بخاری)

وَاتَّفَقَا عَلَى حَدِيْثِهَا فِيْ قِصَّةِ

بخاری اور مسلم دونوں ابو جہم کی چادر انبجانیہ کے

أَنْبِجَانِيَّةِ أَبِي جَهْمٍ، وَفِيْهِ: «فَإِنَّهَا أَلْهَتْنِي عَنْ صَلاَتِي». قصہ میں متفق ہیں اس میں ہے کہ اس چادر نے مجھے میری نماز سے غافل کر دیا۔"

لغوی تشریح: ﴿ قرام ﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ راء پر تخفیف۔ مختلف رنگوں والا باریک کپڑا ﴿ امیطی ﴾ مجھ سے دور کر دو۔ ﴿ تصاویرہ ﴾ اس کی علامات اور نقوش۔ ضروری نہیں کہ یہ نقوش حیوانات کے ہوں کہ جس سے حیوان اور انسان کی تصویر کے جواز کی دلیل بنا لی جائے۔ ﴿ تعرض ﴾ ظاہر اور نمایاں ہوتے ہیں۔ ﴿ فی قصۃ انبجانیۃ ﴾ ہمزہ مفتوح' نون ساکن "با" کے نیچے کسرہ اور جیم مخفف۔ الف کے بعد والا نون مکسورہ اور یاء نسبتی پر تشدید یعنی "اونی چادر بغیر نقوش کے" قصہ اس کا یہ ہے کہ ابو جہم رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چادر تحفہ کے طور پر پیش کی۔ اس چادر میں کچھ نقوش و اعلام تھے اور وہ چادر تھی بھی باریک۔ آپؐ نے اسے پہن کر یا اوڑھ کر نماز ادا فرمائی تو آپؐ کی نظر بھی اعلام و نقوش کی جانب مبذول ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی فرمایا "اس چادر کو ابو جہم رضی اللہ عنہ کے پاس ہی لے جاؤ اور اس سے مجھے ﴿ انبجانیۃ ﴾ لا دو۔" آپؐ نے ابو جہم رضی اللہ عنہ کی خمیصہ (نقش دار چادر) کے بدلہ میں بغیر نقوش والی ﴿ انبجانیۃ ﴾ اسی سے طلب فرمائی تا کہ ایسا نہ ہو کہ ابو جہم رضی اللہ عنہ کے دل کو چوٹ لگے کہ اس کے تحفہ کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس فرما دیا۔ ﴿ فانھا الھتنی عن صلاتی ﴾ یعنی ابو جہم رضی اللہ عنہ کی چادر نے مجھے غافل اور مشغول کر دیا ﴿ الھتنی لھی یلھی ﴾ "ھا" کے نیچے کسرہ بمعنی غفلت' غافل کر دینا اور یہ ﴿ لھا لھوا ﴾ جس کے معنی کھیلنے کے آئے ہیں سے ماخوذ نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے نمازی کی توجہ نماز سے ہٹ کر اس کی طرف ہو جانے کا اندیشہ ہو اسے دور کر دینا چاہئے' تا کہ وہ نماز میں خلل انداز نہ ہو۔ اگر اسے دور کرنا اور ہٹانا بس میں نہ ہو تو خود سامنے سے ہٹ جانا چاہئے' تا کہ خشوع و خضوع اور توجہ میں کمی پیدا نہ ہو۔

راوی حدیث: ﴿ ابوجھم رضی اللہ عنہ ﴾ یہ ابن حذیفہ بن غانم قرشی العدوی ہیں۔ عدی قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے عدوی کہلائے۔ ان کا اصل نام عامر یا عبید ہے۔ فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں سے تھے۔ جب قریش نے کعبہ کو تعمیر کیا' اس موقع پر موجود تھے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے تعمیر خانہ کعبہ کے وقت بھی۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی ایام میں وفات پائی۔

(۱۹۳) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَرْفَعُونَ أَبْصَارَهُمْ إِلَى السَّمَاءِ فِي الصَّلاَةِ، أَوْلاَ تَرْجِعُ إِلَيْهِمْ» رَوَاهُ مُسْلِمٌ

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمان قوم نماز میں اپنی نظریں آسمان کی جانب اٹھانے سے باز آجائیں ورنہ ایسا نہ ہو کہ پھر ان کی نظریں واپس ہی نہ آئیں۔ (یعنی نابینا ہو جائیں)" (مسلم)

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے

عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لاَ صَلاَةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ، وَلاَ وَهُوَ يُدَافِعُهُ الأَخْبَثَانِ».

کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جب کھانا حاضر ہو اور قضائے حاجت درپیش ہو تو نماز نہیں ہوتی۔

لغوی تشریح: ﴿ لینتھین ﴾ انتہاء سے ماخوذ ہے اور اس میں لام قسم محذوف کا جواب ہے۔ آخر میں نون مشددہ تاکید کیلئے ہے اور یہ خبر ہے امر کے معنی میں۔ یعنی رک جائیں' باز آجائیں' منع ہو جائیں ﴿ اولا ترجع ﴾ یعنی واپس نہیں لوٹیں گی ان کی نظریں ﴿ الیھم ﴾ ان کی طرف۔ یعنی وہ نابینا ہو کر رہ جائیں گے۔ دونوں میں سے ایک کا وقوع لازمی ہے یا تو لوگ آسمان کی طرف اوپر نماز میں اپنی نظریں اٹھانے سے باز آجائیں گے یا پھر بطور سزا اللہ تعالیٰ ان کی نظروں کو اچک لے گا۔ ﴿ ولا وھو یدافعہ الاخبثان ﴾ یعنی اس وقت نماز نہیں ہوتی جب نمازی پیشاب یا پاخانہ روک کر نماز پڑھے

حاصل کلام: نماز کے دوران آسمان کی جانب اوپر نظریں اٹھانا حرام ہے۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ایسا کرنے والے کی نماز ہی نہیں رہتی۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ اس میں سخت نہی اور وعید ہے آسمان کی طرف دیکھنے کی۔ انہوں نے اس نہی کے تحریمی ہونے پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے قضائے حاجت کی اگر شدید حاجت ہو تو اسے روک کر نماز ادا نہ کرنی چاہئے۔ ایسی نماز نہیں ہوگی۔ پیشاب' پاخانہ کی جب شدید حاجت ہو تو اس وقت یہ دونوں نمازی کو ان سے فراغت کی جانب بزور کھینچ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے نماز میں یکسوئی نہیں رہتی۔

(١٩٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: قَالَ: «التَّثَاؤُبُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا تَثَاءَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَكْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «فِي الصَّلاَةِ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جمائی کا آنا شیطانی حرکت ہے۔ تم میں سے اگر کسی کو جمائی آجائے تو حتیٰ الوسع اسے روکنے کی کوشش کرے۔" (مسلم اور ترمذی۔ ترمذی نے اپنی روایت میں "نماز میں" کا اضافہ نقل کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ التثاوب ﴾ ھمزہ کے ساتھ۔ التثاوب کے معنی دل کے عضلات میں جو بخارات اور گیسیں جمع ہو جاتی ہیں ان کو خارج کرنے کیلئے منہ کا کھولنا کہ وہ خارج ہو جائیں التثاوب کہلاتا ہے۔ ﴿ من الشیطان ﴾ اس کا مطلب ہے کہ تثاوب (جمائی) معدہ کا خوب پر ہونا' بدن کا بوجھل اور بھاری ہونا۔ ان حواس کا مکدر ہونا جو سوء فہم اور سستی اور نیند کا موجب ہوتا ہے' کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں شیطان کو مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جمائی شیطانی حرکت ہے ﴿ فلیکظم ﴾ یاء مضارع پر فتحہ اور "ظاء" کے نیچے کسرہ یعنی اس کو روکے' باز رکھے' اسے روکنے کیلئے دونوں ہونٹوں کو بند رکھے یا منہ پر ہاتھ رکھ لے۔

حاصل کلام: جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ جمائی نتیجہ ہوتی ہے سستی' کاہلی اور معدہ کو خوب پر کرنے کا۔

ایسی حالت میں بندے کو دیکھ کر شیطان خوش ہوتا ہے۔ اس خوشی کو اس کی طرف منسوب کر دیا ہے "فی الصلاۃ" کی زیادتی بخاری میں بھی مروی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ جمائی کے دوران آواز نہیں نکالنا چاہئے۔

٦ - بَابُ الْمَسَاجِدِ — مساجد کا بیان

(١٩٥) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ. وَأَنْ تُنَظَّفَ وَتُطَيَّبَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَ إِرْسَالَهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں جائے نماز متعین کرنے اور ان کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا تھا۔ (اسے احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب المساجد﴾ مساجد مسجد کی جمع ہے۔ مسجد میں واقع جیم پر کسرہ ہے وہ جگہ جسے نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کر لیا گیا ہو اور جیم پر فتحہ بھی جائز ہے اس صورت میں اس کا معنی سجدہ کرنے کی جگہ۔ ﴿فی الدور﴾ دور' دار کی جمع ہے جس کے معنی گھر "دور" سے مراد محلہ یا قبیلہ ہے اس لئے کہ محلہ اور قبیلہ میں بہت سے گھر ہوتے ہیں یا گھر میں نماز پڑھنے کی جگہ مراد ہے۔ پہلا معنی زیادہ عمدہ اور قریب الفہم ہے ﴿وان تنظف﴾ تنظیف سے ماخوذ ہے صیغۂ مجہول ہے۔ گندگیوں اور ناپاکیوں سے صاف کیا جائے ﴿وتطیب﴾ تطیب سے ماخوذ ہے اور صیغۂ مجہول ہے اور اس میں خوشبو از قسم بخور وغیرہ لگائی یا جلائی جائے۔

حاصل کلام: مسجد اور نماز پڑھنے کی جگھوں کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھنا چاہئے اور ان میں خوشبو لگانی چاہئے۔ اس حدیث میں "دور" سے مراد محلے ہیں۔ محلوں میں چھوٹی چھوٹی مسجدیں ضرور ہونی چاہئے۔ انہیں خوشبو کی دھونی دے کر معطر رکھنا چاہئے۔ ذاتی گھروں میں بھی نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص ہونی چاہئے جہاں سنن و نوافل ادا کئے جا سکیں اور خواتین نماز ادا کر سکیں۔

(١٩٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «وَالنَّصَارَى».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت و برباد کرے انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔" (اسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نصاریٰ کے لفظ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا: **كَانُوا إِذَا مَاتَ**

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "جب ان میں صالح آدمی فوت ہو جاتا ہے تو یہ

فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِداً. وَفِيهِ: أُولٰئِكَ شِرَارُ الخَلْقِ. اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے۔" اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "یہ بدترین مخلوق ہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿ قاتل ﴾ لعن اور اهلك کے معنی میں استعمال ہوا ہے' جس کے معنی ہیں اللہ کی لعنت ہو اور اللہ انہیں تباہ و برباد کرے۔ قبروں کو مساجد بنا لینے کی وجہ سے ملعون قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل حرام ہے ﴿ زاد مسلم والنصاری ﴾ مسلم نے یہود کے بعد لفظ نصاریٰ کا اضافہ نقل کیا ہے (یعنی اس فعل کے نصاریٰ بھی مرتکب ہوتے ہیں) ﴿ شرار ﴾ شر کی جمع ہے جو اسم تفضیل اشر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی بدترین اور شریر ترین کے ہیں اور خلق مخلوق کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی تمام قسم کی مخلوقات میں بدترین مخلوق ہے۔

حاصل کلام : قرآن کے بیان کے مطابق یہ اہل کتاب ہیں جنہیں آسمانی کتب دی گئیں۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے انبیاء کرامؑ کی وفات کے بعد ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ اپنی حاجات طلب کرنا شروع کر دیں۔ اس فعل حرام کا ارتکاب جس طرح یہودیوں نے کیا اسی طرح عیسائیوں نے بھی کیا۔ اس طرح یہ شرک جلی کے مرتکب ہوئے جو خالق کائنات کی نظر میں سنگین ترین اور ناقابل معافی جرم ہے۔ اب نام کے مسلمانوں کو غور کرنا اور سوچنا چاہئے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنا کر کن گمراہ لوگوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور جس جرم بدتر کا ارتکاب کر کے شرار الخلق کے زمرہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ فعل بت پرستی کے مشابہ ہے۔ یہی کام غیر کرے تو قابل صد لعنت اور اگر مسلمان کہلانے والا کرے تو باعث اجر و ثواب۔ یہ اپنے آپ کو فریب اور دھوکہ میں مبتلا کرنے کے سوا اور کیا ہے۔ اس قبر پرستی کے جو نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں وہ سب کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ بت پرستوں کی تہذیب غالب آرہی ہے' ان کا تمدن ہر سو چھایا ہوا ہے' ان کے طور طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے افعال قبیح سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسجدوں کو سجدہ گاہ بنانے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ جو افعال مساجد میں صرف خدا کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں وہی قبروں پر انجام دیئے جائیں مثلاً سجدہ' رکوع کیا جائے یا دو زانو ہو کر ہاتھ باندھ کر تعظیماً ان کے سامنے قیام کیا جائے یا قبروں کے نزدیک مساجد تعمیر کی جائیں۔ میت کی تعظیم و تکریم کی بنا پر یا دوسری مساجد سے انہیں متبرک سمجھا جائے۔ یہ شرعاً درست نہیں۔

(۱۹۷) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ خَيْلاً، فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ، فَرَبَطُوْهُ بِسَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِ الْمَسْجِدِ»، الحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مختصر سا دستہ کسی طرف روانہ کیا۔ یہ لوگ ایک (مشرک) کو گرفتار کر کے آپؐ کی خدمت میں لائے اور اس قیدی کو مسجد (نبوی) کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا (قید

کر دیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ خیلا ﴾ گھوڑ سواروں کا دستہ۔ جماعت ﴿ فربطوه ﴾ اس کو باندھ دیا (مضبوطی کے ساتھ) ﴿ بساریۃ ﴾ ستون کے ساتھ ساریۃ کی جمع سواری آتی ہے۔ یہ قیدی جسے یہ دستہ گرفتار کر کے لایا' ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ تھے۔ گرفتاری کے موقع پر یہ کافر تھے۔ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت مشرک کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے نیز ضرورتاً مسجد کو جیل قرار دینا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کافر و مشرک مسجد میں مسلمانوں کے ارکان اسلام میں سے نماز کو ادا کرتے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں' تلاوت قرآن سنیں' صف بندی سے اتفاق و اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ دیکھیں۔ امیر و غریب کو ایک ہی صف میں دست بدستہ کھڑے دیکھیں اور ان سے تاثر قبول کریں۔ قیدی ہو کر آنے والا یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ عمرہ کی غرض سے آرہا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ مسجد نبویؐ میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز تک ستون سے باندھے رکھا آخر کار وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

(۱۹۸) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ عُمَرَ مَرَّ بِحَسَّانَ يُنْشِدُ فِي المَسْجِدِ، فَلَحَظَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ كُنْتُ أُنْشِدُ فيه، وَفِيْهِ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گزر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا' وہ مسجد میں اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف گھور کر دیکھا (اس پر) حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا (گھورتے کیوں ہو؟) میں تو اس وقت مسجد میں شعر پڑھا کرتا تھا جب مسجد میں وہ ذات گرامی موجود ہوتی تھی جو تم سے افضل تھی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ینشد ﴾ انشاد سے ماخوذ ہے "یاء" پر ضمہ اور "شین" پر کسرہ۔ اشعار پڑھنا ﴿ فلحظ الیه ﴾ دیکھنا۔ ناپسندیدہ نگاہوں سے ﴿ فقال ﴾ سے مراد حضرت حسان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ﴿ وفیه ﴾ "واؤ" حالیہ ہے یعنی جبکہ وہ مسجد میں تھے۔ ﴿ من هو خیر منك ﴾ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مسجد میں اشعار پڑھنا جائز ہے مگر ایسے اشعار نہ ہوں جو توحید کے خلاف ہوں' جن میں سے شرک کی بو آتی ہو' جو مذموم اور برے اشعار ہوں یا نمازیوں کیلئے دخل اندازی کا باعث ہوں کہ نماز میں توجہ منتشر کر دیں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ مسجد میں ایسے اشعار پڑھتے تھے جن میں کفار کی ہجو ہوتی تھی۔ آپؐ سن کر فرماتے تھے "روح القدس تیری مدد فرمائے۔ تمہارے اشعار کفار کو تیر کی طرح لگتے ہیں۔"

راوی حدیث: ﴿ حسان رضی اللہ عنہ ﴾ حسان بن ثابت انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور تھے۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ عرب متفق ہیں کہ شہری شعراء میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سب سے بڑے شاعر تھے۔ ۵۴ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک ۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔

(۱۹۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ سَمِعَ رَجُلاً يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ: لاَ رَدَّهَا اللَّهُ عَلَيْكَ، فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهَذَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ جو کوئی یہ سنے کہ کوئی آدمی مسجد میں اپنی گم شدہ چیز تلاش کر رہا ہے تو سننے والا اسے یہ کہے کہ اللہ کرے وہ چیز تمہیں واپس نہ ملے۔ مسجدیں اس مقصد کیلئے تو نہیں بنائی گئی ہیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ینشد ﴾ "یاء" پر فتحہ اور "شین" پر ضمہ۔ باب نصر ینصر کے وزن پر۔ تلاش و طلب کرنا۔ ڈھونڈنا یا تلاش کرنے کیلئے اونچی آواز سے پکارنا ﴿ ضالة ﴾ گم شدہ حیوان۔ اصلی معنی تو یہی ہیں پھر غیر حیوان کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جاتا ہے ﴿ لاردها الله علیک ﴾ بظاہر تو لا اس میں نافیہ معلوم ہوتا ہے اور نفی فعل پر وارد ہوئی ہے۔ دراصل یہ بددعا ہے گم شدہ چیز کے تلاش کرنے والے کیلئے کہ خدا کرے وہ چیز جس کی وہ تلاش کر رہا ہے اسے نہ ملے۔ کیونکہ وہ مسجد میں ایسے کام کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس مقام پر کرنا جائز نہیں ہے۔ ﴿ لم تبن ﴾ بناء سے ماخوذ ہے۔ صیغہ مجہول ہے یعنی اس غرض کیلئے ان کی تعمیر نہیں کی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ ہے اس سے مقصود لوگوں کو اس بات سے باز رکھنا ہے کہ باہر کہیں اس کی کوئی چیز گم ہو جائے اور وہ مسجد میں آکر اس کی تلاش شروع کر دے۔ یہ آداب مسجد کے خلاف ہے۔ آج کل مسجدوں میں جو اعلانات کی بھرمار ہے وہ بھی اصلاح طلب ہے۔ البتہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر آنے جانے والوں سے دریافت کرنے کی گنجائش ہے۔ اس حدیث میں جانور کا بطور خاص ذکر ہے کیونکہ جانور مسجدوں میں آکر گم تو نہیں ہوتے۔ تو پھر ان کی تلاش یہاں کیا معنی رکھتی ہے۔

(۲۰۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُولُوا: لاَ أَرْبَحَ اللَّهُ تِجَارَتَكَ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم کسی شخص کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے دیکھو تو اسے کہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاروبار و تجارت میں نفع نہ دے۔" (اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یبتاع ﴾ یشتری کے معنی میں، جس کے معنی خریدنا ہے ﴿ لا اربح اللہ تجارتک ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تیری اس تجارت کو سود مند اور منافع بخش نہ بنائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مساجد میں بیع و شراء، خرید و فروخت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ مسجدیں تجارتی منڈیاں نہ بنالی جائیں۔ مسجدیں تو صرف عبادت الٰہی کیلئے تعمیر کی جاتی ہیں اگر ان میں بھی تجارت شروع ہو جائے تو یہ اپنا مقصد تعمیر کھو بیٹھیں گی۔ ان کو صرف یاد الٰہی کیلئے ہی مخصوص ہونا چاہیے۔

(۲۰۱) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تُقَامُ الحُدُودُ فِي المَسَاجِدِ، وَلاَ يُسْتَقَادُ فِيهَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مساجد میں نہ تو حدود قائم کئے جائیں اور نہ ہی ان میں قصاص (خون کا بدلہ) لیا جائے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد اور احمد نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاتقام ﴾ اقامۃ سے ماخوذ ہے نہ نافذ کی جائیں نہ جاری کی جائیں۔ ﴿ الحدود ﴾ وہ سزائیں جن کی اللہ تعالیٰ نے سزا مقرر فرما دی ہے کہ فلاں جرم کی فلاں سزا ہے اور اتنی ہے ﴿ ولا یستقاد ﴾ صیغہ مجہول۔ قصاص لیا جائے ﴿ بسند ضعیف ﴾ ضعیف سند سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور یہی بات درست ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (مرعاۃ)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجدوں میں حدود قائم نہ کی جائیں اور قصاص بھی نہ لیا جائے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ سزا پانے والے کا خون یا گندگی پیٹ سے خارج ہو جائے اور مسجد گندی ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ﴾ حزام "حاء" کے نیچے کسرہ۔ ان کی کنیت ابو خالد تھی۔ قبیلہ قریش کے اسد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھائی کے بیٹے (بھانجے) تھے۔ اشراف قریش میں شمار ہوتے تھے۔ واقعہ فیل سے ۱۳ سال پہلے خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ۵۴ھ میں یا اس کے بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔ ساٹھ برس دور جاہلیت میں گزرے اور ساٹھ سال اسلام میں۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ چاروں کو صحابیت کا شرف حاصل تھا۔ خود بھی نہایت شریف القدر صحابی تھے۔

(۲۰۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أُصِيبَ سَعْدٌ يَوْمَ الخَنْدَقِ، فَضَرَبَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَيْمَةً فِي المَسْجِدِ، لِيَعُودَهُ مِنْ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ غزوۂ خندق کے روز حضرت سعد رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے تھے رسول اللہ ﷺ نے ان کیلئے مسجد میں خیمہ لگوا دیا تھا، تاکہ قریب سے ان کی تیمارداری (بآسانی) کر سکیں۔

قَرِيْبٍ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اصیب سعد ﴾ سعد سے مراد سعد بن معاذ ہیں جو اوس کے سردار تھے۔ غزوہ خندق کے موقع پر ان کے بازو کی رگ (اکحل ہفت اندام رگ) میں دشمن کا تیر لگا اور خون جاری ہو گیا۔ خون رکنے میں نہیں آتا تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے استدعا کی کہ وہ انہیں اس وقت تک وفات نہ دے جب تک وہ بنی قریظہ کا انجام نہ دیکھ لیں۔ اسلامی لشکر نے ان کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ خون بہنا بند ہو گیا' پھر جب بنو قریظہ ان کے فیصلہ کے مطابق گڑھیوں سے نیچے اتر آئے اور ان کو قتل کر دیا گیا (قابل جنگ مردوں کو) تو خون دوبارہ جاری ہو گیا' یہاں تک کہ وفات پا گئے اور ان کی وفات غزوۂ خندق میں تیر لگنے کے ایک ماہ بعد ہوئی۔ اور غزوہ احزاب شوال ۵ھ میں پیش آیا۔ اس معرکہ میں قریش' غطفان وغیرہ قبائل یہودی سازش سے مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو گئے تھے اور سب نے ملکر مدینہ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ مسلمانوں کو جب ان لوگوں کی سازش کا علم ہوا تو انہوں نے مدینہ کی شمالی جانب خندق کھود لی۔ محاصرے نے پچیس (۲۵) روز تک طول کھینچا۔ پھر ناکام و نامراد ہو کر واپس لوٹ گئے۔ ﴿ ضرب علیہ ﴾ خیمہ اس کے لئے نصب کیا۔ ﴿ لیعودہ ﴾ عیادۃ سے ماخوذ ہے۔ عیادت کہتے ہیں مریض کے حال احوال پوچھنے کے لئے جانے کو' ملاقات کرنے کو۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مسجد میں مریض کے قیام کے لئے خیمہ وغیرہ نصب کرنا جائز ہے۔ نیز مسجد میں سونا' بیمار یا زخمی کی بیمار پرسی اور تیمار داری کرنا اور اس کے علاج کا بندوبست کرنا بھی درست اور جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ سعد رضی اللہ عنہ ﴾ یہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں جو قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ کبار صحابہ میں شمار ہوتا ہے انہوں نے عقبہ اولیٰ و ثانیہ میں شرکت کی اور اسلام قبول کیا۔ اور ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے بنو عبدالاشہل نے اسلام قبول کیا۔ اپنی قوم میں سردار اور شریف انسان تھے قوم ان کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتی۔ ان کی رگ اکحل میں غزوۂ خندق کے موقع پر ایک تیر لگا جس کی وجہ سے ذی قعدہ ۵ھ کو واقعہ بنی قریظہ کے بعد فوت ہوئے۔

(۲۰۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْتُرُنِي، وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى الحَبَشَةِ يَلْعَبُونَ فِي المَسْجِدِ، اَلْحَدِيْثَ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپؐ میرے لئے پردہ بنے ہوئے تھے اور میں حبشیوں کے کھیل کو دیکھ رہی تھی جو وہ مسجد میں کھیل رہے تھے۔ یہ طویل حدیث کا جزء ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یسترنی ﴾ آپؐ نے مجھے پردہ میں لیا ہوا تھا یعنی نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے دروازے پر کھڑے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے پیچھے کھڑی ہو کر حبشیوں کا کھیل دیکھ

رہی تھیں۔ ﴿ الحبشۃ ﴾ حبشی کی جمع ہے یعنی ملک حبش کے باشندے ﴿ یلعبون ﴾ گرائمر میں یہ جملہ سے حال واقع ہو رہا ہے۔ روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا کھیل نیزے اور ڈھال کے ساتھ تھا اور عید کا دن تھا۔ اس قسم کا کھیل جنگی مشق کی قسم میں سے ہے۔ اس قسم کی جنگی مشق کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خوشی کے دن جنگی کرتب کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔ نیز عورت اجنبی مرد کو فی الجملہ دیکھ سکتی ہے مگر تفصیل سے نہیں یعنی اجنبی مرد کے اعضاء جسم کو بغور ملاحظہ نہیں کر سکتی۔

(٢٠٤) وَعَنْهَا أَنَّ وَلِيْدَةً سَوْدَآءَ كَانَ لَهَا خِبَاءٌ فِي الْمَسْجِدِ، فَكَانَتْ تَأْتِينِي، فَتَحَدَّثُ عِنْدِي. اَلْحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ ایک سیاہ رنگ لڑکی کا خیمہ مسجد میں تھا وہ میرے پاس باتیں کرنے کیلئے آیا کرتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ولیدۃ ﴾ لونڈی ﴿ خباء ﴾ "خاء" کے نیچے کسرہ "باء" مخفف۔ خیمہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿ فتحدث ﴾ دراصل تتحدث تھا۔ تتکلم کے معنی میں' بات کرنے' گفتگو کرنے کیلئے آتی ہے۔ حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت بھی مسجد میں رات بسر کر سکتی ہے بشرطیکہ کسی فتنہ و فساد کا خطرہ نہ ہو اور اس کیلئے مسجد میں خیمہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث بخاری میں ہے۔

(٢٠٥) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**الْبُصَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيئَةٌ، وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ اس کا کفارہ تھوک کو دفن کرنا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بندگی کیلئے تعمیر کی جاتی ہے' اسے ظاہری اور باطنی گندگی اور نجاست سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ مسجد میں تھوکنا آداب مسجد کے خلاف ہے شائستگی اور نظافت اور ذوق سلیم پر بھی ناگوار گزرتا ہے۔ اس لئے تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے' تاکہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔

(٢٠٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**لاَ تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ**». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ لوگ مسجدوں (کی تعمیر) میں فخر نہ کرنے لگیں۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے بجز ترمذی کے۔

ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یتباھی ﴾ ایک دوسرے پر فخر کریں گے ﴿ فی المساجد ﴾ یعنی مسجدوں کی تعمیر کی بلندی میں۔ علو شان میں۔ اس کی زیبائش و تزئین میں اور خوبصورتی میں۔

حاصل کلام: قیامت کے قریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مسجدیں تعمیر کریں گے خوب نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے آراستہ کریں گے پھر باہمی مقابلہ کریں گے کہ ہماری مسجد فلاں کی مسجد سے خوبصورت اور بہترین بنی ہوئی ہے مگر آباد نہ ہوں گی۔ نمازیوں سے خالی ہوں گی' تعمیر کرنے والوں کی بے حسی اور عدم توجہ کا نوحہ کر رہی ہوں گی۔

(۲۰۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا أُمِرْتُ بِتَشْيِيدِ الْمَسَاجِدِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مجھے مساجد کی آرائش و زیبائش (بناؤ سنوار) کا حکم نہیں دیا گیا۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ما امرت ﴾ "ما" اس میں نافیہ ہے۔ صیغہ مجہول ہے۔ ﴿ بتشيید المساجد ﴾ چونا گچ کرنا' آرائش کرنا' نقش نگاری کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کو نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا منع ہے۔ مسجدوں کو ذکر الٰہی اور خالص عبادت سے آباد کرنے کا حکم ہے۔ تزئین و آرائش سے توجہ الی اللہ میں فرق آجاتا ہے۔ مسجد کی عمارت سے مقصود تو عبادت گاہ کی علامت ہے۔ گرمی' سردی اور بارش وغیرہ سے تحفظ اور بچاؤ ہے۔ مساجد کی آرائش اور نقش و نگاری بادشاہوں کی سنت ہے۔ ولید بن عبدالملک پہلا شخص ہے جس نے مسجد نبوی ﷺ میں نقش و نگاہ کرائے۔ ورنہ عہد رسالت مآب' خلافت راشدہ میں کہیں دور دور تک بھی اس کے نشانات نہیں ملتے۔ علماء حق کو مجبوراً خاموشی اور سکوت اختیار کرنا پڑا۔

(۲۰۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُورُ أُمَّتِي، حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَغْرَبَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کئے گئے۔ (جو باعث ثواب ہیں) یہاں تک کہ وہ تنکا بھی میں نے ان اعمال میں دیکھا جسے آدمی مسجد سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے غریب کہا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿عرضت﴾ صیغۂ غائب صیغۂ مجہول ہے۔ ظاہر کئے گئے۔ سامنے کئے گئے ﴿اجور امتی﴾ اس کا نائب فاعل ہے۔ میری امت کے نامہ اعمال۔ ﴿علی﴾ "یاء" پر تشدید۔ ساتھ والی "یاء" کو یائے متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے ﴿القذاۃ﴾ قاف پر فتحہ۔ تنکا وغیرہ۔ جو مشروب میں گر جاتا ہے یا آنکھ میں پڑ جاتا ہے یا گھروں کے اندر عموماً پڑا ہوتا ہے ﴿واستغربہ﴾ اسے غریب کہا ہے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولی سے معمولی کام بھی اجر و ثواب سے خالی نہیں۔ مساجد کی صفائی اور پاکیزگی کی اسلام نے بہت تاکید کی ہے۔ تنکا تک مسجد میں رہنے نہ دیا جائے۔ جو شخص اتنا سا معمولی کام اس نظریہ کے پیش نظر انجام دیتا ہے کہ (تنکا اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے) اسے بھی اجر ضرور ملے گا۔ ترمذی نے اس کو غریب اس وجہ سے کہا ہے کہ اس کی سند میں "مطلب بن عبداللہ عن انس" کے واسطہ سے ہے اور مطلب نے حضرت انس رضی اللہ عنہ بلکہ کسی بھی صحابی سے سماع نہیں کیا۔

(۲۰۹) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلاَ يَجْلِسْ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی جب (بھی) مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (نفل) ادا کر لے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: حدیث میں جن نوافل کے پڑھنے کا حکم ہے اسے ﴿تحیۃ المسجد﴾ کہتے ہیں۔ شوافع کے نزدیک یہ واجب ہیں جبکہ جمہور اسے مستحب کہتے ہیں۔ حدیث کے ظاہر الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علماء نے ان نوافل کو مکروہ اوقات میں پڑھنے کی بھی اجازت دی ہے۔ اور بعض اوقات ممنوعہ میں ممنوع کہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خطیب منبر پر خطبہ بھی دے رہا ہو تو اس وقت بھی مسجد میں داخل ہونے والا دو رکعت پڑھ کر بیٹھے۔

۷ - بَابُ صِفَةِ الصَّلاَةِ — نماز کی صفت کا بیان

(نماز ادا کرنے کا مسنون طریقہ)

(۲۱۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلاَةِ فَأَسْبِغِ الْوُضُوءَ، ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ، ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ، ثُمَّ ارْكَعْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ رَاكِعاً، ثُمَّ ارْفَعْ حَتَّى

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم نماز ادا کرنے کیلئے کھڑا ہونے کا ارادہ کرو تو پہلے وضو اچھی طرح کر لو پھر قبلہ رو ہو کر تکبیر (اللہ اکبر) کہو۔ پھر قرآن کا جتنا حصہ تمہیں یاد ہو اس میں سے جتنا آسانی سے پڑھ سکتے ہو، پڑھو۔ پھر رکوع کرو اور پوری طرح اطمینان سے

تَعْتَدِلَ قَائِماً، ثُمَّ اسْجُدْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ سَاجِداً، ثُمَّ ارْفَعْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ جَالِساً، ثُمَّ اسْجُدْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ سَاجِداً، ثُمَّ افْعَلْ ذَلِكَ فِي صَلاَتِكَ كُلِّهَا». أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

رکوع کرو۔ پھر سیدھا کھڑے (ہو جاؤ) اور پورے اطمینان سے کھڑے رہو' پھر سجدہ کرو اور پورے اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو پھر سجدہ سے اپنا سر اٹھا کر پورے اطمینان سے بیٹھ جاؤ پھر دوسرا سجدہ کرو اور پورے اطمینان سے کرو۔ پس پھر باقی ساری نماز میں اسی طرح (اطمینان سے ارکان نماز ادا کرو)'' (اسے بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور امام احمد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ امام بخاری کے ہیں۔)

وَلاِبْنِ مَاجَهْ بِإِسْنَادِ مُسْلِمٍ: «حَتَّى تَطْمَئِنَّ قَائِماً» وَمِثْلُهُ فِي حَدِيْثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعِ بْنِ مَالِكٍ عِنْدَ أَحْمَدَ وَابْنِ حِبَّانَ. وَفِي لَفْظٍ لِأَحْمَدَ: فَأَقِمْ صُلْبَكَ حَتَّى تَرْجِعَ العِظَامُ.

ابن ماجہ نے مسلم کی سند سے رکوع سے کھڑے ہونے کے وقت یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ پورے اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ۔ احمد اور ابن حبان میں رفاعہ بن رافع بن مالک کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ اپنی کمر (پشت) کو سیدھا کرو کہ ہڈیاں اپنے مقام میں واپس آجائیں۔

وَلِلنَّسَائِيِّ وَأَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ: إِنَّهَا لَنْ تَتِمَّ صَلاَةُ أَحَدِكُمْ حَتَّى يُسْبِغَ الْوُضُوءَ كَمَا أَمَرَهُ اللَّهُ تَعَالَى، ثُمَّ يُكَبِّرَ اللَّهَ تَعَالَى، وَيَحْمَدَهُ، وَيُثْنِيَ عَلَيْهِ. وفيها: فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَاقْرَأْ، وَإِلاَّ فَاحْمَدِ اللَّهَ، وَكَبِّرْهُ، وَهَلِّلْهُ. وَلأَبِي دَاوُدَ «ثُمَّ اقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ، وَبِمَا شَآءَ اللَّهُ» وَلاِبْنِ حِبَّانَ: «ثُمَّ بِمَا شِئْتَ».

نسائی اور ابوداؤد میں رفاعہ بن رافع سے ہے کہ جب تک وضو کامل نہ ہو جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے اس وقت تک نماز مکمل نہیں ہو سکتی۔ پھر تکبیر کہے اور اللہ کی حمد و ثناء کرے اور اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے اگر تجھے قرآن کا کچھ حصہ یاد ہو تو اسے پڑھ بصورت دیگر اللہ کی حمد و توصیف کر اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ۔ ابوداؤد میں ہے کہ ''پھر سورۂ فاتحہ پڑھ اور مزید جو اللہ نے چاہا۔'' ابن حبان میں ہے ''پھر جو تم چاہو پڑھو۔''

لغوی تشریح: ﴿ فاسبغ الوضو ﴾ اسبغ امر کا صیغہ ہے' مبالغہ کرو' پوری طرح کرو۔ ﴿ تعتدل ﴾ اعتدال پر آجائیں' برابر اپنی جگہ پر آجائیں۔ ﴿ قائما ﴾ سیدھے کھڑے ہونا جس میں دائیں بائیں جانب جھکاؤ نہ ہو ﴿ فاقم صلبک ﴾ رکوع سے جب سر اٹھائے تو اپنی پشت اس طرح سیدھی کر کہ اس میں

کسی قسم کا ٹیڑھ اور جھکاؤ کی جانب میلان نہ ہو ﴿ العظام ﴾ ہڈیاں۔ پشت کی ہڈیاں اور اس کے سرے مراد ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی بھی ہو سکتی ہے ﴿ یثنی علیہ ﴾ باب افعال سے "یاء" پر ضمہ ہے۔ اس کی حمد و تعریف اور تعریف بھی مبالغہ کی حد تک۔ ﴿ وھللہ ﴾ تھلیل سے امر کا صیغہ ہے مطلب ہے کہ لا الہ الا اللہ کہو۔ یہ حدیث حدیث مسئی الصلاۃ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نبی ﷺ نے نمازی کو ارکان نماز پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ہر رکن نماز کو اپنی جگہ اور دو ارکان کے درمیانی وقفہ میں اطمینان و اعتدال واجب ہے۔ حدیث کے الفاظ "ثم اقرا ما تیسر" سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرأت قرآن واجب ہے ایک دوسری روایت میں "ثم اقرا بام القرآن" کے الفاظ بھی منقول ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ماتیسر اور بام القرآن دونوں ایک ہی معنی دے رہے ہیں اور وہ فاتحہ ہی ہے۔ اس حدیث میں نماز کی ترتیب کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں امام' مقتدی اور منفرد نماز ادا کرتے ہیں' انہیں سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو آپؐ نے بدترین چور اور ایسی نماز کو منافق کی نماز قرار دیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ رفاعہ بن رافع بن مالک رضی اللہ عنہ ﴾ ابو معاذ ان کی کنیت ہے' زرقی انصاری مدنی مشہور ہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ بیعت عقبہ میں حاضر تھے۔ ان کے والد انصار میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ رفاعہ بن رافع بدر کے علاوہ باقی سب غزوات میں شریک رہے ہیں۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں شامل تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں ۴۱ھ میں وفات پائی۔

(۲۱۱) وَعَنْ أَبِي حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ، وَإِذَا رَكَعَ أَمْكَنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهُ، فَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ ٱسْتَوَى، حَتَّى يَعُودَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهُ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلاَ قَابِضِهِمَا، وَاسْتَقْبَلَ بِأَطْرَافِ أَصَابِعِ رِجْلَيْهِ القِبْلَةَ، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلَى رِجْلِهِ اليُسْرَى، وَنَصَبَ اليُمْنَى، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الأَخِيرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو تکبیر (اولیٰ) کے وقت اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر تک اٹھاتے دیکھا ہے اور جب رکوع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے اور اپنی پشت مبارک جھکا لیتے پھر جب اپنا سر رکوع سے اوپر اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہوتے کہ ہر جوڑ اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتا (اس کے بعد) پھر جب سجدہ فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ (زمین) پر اس طرح رکھتے کہ نہ زیادہ سمٹے ہوتے اور نہ زمین پر بچھے ہوئے ہوتے۔ حالت سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوتیں۔ جب آپؐ دو رکعت پڑھ کر قعدہ کرتے

الْيُسْرَى، وَنَصَبَ الأُخْرَى، وَقَعَدَ عَلَى مَقْعَدَتِهِ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

تو بایاں پاؤں زمین پر بچھا لیتے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھتے اور جب آخری قعدہ کرتے تو بایاں پاؤں (دائیں ران کے نیچے سے) آگے بڑھا دیتے اور دایاں کھڑا رکھتے اور سرین پر بیٹھ جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ حذو منکبیه ﴾ الحذو "حاء" پر فتحہ' ذال ساکن۔ مقابل برابر۔ دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے مقابل (برابر) اٹھاتے۔ ﴿ المنکب ﴾ "میم" پر فتحہ' نون ساکن۔ کاف کے نیچے کسرہ۔ کندھے اور بازو کے باہم ملنے کی جگہ ﴿ امکن یدیه من رکبتیه ﴾ الرکبة پنڈلی اور ران کے ملنے کی جگہ امکان مضبوطی سے پکڑنا۔ یعنی دونوں ہاتھوں سے دونوں گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا ﴿ هصر ظهره ﴾ اپنی کمر جھکائی' پشت نیچے کی ﴿ فقار ﴾ "فا" پر فتحہ اور قاف مخفف۔ پشت کی وہ ہڈی جو اوپر سے نیچے والے جوڑوں کو باہم ملاتی ہے ﴿ غیر مفترش ﴾ نہ پھیلانے والے اپنے بازوؤں کو ﴿ ولا قابضهما ﴾ اور نہ ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں کی طرف سکیڑنے' سمیٹنے والے ﴿ قدم رجله الیسری ﴾ قدم تقدیم سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگے بڑھانا' دراز کرنا۔ یعنی دائیں ران کے نیچے سے بڑھا کر دوسری جانب نکالنا ﴿ نصب ﴾ کھڑا رکھنا' قائم کرنا' دایاں پاؤں کھڑا رکھا وقعد علی مقعدته بائیں چوتڑ پر بیٹھ گئے اسے تورک کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نبی ﷺ کی نماز کی پوری کیفیت بیان کی گئی ہے کہ آپؐ ارکان نماز کو کس طرح ادا فرماتے تھے۔ للذا اہل ایمان کو اسی طرح نماز ادا کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہئے۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے "صلوا کما رایتمونی اصلی" نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ فرمان نبویؐ کی موجودگی میں اپنی سی کوشش کرنی چاہئے کہ نماز اسی طرح آرام' سکون و اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کی جائے جس طرح آپؐ نے پڑھ کر عملاً تعلیم دی ہے۔ جلدی جلدی ارکان نماز ادا کر کے نماز کو خراب نہیں کرنا چاہئے۔ تنگ وقت میں جلدی جلدی نماز پڑھنے والے کو مرغ کی ٹھونگوں سے تشبیہہ دے کر منافق کی نماز قرار دیا گیا ہے۔ نمازیوں کو بہت فکر کرنی چاہئے کہ نمازیں بھی پڑھیں مگر حاصل بھی کچھ نہ ہو۔ ایسی نمازوں کا کیا خاک فائدہ۔

راوی حدیث: ﴿ ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ ﴾ ابو حمید (تصغیر کے ساتھ) ان کا نام عمرو تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ منذر بن سعد بن منذر تھے۔ بعض نے مالک انصاری خزرجی مدنی بھی نام بتایا ہے۔ خزرج کے باپ ساعدہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ساعدی کہلائے۔ احد اور بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ ۶۱ھ میں امیر معاویہؓ کے دور امارت کے آخر میں یا یزیدؒ کے شروع دور میں فوت ہوئے۔

(۲۱۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو پہلے یہ دعا پڑھتے کہ "میں

اللهِ ﷺ، أَنَّهُ كَانَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلاَةِ، قَالَ: «وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ والأَرْضَ - إِلَى قَوْلِهِ - مِنَ الْمُسْلِمِينَ. اللَّهُمَّ أَنْتَ المَلِكُ، لاَ إِلاَّ أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ، إلى آخره». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نے اپنے چہرے کو آسمانوں اور زمینوں کے خالق کی طرف متوجہ کیا اور میں مشرکوں سے نہیں۔ میری نماز و قربانی' میرا جینا و مرنا اللہ رب العزت ہی کے لئے ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' اسی کا مجھے حکم ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی مالک' تو ہی معبود ہے' تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں......" (آخر تک) (مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ إِنَّ ذَلِكَ فِي صَلاَةِ اللَّيْلِ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ یہ رات کی نماز (تہجد) میں پڑھا کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ اذا قام الی الصلاۃ ﴾ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے سے' مراد ہے تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے افتتاح کے طور پر پڑھتے۔ ﴿ وجھت ﴾ توجیہ سے ماخوذ ہے۔ میں نے چہرہ پھیرلیا ﴿ فطر ﴾ خلق کے معنی میں (پیدا کیا) ﴿ من المسلمین ﴾ تک اس بارے میں دو روایتیں مروی ہیں۔ ایک روایت میں ﴿ انا اول المسلمین ﴾ ہے۔ میں پہلا مسلمان (مطیع فرمان بندہ) ہوں۔ آیت قرآنی میں مذکور لفظ ﴿ وانا اول المسلمین ﴾ سے الفاظ کے لحاظ سے اور دوسرا ﴿ انا من المسلمین ﴾ معنیٰ کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ مصنف نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ تمام آیت اس طرح ہے ﴿ انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ' وبذلک امرت وانا اول المسلمین (٦: ٧٩' ١٦٢' ١٦٣) ﴿ الی آخرہ ﴾ سے مراد اس مشہور و معروف دعا کے اختتام تک۔ پوری دعا کا ترجمہ اس طرح ہے: "میں نے اپنا رخ اس ذات اقدس کی جانب کرلیا جو آسمانوں اور زمین کی خالق ہے' یکسو ہو کر اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یقیناً میری نماز' میری ہر عبادت' میرا جینا مرنا بھی اسی اللہ کیلئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک و پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں (ذات' صفات' حقوق و اختیارات میں) اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مطیع فرمان بندوں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے۔ تیرے سوا کوئی آقا و مالک نہیں۔ تو ہی میرا آقا و پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ و غلام ہوں۔ میں نے (یقیناً) اپنی جان پر ظلم کیا اور میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ لہٰذا میرے سارے (ہی) گناہ بخش دے (حقیقت بھی یہی ہے) کہ تیرے سوا کوئی بھی دوسرا گناہ بخش نہیں سکتا۔ مجھے عمدہ اور اچھے اخلاق کی طرف راہنمائی فرما۔ تیرے سوا بہترین اخلاق کی راہ کوئی دوسرا نہیں دکھا سکتا۔ مجھ سے میری بری خصلتیں ہٹا دے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ تیرے سوا برے اخلاق کو ہٹا بھی کوئی نہیں سکتا۔ بار بار تیرے حضور حاضر ہوں اور تیرا فرمانبردار ہوں۔ بھلائی ساری کی ساری تیرے قبضہ قدرت میں ہے اور برائی تیری جانب رجوع نہیں کر سکتی۔ میں تیرے ساتھ اور تیری

جانب ہوں۔ تو ہی بہت برکت والا اور بہت بلندی و برتری والا ہے۔ بخشش و خطا بخشی کا تجھی سے طلبگار ہوں اور توبہ کی صورت میں تیری جناب میں رجوع کرتا ہوں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ دعا رات کی نماز (تہجد) میں پڑھتے تھے۔

مشہور محقق و محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی (ج:ا' ص: ۲۰۳) پر اس حدیث پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم شریف کے باب صلاۃ اللیل میں دو طریق سے منقول ہے۔ ان دونوں طرق سے مروی روایت میں کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ رات کی نماز میں پڑھتے تھے۔ نیز اس حدیث کو ترمذی نے ابواب الدعوات میں تین طرق سے روایت کیا ہے۔ تینوں میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ نماز شب میں پڑھتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک روایت میں ہے کہ جب آپؐ فرض نماز کی ادائیگی کیلئے کھڑے ہوتے (تو اس موقع پر یہ دعا پڑھتے) اور ابوداؤد نے اپنی سنن کی کتاب الصلوٰۃ میں بھی دو طریق سے روایت نقل کی ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ رات کی نماز میں مانگتے تھے بلکہ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ آپؐ جب فرض نماز کی ادائیگی کیلئے کھڑے ہوتے تو اس وقت یہ دعا مانگتے اور دارقطنی کی ایک روایت میں ہے جب آپؐ فرض نماز کا آغاز فرماتے تو اس وقت وجھت وجھی الخ پڑھتے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب نیل الاوطار میں کہا ہے کہ ابن حبان نے بھی اسی طرح اس حدیث کی تخریج کی اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ جب آپؐ فرض نماز کیلئے کھڑے ہوتے اور اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسے روایت کیا ہے' انہوں نے فرض نماز کی قید لگائی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دوسروں نے بھی اسی طرح کہا۔ یہ قول کہ یہ دعا نفلی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور فرض نماز میں مشروع نہیں بالکل ہی باطل ہے۔

حاصل کلام: اس ضروری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دعا فرض نماز کے آغاز پر کرنا مسنون ہے۔ تلخیص میں یہ نہیں۔ سبل السلام میں تلخیص کا حوالہ ہے مگر صحیح نہیں۔

(۲۱۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ لِلصَّلَاةِ سَكَتَ هُنَيْهَةً قَبْلَ أَنْ يَقْرَأَ، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: أَقُولُ: «اللَّهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ، كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللَّهُمَّ نَقِّنِي مِنْ خَطَايَايَ، كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللَّهُمَّ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تھوڑا سا وقفہ فرماتے پھر قرأت شروع کرتے (ایک روز) میں نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! وقفہ کے دوران آپؐ کیا پڑھتے ہیں؟ فرمایا "اللھم باعد بینی وبین خطایای الخ پڑھتا ہوں۔ اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے مابین اتنا فاصلہ اور دوری فرما دے کہ جتنا مشرق و مغرب کے درمیان فاصلہ ہے۔ اے اللہ! مجھے گناہوں اور خطاؤں سے

اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالبَرَدِ» . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اس طرح صاف فرما دے کہ جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو پانی' برف۔اولوں سے دھو ڈال"۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ هنيهة ﴾ "هاء" پر ضمہ۔ "نون" پر فتحہ "یاء" ساکن۔ هاء پر فتحہ۔ تھوڑا سا وقفہ ﴿ نقنى ﴾ "نون" پر فتحہ۔ "قاف" پر تشدید نیچے کسرہ۔ تنقية سے امر کا صیغہ ہے۔ پاک و صاف کر دے ﴿ ينقى ﴾ صیغہ مجہول ﴿ الدنس ﴾ دال اور نون پر فتحہ' میل کچیل۔ ﴿ الثلج ﴾ "ثاء" پر فتحہ' لام ساکن۔ بخار جو فضا میں سردی کے درجہ انجماد تک پہنچنے کی وجہ سے منجمد ہو جاتا ہے اور سفید روئی کی طرح ہو کر زمین پر گرتا ہے (جسے برف کہتے ہیں) ﴿ والبرد ﴾ "باء" اور "راء" دونوں پر فتحہ ہے۔ بادلوں کا پانی جو سرد ہوا میں جم کر اولوں کی صورت میں زمین پر گرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت سے پہلے قدرے وقفہ ہے اور اس میں یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعائے افتتاح بلند آواز سے نہیں بلکہ آہستہ پڑھنی چاہیے۔

(٢١٤) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، وَبِحَمْدِكَ، وَتَبارَكَ اسْمُكَ، وَتَعالَى جَدُّكَ، وَلاَ إِلَهَ غَيْرُكَ» . رَوَاهُ مُسْلِمٌ بِسَنَدٍ مُنْقَطِعٍ، وَالدَّارَقُطْنِيُّ مَوْصُولاً، وَهُوَ مَوقُوفٌ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ (وقفہ کے دوران میں) سبحانك اللهم وبحمدك الخ پڑھتے تھے اے اللہ! تو پاک ہے (ہر عیب اور ہر نقص سے) سب تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں۔ بابرکت ہے تیرا نام اور بلند ہے تیری شان اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ (اسے مسلم نے منقطع اور دارقطنی نے موصول روایت کیا ہے اور یہ موقوف ہے۔

وَنَحْوُهُ عَنْ أَبِي سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ مَرْفُوعاً عِندَ الخَمْسَةِ، وَفِيْهِ: وَكَانَ يَقُولُ بَعْدَ التَّكْبِيْرِ: «أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيْعِ العَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهِ، وَنَفْخِهِ، وَنَفْثِهِ» .

احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تعوذ یعنی اعوذ بالله السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه ونفثه پڑھتے تھے "میں اللہ سمیع و علیم کی شیطان مردود سے پناہ لیتا ہوں اس کے وسوسوں سے' اس

کے پھونکنے سے یعنی کبر و نخوت سے اور اس کے
اشعار اور جادو سے"۔

لغوی تشریح: ﴿ وبحمدك ﴾ تیری حمد کے ساتھ تیری حمد و ستائش کرتا ہوں ﴿ وتعالی جدك ﴾ تیری عظمت و کبریائی بلند و بالا ہے۔ ﴿ موصولاً ﴾ یعنی یہ حدیث متصل سند کے ساتھ مروی ہے کسی قسم کا انقطاع نہیں ہے۔ ﴿ وهو ﴾ یعنی دارقطنی کی یہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں اور ﴿ نحوه ﴾ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی طرح ﴿ وفيه ﴾ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں الرجیم مردود، ذلیل، دھتکارا ہوا ﴿ من همزه ﴾ اس کے جنون سے یعنی اس سے اللہ کی پناہ کہ وہ کسی کو مجنون بنا دے۔ اس سے شیطان کی وسوسہ اندازی مراد ہے ﴿ ونفخه ﴾ اس کے تکبر سے یعنی اس تکبر و نخوت سے اللہ کی پناہ جو وہ لوگوں کے دماغوں میں بھر دیتا ہے اور وہ لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں برتر اور بڑا سمجھنے لگتے ہیں گویا ان کے دماغوں میں کبر و غرور کی ہوا بھر دیتا ہے ﴿ ونفثه ﴾ یعنی شعرہ۔ اس کے اشعار سے اللہ کی پناہ۔ اس سے وہ مذموم اشعار مراد ہیں جن کو وہ لوگوں کے دماغوں میں ڈالتا ہے اور جادو بھی اس سے مراد ہے۔ ان تینوں کلمات کا پہلا حرف مفتوح اور دوسرا ساکن ہے۔

حاصل کلام: تکبیر تحریمہ کے بعد سورۂ فاتحہ سے پہلے نبی ﷺ سے اللهم باعد الخ والی دعا ثابت ہے۔ بعض روایات کے مطابق انی وجهت وجهي والی دعا اور سبحانك اللهم الخ دونوں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے سبحانك اللهم والی حدیث اگرچہ موقوف ہے' مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی اسے بطور تعلیم بلند آواز سے پڑھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو سکھاتے تھے اس لئے یہ حکماً مرفوع ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ نیز سورۂ فاتحہ کے شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کی موافقت کرتے ہوئے اعوذ بالله ...... الخ کے پڑھنے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا ہے اس لئے تعوذ پڑھنا ضروری ہے۔

(٢١٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَسْتَفْتِحُ الصَّلَاةَ بِالتَّكْبِيْرِ، وَالقِرَاءَةَ بِ«الحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ، وَكَانَ إِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهُ وَلَمْ يُصَوِّبْهُ، وَلٰكِنْ بَيْنَ ذٰلِكَ؛ وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ لَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَسْتَوِيَ قَائِماً، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُودِ لَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَسْتَوِيَ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز کا آغاز اللہ اکبر سے کیا کرتے تھے اور قرأت الحمد لله رب العالمين (سورہ فاتحہ) سے شروع کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنا سر مبارک نہ اونچا کرتے اور نہ نیچا کرتے بلکہ اس کے درمیان کی حالت میں رکھتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اس وقت تک سجدہ میں نہ جاتے جب تک کہ بالکل سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو دوسرا سجدہ اس وقت تک نہ کرتے جب

جَالِساً ، وَكَانَ يَقُولُ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةَ ، وَكَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرَى ، وَيَنْصِبُ الْيُمْنَى ، وَكَانَ يَنْهَى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ ، وَيَنْهَى أَنْ يَفْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعَيْهِ آفْتِرَاشَ السَّبُعِ ، وَكَانَ يَخْتِمُ الصَّلاَةَ بِالتَّسْلِيْمِ . أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلَهُ عِلَّةٌ .

تک کہ ٹھیک آرام سے بیٹھ نہ جاتے اور ہر دو رکعت کے بعد تشہد پڑھتے اور اپنے بائیں پاؤں کو زمین پر بچھا لیتے اور دائیں کو قائم رکھتے (کھڑا رکھتے) شیطان کی چوکڑی سے منع فرماتے اور درندوں کی طرح بازو آگے نکال کر بیٹھنے سے بھی منع فرماتے تھے اور نماز کو سلام کے ساتھ ختم کرتے۔ (مسلم۔ اس کی سند معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ يستفتح ﴾ آغاز فرماتے' شروع کرتے' ابتدا کرتے ﴿ والقراة ﴾ منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ قرأت شروع فرماتے ﴿ لم يشخص ﴾ اشخاص سے ماخوذ ہے (باب افعال) اونچا نہ اٹھاتے ﴿ ولم يصوبه ﴾ تصویب سے ماخوذ ہے (باب تفعیل سے) یعنی بہت زیادہ نیچے نہ جھکاتے ﴿ بين ذلك ﴾ یعنی ان دونوں کیفیتوں (اونچ' نیچ) کے مابین رکھتے۔ ﴿ فى كل ركعتين ﴾ یعنی دونوں رکعتوں کے بعد ﴿ التحية ﴾ یقول کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ یعنی تشہد ہے ﴿ التحيات لله ﴾ الخ پڑھتے اور ﴿ وكان يفرش رجله اليسرى ﴾ اپنا بایاں پاؤں زمین پر بچھا لیتے یعنی اس پر بیٹھ جاتے۔ یہ کیفیت دو سجدوں کے مابین اور پہلے تشہد کے موقع پر رکھتے جیسا کہ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں اس کی وضاحت ہے ﴿ وعقبة الشيطان ﴾ عین پر ضمہ اور قاف ساکن (شیطان کی چوکڑی) اسے اقعاء الکلب بھی کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی سرین کو زمین پر رکھے' گھٹنے اور پنڈلیاں کھڑی کر لے اور اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ لے۔ اقعاء کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ یہ ہے کہ اپنے دونوں پاؤں کھڑے رکھے اور زمین پر بیٹھ جائے۔ یہ ممنوع نہیں ہے۔ آخری تشہد کے علاوہ ﴿ افتراش السبع ﴾ سبع سین پر فتحہ اور "با" پر ضمہ۔ درندوں کے پھیلانے کی طرح اور درندوں کا بیٹھنا اسی طرح ہے کہ اپنی سرین پنڈلیوں پر بچھا کر بیٹھے اور اپنے ہاتھ آگے پھیلا کر ان پر جھک جائے۔ ایک روایت میں لفظ الکلب مذکور ہے السبع کی بجائے ﴿ وله علة ﴾ علة اس روایت میں یہ ہے کہ ابوالجوزاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کو روایت کیا اور ابوالجوزاء کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس وجہ سے اس حدیث کو معلول قرار دیا گیا ہے۔

(۲۱۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلاَةَ وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوعِ ، وَإِذَا رَفَعَ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کا آغاز فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل تک اٹھاتے اور جب رکوع کیلئے اللہ اکبر کہتے تو بھی اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تب بھی اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل تک اٹھاتے۔

رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

(رفع الیدین کرتے) (بخاری و مسلم)

وَفِيْ حَدِيْثِ أَبِي حُمَيْدٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتَّى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، ثُمَّ يُكَبِّرُ.

اور ابوداؤد میں ابوحمید سے مروی حدیث میں ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے پھر اللہ اکبر (تکبیر) کہتے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. نَحْوَ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ، لَكِنْ قَالَ: حَتَّى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوْعَ أُذُنَيْهِ.

اور مسلم میں مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی اسی طرح منقول ہے' جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے لیکن اس میں "کندھوں کے مقابل" کی جگہ اپنے کانوں کے مقابل تک اٹھاتے مذکور ہے۔

لغوی تشریح: ﴿یحاذی﴾ یقابل کے معنی یعنی بالمقابل ﴿ثم یکبر﴾ افتتاح صلاۃ کے وقت پہلے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل اٹھاتے پھر اللہ اکبر کہتے۔ اس کے برعکس پہلے تکبیر پھر رفع الیدین اور تکبیر کے ساتھ ہی رفع الیدین کا ذکر بھی حدیث سے ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس فعل میں یہ وسعت ہے۔ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور مصنف نے اسی پر انحصار کیا ہے۔ اس میں رکوع کے موقع پر اور رکوع سے اٹھتے وقت کا بھی ذکر ہے۔ ﴿نحو حدیث ابن عمر﴾ یعنی جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں تین مواقع پر رفع الیدین ثابت ہے ﴿فروع اذنیہ﴾ کانوں کے اطراف۔ یہ اس روایت کے مخالف ہے جس میں رفع الیدین کندھوں تک کرنے کا ذکر ہے۔ دونوں روایتوں میں تطبیق و موافقت اس طرح ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں تو کندھوں کے برابر اور انگلیوں کے پورے کانوں کے مقابل تک اٹھائے جائیں۔ یہ تطبیق اچھی ہے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ اسے بھی توسع پر محمول کیا جائے کہ کبھی کانوں کے برابر اور کبھی کندھوں کے برابر اٹھاتے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ' رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع الیدین مسنون ہے۔ بعض احادیث میں دو رکعتوں کے بعد تیسری رکعت کی ابتدا میں بھی رفع الیدین ثابت ہے۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا اسی پر عمل ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ' احمد رحمہ اللہ' ابوثور رحمہ اللہ' ابن مبارک رحمہ اللہ' اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ اور صحیح روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ سے بھی یہی منقول ہے۔ بلکہ زاد المعاد اور التلخیص الحبیر وغیرہ میں مروی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تادم زیست رفع الیدین کرتے رہے۔ خلفائے راشدین بلکہ باقی عشرہ مبشرہ سے بھی رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔ اس کے برعکس رفع الیدین نہ کرنے کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں۔ جس کی تفصیل فتح الباری' التلخیص الحبیر اور "جلاء العینین فی تخریج روایات البخاری فی جزء رفع الیدین" وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی شہادت اس مسئلہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ رفع الیدین پر

نبی کریم ﷺ کا ہمیشہ عمل رہا۔

چنانچہ فتویٰ ہے کہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کے بعد ۹ھ میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے (البدایہ والنہایہ' ج ۵ ص: ۷۵۔ شرح العینی علی صحیح البخاری ج ۹' ص: ۴۳)

آئندہ سال جب دوبارہ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو وہ سخت سردی کا موسم تھا۔ انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کپڑوں کے نیچے سے رفع الیدین کرتے دیکھا' یہ ۱۰ھ کے آخری مہینے تھے۔ اس کے بعد ۱۱ھ میں سرور دوعالم ﷺ کا انتقال ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی زندگی کے آخری حصے تک رفع الیدین کرتے رہے۔ نہ یہ عمل منسوخ ہوا نہ اس پر عمل متروک ہوا۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلکہ کوفہ کے علاوہ باقی تمام بلاد اسلامیہ میں اس پر عمل رہا۔ فقہائے اسلام کی اکثریت نے اس کو پسند کیا ہے۔ (بخاری و مسلم کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب میں بھی یہ حدیث موجود ہے: سنن ابی داوٗد' جامع ترمذی' سنن نسائی' سنن ابن ماجہ' سنن دارمی' موطا امام مالک' مصنف عبدالرزاق' المصنف لابن ابی شیبہ' مسند احمد' صحیح ابن خزیمہ' صحیح ابن حبان' مسند ابی عوانہ' سنن دارقطنی' سنن کبریٰ' للبیہقی وغیرہ۔)

(۲۱۷) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنَى عَلَى يَدِهِ الْيُسْرَى عَلَى صَدْرِهِ. أَخْرَجَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر باندھ لیے۔ (ابن خزیمہ)

حاصل کلام: اس حدیث سے دو مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلا مسئلہ تو یہ کہ نماز میں ہاتھ باندھ کر دست بستہ کھڑا ہونا مسنون ہے اور ہاتھ کھلے چھوڑنا غیر مسنون۔ شوافع' احناف اور حنابلہ سب اس پر متفق ہیں کہ نماز میں ہاتھ باندھنا ہی سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس کے خلاف نہیں آیا۔ جمہور صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے۔ ابن المنذر وغیرہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے اس کے سوا دوسرا کوئی قول نقل نہیں کیا بلکہ مؤطا امام مالک میں بھی ہاتھ باندھنے کی روایت موجود ہے تو پھر روایت پر عمل کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس امام مالک رحمہ اللہ سے جو ہاتھ چھوڑنے کا ذکر ہے' وہ شاذ ہے' صحیح نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہاتھ باندھے کہاں جائیں سینے پر یا زیر ناف۔ بعض حضرات زیر ناف باندھتے ہیں' مگر زیر ناف ہاتھ باندھنے والی حدیث ضعیف ہے' صحیح نہیں۔ متذکرہ بالا حدیث کو ابن خزیمہ نے اپنی الصحیح میں لکھا ہے جس کی تائید مسند احمد میں حضرت ھلب کی حدیث سے ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے تھے اور ایک روایت میں فوق السرۃ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ تحت السرۃ کے مقابلہ میں فوق السرۃ والی روایت وزنی ہے اور اہلحدیث علماء کرام کے نزدیک قوی دلائل کی روشنی میں سینے پر ہاتھ

باندھنا ہی راجح ہے اور تحت السرۃ یعنی زیر ناف والی حدیث ضعیف ہے' قابل اعتبار نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوھنیدہ یا ابوھندہ ہے۔ حجر "حا" پر ضمہ اور جیم ساکن۔ جلیل القدر صحابی تھے۔ حضر موت کے بادشاہوں میں سے تھے۔ جب یہ نبی ﷺ کی خدمت میں اپنے وفد کے ساتھ حاضر ہوئے تو آپ ؐ نے (ان کے اعزاز میں) اپنی چادر مبارک ان کے بیٹھنے کیلئے بچھا دی اور ان کیلئے اور ان کی اولاد کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔ حضر موت کے قبائل پر ان کو عامل مقرر فرمایا۔ کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے اور خلافت معاویہ ؓ کے دور میں وفات پائی۔

(۲۱۸) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ صَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس نے (نماز میں) ام القرآن نہ پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں۔" (بخاری و مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لاِبْنِ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيِّ: «لاَ تُجْزِىءُ صَلاَةٌ لا يُقْرَأُ فِيهَا بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ».

ابن حبان اور دار قطنی میں روایت ہے کہ "جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو وہ نماز کافی نہیں ہوتی۔"

وَفِي أُخْرَى لِأَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ وَابْنِ حِبَّانَ: «لَعَلَّكُمْ تَقْرَءوْنَ خَلْفَ إِمَامِكُمْ؟» قُلْنَا نَعَمْ؛ قَالَ: «لاَ تَفْعَلُوا إِلاَّ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ، فَإِنَّهُ لاَ صَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا.»

احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن حبان کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ "شاید تم لوگ امام کے پیچھے (کچھ) پڑھتے ہو' ہم نے عرض کیا جی ہاں (پڑھتے ہیں) فرمایا ایسا نہ کیا کرو بجز سورۂ فاتحہ کے۔ اس لئے کہ جس نے اسے نہ پڑھا اس کی (تو) نماز ہی نہیں۔"

لغوی تشریح : ﴿ بام القرآن ﴾ ام القرآن سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ یہ حدیث سورۂ فاتحہ کے (نماز میں) پڑھنے کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ "لام" نافیہ جس پر آتا ہے اس سے ذات کی نفی مراد ہوتی ہے اور یہ اس کا حقیقی معنی ہے۔ یہ صفات کی نفی کیلئے اس وقت آتا ہے جب ذات کی نفی مشکل اور دشوار ہو اور اس حدیث میں ذات کی نفی کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ نماز کا شرعاً معنی تو یہ ہے کہ وہ اقوال اور افعال کا مجموعہ ہے لہٰذا بعض یا کل کی نفی سے اس کی نفی ہوگی۔ اگر بالفرض ذات کی نفی میں دشواری پیش آئے تو پھر حقیقت کے قریب والی صفت پر محمول کیا جائے گا مثلاً اس کی صحت کی نفی اور اس کے کافی ہونے کی نفی۔ اس معنی کی تائید حدیث میں وارد الفاظ ﴿ لا تجزی صلاۃ ﴾ سے ہوتی ہے اس کے معنی ہوئے کہ نہ نماز کافی ہوگی اور نہ صحیح۔ ابن حبان اور دار قطنی میں ہے کہ جب اس حدیث

سے نماز کی نفی اور اس کا صحیح نہ ہونا سورۂ فاتحہ کی قراءت پر منحصر ہے تو پھر معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اس میں سب شامل ہیں خواہ امام ہو یا مقتدی یا اکیلا نماز پڑھنے والا۔ سورۂ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا واجب ہے اس پر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت جسے مصنف نے بیان کیا ہے کھلی اور واضح دلیل ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث کھلا اور واضح ثبوت ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام ہو خواہ مقتدی یا اکیلا ہو۔ صحیح ترین مرفوع احادیث کی روشنی میں یہی مذہب حق اور مبنی بر صداقت ہے۔ شوافع' اہل حدیث اور اہل ظواہر اسی طرف گئے ہیں کہ ہر نمازی کو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین میں سے جمہور علماء کا یہی مسلک ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں ہر ایک کیلئے اس کا پڑھنا واجب ہے۔ اس میں امام اور مقتدی کا کوئی فرق نہیں اور نہ ہی جہری اور سری کا۔ مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے بھی الحمد (سورۂ فاتحہ) کا پڑھنا لازمی اور لابدی ہے۔ ابوداؤد' ترمذی اور نسائی وغیرہ میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد صحابہؓ سے پوچھا کہ کیا تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا۔ جی ہاں! اس پر آپؐ نے فرمایا کہ الحمد (سورۂ فاتحہ) کے سوا اور کچھ نہ پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی اور احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز قطعاً نہیں ہوتی۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے "ام الکلام" اور "التعلیق الممجد" میں کہا ہے کہ "کسی بھی صحیح حدیث سے فاتحہ خلف الامام کی ممانعت ثابت نہیں اور اس سلسلے میں جو نقل کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ سری نمازوں میں اور جہری کے سکتات میں مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ محدثین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔" ان کے علاوہ متقدمین و متاخرین علمائے احناف کی ایک جماعت دلائل کی بناء پر فاتحہ خلف الامام کی قائل رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ' شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل تھے حتیٰ کہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی سری نمازوں کے علاوہ جہری کے سکتات میں فاتحہ خلف الامام کو جائز قرار دیا ہے جس کی باحوالہ تفصیل توضیح الکلام جلد اول میں دیکھی جا سکتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج کے فرد تھے۔ سرداران انصار میں نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شریک تھے۔ غزوۂ بدر کے ساتھ دوسرے معرکوں میں بھی شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کی طرف قاضی اور معلم بنا کر بھیجا۔ پہلے حمص میں قیام پذیر ہوئے بعد ازاں فلسطین کی طرف منتقل ہوگئے اور "رحلہ" میں وفات پائی اور بقول بعض ۳۴ھ میں ۷۲ برس کی عمر میں بیت المقدس میں فوت ہوئے۔

(۲۱۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر

تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ كَانُوْا يَفْتَتِحُونَ الصَّلاَةَ بِـ«الحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور عمر رضی اللہ عنہ سب نماز کا آغاز الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

زَادَ مُسْلِمٌ: لاَ يَذْكُرُونَ «بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ» فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ وَلاَ فِي آخِرِهَا.

مسلم نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ قراءت کے شروع اور آخر دونوں موقعوں پر بسم اللہ الرحمان الرحیم نہیں پڑھتے تھے۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِأَحْمَدَ وَالنَّسَائِيِّ وَابْنِ خُزَيْمَةَ: لاَ يَجْهَرُوْنَ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

مسند احمد، نسائی اور ابن خزیمہ کی ایک روایت میں ہے کہ بسم اللہ الرحمان الرحیم کو جہری طور (اونچی آواز) پر نہیں پڑھتے تھے۔

وَفِيْ أُخْرَى لاِبْنِ خُزَيْمَةَ: «كَانُوا يُسِرُّونَ». وَعَلَى هَذَا يُحْمَلُ النَّفْيُ فِيْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ، خِلاَفاً لِمَنْ أَعَلَّهَا.

نیز ابن خزیمہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ بسم اللہ، آہستہ پڑھتے تھے اور اسی پر مسلم کی نفی کو محمول کیا جائے گا بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اسے معلول کہا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿لا یذکرون بسم اللہ﴾ بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ فقرہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ آپؐ کے صحابہ کرامؓ مطلقاً بسم اللہ الخ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ تو صرف اس پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ الخ کو جہری (بآواز بلند) نہیں پڑھتے تھے۔ ﴿یسرون﴾ اسرار سے ماخوذ ہے۔ صحابہ کرامؓ بسم اللہ بغیر آواز نکالے آہستہ آہستہ پڑھتے تھے ﴿وعلی ھذا﴾ بسم اللہ کو بے آواز یعنی سراً پڑھنے کی بنیاد پر۔ ﴿یحمل﴾ صیغہ مجہول۔ محمول کیا جائے گا ﴿النفی﴾ بسم اللہ کی نفی کو ﴿فی روایۃ مسلم﴾ مسلم کی وہ روایت جو ابھی الفاظ میں بیان کی گئی ہے ﴿خلافا لمن اعلھا﴾ یہ توجیہ اس شخص کے خلاف ہے جو یہ کہتا ہے کہ مسلم میں بسم اللہ کی نفی کا جو اضافہ ہے یہ معلول ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ نفی کو حقیقی پر محمول کیا جائے گا لیکن اس کے معلول ہونے کی صورت میں اس سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔ علت دراصل یہ ہے کہ اوزاعی نے یہ اضافہ قتادہ کے واسطہ سے مکاتبتاً نقل کیا ہے حالانکہ یہ علت درست نہیں کیونکہ اوزاعی اس کے روایت کرنے میں تنہا نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی اس کو روایت کرنے والے ہیں جن کی روایت صحیح ہے۔ لہٰذا نفی کی وہ تاویل صحیح ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص: ۲۰۴)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سورۂ فاتحہ سے قرأت کا آغاز کرتے اور بسم اللہ آہستہ پڑھتے تھے۔ بعض روایات میں بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنے کا بھی ثبوت ہے اس لئے بسم اللہ

کو آہستہ اور اونچی آواز سے پڑھنا یعنی دونوں طرح جائز ہے تاہم اکثر اور صحیح تر روایات سے آہستہ پڑھنا ہی ثابت ہے۔ یہ موقف شارح بلوغ المرام نیز قاضی شوکانی وغیرہ اور علامہ مبارکپوری کے موقف کے خلاف ہے اور دلائل سے درست بھی نہیں۔ علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کے برعکس لکھا گیا ہے۔

(۲۲۰) وَعَنْ نُعَيْمِ الْمُجْمِرِ قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَآءَ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، فَقَرَأَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيْمِ، ثُمَّ قَرَأَ بِأُمِّ الْقُرْآنِ، حَتَّى إِذَا بَلَغَ «وَلاَ الضَّآلِّيْنَ» قَالَ: آمِيْنَ. وَيَقُوْلُ كُلَّمَا سَجَدَ، وَإِذَا قَامَ مِنَ الْجُلُوسِ: اَللّٰهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ يَقُوْلُ إِذَا سَلَّمَ: وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ إِنِّي لَأَشْبَهُكُمْ صَلاَةً بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت نعیم المجمر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز پڑھی تو انہوں نے پہلے بسم اللہ تلاوت فرمائی پھر بعد ازاں ام القرآن (سورۂ فاتحہ) پڑھی تاآنکہ آپ ولا الضالین پر پہنچ گئے اور آمین کہی۔ راوی کا بیان ہے کہ جب سجدہ کیا اور جب بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوئے تو اللہ اکبر کہتے۔ پھر سلام پھیر کر فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! یقیناً میں تم سے نماز کی ادائیگی میں رسول اللہ ﷺ کے بہت مشابہ ہوں۔ (میری نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بہت مشابہ ہے) (نسائی' ابن خزیمہ)

حاصل کلام: یہ حدیث بسم اللہ الخ اور آمین بالجہر کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ جو آدمی امام سے متصل صف سے پچھلی صف میں ہوگا اسے امام کی قرأت اور دعا اسی صورت میں سنائی دے گی کہ وہ بلند آواز سے پڑھے (ورنہ اسے سنائی نہیں دے گی) پھر بسم اللہ اور آمین کے بلند آواز سے کہنے میں اختلاف رائے ہے باعتبار دلیل قابل ترجیح بات یہی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو آہستہ اور آمین بلند آواز سے کہی جائے۔ اکثر اوقات جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھی گئی ہے اور کبھی جہری طور پر بھی۔

سورۂ فاتحہ کے اختتام و اتمام پر آمین کہنا بالاتفاق مسنون ہے خواہ امام ہو یا مقتدی یا تنہا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک آمین کہنا واجب ہے اور اسے چھوڑنے والا گنہگار ہے۔ آمین کے معنی ہیں "اے اللہ! میری دعا قبول فرما۔"

راوی حدیث: ﴿ نعیم المجمر رحمہ اللہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ نعیم' نعیم کی تصغیر ہے۔ مجمر میں میم پر ضمہ' جیم ساکن اور دوسرے میم کے نیچے کسرہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہر جمعہ کو دوپہر کے بعد مسجد نبویؐ میں خوشبو کی دھونی دیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا نام مجمر مشہور ہوگیا۔ مشہور تابعی تھے۔ ابوحاتم' ابن معین' ابن سعد اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

(۲۲۱) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول

تَعَالَی عَنْهُ قَالَ: قال رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا قَرَأْتُمُ الفَاتِحَةَ فَاقْرَؤُا بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، فَإِنَّهَا إِحْدَى آيَاتِهَا». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَوَّبَ وَقْفَهُ.

اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم سورۂ فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی ساتھ ہی پڑھا کرو' اس لئے کہ وہ بھی سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہی ہے۔" (دارقطنی نے اس کا موقوف ہونا درست قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ صوب ﴾ تصویب سے ماخوذ ہے۔ حقیقت کو پہنچنے والی بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ جب بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہے تو یہ جہراً پڑھنے کی دلیل ہوئی جب فاتحہ جہراً پڑھی جائے تو یہ بھی جہراً پڑھی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے مگر یہ حدیث موقوف ہے جبکہ مسلم میں صحیح حدیث اس کے معارض ہے۔ جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سورۂ کو تقسیم کیا تو پہلا جزء الحمد للہ کو قرار دیا۔ بسم اللہ کو اس میں شمار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

(۲۲۲) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ أُمِّ الْقُرْآنِ، رَفَعَ صَوْتَهُ وَقَالَ: آمِينَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَحَسَّنَهُ، وَالحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ. وَلِأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ نَحْوُهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کی قراءت سے فارغ ہوتے تو آمین بلند آواز سے کہتے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے نیز ابوداؤد اور ترمذی میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی طرح ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت کے اختتام پر آپؐ باآواز بلند آمین کہتے تھے۔ مگر آمین بالجہر اور بالسر ایسا مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔ آمین کہنے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ بلند آواز یا آہستہ کہنے میں ہے۔ احناف آمین آہستہ کہنے کے قائل ہیں جبکہ دوسرے تین ائمہ' محدثین اور اہلحدیث بلند آواز سے آمین کہنے کے قائل ہیں۔

بہت سی صحیح احادیث سے آمین بالجہر کی تائید و توثیق ہوتی ہے چنانچہ ترمذی' ابوداؤد اور دارمی میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آمین کہی اور اپنی آواز کو دراز کیا اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں کہ آپؐ نے آمین بلند آواز سے کہی۔ اس حدیث کو ترمذی نے حسن اور دارقطنی نے صحیح قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح ابن حبان' دارقطنی' حاکم وغیرہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ام القرآن کی قراۃ سے فارغ ہوتے تو اونچی آواز سے آمین کہتے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح' امام بیہقی نے حسن صحیح کہا ہے اور امام دارقطنی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے اور امام ابن حبان اور ابن

خزیمہ نے اپنی کتاب "الصحیح" میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور حدیث بھی گزر چکی ہے۔
صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے کہ وہ جب امام کے پیچھے نماز پڑھتے لوگ بھی آمین کہتے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی آمین کہتے اور اسے سنت سمجھتے تھے۔ ان کے شاگرد نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آمین نہیں چھوڑتے تھے بلکہ ہمیں آمین کہنے کی ترغیب دیتے تھے۔
حضرت عطاء بن ابی رباح جو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور استاد ہیں' کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بلند آواز سے آمین کہتے اور وہ لوگ بھی بلند آواز سے آمین کہتے جو انکے پیچھے تھے یہاں تک کہ مسجد گونج اٹھتی۔ امام بخاری نے اسے مطلقاً روایت کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ' عبدالرزاق اور مسند الشافعی وغیرہ میں یہ صحیح سند سے مروی ہے۔
حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہود مسلمانوں سے تین باتوں کی بنا پر حسد کرتے ہیں سلام کے جواب پر صفوں کی درستگی اور امام کے پیچھے آمین کہنے پر۔" امام طبرانی نے الاوسط میں اسے بیان کیا ہے اور علامہ ہیثمی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے اسی طرح سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہود تمہارے ساتھ کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا سلام اور آمین پر حسد کرتے ہیں۔" امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ اور اسی نوعیت کی دیگر احادیث کی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نماز میں جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرے تو امام و مقتدی کو بلند آواز سے آمین کہنی چاہئے اور علمائے احناف کے مقتدر علماء نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔
امام ابن ہمام حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں متوسط درجہ کی آواز سے آمین کہنے کو پسند فرمایا ہے۔ مدارج النبوۃ اور اشعۃ اللمعات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہری نمازوں میں بلند آواز سے آمین کہتے اور مقتدی بھی آپ کی موافقت کرتے اور جہراً آمین کہنے کی احادیث زیادہ اور بہت صحیح آئی ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تنویر العینین میں کہا ہے کہ جہراً آمین کہنے کی احادیث اکثر اور واضح ہیں اور التعلیق الممجد میں مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انصاف کی بات تو یہی ہے کہ آمین زور سے کہنا دلیل کی روشنی میں قوی ہے اور یہی بات انہوں نے "سعایہ" میں فرمائی ہے بلکہ وہاں تو صاف طور پر اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ "آہستہ آمین کہنے والی روایات ضعیف ہیں جو جہراً آمین کہنے والی روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں"۔ اس اظہار حقیقت کے بعد ہم مزید کسی بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

(۲۲۳) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي أَوْفَي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہیں رکھ

لاَ أَسْتَطِيْعُ أَنْ آخُذَ مِنَ الْقُرْآنِ شَيْئاً، فَعَلِّمْنِي مَا يُجْزِئُنِي مِنْهُ، فَقَالَ: «قُلْ: سُبْحَانَ اللهِ، وَالحَمْدُ لِلَّهِ، وَلاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ، وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ العَلِيِّ العَظِيمِ» الحَدِيْثَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ.

سکتا۔ لہٰذا مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو (میری نماز کے لئے) اس کی جگہ کافی ہو جائے۔ فرمایا " سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولاقوہ الا باللہ العلی العظیم پڑھ لیا کرو۔" الحدیث (اس روایت کو احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور دارقطنی اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فعلمنی ﴾ تعلیم سے امر کا صیغہ ہے ﴿ ما یجزئنی ﴾ زاء کے بعد ھمزہ ہے' معنی ہیں جو میرے لئے کافی ہو جائے ﴿ منہ ﴾ قرآن کے بدلہ میں ﴿ الحول ﴾ قدرت اور حیلہ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کسی کو قرآن پاک میں سے کچھ بھی نہیں آتا تو مجبوری کی صورت میں یہ کلمات پڑھنے سے نماز ہو جائے گی۔ اس روایت سے اگر کوئی یہ استدلال کرے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں فرض نہیں ہے تو یہ سینہ زوری ہے ورنہ کہاں مجبوری کی حالت اور کہاں غیر مجبوری۔ یہ آدمی تو معذور تھا اس لئے معذوری کے دور ہونے تک اسے متبادل راستہ بتلایا گیا ہے۔ معذور کیلئے شریعت مطہرہ نے بہرصورت رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ عارضی رعایت سے احکام میں تغیر و تبدل نہیں ہو جاتا۔ ایک معذور آدمی اگر یہ کہے کہ میں وضو نہیں کر سکتا اور کہا جائے کہ بھئی پھر تم تیمم کر لو تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ اب وضو فرض ہی نہیں رہا ایسا کوئی بھی نہیں جو اس کا قائل ہو کہ عدم استطاعت وضو کی صورت میں تیمم کا مشورہ وضو کی فرضیت ساقط کر دے گا۔ اس لئے مجبوری کی صورت میں اگر ان کلمات کے پڑھنے کا حکم دیا تو اس سے فاتحہ کی فرضیت کیسے ساقط ہوگئی؟

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو معاویہ ہے۔ ان کے والد کا نام علقمہ بن حارث اسلمی ہے۔ خود بھی شرف صحابیت سے سرفراز اور باپ بھی (باپ بیٹا دونوں صحابی) صلح حدیبیہ اور خیبر میں شریک ہوئے اور بعد والے غزوات میں بھی حصہ لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کوفہ کی طرف منتقل ہوگئے۔ ۸۷ھ میں وفات پائی۔ کوفہ میں وفات پانے والے صحابہ کرامؓ میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ہیں۔ ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

(٢٢٤) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي بِنَا فَيَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَالعَصْرِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الأُوْلَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھاتے تھے تو ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے اور کبھی ہمیں کوئی آیت سنا بھی دیتے تھے۔ پہلی

الْكِتَابِ وَسُورَتَيْنِ، وَيُسْمِعُنَا الآيَةَ أَحْيَاناً، وَيُطَوِّلُ ٱلرَّكْعَةَ الأُولٰى، وَيَقْرَأُ فِي الأُخْرَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

رکعت بھی لمبی کرتے تھے اور آخری دونوں رکعتوں میں صرف فاتحۃ الکتاب پڑھتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بفاتحۃ الکتاب ﴾ یعنی فاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ) ہر رکعت میں پڑھتے تھے ﴿ وسورتین ﴾ ہرایک رکعت میں ایک سورۃ پڑھتے۔ ﴿ یسمعنا ﴾ اسماع سے ماخوذ ہے' ہمیں سناتے تھے ﴿ احیانا ﴾ حین کی جمع ہے' بسا اوقت' بعض اوقات ﴿ یطول ﴾ تطویل یعنی باب تفعیل z سے۔ طول دینا' لمبا کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے چند مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ظہراور عصر کی نمازوں میں قرأت بالاتفاق سری (خاموشی سے) ہے۔ جہری نہیں۔ تو پھر بعض اوقات کوئی آیت سنانے کی کیا حکمت اور وجہ ہے۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نمازیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ اس وقت قرآن مجید ہی کا کوئی حصہ تلاوت فرما رہے ہیں دوسرا کوئی ذکر یا دعا نہیں پڑھ رہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا بھی نمازیوں کو علم ہو جائے کہ اس نماز میں فلاں سورت پڑھی جا رہی ہے۔

ایک مسئلہ یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلی رکعت میں قرأت ذرا نسبتاً لمبی اور دوسری میں چھوٹی ہونی چاہئے۔ ائمہ ثلاثہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں قرأت مساوی ہونی چاہئے۔ ظہر' عصراور فجر میں تو پہلی رکعت کا لمبا ہونا نص سے ثابت ہے باقی دو کو انہی پر قیاس کرلیا ہے۔ ایسا آپؐ کیوں کرتے تھے؟ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پہلی رکعت میں شامل ہو جائیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں صرف الحمد کے سوا اور کچھ نہ پڑھے۔ لیکن بعض احادیث سے پچھلی رکعتوں میں قرأت کرنا بھی ثابت ہے۔ اس لئے آخری دو رکعتوں میں فاتحہ سے زائد نہ بھی قراءت پڑھی جائے تب بھی درست ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سری نمازوں میں کسی آیت کا بلند آواز سے پڑھنے سے سجدہ سہو لازم نہیں آتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا فعل آپؐ سے ایک مرتبہ ہی عمل میں نہیں آیا بلکہ متعدد بار ایسا ہوا ہے۔

(۲۲۵) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَحْزُرُ قِيَامَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، فَحَزَرْنَا قِيَامَهُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الأُولَيَيْنِ مِنَ ٱلظُّهْرِ قَدْرَ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم ظہراور عصر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا اندازہ لگایا کرتے تھے (کہ آپ دونوں رکعتوں میں کتنا قیام فرماتے تھے) ہم نے اندازہ لگایا کہ آپؐ ظہر کی پہلی دونوں رکعتوں میں اتنا قیام فرماتے جتنی دیر میں سورۂ

﴿آلم تنزیل﴾ السجدة وفي الأُخْرَيَيْنِ قدر النِّصْفِ مِنْ ذَلِكَ وَفِي الأُولَيَيْنِ مِنَ العَصْرِ، عَلَى قَدْرِ الأُخْرَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ، وَالأُخْرَيَيْنِ عَلَى النِّصْفِ مِنْ ذَلِكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

الم السجدۃ کی تلاوت کی جا سکے اور آخری دونوں رکعتوں میں پہلی دونوں سے نصف کے برابر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں ظہر کی آخری دونوں رکعتوں کے برابر اور عصر کی آخری دونوں میں عصر کی پہلی دو رکعتوں سے نصف۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نحزر ﴾ باب نصر ینصر تخمینہ لگاتے۔ قیاس کرتے۔ اندازہ لگاتے۔ ﴿ قدر الم تنزیل السجدہ ﴾ یعنی فاتحہ کے بعد اس سورۃ کی مقدار کے برابر قرأت فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظہر کی پہلی اور دوسری رکعت میں قرأت برابر ہوتی تھی۔ یہ بات پہلی مذکور حدیث کے خلاف ہے۔ اسے اوقات کے مختلف ہونے پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی برابر پڑھتے اور کبھی پہلی رکعت بڑی اور دوسری چھوٹی ہوتی تھی یا پھر یہ کہا جائے گا کہ پہلی رکعت میں چونکہ دعائے افتتاح اور تعوذ زائد پڑھے جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں احادیث میں تطابق پیدا ہو جائے گا اور اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ ﴿ وفی الاخریین قدر النصف ﴾ یعنی نصف مقدار ﴿ من ذلک ﴾ یعنی پہلی دو رکعتوں کی طوالت سے کم۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر و عصر کی نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کی مقدار قرات کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی دوسری آیت پڑھنا مسنون ہے۔ جس طرح کبھی نہ پڑھنا بھی مسنون ہے' لہٰذا نمازی اگر آخری دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ دوسری آیات بھی پڑھ لے تو اس کی اجازت ہے اور نہ پڑھے تب بھی گنجائش ہے۔

(٢٢٦) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: كَانَ فُلاَنٌ يُطِيلُ الأُولَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ العَصْرَ وَيَقْرَأُ فِي المَغْرِبِ بِقِصَارِ المُفَصَّلِ، وَفِي العِشَاءِ بِوَسَطِهِ، وَفِي الصُّبْحِ بِطِوَالِهِ، فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَحَدٍ أَشْبَهَ صَلاَةً بِرَسُولِ اللهِ ﷺ مِنْ هَذَا. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ فلاں صاحب ظہر کی پہلی دو رکعتیں لمبی کرتے ہیں (ان میں قرأت لمبی کرتے ہیں) اور نماز عصر میں تخفیف کرتے ہیں اور نماز مغرب میں قصار مفصل (چھوٹی سورتیں) اور عشاء میں اوساط مفصل اور صبح کی نماز میں طوال مفصل پڑھتے ہیں۔ تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے کسی کی امامت میں اس سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی نماز سے مشابہ نماز نہیں پڑھی۔ (نسائی نے اسے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿کان فلان﴾ سے مراد امیر مدینہ عمرو بن سلمہ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے عمر

بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مراد ہیں مگر یہ صحیح نہیں اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تو ولادت ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی ہے ﴿ یخفف العصر ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخفیف ظہر کے اعتبار سے عصر کی سب رکعتوں میں ہے ﴿ بقصار المفصل ﴾ قصار میں قاف پر کسرہ قصیرہ کی جمع ہے اور مفصل جس کے درمیان میں فاصلہ زیادہ ہو۔ یاد رہے کہ قرآن کا آخری حصہ جن چھوٹی چھوٹی سورتوں پر مشتمل ہے اس کا نام مفصل ہے۔ کیونکہ اس حصہ کی سورت چھوٹی ہے اور ہر سورت کی نوعیت یہ ہے کہ جیسے گفتگو میں فاصلہ ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ مفصل کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ مشہور تو یہی ہے کہ اس کا آغاز سورۃ الحجرات سے ہوتا ہے اور یہ بھی رائے ہے کہ دوسری کسی سورت سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کی انتہا آخر قرآن تک ہے۔ پھر مفصل کی تین اقسام ہیں۔ طوال مفصل' اوساط مفصل اور قصار مفصل۔ پس طوال مفصل سورۂ حجرات سے شروع ہو کر سورۂ بروج تک اور اوساط مفصل سورۂ بروج سے شروع ہو کر سورۂ بینہ تک اور سورۂ بینہ سے لے کر قرآن پاک کے اختتام تک قصار مفصل کہلاتی ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ حجرات سے لے کر اختتام قرآن مجید تک مفصلات کہلاتی ہیں۔ مفصلات کی تین اقسام ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ صبح کی نماز میں طوال مفصل اور نماز عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔

راوی حدیث: ﴿ سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ ﴾ ان کی کنیت ابوایوب تھی۔ یسار "یاء" پر فتحہ ہے۔ کبار تابعین میں سے ہیں۔ فقہائے سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بڑے عابد اور فقیہہ تھے۔ بہت بڑے مرتبہ کے عالم تھے۔ بے شمار احادیث ان سے مروی ہیں۔ حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۱۰۷ھ میں ۷۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۲۲۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالطُّورِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھتے سنا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بالطور ﴾ یعنی سورۂ طور نماز مغرب میں پڑھتے سنا ہے۔

حاصل کلام: عام معمول تو آنحضور ﷺ کا یہی تھا کہ مغرب میں قصار مفصل پڑھتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے مگر بعض اوقات لمبی سورت بھی پڑھتے تھے۔ جیسا کہ اس حدیث میں سورۂ طور پڑھنا ثابت ہوا۔ بعض روایات میں المص' صافات' اور حم الدخان کا نماز مغرب میں پڑھنا بھی ثابت ہے اور آپ ؐ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ؐ نے سفر کے دوران صبح کی فرض نماز میں صرف معوذتین کی تلاوت کی۔ بہرحال عام معمول وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا البتہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی جائز ہے۔

(۲۲۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي صَلاَةِ الفَجْرِ يَوْمَ الجُمُعَةِ (آلم تَنْزِيْلُ) السَّجْدَةَ، «وَهَلْ أَتَى عَلَى الإِنْسَانِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِلطَّبْرَانِيِّ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «يُدِيْمُ ذٰلِكَ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے روز نماز فجر کی پہلی رکعت میں الم تنزیل السجدۃ اور دوسری میں ھل اتی علی الانسان (سورہ دھر) پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور طبرانی میں ابن مسعود سے مروی روایت میں ہے کہ ایسا آپ ہمیشہ کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ یدیم ذلک ﴾ ادامۃ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے روز صبح کی نماز میں ان سورتوں کو ہمیشہ پڑھتے رہے۔

حاصل کلام: ان سورتوں کا التزام کیوں کرتے تھے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مصلحت و حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان سورتوں میں تخلیق آدم' روز قیامت بندوں کا میدان محشر میں جمع ہونا مذکور ہے اور احادیث میں مذکور ہے کہ قیامت بھی جمعہ کے روز قائم ہوگی غالباً اسی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آنجناب ﷺ جمعہ کے روز ان کا التزام فرماتے تھے۔ اس لئے جمعہ کے روز صبح کی فرض نماز میں ان دونوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ جن سورتوں کو نبی کریم ﷺ نے کسی نماز میں بالالتزام پڑھا ہو ہمارے لئے امتثال امر اور تعمیل عمل کرتے ہوئے ان سورتوں کو انہی نمازوں میں پڑھنا افضل اور مسنون ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی جا سکتی۔ مگر اتباع سنت کا تقاضا ہے کہ انہی سورتوں کو پڑھا جائے جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھی ہیں اور آج بحمد اللہ علمائے اہلحدیث اس کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲۲۹) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَمَا مَرَّتْ بِهِ آيَةُ رَحْمَةٍ إِلاَّ وَقَفَ عِنْدَهَا يَسْأَلُ، وَلاَ آيَةُ عَذَابٍ إِلاَّ تَعَوَّذَ مِنْهَا. أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی جب ایسی آیت گزرتی جس میں رحمت الٰہی کا ذکر ہوتا تو آپ وہاں وقفہ فرما کر رحمت طلب فرماتے اور جب آیت عذاب گزرتی تو وہاں ذرا وقفہ فرما کر اس سے پناہ مانگتے۔ (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ وقف ﴾ رک جاتے قرأت سے وقفہ فرما کر۔ ﴿ یسال ﴾ اللہ کی رحمت طلب فرماتے۔

حاصل کلام: یہ عمل غالباً آپ ؐ کا نماز تہجد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ مسند احمد اور ابن ماجہ میں عبدالرحمٰن بن

ابی لیلیٰ عن ابیہ سے روایت ہے کہ ایسا آپؐ نفل نماز میں کرتے تھے۔ اسی طرح مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تہجد کی نماز میں تھا اور اگر کوئی یہ عمل فرض نماز میں بھی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں بالخصوص جبکہ وہ اکیلا فرض نماز پڑھ رہا ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ کسی کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ (سبل السلام)

(٢٣٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَلاَ وَإِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعاً أَوْ سَاجِداً، فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظِّمُوا فِيهِ الرَّبَّ، وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَقَمِنٌ أَنْ يُسْتَجَابَ لَكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لوگو! سن لو کہ مجھے رکوع اور سجدہ میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا رکوع میں اپنے مالک و پروردگار کی عظمت بیان کرو اور سجدہ میں دعا مانگنے کی کوشش کرو۔ یہ اس لائق ہے کہ تمہاری دعا قبول کرلی جائے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فقمن ﴾ اس میں "فا" جزاء کیلئے ہے۔ قمن میں "قاف" پر فتحہ اور میم کے نیچے کسرہ یعنی اس کی مستحق ہے۔ اس لائق ہے۔

حاصل کلام: نماز کے مختلف ارکان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ہیئت الگ الگ ہے۔ ہر ایک کے حسب حال اذکار مقرر ہیں اور سنت سے ثابت ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تلاوت قرآن رکوع و سجود میں ممنوع قرار دی ہے۔ اس کی جگہ آپؐ نے رکوع میں عظمت رب یعنی سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ بعض محدثین اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک رکوع میں تعظیم رب اور سجدہ میں دعا کرنا واجب ہے البتہ جمہور علماء نے مستحب قرار دیا ہے۔ سجدہ قبولیت دعا کا ایک اہم ترین مقام ہے۔ اسی لئے آپؐ نے اس میں دعا کی ترغیب دی ہے۔ خود بھی سجدہ میں مختلف دعائیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک دعا آئندہ حدیث میں آرہی ہے۔

(٢٣١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ فِي رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ رکوع و سجود میں سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اللهم اغفرلی "تو پاک ہے اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! اپنی حمد و ثنا کے ساتھ۔ اے اللہ! مجھے بخش دے۔" پڑھا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وبحمدك ﴾ اس میں "واؤ" عطف کیلئے ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تیری

حمد و توصیف میں محو ہوتا ہوں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ "واؤ" حالیہ ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تیری پاکی بیان کرتا ہوں اس حال میں کہ میں تیری حمد و ثنا میں محو ہونے والا ہوں۔ رکوع و سجود کیلئے متعدد اذکار اور دعائیں حضور ﷺ سے ثابت ہیں۔ نمازی ان میں سے جسے چاہے منتخب کر سکتا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ رکوع میں (سبحان ربی العظیم) اور سجدہ میں (سبحان ربی الاعلی) کے علاوہ مذکورہ بالا دعا بھی پڑھی جا سکتی ہے بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ (اذا جاء نصر الله والفتح) نازل ہونے کے بعد آپؐ ہمیشہ رکوع و سجود میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ نمازی ان مسنونہ دعاؤں میں سے وقتاً فوقتاً جسے چاہے پڑھ سکتا ہے۔

(٢٣٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلاَةِ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْكَعُ، ثُمَّ يَقُولُ: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، حِيْنَ يَرْفَعُ صُلْبَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، ثُمَّ يَقُولُ وَهُوَ قَائِمٌ. رَبَّنَا وَلَكَ ٱلْحَمْدُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَهْوِي سَاجِداً، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَسْجُدُ. ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْفَعُ، ثُمَّ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي الصَّلاَةِ كُلِّهَا، وَيُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ مِنَ الثِّنْتَيْنِ بَعْدَ الجُلُوسِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے۔ پھر جب رکوع کیلئے جاتے تو اس وقت اللہ اکبر کہتے۔ پھر رکوع سے اٹھتے وقت سمع الله لمن حمده کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے اور پھر جب رکوع سے سیدھے کھڑے ہو جاتے تو ربنا ولك الحمد کہتے۔ پھر سجدے میں جاتے وقت تکبیر کہہ کر سجدے کیلئے جھکتے پھر سجدے سے اٹھتے ہوئے اللہ اکبر کہتے پھر سجدے میں جاتے تو اللہ اکبر کہتے پھر سجدے سے سر اٹھاتے ہوئے اللہ اکبر کہتے پھر ساری نماز میں اسی طرح کرتے جاتے تھے۔ پھر جب دوسری رکعت کی (تکمیل) کے بعد تشہد پڑھ کر اٹھتے تو بھی اللہ اکبر کہتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ ربنا لك الحمد ﴾ بعض روایات میں ﴿ ربنا ولك الحمد ﴾ بھی مروی ہے یعنی "لک" سے پہلے "واؤ" ہے بھی اور نہیں بھی۔ دونوں طرح ثابت ہے۔ "واؤ" کو جب ثابت رکھیں گے اس صورت میں تو محذوف پر عطف ہوگا۔ جیسے ہم نے آپ کی اطاعت اور حمد و ستائش کی یا "واؤ" کو حالیہ تسلیم کیا جائے گا یا پھر اسے زائدہ قرار دیا جائے۔ ساری صورتیں ممکن ہیں۔ بعض روایات میں اللهم ربنا لك الحمد بھی آیا ہے۔ ﴿ يهوى ﴾ باب ضرب يضرب سے هوى يهوى جھکنا، مائل ہو جانا، گر جانا وغیرہ۔

حاصل کلام : نماز میں جو تکبیریں کہی جاتی ہیں ان میں سے پہلی تکبیر کو تکبیر تحریمہ، تکبیر افتتاح یا تکبیر

اولیٰ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ اب نماز میں داخلہ کے بعد وہ سارے کام اور چیزیں حرام ہوگئیں جو نماز شروع کرنے سے پہلے حلال تھیں۔ باقی تکبیرات کو تکبیرات انتقال کہتے ہیں یعنی ایک رکن نماز سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے کی تکبیریں۔ پہلی تکبیر (تکبیر تحریمہ) تو فرض ہے اور باقی تکبیریں عند البعض واجب ہیں مگر اکثر کے نزدیک مسنون ہیں۔ بنو امیہ کے دور میں بعض امراء بنی امیہ نے ان تکبیروں کو غیر اہم اور معمولی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر اس دور کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لوگوں کو ان کے مسنون ہونے کی تعلیم و یاد دھانی کراتے تھے' تاکہ لوگ سنت نبویؐ پر عمل پیرا رہیں اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کا تعلق منقطع نہ ہونے پائے۔ ہر دور میں علماء حق کا فریضہ ہے کہ وہ نادان اور جاہل لوگوں کو سنت رسول ﷺ کی اہمیت و فضیلت سے آگاہ رکھیں اور انکار سنت کے فتنہ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں۔

(۲۳۳) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ قَالَ: «اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ، وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ العَبْدُ - وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ - اللّٰهُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلاَ يَنْفَعُ ذَا الجَدِّ مِنْكَ الجَدُّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے اپنا سر اوپر اٹھاتے تو اللھم ربنا لک ...... الخ کہتے تھے۔ (یعنی) اے اللہ! ہمارے آقا و پروردگار تعریف صرف تیرے ہی لئے ہے اتنی تعریف جس سے آسمان و زمین بھر جائے اور اس کے بعد ہر وہ چیز بھر جائے جسے تو چاہے۔ اے بزرگی اور تعریف کے مالک! تو اس کا زیادہ مستحق ہے جو کچھ بندہ کہے اور سبھی تیرے بندے ہیں۔ اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے تو ہی نہ دے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی کو اس کی بزرگی اور بخت آپ کے عذاب کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ملء السموات ﴾ "ملء" کے ہمزہ کو منصوب پڑھیں تو یہ مصدر ہوگا اور اگر ملء کے ھمزہ کو مرفوع پڑھنے کی صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی۔ ﴿ من شئی ﴾ "ما شئت" کا بیان ہے۔ یعنی جو کچھ بھی تو چاہے۔ ﴿ بعد ﴾ مبنی علی الضم اس کے بعد مضاف الیہ محذوف ہوتا ہے' مگر نیت میں موجود ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین بھر کی حمد و ثنا کے بعد۔ ﴿ اھل الثناء والمجد ﴾ اگر اھل کے لام پر ضمہ پڑھیں تو اس صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر بنے گا۔

یعنی اے بزرگی اور تعریف کے مالک! اور حرف نداء کے محذوف ماننے کی صورت میں اسے منصوب بھی پڑھا گیا ہے اور "ثناء" کے معنی زبان سے کسی کی تعریف کرنا ﴿ والمجد ﴾ عظمت و بزرگی۔ ﴿ احق ما قال العبد ﴾ احق کے قاف پر رفع اور ما موصولہ کی طرف مضاف ہے اور مبتداء محذوف کی خبر واقع ہو رہا ہے اور وہ ہے ربنا لک الحمد کا قول۔ بندے کے اقوال کا وہ زیادہ استحقاق رکھتا ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ یہ ﴿ اللھم لا مانع ﴾ خبر کا مبتداء ہو اور اس کا یہ قول کہ "ہم سب تیرے بندے ہیں" مبتداء اور خبر کے درمیان بطور جملہ معترضہ آیا ہو۔ لیکن پہلی تاویل زیادہ مناسب ہے۔ ﴿ ذاالجد ﴾ صاحب بزرگی۔ اس صورت میں کہ جد کی جیم پر فتحہ پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا۔ نصیبہ۔ وافر حصہ۔ استغنی۔ عظمت و غلبہ۔ ﴿ منک ﴾ تیرے مؤاخذہ اور گرفت سے یا یہ معنی کہ تیرے ہاں جو پکڑ اور مواخذہ ہے ﴿ الجد ﴾ دال پر رفع ہونے کی صورت میں فاعل ہے قول ﴿ لا ینفع ﴾ کا۔ یعنی کسی مالدار آدمی کو اس کی بزرگی اور تونگری کوئی فائدہ نہیں دے گی اور اسے تیری پکڑ اور گرفت مواخذہ سے بچا نہیں سکتی۔ بس عمل صالح ہی وہاں نفع دے گا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل و حجت ہے کہ قومہ کی حالت میں یہ دعا پڑھنا مسنون و مشروع ہے۔ جن حضرات نے اس دعا کو نفل نماز کے ساتھ مخصوص کیا ہے ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ صرف اپنے ذہن کی بات ہے۔ مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت اس خیال کی تردید کیلئے کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نماز میں اس کا پڑھنا ثابت ہے۔ نیز اس دعا کے اس جملہ "ولا ینفع ذاالجد منک الجد" سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے مالک و خالق کے پاس محض دنیوی جاہ و جلال اور عظمت و بزرگی کچھ بھی کام نہ دے گی اور نہ کسی حسب و نسب کا امتیاز کچھ فائدہ مند ثابت ہوگا وہاں تو عمل صالح کی قدر و قیمت ہوگی اور بس۔ کسی کا عالی نسب ہونا' بزرگوں کی اولاد ہونا' کسی معروف و مشہور خاندان سے متعلق ہونا عذاب الٰہی سے نہیں چھڑا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نوح علیہ السلام کا بیٹا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ اور نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حقیقی چچا ابو طالب عتاب الٰہی اور عذاب الٰہی کا شکار نہ ہوتے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے خاندان والوں کو بلا کر صاف طور پر کہہ دیا کہ عمل صالح کرو ورنہ اللہ کے عذاب سے بچنا مشکل اور اپنی لخت جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے صاف فرما دیا تھا کہ "بیٹی! میں تجھے عذاب الٰہی سے ہرگز نہیں بچا سکتا' گھمنڈ اور خوش فہمی میں نہ رہ جانا کہ میں نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لخت جگر ہوں۔ محض میری بیٹی ہونا تجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت اور پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ عمل صالح کیا کرو جو تجھے عذاب الٰہی سے بچا سکے" اولوالعزم پیغمبروں اور خاص کر رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی اولاد سے یہ فرما دیں تو اور کون ہے جو غرور نسب میں مبتلا ہو کر بھی کامیاب و کامران ہو جائے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قومہ میں صرف سیدھا کھڑا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مسنون دعاؤں میں سے کوئی دعا مثلاً یہ ہی دعا پڑھنی چاہئے۔

(۲۳۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أُمِرْتُ أَنْ أَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ أَعْظُمٍ: عَلَى الجَبْهَةِ - وَأَشَارَ بِيَدِهِ إِلَى أَنْفِهِ - وَالْيَدَيْنِ، وَالرُّكْبَتَيْنِ وَأَطْرَافِ الْقَدَمَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مجھے سات ہڈیوں (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اپنے دست مبارک سے اشارہ کر کے فرمایا "پیشانی و ناک پر اور دونوں ہاتھوں اور دونوں گھٹنوں اور دونوں قدموں پر۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امرت ﴾ صیغہ مجہول۔ حکم صادر فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ﴿ اعظم ﴾ ظاء پر ضمہ، عظم کی جمع ہے اور اشارہ ناک کی جانب۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ پیشانی اصل ہے اور ناک اس کے تابع ہے۔ حدیث مذکور اس پر دلالت کرتی ہے کہ متذکرہ بالا سات اعضاء پر اکٹھے سجدہ کرنا واجب ہے اس لئے کہ امر وجوب کیلئے آتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشانی اور ناک دونوں مل کر ایک عضو ہے اگر ان کو الگ الگ عضو شمار کیا جائے تو یہ آٹھ اعضاء بن جاتے ہیں اس لئے ان دونوں کو ایک عضو ہی شمار کیا جانا چاہیئے۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ تینوں امام اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگردان رشید امام ابویوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ بھی اس کے قائل ہیں کہ صرف پیشانی یا صرف ناک زمین پر رکھ کر سجدہ کرے تو یہ سجدہ ناتمام متصور ہوگا اور اسے سجدہ ہی شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عضو ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک اگر زمین پر رکھا گیا تو سجدہ ہو جائے گا اور کسی قسم کا کوئی نقص نہیں رہے گا۔ لیکن ایک تو یہ اکثریت کے خلاف ہے کیونکہ تین امام اور دو مزید حنفی امام ایک طرف اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تنہا ایک طرف۔ پھر یہ مذکورہ بالا حدیث کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کمزور ہے۔ ابن ابی شیبہ میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک ایسے نمازی پر ہوا جس کی ناک زمین پر لگ نہیں رہی تھی۔ آپؐ نے فرمایا "جس کسی کی پیشانی اور ناک زمین پر نہ لگے اس کی تو نماز ہی نہیں ہوتی۔" یعنی ناک اور پیشانی دونوں کا حالت سجدہ میں زمین پر لگنا ضروری ہے۔ خلاصہ گفتگو یہ کہ سجدہ ساتوں اعضاء پر کیا جانا چاہیئے ورنہ سجدہ صحیح نہیں۔

(۲۳۵) وَعَنِ ابْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا صَلَّى وَسَجَدَ، فَرَّجَ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتَّى يبدو بَيَاضُ إِبطَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ادا فرماتے اور سجدہ کرتے تو اس حالت میں اپنے دونوں بازو اپنے پہلوؤں سے الگ رکھتے تھے، یہاں تک کہ آپؐ کی بغلوں کی سفیدی

نظر آنے لگتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فرج ﴾ تفریج (باب تفعیل) سے ماخوذ ماضی کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی دوری اور دونوں پہلوؤں کے درمیان کشادگی اور فراخی پیدا کرنا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنی رانوں کو اپنے بازوؤں سے اتنا الگ رکھے کہ بغلوں کا اندرون بھی نمایاں ہو جائے۔ اس حدیث کی بناء پر امام طبری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلیں جسم اطہر کے دوسرے اعضاء کی طرح سفید تھیں۔ سیاہ نہ تھیں۔ یہ آپ کی دیگر خصوصیات و امتیازات کی طرح ایک خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کی تصریح طبری نے کتاب الاحکام کے باب الاستسقاء میں کی ہے کہ آپ کی بغلیں دوسروں کی طرح سیاہ نہ تھیں بلکہ سفید تھیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابن بحینہ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا پورا نام یہ تھا عبداللہ بن مالک بن القشب (قاف پر کسرہ "شین" ساکن) الازدی اور بحینہ تصغیر' ان کی والدہ کا نام ہے۔ والدہ کے نام سے مشہور ہوئے ہیں ورنہ والد کا نام مالک ہے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ بڑے زاہد' شب زندہ دار' صائم النہار تھے۔ دنیا سے بڑے بے رغبت تھے۔ مدینہ سے تیس میل کے فاصلہ پر واقع جگہ وادی ریم میں ۵۴ھ اور ۵۸ھ کے درمیان وفات پائی۔

(۲۳۶) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا سَجَدْتَ فَضَعْ كَفَّيْكَ، وَارْفَعْ مِرْفَقَيْكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تو سجدہ کرے تو (اس وقت) اپنی ہتھیلیوں کو زمین پر ٹکا دے اور اپنی کہنی کو اوپر اٹھا لے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فضع ﴾ اس میں "فاء" جزاء کیلئے ہے اور ﴿ ضع ﴾ وضع سے امر کا صیغہ ہے۔ معنی اس کے یہ ہوئے کہ دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر ٹکا دو۔ رکھ دو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سجدہ کرتے وقت ہتھیلیوں کو زمین پر رکھنے اور کہنیوں کو اوپر اٹھانے کا حکم ہے۔ البتہ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز صحابہ کرام نے سجدہ کو لمبے کرنے کی وجہ سے تھکاوٹ کا شکوہ کیا تو آپ نے انہیں کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ کر ذرا آرام لینے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ مگر یہ روایت سنداً صحیح نہیں۔ بصورت دیگر یہ عذر پر تو محمول ہے۔ اکثر و بیشتر روایات میں یہی مذکور ہے کہ سجدہ میں آپ کی کہنیاں نہ زمین پر لگتیں اور نہ ہی رانوں وغیرہ سے جس کی وجہ سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ آپ کا یہ عمل امت کے ہر فرد کیلئے ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ آپ کا حکم بھی یہ ہے (صلوا کما رایتمونی اصلی) کہ "تم اسی طرح نماز پڑھو جیسا تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔" کسی بھی صحیح و مرفوع روایت میں عورت کیلئے اس کے برعکس حکم ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ براء بن عازب رضی اللہ عنہ ﴾ ابوعمارہ ان کی کنیت ہے۔ براء "باء" پر فتحہ ہے۔ باپ کا نام

عازب بن حارث بن عدی ہے۔ انصار کے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ باپ بھی شرف صحابیت سے بہرہ ور اور بیٹا بھی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر کم عمری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہو سکے۔ پہلا معرکہ جس میں انہوں نے شرکت کی وہ احد یا خندق دونوں میں کوئی ایک ہے۔ رے کو فتح کیا۔ جنگ جمل' جنگ صفین اور معرکہ نھروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے تھے۔ کوفہ میں ۷۲ھ میں فوت ہوئے۔

(۲۳۷) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَكَعَ فَرَّجَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ، وَإِذَا سَجَدَ ضَمَّ أَصَابِعَهُ. رَوَاهُ الحَاكِمُ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع میں ہوتے تو اپنی (ہاتھوں کی) انگلیاں کھلی رکھتے اور جب سجدہ میں ہوتے تو اپنی (ہاتھوں کی) انگلیاں باہم ملا لیا کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم)

لغوی تشریح: ﴿ ضم اصابعه ﴾ اپنی انگلیاں باہم ملا لیتے۔ یعنی اس طرح اپنی انگلیاں اکٹھی کر کے ایک دوسرے سے ملاتے کہ ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو جاتا۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتاتی ہے کہ رکوع و سجود میں انگلیوں کی کیفیت کیسی ہونی چاہئے؟ معلوم ہوا کہ رکوع کی حالت میں انگلیوں کو کھلا رکھنا ہی مسنون ہے۔ نیز اس میں حالت سجدہ میں انگلیوں کا باہم ضم کرنا اس لئے ہے کہ انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف ہو جائے۔

(۲۳۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي مُتَرَبِّعاً. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو چار زانوؤں پر بیٹھ کر نماز ادا فرماتے دیکھا ہے۔ (نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ متربعا ﴾ تربع سے ماخوذ ہے۔ تربع یہ ہے کہ دائیں پاؤں کے نچلے حصہ کو اپنی بائیں ران کے نیچے کر لینا اور بائیں قدم کا باطنی حصہ دائیں ران کے نیچے پورے اطمینان اور سکون کی حالت کے ساتھ اور اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر اس طرح رکھے کہ انگلیاں کھلی ہوئی ہوں جس طرح حالت رکوع میں کھلی ہوتی ہیں۔ اس طرح بیٹھنا مرض کی وجہ سے ہے اور یہ حدیث نبی ﷺ کی اس نماز کی کیفیت بیان کرتی ہے جب آپؐ گھوڑے سے نیچے گر گئے تھے اور پاؤں پر چوٹ آگئی تھی (پاؤں کا جوڑ کھل گیا تھا) (سبل السلام)

حاصل کلام: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جب آدمی کسی وجہ سے معمول کے مطابق نماز ادا کرنے سے معذور ہو جائے اور قیام پر قادر نہ ہو تو اس کیلئے چار زانوں بیٹھ کر نماز ادا کرنی جائز ہے۔

(۲۳۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے

يَقُولُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ : اَللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي، وَارحَمْنِي، وَاهْدِنِي، وَعَافِنِيْ، وَارْزُقْنِي . رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَاللَّفْظ لِأَبِيْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

اللهم اغفرلی .... الخ یا اللہ! میری پردہ پوشی فرما دے (یا مجھے بخش دے) مجھ پر رحم فرما۔ مجھے راہ ہدایت پر چلا (اور گامزن رکھ) مجھ سے درگزر فرما (معاف کر دے) مجھے رزق (حلال) عطا فرما۔ (اسے نسائی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عافنی ﴾ معافات سے ماخوذ ہے۔ یہ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ مجھے سلامتی اور عافیت سے نواز۔

حاصل کلام: نماز میں مختلف مواقع پر نبی ﷺ سے مختلف دعائیں منقول ہیں۔ اسی طرح دو سجدوں کے مابین جلسہ کے موقع پر مذکورہ بالا دعا آپؐ نے پڑھی ہے۔ لہٰذا سب نمازیوں کو یہ دعا مسنون پڑھنی چاہئے۔ بعض روایات میں "وارفعنی" اور بعض میں "واجبرنی" کا اضافہ منقول ہے اور بعض میں مختصراً "رب اغفرلی" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس لئے حسب حال جو دعا پڑھ لی جائے درست ہے۔

(٢٤٠) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي، فَإِذَا كَانَ فِيْ وِتْرٍ مِنْ صَلاَتِهِ لَمْ يَنْهَضْ حَتَّى يَسْتَوِيَ قَاعِداً . رواه البخاري.

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو نماز ادا فرماتے دیکھا' جب آپ اپنی نماز کی وتر (رکعت) پڑھتے تو (پہلے تھوڑا) بیٹھتے پھر سیدھا کھڑے ہو جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ فی وتر من صلاته ﴾ یعنی جب آپؐ پہلی یا تیسری رکعت مکمل فرما لیتے اور دوسری یا چوتھی کیلئے کھڑا ہونا چاہتے (تو اس وقت ایسا کرتے) ﴿ لم ینهض ﴾ نہ کھڑے ہوتے۔ ﴿ حتی یستوی قاعدا ﴾ پہلے سیدھے مکمل طور پر بیٹھتے' اس کو جلسہ استراحت کہتے ہیں اور یہ مسنون و مشروع ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے جلسہ استراحت کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں مگر امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں اور وہ اسے بڑھاپے پر محمول کرتے ہیں۔ مگر یہ تاویل درست نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء سے فرمایا تھا "صلوا کما رایتمونی اصلی" کہ "تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔" اور وہی بیان کرتے ہیں کہ آپؐ جلسہ استراحت کرتے تھے۔ خود راوی حدیث نے جب اسے بڑھاپے پر محمول نہیں کیا تو پھر یہ محمول محض دفع الوقتی ہے۔

(٢٤١) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَنَتَ شَهْراً بَعْدَ الرُّكُوعِ ، يَدْعُوْ عَلَى أَحْيَاءٍ مِن أَحْيَاءِ الْعَرَبِ ، ثُمَّ تَرَكَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِأَحْمَدَ وَالدَّارَقُطْنِيِّ نَحْوُهُ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ، وَزَادَ: فَأَمَّا فِي الصُّبْحِ فَلَمْ يَزَلْ يَقْنُتُ حَتَّى فَارَقَ الدُّنْيَا.

کریم ﷺ نے پورا مہینہ رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھی پھر اسے چھوڑ دیا۔ (بخاری و مسلم)

احمد اور دارقطنی وغیرہ نے ایک اور طریق سے اسے روایت کیا ہے' اس میں اتنا اضافہ ہے صبح کی نماز میں دعائے قنوت تادم زیست ہمیشہ کرتے رہے۔

لغوی تشریح: ﴿ قنت ﴾ قنوت سے ماخوذ ہے۔ اس کے متعدد معنی ہیں۔ یہاں مراد ہے قیام کی حالت میں دوران نماز دعا کرنا۔ یہ دعا قبل از رکوع ہے یا بعد از رکوع۔ ﴿ علی احیاء ﴾ علی اس جگہ نقصان' ضرر کیلئے استعمال ہوا ہے یا یوں بھی کہا گیا ہے بددعا کی۔ یعنی جب کسی کے نقصان اور ضرر کیلئے دعا کی جائے تو اس موقع پر دعا علیہ بولا جاتا ہے یعنی فلاں نے فلاں کیلئے نقصان و ضرر کی دعا کی اور احیاء جمع ہے "حی" کی۔ جس کے معنی قبیلہ کے ہیں اور یہ قبائل (عہد شکن) رعل' ذکوان' عصیہ اور بنو لحیان تھے۔ ان کیلئے رسول اللہ ﷺ نے بددعا فرمائی۔ اس لئے کہ آپؐ نے ان کی درخواست پر پروردگار کے احکامات پہنچانے اور تبلیغ اسلام کیلئے ان قبائل کی طرف اپنے ستر قاری اصحاب کرامؓ کو بھیجا تھا' جب یہ قافلہ مبلغین' بئر معونہ پر پہنچا (اور یہ کنواں یا چشمہ بنی عامر اور حرہ بنی سلیم کے علاقہ میں واقع تھا بلکہ یہ حرہ بنی سلیم سے زیادہ قریب تھا) تو بنو سلیم کے قبائل میں سے عامر بن طفیل ان کی طرف نکلا اور یہ قبائل رعل' ذکوان و عصیہ تھے۔ جہاں یہ قراء حضرات ٹھہرے ہوئے تھے وہیں ان قبائل کے لوگوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ ان قاریوں نے بھی اپنی تلواریں نکال لیں اور مد مقابل دشمنوں سے خوب لڑے کہ سب کے سب جام شہادت نوش کر گئے۔ صرف کعب بن زید رضی اللہ عنہ زندہ بچے۔ کفار نے انہیں اس حالت میں چھوڑا تھا کہ زندگی کی رمق ابھی ان کے اندر باقی تھی مگر انہوں نے اپنے گمان کے مطابق انہیں مار دیا تھا۔ مقتولین میں سے صرف یہی بچے۔ بالآخر غزوۂ خندق میں جام شہادت نوش فرمایا۔ یہ المناک اور دردناک واقعہ ۴ھ ماہ صفر میں پیش آیا۔ یعنی غزوۂ احد کے چار ماہ بعد۔ بنو لحیان کے حق میں بددعا کی وجہ یہ تھی کہ عضل و قارہ کے قبائل نے نبی کریم ﷺ سے ایسے (عالم) آدمیوں کا مطالبہ کیا تھا جو انہیں اسلام کی دعوت دے سکیں اور انہیں احکام شریعت کی تعلیم دے سکیں۔ چنانچہ آپؐ نے دس مردان عظیم ان کی جانب بھیجے۔ جب یہ حضرات رجیع تک پہنچے (یہ جگہ رابغ اور جدہ کے درمیان واقع ہے) تو ان قبائل کے لوگوں نے ان دس آدمیوں کے ساتھ دھوکہ کیا اور بنو لحیان کو بھی اشارہ کیا (شہہ دی) یہ ھذیل کے قبائل سے ایک قبیلہ تھا۔ یہ سب لوگ ان کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور ان کو گھیرے میں لے لیا۔ چنانچہ دو کے علاوہ باقی کو قید کر لیا یعنی صرف خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ اور زید بن دشنہ رضی اللہ عنہ بچ گئے۔ ان دونوں کا قصہ مشہور و معروف

ہے یہاں بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان دونوں کے علاوہ باقی تمام کو انہوں نے تہ تیغ کر دیا اور یہ واقعہ بھی مذکورہ بالا ماہ صفر کا ہے۔ نبی ﷺ کو ان دونوں المناک واقعات کی اطلاع ایک ہی شب میں ملی۔ اس سے نبی ﷺ نہایت ہی افسردہ اور غمگین ہوئے کہ پورا ایک مہینہ ان کیلئے بددعا فرماتے رہے اور پھر بددعا کرنا ترک کر دیا۔ اس قسم کی دعاء قنوت کو قنوت نازلہ کہا جاتا ہے۔ یہ دعاء قنوت بڑے بڑے المناک اور دردناک واقعات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ورنہ نبی ﷺ دعا قنوت نہیں پڑھتے تھے' الا یہ کہ مسلمانوں میں سے لوگوں کیلئے دعا فرمائیں یا کفار میں سے بد عہد' عہد شکن قسم کے لوگوں کیلئے بددعا فرمائیں۔ رہا نماز فجر میں مسند احمد اور دارقطنی کے حوالہ سے قنوت کے پڑھنے کا التزام و مواظبت کا اضافہ تو یہ قابل استدلال نہیں۔ نیز یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت آگے آنے والی حدیث کے بھی معارض ہے اور قنوت نازلہ کسی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اسے تمام نمازوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ نماز فجر میں آپؐ سے دعاء قنوت ثابت ہے۔ مہینہ بھر آپؐ عہد شکنی اور بد عہدی کی بناء پر مقتول صحابہؓ کی وجہ سے بددعا کرتے رہے۔ ظاہر ہے یہ فرض نماز ہی تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد دعا فرماتے رہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام دین تبلیغ ہے۔ مبلغین کی جماعت تیار رہنی چاہئے' جہاں تبلیغ کی ضرورت ہو وہاں جماعتی شکل میں تبلیغ کیلئے جانا چاہئے۔ نظم جماعت کی طرف بھی اس سے اشارہ ملتا ہے اور اطاعت امیر بھی اس سے ظاہر ہے۔ ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ ذاتی علم غیب نہیں رکھتے تھے اگر ان کو علم غیب ہوتا تو اپنے تیار مبلغین کو قتل کیلئے کیوں بھیجتے۔ جان بوجھ کر نعوذ باللہ تو آپؐ نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع موصول نہیں ہوئی اس وقت تک آپؐ کو اپنے بھیجے ہوئے مبلغین کی صورت حال کی کچھ خبر نہیں تھی۔ احناف اسی حدیث کی روشنی میں عند الضرورت قنوت نازلہ کے قائل ہیں۔ جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نماز فجر میں ہمیشہ دعاء قنوت پڑھنے کے قائل ہیں اور اسے مسنون قرار دیتے ہیں۔ طریقہ دعا یہ ہے کہ امام رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت نازلہ پڑھے اور مقتدی آمین کہیں۔

(٢٤٢) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لاَ يَقْنُتُ إِلاَّ إِذَا دَعَا لِقَوْمٍ أَوْ عَلَى قَوْمٍ.. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ جب کسی قوم کے حق میں یا کسی کیلئے بددعا کرتے تو اس صورت میں قنوت پڑھتے ورنہ نہیں پڑھتے تھے۔ (اس کو ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿كان لا يقنت﴾ یعنی قنوت نازلہ نہیں پڑھتے تھے۔ ﴿الا اذا دعا لقوم﴾ مگر جب کسی قوم کے نفع کیلئے دعا کرتے۔ مصیبت سے نجات و چھٹکارے کیلئے اور ﴿دعا على قوم﴾ یا کسی قوم پر بددعا کرتے۔

حاصل کلام: بظاہر ان احادیث میں تعارض محسوس ہوتا ہے کہ پہلی حدیث میں نماز فجر میں قنوت کا ہمیشہ

پڑھنا ثابت ہے اور دوسری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی قوم کے نفع کیلئے دعا یا کسی کی ہلاکت کیلئے بددعا کرتے تھے اور تیسری کے جو اس کے بعد آرہی ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر میں قنوت پڑھنا بدعت ہے۔ ان میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ آپؐ اور صحابہ کرامؓ اور خصوصاً خلفاء راشدینؓ نماز فجر میں قنوت پڑھتے رہے ہیں۔ جس حدیث میں بدعت قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بالالتزام، مسلسل اور بلاناغہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اس التزام کو مسنون قرار دینا غیر مسنون اور بدعت ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ صبح کی نماز میں ہمیشہ بلاناغہ، بلاضرورت قنوت نہ پڑھی جائے۔ جس حدیث میں صبح کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھنے کا ذکر ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قنوت کبھی منسوخ نہیں ہوئی۔ ضرورت پیش آنے پر آپؐ قنوت پڑھتے رہے اور جس حدیث میں کسی کے حق میں دعا اور کسی کیلئے بددعا کا ذکر ہے یہ تطبیق کی صورت ہی ہے کہ ضرورت لاحق ہونے کی صورت میں دعا و بددعا کرتے تھے۔ احناف اسی کے قائل ہیں۔ نیز احناف وتروں کے علاوہ کسی نماز میں ہمیشہ اور مسلسل قنوت پڑھنے کے حق میں نہیں ہیں اور جب مسلمانوں پر کوئی ناگہانی آفت، مصیبت نازل ہو جائے مثلاً دشمن نے اسلامی ریاست پر حملہ کر دیا ہے، کوئی وباء پھوٹ پڑی ہے، قحط سالی کا سماں پیش آگیا ہے۔ ایسے حالات میں تو احناف بھی نماز پنج گانہ میں قنوت پڑھنا مسنون سمجھتے ہیں اور شوافع حضرات آدھے آخری رمضان میں قنوت وتر کے قائل ہیں باقی ایام میں وہ قائل نہیں البتہ فجر کی نماز میں ہیشگی اور دوام کے قائل ہیں اور دوسری نمازوں میں جب کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے یا وبا پھوٹ پڑے تو پڑھنے کے قائل ہیں۔

(۲۴۳) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ طَارِقٍ الأَشْجَعِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي: يَا أَبَتِ! إِنَّكَ قَدْ صَلَّيْتَ خَلْفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ، أَفَكَانُوا يَقْنُتُونَ فِيْ الفَجْرِ؟ قَالَ: أَيْ بُنَيَّ مُحْدَثٌ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ أَبَا دَاوُدَ.

حضرت سعد بن طارق اشجعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد سے استفسار کیا کہ ابا جان! آپ نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ کیا یہ سب نماز فجر میں قنوت پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بیٹا! یہ نئی بات ہے۔ (اس کو ابوداؤد کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ای بنی ﴾ ای حرف ندا ہے اور بنی "با" پر ضمہ اور "یا" پر فتحہ اور تشدید۔ "ابن" کی تصغیر ہے یائے متکلم مضاف ہے۔ معنی اے میرے بیٹے ﴿ محدث ﴾ احداث سے اسم مفعول ہے یعنی گھڑی ہوئی۔ تصنیف شدہ بات۔ (بدعت) جو دور رسالت میں موجود نہیں تھی۔ پس اس گفتگو کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے کہ قنوت نازلہ بسا اوقات پڑھنا ثابت ہے، اس پر دوام اور ہیشگی ثابت نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں یہ استدلال کرنا کہ نماز میں قنوت پڑھنا بدعت ہے درست نہیں۔ اس سلسلہ کی ضروری وضاحت ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد التزام اور ہیشگی ہے۔

مطلقاً قنوت کی نفی مراد نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ سعد رحمہ اللہ ﴾ پورا نام سعد بن طارق بن اشیم (احمد کے وزن پر) بن مسعود اشجعی کوفی ہے۔ ان کی کنیت ابو مالک تھی۔ ثقہ تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۴۰ھ کے آخر پر فوت ہوئے۔

﴿ طارق اشجعی رضی اللہ عنہ ﴾ طارق بن شیم بن مسعود اشجعی کوفی۔ مشہور صحابی ہیں۔ ان سے صرف چودہ احادیث نقل کی گئی ہیں اور ان کے بیٹے سعد کے علاوہ ان سے کسی نے روایت نہیں کی۔ کوفیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

(٢٤٤) وَعَنِ الحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: عَلَّمَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ كَلِمَاتٍ أَقُولُهُنَّ فِي قُنُوتِ الوِتْرِ: «**اللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِي فِيمَا أَعْطَيْتَ، وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلاَ يُقْضَى عَلَيْكَ، إِنَّهُ لاَ يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ**». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَزَادَ الطَّبَرَانِيُّ وَالبَيْهَقِيُّ: «**وَلاَ يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ**». زَادَ النَّسَائِيُّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ فِي آخِرِهِ: «**وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ**».

وَلِلْبَيْهَقِي عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا دُعَاءً نَدْعُو بِهِ فِي القُنُوتِ مِنْ صَلاةِ الصُّبْحِ. وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے چند کلمات ایسے سکھائے ہیں جنہیں میں وتروں میں (دعائے قنوت کے طور پر) پڑھتا ہوں۔ اللھم اھدنی فیمن ہدیت ...... الخ "اے اللہ! مجھے ہدایت دے کر ان لوگوں کے زمرہ میں شامل فرما جنہیں تو نے رشد و ہدایت سے نوازا ہے اور مجھے عافیت دے کر ان میں شامل فرما دے جنہیں تو نے عافیت بخشی ہے اور جن کو تو نے اپنا دوست قرار دیا ہے ان میں مجھے بھی شامل کر کے اپنا دوست بنا لے۔ جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت ڈال دے اور جس شرو برائی کا تو نے فیصلہ فرما دیا ہے اس سے مجھے محفوظ رکھ اور بچا لے۔ یقیناً فیصلہ تو ہی صادر فرماتا ہے تیرے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا اور جس کا تو والی بنا وہ کبھی ذلیل و خوار اور رسوا نہیں ہو سکتا۔ آقا ہمارے پروردگار تو ہی برکت والا اور بلند و بالا ہے" (اسے پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔) طبرانی اور بیہقی نے ولا یعز من عادیت کا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ نیز نسائی نے ایک دوسرے طریق سے اس دعا کے آخر میں وصلی اللہ علی النبی کا اضافہ بھی روایت کیا ہے۔

اور بیہقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دعا سکھاتے تھے جسے ہم
صبح کی نماز میں دعا قنوت کی صورت میں مانگتے تھے۔

(اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح : ﴿ تولنی ﴾ یعنی میرے کام کو پھیر دے' اس کی اصلاح کر دے۔ ﴿ فیمن تولیت ﴾ یعنی ان لوگوں کے کاموں کی طرح جن کی تو نے اصلاح کی ہے ﴿ وقنی ﴾ میری حفاظت فرما ﴿ شرما قضیت ﴾ یعنی ہر اس شر سے جو اللہ کی تقدیر میں ہے۔ ﴿ فانک تقضی ﴾ یعنی تو مقدر کرتا ہے اور حکم فرماتا ہے جس کا بھی تو ارادہ کرتا ہے ﴿ ولا یقضی علیک ﴾ مجہول کا صیغہ ہے۔ یعنی تجھ پر کسی قسم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ﴿ انہ ﴾ اس کی شان یہ ہے۔۔ ﴿ لایذل ﴾ "یاء" پر فتحہ اور ذال پر کسرہ۔ یعنی وہ ذلیل نہیں ہوتا' رسوا نہیں ہوتا ﴿ من والیت ﴾ یہ "مولاہ" سے ماخوذ ہے۔ "معاداۃ" کی ضد ہے۔ یعنی جس کا تو والی بن جاتا ہے۔ ﴿ ولا یعز ﴾ "یاء" پر فتحہ اور عین کے نیچے کسرہ۔ یعنی وہ صاحب عزت و شرف نہیں ہو سکتا۔ ﴿ من عادیت ﴾ یعنی جس کا تو دشمن ہو جائے۔ اس دعا کے ساتھ صبح کی نماز میں قنوت کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ ﴿ یعلمنا ﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے یعنی وہ ہمیں سکھاتے تھے۔ "دعاء" گزشتہ دعا یعنی اللھم اھدنی والی دعا۔ اور یہ بات کہ وہ ہمیں صبح کی نماز میں کرنے کے لئے یہ سکھاتے تھے' ضعیف ہے۔ جس طرح مصنف نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ اس میں عبدالرحمٰن بن ھرمز راوی ضعیف ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز وتر میں یہ دعا پڑھنا چاہئے۔ یہ دعا رکوع سے پہلے اور بعد دونوں طرح درست ہے لیکن مستدرک حاکم اور بیہقی میں جو یہ الفاظ ہیں کہ جب رکوع سے اٹھو تو یہ دعا پڑھو۔ یہ الفاظ شاذ اور محل نظر ہیں جیسا کہ مرعاۃ المفاتیح اور ارواء الغلیل میں ہے۔ اس دعا کے آخر میں جو "صلی اللہ علی النبی" کے الفاظ ہیں۔ بعض حضرات نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے مگر علامہ البانی نے کہا ہے کہ یہ زیادت صحیح ہے۔ (ارواء الغلیل ج ۲ ص ۱۷۷) اور یہی بات درست ہے۔ نماز وتر کی حیثیت کیا ہے اور ان کی تعداد کتنی ہے اس بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک یہ واجب ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ سنت ہے اور یہی بات راجح ہے۔

رہا تعداد کا معاملہ۔ تو اس کی تعداد ایک سے لے کر گیارہ تک احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔ احناف تین کے قائل ہیں البتہ ان کے پڑھنے کی نوعیت مختلف ہے۔ تین وتر ایک ہی تشہد سے یا دو کے بعد تشہد' درود شریف' دعا اور سلام پھر ایک وتر علیحدہ پڑھا جائے۔ اکثر احادیث میں یہی دوسری کیفیت مروی ہے۔ پانچ یا سات وتر میں بھی صرف آخر میں ایک تشہد ہے۔ البتہ نو وتر اکٹھے پڑھے جائیں تو آٹھ میں تشہد درود شریف و دعا کے بعد بغیر سلام کے نویں رکعت پوری کر کے سلام پھیر دیا جائے یا یہ کہ دو دو

رکعت پر سلام اور آخر میں ایک وتر پڑھا جائے۔ مگر احناف صرف تین وتر کے قائل ہیں اور اس میں دو تشہد پڑھتے ہیں لیکن یہ صحیح تر روایات کے خلاف ہے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے یا بعد دونوں طرح درست ہے۔ دعائے قنوت ہاتھ اٹھا کر پڑھنی چاہئے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حسن بن علی رضی اللہ عنہما ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور ان کے دل کا سرور اور دنیا میں ان کے لئے خوشبو تھے۔ جنت کے نوجوانوں کے سرداروں میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ۳ھ کو پیدا ہوئے اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے والد گرامی کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ بنایا گیا۔ لیکن اپنی خلافت کے سات ماہ بعد جمادی الاولیٰ ۴۱ھ کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ تاکہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان خون نہ بہے۔ ۴۹ھ کو فوت ہوئے اور بقیع میں دفن ہوئے۔

(٢٤٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلاَ يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ، وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ». أَخْرَجَهُ الثَّلاَثَةُ.

وَهُوَ أَقْوَى مِنْ حَدِيْثِ وَائِلِ ابْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ. فَإِنَّ لِلأَوَّلِ شَاهِداً مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ مُعَلَّقاً مَوْقُوفاً.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے اور گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔" (نسائی' ترمذی اور ابن ماجہ)

اور یہ حدیث وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے مروی اس حدیث سے قوی تر ہے جس میں ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں جاتے دیکھا ہے کہ آپ اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ (اس کو چاروں ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ پہلی حدیث کا شاھد ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے تعلیقاً موقوف بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا سجد احدکم ﴾ یعنی جب سجدہ کرنے کیلئے جھکے۔ ﴿ فلا یبرک ﴾ باب نصر ینصر سے نہی کا صیغہ ہے۔ یعنی نہ بیٹھے۔ ﴿ کما یبرک البعیر ﴾ جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ سجدہ کرنے کیلئے جھکتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھنے چاہیں بعد میں گھٹنے۔ ﴿ وھو ﴾ سے مراد یہاں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ہے۔ ﴿ اقوی ﴾ سند کے اعتبار سے قوی تر ہے۔ ﴿ من حدیث وائل بن حجر ﴾ وائل بن حجر سے مروی حدیث سے جس میں گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھنے کا ذکر ہے۔ ﴿ فان للاول ﴾ سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ بالا حدیث ہے

﴿ شاهدا ﴾ یعنی گواہ' اس سے مراد حدیث کو تقویت پہنچانے والا ہے۔ جسے "دراوردی" نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت کیا ہے مگر ﴿ وذکره ﴾ یعنی وہ شاهد ذکر کیا ہے۔ ﴿ البخاری موقوفا ﴾ یعنی بخاری نے موقوفاً چنانچہ نافع کا قول ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ بخاری نے تو موقوفاً نقل کیا ہے۔

حاصل کلام: حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرنے میں شریک تنہا ہے اور وہ جب تنہا کوئی روایت بیان کرے تو اس کی روایت میں محدثین نے کلام کیا ہے اور وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تائید گو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی ایسا ہے جو مجہول ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ باعتبار سند حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث راجح ہے اور بحیثیت معنی تو یہ معلوم حقیقت ہے کہ حیوان کے گھٹنے اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں یعنی اس کے پہلے دونوں پاؤں اور یہ مشاہدہ شدہ حقیقت ہے کہ اونٹ جب نیچے بیٹھنے کیلئے جھکتا ہے تو پہلے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیکتا ہے پھر بیٹھتا ہے۔ جس کی تفصیل تحفۃ الاحوذی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھنے چاہئیں یا گھٹنے۔ اس سلسلہ میں دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جس میں ہاتھوں کو پہلے زمین پر رکھنے کا ثبوت ہے اور دوسری حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں پہلے گھٹنے رکھنے کا ذکر ہے۔ مصنف یعنی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو راجح قرار دیا ہے اور اس کی تائید ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ عموماً محدثین اور حنابلہ اسی کے قائل ہیں مگر احناف اور شوافع حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق پہلے گھٹنے رکھنے کے قائل ہیں مگر صحیح بات یہی ہے کہ پہلے ہاتھ رکھے جائیں جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(٢٤٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ إِذَا قَعَدَ لِلتَّشَهُّدِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرَى عَلَى رُكْبَتِهِ الْيُسْرَى، وَالْيُمْنَى عَلَى الْيُمْنَى، وَعَقَدَ ثَلاثاً وَخَمْسِينَ، وَأَشَارَ بِإِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد کیلئے بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر دایاں ہاتھ اپنے دائیں گھٹنے پر رکھتے اور ترپن کی گرہ دیتے (یعنی ترپین کا عدد بناتے) اور اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔ (مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: وَقَبَضَ أَصَابِعَهُ كُلَّهَا، وَأَشَارَ بِالَّتِيْ تَلِي الإِبْهَامَ.

اور ایک روایت میں ہے جسے مسلم ہی نے روایت کیا ہے کہ اپنی تمام انگلیاں بند کر لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی انگلی سے اشارہ کرتے۔

لغوی تشریح: ﴿ عقد ثلاثا وخمسین ﴾ اپنی انگلیوں کو گرہ دے کر ترپین کے عدد کی شکل بنا لے۔ اس کی صورت اس طرح ہوتی کہ اپنے انگوٹھے کو سبابہ (انگشت شہادت) کے نیچے کر لیتے۔ ﴿ سبابة ﴾

"با" پر تشدید انگوٹھے کے متصل انگشت کو کہتے ہیں۔ اس انگشت کا نام سبابہ یعنی گالی دینے والی کیوں پڑ گیا؟ اس لئے کہ دور جاہلیت میں گالی گلوچ کے موقع پر اس انگلی سے اشارہ کرتے ہیں بلکہ ہمارے مہذب زمانے میں بھی آج کل لوگ اس طرح اشارہ کر کے گالی مراد لیتے ہیں۔ روایات سے تشہد کی حالت میں بیٹھتے وقت دائیں ہاتھ کو گرہ دینے کی صورت میں تین حالتیں یا صورتیں بنتی ہیں۔ پہلی تو یہی ترپن کی شکل جو اسی حدیث میں مذکور ہے اور دوسری اس طرح کی انگشت شہادت کو چھوڑ کر باقی ساری انگلیوں کو ہتھیلی کے ساتھ ملا دینا اور یہ وہی ہیئت ہے جس کا "وقبض اصابعه کلها" کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے اور تیسری ہیئت یہ ہے کہ انگشت وسطیٰ اور انگوٹھے کا حلقہ بنایا جائے۔ اسے ابن ماجہ نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مرفوع بیان کیا ہے۔ اس موقع پر مناسبت کے لحاظ سے یہ ذہن نشین رہے کہ حساب کا شمار کرنے کیلئے اہل عرب بھی ایک معروف طریقہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ جیسے صاحب سبل السلام نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے۔ ایک کے عدد کیلئے خنصر (یعنی چھوٹی انگلی) کو ہتھیلی کے باطن (اندرونی طرف) کے قریب گرہ کی شکل میں موڑ دینا اور دو کے عدد کیلئے خنصر اور بنصر (چھوٹی کے ساتھ والی) دونوں کو ہتھیلی کے اندرونی طرف موڑ دینا اور تین کیلئے انگشت وسطیٰ (بڑی درمیانی) کو بھی خنصر اور بنصر کے ساتھ بند کر دینا اور چار کے عدد کیلئے خنصر کو کھول دینا اور پانچ کیلئے بنصر کو خنصر کے ساتھ کھول دینا اور وسطیٰ کو بدستور بند رکھنا اور چھ کے عدد کیلئے تنہا بنصر کو بند کر دینا اور باقی انگلیوں کو کھلا رکھنا اور سات کے عدد کیلئے خنصر کو ہتھیلی سے ملے ہوئے انگوٹھے کے حصہ کی طرف دراز کر دینا اور آٹھ کے عدد کیلئے بنصر کو ان کے اوپر پھیلا دینا اور نو کے عدد کیلئے ان پر انگشت وسطیٰ کو پھیلا دینا۔ یہ طریقہ تو تھا اکائی کی گنتی کیلئے۔ اب دہائی کو لے لیں۔ دس کے عدد کو نمایاں کرنے کیلئے انگوٹھے کا سر انگشت شہادت کی طرف گرہ کی صورت میں موڑ دیا جائے اور بیس کے عدد کیلئے انگشت شہادت اور وسطیٰ کے درمیان میں انگوٹھے کو داخل کرنا اور تیس کے عدد کیلئے انگشت سبابہ کے سر کو انگوٹھے کے سر پر گرہ کی شکل دے دیں۔ یعنی دس کے عدد کے اظہار کیلئے جو صورت بنتی ہے یہ اس کے برعکس ہے اور چالیس کیلئے انگوٹھے کو انگشت سبابہ کے درمیان جہاں گرہ پڑتی ہو پر سوار کر دینا اور انگوٹھے کو اس کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور پچاس کیلئے انگوٹھے سبابہ کی جڑ کی طرف موڑ دینا۔ یعنی انگوٹھے کے اندرونی حصہ کو اس خط پر رکھنا جو سبابہ اور انگوٹھے کے درمیان ہے اور ساٹھ کے عدد کیلئے سبابہ کو انگوٹھے کی پشت پر سوار کر دینا یعنی چالیس کی جو صورت بنتی ہے اس کے برعکس اور ستر کے عدد کیلئے انگوٹھے کے سر کو سبابہ کی وسطی گرہ (باطنی حصہ) پر ڈال دینا اور سبابہ کی ایک طرف کو انگوٹھے کی طرف لوٹا دینا اور اسی کے عدد کیلئے سبابہ کی ایک جانب کو اس کی جڑ کی طرف لوٹا دینا اور انگوٹھے کی جانب سے سبابہ کے پہلو پر انگوٹھے کو پھیلا دینا اور نوے کے عدد کے لئے سبابہ کو انگوٹھے کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور انگوٹھے کو اس کے اوپر پھیلا دینا پکڑنے کی صورت میں۔ رہی سینکڑوں کی گنتی کا طریقہ تو اکائیوں کی طرح ہے نو سو تک بائیں ہاتھ میں اور ہزاروں کی گنتی کا طریقہ شمار بائیں ہاتھ میں جس سے دہائیاں شمار کی گئی ہیں۔

اب رہا تشہد کے موقع پر انگشت شہادت سے اشارہ کرنا کہ یہ کب اور کس طرح کیا جائے تو اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تشہد کے آغاز ہی سے لے کر اختتام تشہد تک انگلی کو ایک ہی ہیئت میں رکھے اور یہ صورت ترپین کے عدد کی سی بنتی ہے۔ یہ اشارہ کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے مگر یہ روایت جس کی ہم شرح کر رہے ہیں اس کی تردید کرتی ہے کیونکہ ﴿ واشار باصبعه السبابة ﴾ کا عطف قول ماقبل پر ہے اور عطف مغایرت کا متقاضی ہے اور اشارہ ترپین کی گرہ سے پیدا شدہ ہیئت پر زائد چیز ہے نیز ابن خزیمہ اور بیہقی میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی اوپر اٹھائی پھر میں نے دیکھا کہ آپؐ اسے حرکت دیتے رہے اور دعا کرتے رہے" ظاہر ہے کہ حرکت تو کسی چیز کو ایک ہی ہیئت پر برقرار رکھنے کے منافی ہے اور جس روایت میں آیا ہے کہ آپؐ حرکت نہیں دیتے تھے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ اشارہ اس وقت کرتے جب لا الٰہ الا اللہ کہتے۔ اس سے توحید کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ تشہد کی حالت میں جو اشارہ کیا جاتا ہے یا تو وہ کسی محسوس چیز کی طرف ہوگا یا کسی معنی کی جانب جو ذہن میں ہوگا۔ نماز تو بہرحال کسی حسی اشارہ کا موقع و محل نہیں اور نہ امام کے سامنے کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کی طرف وہ اشارہ کرے۔ لہٰذا اشارہ میں کوئی ایسی چیز ہی ہو سکتی ہے جس کا ذہن میں تصور ہو اور اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ ہے کیونکہ کسی چیز کی وحدانیت بیان کرنے کیلئے ایک انگلی اٹھا کر اشارہ کرنا لوگوں کے ہاں متعارف اور مشہور ہے۔ لیکن یہ بات گو عقلاً قابل توجہ ہے مگر سنت سے اس کی تائید نہیں ہوتی کہ آپؐ لا الٰہ الا اللہ پر یوں اشارہ کرتے کہ "لا الٰہ" پر انگلی کو اوپر اٹھاتے اور "الا اللہ" پر نیچے کر لیتے۔ یہ اشارہ بلاشبہ اشارۂ توحید بھی ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابیؓ دو انگلیوں سے اشارہ کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا "احد' احد کہ ایک ہی انگلی سے اشارہ کرو" اور اسی بنا پر یہ شیطان کیلئے بمنزلہ نیزہ کے ہے لیکن کلمۂ توحید پر یوں اشارہ کی کیفیت بہرحال سنت سے ثابت نہیں۔ اس کے برعکس حدیث کے ظاہری الفاظ "یدعوبھا" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد طلب مغفرت اور دعا ہے اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ اشارہ ابتدا سے آخر تشہد تک ہونا چاہئے' کیونکہ آداب دعا میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے جیسا کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا ہے اور آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور لا الہ الا اللہ فی الجملہ دعا بھی ہے کیونکہ دعا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دعائے ثنا اور دوسری دعائے طلب اور پورا تشہد دعا کی ان دونوں قسموں پر مشتمل ہے۔ اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ اشارہ ابتدا سے اختتام دعا تک ہونا چاہئے اور اشارہ کے ساتھ انگلی کو حرکت بھی دینی چاہئے۔

حاصل کلام : اس حدیث میں (عقد ثلاثا و خمسین۔) تشہد میں بیٹھے ہوئے جب اشارہ فرماتے تو اپنے انگوٹھے کو پاس والی انگلی کی جڑ میں رکھتے اور باقی انگلیوں کو بند رکھتے۔ اسی طرح ہمیں کرنا چاہئے' تاکہ سنت پر عمل ہو جائے۔ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ پر سب ائمہ متفق ہیں۔ ملا علی قاری

مشہور حنفی عالم نے رفع سبابہ پر دو مستقل رسالے لکھے ہیں جن میں صحیح احادیث لاکر ثابت کیا ہے کہ رفع سبابہ مسنون ہے اور خلاصہ کیدانی وغیرہ میں جو اسے حرام لکھا گیا ہے اس کی بڑی سخت تردید کی ہے' جو قابل دید ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتب رد المختار' شامی اور شرح وقایہ وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے۔

(٢٤٧) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اَلْتَفَتَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَقَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلِ: «التَّحِيَّاتُ للهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ! وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِينَ، أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ» ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ أَعْجَبَهُ إِلَيْهِ، فَيَدْعُو». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف توجہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو تشہد میں یوں کہے۔ تمام سلامیاں اللہ ہی کیلئے ہیں اور نمازیں اور پاکیزیاں بھی (زبانی' بدنی اور مالی عبادتیں صرف اللہ کیلئے ہیں) اے نبی! سلام ہو تجھ پر اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔ سلام ہو ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت (معبود) نہیں اور اس کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پھر اسے دعا کا انتخاب کرنا چاہئے کہ جو اسے سب سے اچھی لگے وہ مانگے۔" (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

وَلِلنَّسَائِيِّ: «كُنَّا نَقُولُ قَبْلَ أَنْ يُفْرَضَ عَلَيْنَا التَّشَهُّدُ». وَلِأَحْمَدَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ التَّشَهُّدَ، وَأَمَرَهُ أَنْ يُعَلِّمَهُ النَّاسَ.

اور نسائی میں ہے کہ ہم تشہد فرض ہونے سے پہلے کہا کرتے تھے اور احمد میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو تشہد سکھایا اور حکم دیا کہ لوگوں کو اسے سکھاؤ

وَلِمُسْلِمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ: «التَّحِيَّاتُ المُبارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ للهِ» إِلَى آخِرِهِ.

اور مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں تشہد سکھاتے تھے (وہ اس طرح تھا التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ ....الی آخرہ)

لغوی تشریح: ﴿ التحیات ﴾ التحیۃ کی جمع ہے۔ معنی اس کے عظمت و بزرگی' دوام و ہمیشگی یا پھر اس سے مراد قولی و زبانی عبادات۔ ﴿ الصلوات ﴾ نماز پنج گانہ یا پھر مطلق عبادات یا عبادات فعلیہ' فعلی و بدنی عبادتیں۔ ﴿ الطیبات ﴾ عمدہ کلام۔ مثلاً اللہ کی حمد و ثناء اور ذکر الٰہی اور اقوال صالحہ مراد ہیں یا پھر

ان سے اعمال صالحہ عامہ مراد ہیں یا مالی عبادات بھی مراد ہو سکتی ہیں اور ان کے طیب ہونے سے مراد ان کا ہر قسم کے شوائب سے خالص ہونا جن سے اللہ کی خوشنودی مطلوب ہو۔ ﴿اعجبہ﴾ جو اسے سب سے زیادہ پسندیدہ و محبوب ہے اور اس کے نزدیک سب سے عمدہ' اچھا اور احسن ہے۔ ﴿کنا نقول﴾ مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کیا کہتے تھے بلکہ تمام حدیث کو حذف کر دیا ہے۔ اس لئے ذکر نہیں کیا کہ مصنف اس پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ ﴿قبل ان یفرض﴾ کا جملہ فرضیت تشہد پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد احمد کی وہ روایت بیان کی ہے جو اس کی تائید کرتی ہے کیونکہ تشہد کی تعلیم کا حکم فرمانا اس کے وجوب پر دلالت کرتا ہے اور مصنف کا مقصد تشہد کے فرض ہونے سے پہلے صحابہ کرامؓ کیا کہتے تھے کو بیان کرنا نہیں ہے۔ اس لئے اسے حذف کر دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ یہ کہا کرتے تھے۔ السلام علی اللہ۔ السلام علی جبرئیل و میکائیل۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا کہ "اس طرح نہ کہا کرو' بلکہ اس طرح کہا کرو: التحیات للہ .... الخ۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تشہد کے بعد دعا مانگنا مسنون ہے۔ دعا کونسی مانگی جائے اس پر کوئی پابندی نہیں۔ جو چاہے جتنی چاہے مانگ سکتا ہے۔ تاہم نبی ﷺ کی فرمودہ دعائیں افضل ہیں۔ قرآنی دعائیں بھی مانگ سکتا ہے اور اپنی ضروریات کے لئے دیگر دعائیں بھی اس حدیث سے تشہد کا واجب ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وجوب کے قائل ہیں۔ دوسرے اہل علم کے نزدیک فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کے جو الفاظ مروی ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اکثر علماء نے انہیں پسند کیا ہے کیونکہ یہ تشہد کے باب میں صحیح ترین روایت ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تشہد کو اختیار کیا ہے۔

(۲۴۸) وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ رَجُلاً يَدْعُو فِي صَلاَتِهِ، وَلَمْ يَحْمَدِ اللَّهَ، وَلَمْ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: عَجِلَ هٰذَا، ثُمَّ دَعَاهُ، فَقَالَ: إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِتَحْمِيدِ رَبِّهِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ، ثُمَّ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، ثُمَّ يَدْعُوْ بِمَا شَاءَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اپنی نماز میں دعا کرتے سنا۔ نہ تو اس نے اللہ کی حمد کی اور نہ نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا۔ آپؐ نے فرمایا "اس نے جلدی کی" پھر آپ نے اسے اپنے پاس بلایا اور سمجھایا کہ "تم میں سے کوئی جب دعا مانگنے لگے تو پہلے اسے اپنے رب کی حمد و ثنا کرنی چاہئے پھر نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا چاہئے پھر اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے۔" (اسے احمد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿عجل﴾ باب سمع یسمع سے عجل یعجل۔ اپنی دعا میں جلدی کی بایں صورت

کہ حمد اور درود کو چھوڑ دیا تھا۔ ﴿ ثم دعاہ ﴾ پھر اسے اپنے پاس بلایا کہ اسے آداب دعا سکھائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا جلدی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ دعا تو نام ہی عاجزی و انکساری اور اظہار تذلل کا ہے۔ اس لئے جب دعا کی جائے تو پورے اہتمام و اطمینان سے دعا کی جائے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے پھر رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے پھر دعا کی جائے۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث تشہد کے عین مطابق ہے کہ تشہد میں بھی پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ حدیث تشہد کے بعد لا کر اشارہ کیا ہے کہ اس کا محل تشہد ہے۔

تشہد میں پہلے السلام علیک ایھا النبی اور پھر السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے اور آپؐ ہی کی بدولت ہمیں نماز کا طریقہ و سلیقہ حاصل ہوا۔ اس میں خطاب کا لفظ "السلام علیک" حکائی ہے جیسا کہ علامہ ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں کہا ہے۔ آپؐ خود بھی یہ کلمات یوں ہی پڑھتے تھے۔ نیز آپؐ کے انتقال کے بعد صحابہ کرام السلام علی النبی کے الفاظ پڑھنے لگے تھے۔ (بخاری) خطاب کبھی حاضر فی الذہن کیلئے بھی ہوتا۔ بہر نوع تشہد میں اس خطاب سے خرافیوں کا وجودی و حسی حاضر و ناظر مراد لینا غلط اور بے بنیاد ہے۔

راوی حدیث: ﴿ فضالۃ بن عبید رضی اللہ عنہ ﴾ "فا" پر فتحہ اور عبید' عبد سے تصغیر۔ فضالہ بن عبید بن نافذ بن قیس۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ انصار کے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ پہلا معرکہ' جس میں یہ شریک ہوئے معرکہ احد تھا۔ اس کے بعد سب غزوات میں شریک رہے۔ بیعت رضوان میں شامل تھے۔ شام کی طرف نقل مکانی کر گئے تھے اور دمشق میں سکونت پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ صفین کی جنگ کیلئے نکلے اس وقت یہ وہاں کے قاضی (جج) تھے۔ ۵۶ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

(٢٤٩) وَعَنْ أَبِيْ مَسْعُودٍ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ بَشِيْرُ بْنُ سَعْدٍ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَمَرَنَا اللَّهُ أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ، فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ؟ فَسَكَتَ؟ ثُمَّ قَالَ: «قُولُوا: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ، وَبَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ فِي الْعَالَمِينَ،

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپؐ پر درود بھیجنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے لہٰذا ہم کس طرح آپؐ پر درود بھیجیں؟ تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا "اس طرح کہا کرو اللھم صل علی محمد .... الخ اے اللہ! محمد (ﷺ) اور آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما جس طرح تو نے رحمت نازل فرمائی' ابراہیمؑ پر اور برکت نازل فرما محمد (ﷺ) اور آل محمد ﷺ پر جس طرح تو نے برکت نازل فرمائی ابراہیمؑ پر دونوں جہانوں میں۔ یقیناً

إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ. والسَّلَامُ كَمَا عَلِمْتُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَزَادَ ابْنُ خُزَيْمَةَ فِيهِ: فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا عَلَيْكَ فِي صَلَاتِنَا؟.

تو ستودہ صفات ہے اور بزرگ ہے اور رہا سلام تو اس کا علم تمہیں سکھلا دیا گیا ہے۔" (مسلم) اور ابن خزیمہ نے اس میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہم جب نماز پڑھ رہے ہوں تو اس وقت آپؐ پر درود کس طرح پڑھیں۔

لغوی تشریح: ﴿ امرنا اللہ ان نصلی علیک ﴾ اللہ کا حکم ﴿ صلوا علیہ وسلموا تسلیما ﴾ میں ہے "والسلام کما علمتم" تعلیم سے صیغہ مجہول ہے۔ یعنی جس طرح تمہیں سکھایا گیا ہے تعلیم دی گئی ہے اور اس کا احتمال ہے کہ علم سے ماخوذ صیغہ معلوم ہو اور وہ اس طرح کہ نبی ﷺ نے التحیات للہ الخ کی صورت میں تمہیں سکھایا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نبی ﷺ پر نماز میں درود و سلام بھیجنا واجب معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سمیت بہت سے ائمہ رحمہ اللہ اسے واجب ہی قرار دیتے ہیں۔ درود شریف کے مختلف الفاظ احادیث میں مروی ہیں۔ جس کی تفصیل جلاء الافھام اور القول البدیع میں موجود ہے اور صحیح ترین روایت جو نماز میں درود شریف پڑھنے کی ہے وہ یہی ہے۔ "آل" میں لغوی اعتبار سے گو آپؐ پر ایمان لانے والے تمام مومن و متقی بھی مراد ہیں مگر صحیح تر بات یہ ہے کہ یہاں اس سے آپؐ کے وہ رشتہ دار مراد ہیں جن پر صدقہ و زکوٰۃ حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عقبہ بن عمرو ہے اور ابومسعود ان کی کنیت ہے۔ انصار مدینہ میں ہونے کی بنا پر انصاری کہلائے۔ بدر میں شامل ہونے والے جلیل القدر اور بزرگ صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تو تھے مگر کم سن تھے۔ کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ھ کے بعد انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔

﴿ بشیر بن سعد (رضی اللہ عنہ) ﴾ ابونعمان کنیت تھی۔ بشیر ("باء" پر زبر "شین" کے نیچے کسرہ اور "یا" ساکن) بن سعد بن ثعلبہ بن جلاس (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یا خلاس ("خاء" کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ)۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری اور قبیلہ خزرج میں سے ہونے کی وجہ سے خزرجی کہلائے۔ بدر اور بیعت عقبہ میں شامل ہونے والے صحابی تھے۔ احد و خندق اور بعد کے معرکوں میں شامل رہے۔ عین تمر میں ۱۳ھ کو شہید ہوئے۔

(۲۵۰) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَشَهَّدَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللهِ مِنْ أَرْبَعٍ، يَقُوْلُ: اللّٰهُمَّ إِنِّي

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی تشہد پڑھ چکے تو چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے (اور یوری کہے) اے اللہ! میں تجھ سے عذاب جہنم سے پناہ مانگتا

أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: إِذَا فَرَغَ أَحَدُكُمْ مِنَ التَّشَهُّدِ الْأَخِيرِ.

ہوں اور عذاب قبر سے پناہ طلب کرتا ہوں اور موت و حیات کے فتنہ سے تیری پناہ کا طلبگار ہوں اور مسیح دجال کے فتنہ کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ایک روایت کے یہ الفاظ بھی ہیں۔ "جب تم سے کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو۔ تو اس وقت ان چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔"

لغوی تشریح: ﴿فتنة المحیا﴾ محیا سے زندگی مراد ہے اور اس کے فتنہ سے مراد انسان کو جو آزمائشیں دنیا میں پیش آتی ہیں اور وہ خواہشات یا نادانی و جہالت کی وجہ سے جن دشواریوں اور پریشانیوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے یا وہ بلائیں جو صبر و تحمل نہ کرنے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ سب ہی مراد ہیں۔ ﴿الممات﴾ ممات سے مراد موت ہے اور موت کے فتنہ سے مراد برا خاتمہ ہے۔

حاصل کلام: تشہد میں درود و سلام کے بعد اس استعاذہ کو ابن حزم نے واجب قرار دیا ہے۔ تابعین میں امام طاؤس رحمہ اللہ کا بھی موقف یہی تھا۔ بلکہ حافظ ابن حزم تو دونوں تشہدوں میں استعاذہ واجب سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی علماء اسے آخری تشہد میں درود کے بعد پڑھنے کو مستحب ہی کہتے ہیں۔

اس حدیث سے عذاب قبر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک عذاب قبر برحق ہے اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس کا انکار نص قرآن اور حدیث صحیح کا انکار ہے۔

(٢٥١) وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ قَالَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ: عَلِّمْنِي دُعَاءً أَدْعُوْ بِهِ فِيْ صَلاَتِيْ! قَالَ: «قُلْ: اللَّهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْماً كَثِيراً، وَلاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلاَّ أَنْتَ، فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِي، إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ایسی دعا سکھائیں جسے میں اپنی نماز میں پڑھا کروں۔ آپ ؐ نے فرمایا "یہ دعا پڑھا کرو۔ اللھم انی ظلمت نفسی الخ اے پروردگار! میں نے اپنی جان پر بہت ہی ظلم کیا ہے۔ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔ لہٰذا تو مجھے اپنی جناب سے معاف فرما دے اور مجھ پر رحم فرما۔ بے شک تو ہی بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی معافی مانگتے رہنا چاہئے۔ کیونکہ انسان سے ہر وقت لغزش اور غلطی و خطا کا امکان رہتا ہے۔ ابوبکر الصدیق

رضی اللہ عنہ جیسا انسان بھی اپنے آپ کو اس سے مستغنی نہیں سمجھتا۔ حالانکہ ان کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے الصدیق کا خطاب عطا ہوا تھا۔

راوی حدیث : ﴿ ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ ﴾ ابوبکر کنیت تھی۔ الصدیق لقب تھا۔ عبداللہ بن عثمان نام تھا۔ عثمان جو ابو قحافہ کی کنیت سے مشہور تھے۔ تیم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلے خلیفہ راشد تھے۔ انبیائے کرام ؑ کے بعد تمام انسانوں میں افضل انسان تھے۔ سفر ہجرت مدینہ کے موقع پر غار ثور میں آپ ؐ کے ساتھی تھے۔ اسی بنا پر ان کو صاحب غار کہا جاتا ہے۔ گورے چٹے' دبلے پتلے جسم کے انسان تھے۔ تعریف سے مستغنی ہیں۔ بڑے عزم و استقلال اور صمیم الارادۃ تھے۔ احباب و رفقاء کیلئے رحیم و رقیق اور اعداء السلام اور دشمنان دین کیلئے ناقابل شکست چٹان تھے۔ ۱۳ھ میں جمادی الاخریٰ میں وفات پائی۔

(۲۵۲) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَكَانَ يُسَلِّمُ عَنْ يَمِينِهِ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، وَعَنْ شِمَالِهِ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی آپ ؐ نے دائیں جانب سلام پھیرتے ہوئے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور اسی طرح بائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" (ابوداؤد نے اسے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے سلام میں "وبرکاتہ" کا اضافہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یہ اضافہ گو اس موضوع کی اکثر روایات میں نہیں ہے لیکن یہ اور اس کے علاوہ بعض دیگر روایات سے بھی اس کی صحت ثابت ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نتائج الافکار میں تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ اس لئے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہنا بھی درست ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ بلکہ کبار صحابہ و تابعین کے نزدیک السلام علیکم کہہ کر نماز سے فارغ ہونا فرض ہے مگر احناف اسے صرف سنت قرار دیتے ہیں اور کسی بھی ایسے عمل کو نماز سے فارغ ہونے کیلئے کافی سمجھتے ہیں جو نماز کے منافی ہو لیکن یہ صریح احادیث کے خلاف ہے اور سنت قولی و عملی کے منافی ہے۔

(۲۵۳) وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ: «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ،

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض کے اختتام پر یہ دعا پڑھا کرتے تھے لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ .... اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں۔ فرمانروائی اسی کی ہے اور حمد و ثناء اسی کے لئے ہے

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلاَ مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلاَ يَنْفَعُ ذَا الجَدِّ مِنْكَ الجَدُّ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ تو روک لے اسے عطا کرنے والا کوئی نہیں اور کسی صاحب نصیبہ کو تیرے بغیر کوئی نصیبہ فائدہ نہیں دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منقول دعا اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ وحدہ کے ماسوا کوئی بھی معبود نہیں کہ جس کی طرف حاجات و ضروریات کی تکمیل کیلئے رجوع کیا جا سکے۔ دنیا و مافیہا اور آسمانوں کی ہر ایک چیز اس کی مخلوق ہے اور مخلوق اپنے خالق کی ہر وقت محتاج ہے۔ وہ قادر مطلق ہے کسی کو کچھ دینے اور نہ دینے کے جملہ اختیارات بلا شرکت غیرے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس کی سرکار میں دنیوی جاہ و حشمت، عزت و سلطنت اس کے فضل اور رحمت کے سوا ذرا بھر بھی کارگر اور منافع بخش ثابت نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ دعا نماز فرض سے فارغ ہو کر پڑھنی مستحب ہے۔

(٢٥٤) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَتَعَوَّذُ بِهِنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوذُ بِكَ مِنَ البُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الجُبْنِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلَى أَرْذَلِ العُمُرِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ القَبْرِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے آخر میں یہ تعوذ پڑھا کرتے تھے۔ اللھم انی اعوذبک من البخل الخ .... ”اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں بخل سے اور بزدلی سے اور تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میں رذیل ترین عمر کی طرف لوٹایا جاؤں اور میں دنیا کے فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ لیتا ہوں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ بهن ﴾ ان کلمات کے ذریعہ سے مراد ہیں وہ کلمات جو اس حدیث میں مذکور ہیں ﴿ دبر کل صلاۃ ﴾ نماز کے اختتام کے موقع پر یا سلام پھیر دینے کے بعد۔ ﴿ الجبن ﴾ جیم پر ضمہ اور ”با“ ساکن۔ کمزوری اور ضعف یا پھر دشمن سے نبرد آزمائی کا خوف و اندیشہ۔ ﴿ من ان ارد ﴾ ارد صیغہ متکلم ہے۔ صیغہ مجہول ہے۔ یعنی میں لوٹایا جاؤں یا اس طرف پھیرا جاؤں۔ ﴿ الی ارذل العمر ﴾ یعنی خسیس اور ذلت آمیز عمر کی طرف وہ اس وقت ہوتی ہے جب بڑھاپا شدت اختیار کر جائے اور کبر سنی انسان کو بچوں سے بھی زیادہ کمزور و ناتواں اور حیوان سے زیادہ رذیل بنا دیتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بول و براز بھی اپنے کپڑوں میں نکل جاتے ہیں اور کھانا پینا اور خورد و نوش بھی بستر پر ہو جاتا

ہے۔ اللہ سے استدعا ہے کہ ہم سب کو ایسی رسوا کن اور رذیل ترین عمر سے اپنی پناہ میں رکھے۔

حاصل کلام: حدیث کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تعوذ اختتام نماز یعنی سلام پھیرنے سے پہلے بھی پڑھے جاسکتے ہیں اور سلام پھیرنے کے بعد بھی۔ بڑی بامعنی دعا ہے۔ اس کا التزام کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ﴾ ابواسحق ان کی کنیت تھی۔ باپ کا نام مالک تھا۔ قریش سے تعلق رکھنے کی بنا پر قرشی کہلائے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں پانچواں نمبر ہے یا بقول بعض ساتواں نمبر۔ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ (جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی ہی میں جنت کی خوشخبری و بشارت دے دی تھی) اللہ کی راہ میں تیر اندازی کرنے والے یہ پہلے شخص ہیں۔ یعنی سب سے پہلے اللہ کی راہ میں انہوں نے تیر چلایا۔ تمام غزوات میں شریک رہے۔ فاتح عراق ہیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ پستہ قامت مگر گٹھا ہوا بدن' گندمی رنگ' مدینہ سے دس میل دور واقع مقام عقیق میں وفات پائی۔ وہاں سے ان کی میت مدینہ طیبہ لائی گئی اور ۵۵ھ میں جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

(۲۵۵) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلاَتِهِ اسْتَغْفَرَ اللَّهَ ثَلاَثاً، وَقَالَ: «**اللّهُمَّ أَنْتَ السَّلاَمُ، وَمِنْكَ السَّلاَمُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ استغفر اللہ کہتے اور پھر اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذاالجلال والاکرام پڑھتے۔ "اے اللہ! میں تجھ سے مغفرت کا طالب ہوں اور اے اللہ! تو سلام ہے یعنی تو ہی سلامتی والا ہے اور سلامتی تجھ ہی سے ہے اے بزرگی و برتری کے مالک! تو بڑی برکت والا ہے) (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے نماز کے ان اذکار کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار بطور شکر اور تعلیم کے تھا اور اہل ایمان کا استغفار نماز میں کمی و بیشی' وسواس اور خیالات کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے جو کمی و زیادتی اور آمد خیالات کی بنا پر نماز میں نقص واقع ہوگیا۔ بتقاضائے بشریت ہم اس کی مغفرت اور درگزر کی درخواست کرتے ہیں۔ یہی عبدیت کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے معبود سے معافی کی استدعا کرتا ہی رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم استغفار کس طرح پڑھتے تھے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اذکار میں بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے استفسار کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کون سا تھا؟ تو انہوں نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم استغفر اللہ' استغفر اللہ' استغفر اللہ فرماتے۔

اس حدیث میں دعا کے جتنے فقرات مذکور ہیں وہی پڑھنے مسنون ہیں مگر یار لوگوں نے اس پر صبر نہیں کیا بلکہ اپنی جانب سے اضافہ فرما کر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ مثلاً اسی دعا میں اس طرح اضافہ کر دیا اللھم

انت السلام ومنک السلام والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام تبارکت یا ذالجلال والکرام وغیرہ کا۔ بہرحال حدیث میں یہ اضافہ کہیں منقول نہیں اپنی طرف سے یہ اضافہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند کے مصداق ہے۔

(٢٥٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ اللهِ قَالَ: «مَنْ سَبَّحَ اللَّهَ دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ ثلاثاً وَثلاَثِيْنَ، وَحَمِدَ اللَّهَ ثَلاَثاً وَثلاَثِيْنَ وَكَبَّرَ اللَّهَ ثلاثاً وَثلاَثِيْنَ، فَتِلْكَ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ، وَقَالَ تَمَامَ المِائَةِ «لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَحْدَهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ المُلْكُ، وَلَهُ الحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ» غُفِرَتْ لَهُ خَطَايَاهُ وَلَوْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ البَحْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرَى: أَنَّ التَّكْبِيْرَ أَرْبَعٌ وَثَلاَثُونَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ پڑھا اور ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور اللہ اکبر بھی ۳۳ مرتبہ یہ مجموعی طور پر ۹۹ یعنی ایک کم سو ہوئے اور سو مکمل کرنے کیلئے لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر کہا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں خواہ ان کی تعداد سمندر کی جھاگ کے مساوی ہو۔" (مسلم) اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ کہے

لغوی تشریح: ﴿ سبح ﴾ تسبیح بیان کی یعنی سبحان اللہ کہا۔ ﴿ زبد البحر ﴾ زاء اور "با" دونوں پر فتحہ۔ جھاگ۔ جب پانی موجزن ہوتا ہے تو اس کے اوپر جھاگ آ جاتی ہے۔ اس قسم کی عبارت بیان کرنے سے مقصود کسی شے کی کثرت بیان کرنا ہوتا ہے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جن گناہوں اور خطاؤں کے معاف کئے جانے کا ذکر ہے ان سے چھوٹے گناہ مراد ہیں۔ مگر جہاں تک کبائر کا تعلق ہے تو ان کیلئے توبہ ناگزیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ہر نماز کے اختتام پر خواہ وہ نفل نماز ہو یا فرض یہ کلمات پڑھنے مسنون بھی ہیں اور بکثرت گناہوں کے بخشے جانے کی نوید بھی۔ اگرچہ بعض علماء نے ان کلمات کا فرائض کے بعد پڑھنا مشروع ہونا ثابت کیا ہے۔

اس دعا کا پس منظر جو بخاری میں مذکور ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک روز فقراء مہاجرین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مالدار صاحب ثروت لوگ تو سب نیکیاں اور بھلائیاں لوٹ کر لے گئے۔ وہ لوگ ہماری طرح نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں اور وہ صدقہ و خیرات بھی ہم سے زیادہ کرتے ہیں اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے (کیونکہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی نہیں ہے) آپؐ نے (انہیں تسلی دیتے ہوئے) فرمایا "میں تمہیں ایسا عمل نہ سکھاؤں یا بتلاؤں کہ تم اپنے سے بڑھ جانے والوں کا ثواب بھی حاصل کر لو اور کوئی تم سے آگے بھی نہ بڑھ سکے

بشرطیکہ کوئی وہی عمل کرے جو تم کرو۔" اس موقع پر آپ ؐ نے ہر نماز کے بعد مذکورہ کلمات کہنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

ان کلمات کو پڑھنے کی دو صورتیں اس حدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ اور الحمد للہ ۳۳ مرتبہ اور اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ یا ۳۴ مرتبہ۔ دوسرا یہ کہ ۳۳' ۳۳ مرتبہ تینوں کلمات اور ۳۴ویں مرتبہ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ' لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر پڑھ کر سو کی تعداد پوری کرے۔ اگر تینوں کلمات بالترتیب ۳۳' ۳۳ اور ۳۴ مرتبہ پڑھے جائیں تو پھر لا الہ الا اللہ .... الخ نہیں پڑھنا چاہئے کیونکہ اس طرح تعداد ۱۰۰ میں ایک عدد کا اضافہ ہو کر سو کی بجائے تعداد ایک سو ایک ہو جائے گی جو سنت سے ثابت نہیں۔

(۲۵۷) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لَهُ: «أُوصِيكَ يَا مُعَاذُ: لاَ تَدَعَنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ أَنْ تَقُولَ: اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "اے معاذ! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے اختتام کے بعد ان کلمات کو کبھی فراموش نہ کرنا "اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک و حسن عبادتک" اے اللہ! مجھے اپنے ذکر اور شکر اور حسن عبادت کی توفیق سے نواز یا اے اللہ! میری مدد فرما کہ میں ذکر کروں تیرا اور شکر ادا کر سکوں تیرا اور عمدہ اور بہتر عبادت بجالاؤں تیری۔" (اسے احمد ؒ ابوداؤد اور نسائی نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاتدعن ﴾ تا' دال اور عین تینوں پر فتحہ۔ معنی ہیں نہ ترک کرنا۔ ودع یدع سے نہی کا صیغہ ہے جب اسے چھوڑ دے' نظر انداز کر دے۔ ﴿ اعنی ﴾ ھمزہ پر فتحہ اور عین کے نیچے کسرہ اور نون پر تشدید۔ ﴿ الاعانۃ ﴾ سے دعا کا صیغہ ہے۔ ایک نون کو دوسرے نون وقایہ میں مدغم کر دیا گیا اس طرح وہ مشددہ ہوگیا۔ معنی یہ ہوئے کہ میری نصرت فرما اور مجھے توفیق سے نواز۔

حاصل کلام: "لا تدعن" اس پر مدلول ہے کہ اس دعا کو فرض نماز کے بعد نظر انداز کرنا اور ترک کر دینا مناسب نہیں۔ اس لئے کہ نہی اصل تو تحریم کا فائدہ دیتی ہے۔ اس دعا کے علاوہ کتب احادیث مثلاً مسلم' ابوداؤد' نسائی' احمد اور ترمذی وغیرہ میں اور بہت سی دعائیں آپ ؐ سے پڑھنا ثابت ہیں۔ حتی الوسع زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ سنت پر عمل بھی ہو اور اس کی اشاعت و ترویج بھی۔

(۲۵۸) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے ہر فرض نماز کے

ﷺ: «مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ مَكْتُوبَةٍ، لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُولِ الْجَنَّةِ إِلاَّ الْمَوْتُ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَزَادَ فِيهِ الطَّبَرَانِيُّ: «وَقُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ».

ادا کرنے کے بعد آیت الکرسی پڑھی۔ اس کو جنت میں داخل ہونے سے موت کے سوا اور کوئی چیز روکنے والی نہیں۔ (مرتے ہی جنت میں داخل ہو جائے گا بشرطیکہ عقیدۂ توحید صحیح ہو) (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور طبرانی نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ "قل ھو اللہ احد" بھی پڑھے)۔

حاصل کلام: آیت الکرسی کی فضیلت کے بارے میں آپؐ کے اور بھی ارشادات کتب حدیث میں منقول ہیں۔ اس کی اتنی فضیلت کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ اس میں توحید الٰہی کو صاف طور پر نکھار کر بیان کیا ہے۔ اللہ کی وحدانیت' اس کی قدرت اور اس کا علم ماکان ومایکون اور کائنات کی حفاظت وغیرہ صفات کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں اور سورۂ اخلاص تو تہائی قرآن کے برابر ثواب رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اصل میں تین بنیادی عقائد ہیں۔ توحید' رسالت اور آخرت۔ اس سورت میں توحید کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ اس سورۃ میں اللہ کی وحدانیت' اس کی صمدیت کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ سورۃ بھی اللہ کو بہت ہی محبوب ہے۔ لہٰذا جو آدمی اہتمام کے ساتھ ان کو نماز فرض کے بعد پڑھے گا اسے مرتے ہی جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ (انشاء اللہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا دنیا میں کوئی منکر آج تک نہیں پایا گیا۔ نیز اس سے جنت کا وجود بھی معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت بھی مخلوق ہے یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی۔

راوی حدیث: ﴿ابو امامہ رضی اللہ عنہ﴾ ابوامامہ کنیت ایاس بن ثعلبہ بلوی نام تھا اور انصار کے قبیلہ بنو حارثہ کے حلیف تھے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔ والدہ کی تیمار داری میں مشغولیت کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شرکت نہ کر سکے۔

(۲۵۹) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے تم نے دیکھا ہے۔" (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے براہ راست تو خطاب صحابہ کرامؓ سے ہے۔ لیکن عمومی حکم میں امت مسلمہ کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔ امیر یمانی نے کہا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں آپؐ نے جو افعال جس طرح ادا فرمائے بعینہ اسی طرح ادا کرنا واجب ہے۔ البتہ جس کا کسی دوسری دلیل

سے غیر واجب ہونا ثابت ہو جائے تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہو گا۔ (سبل)

(٢٦٠) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلِّ قَائِماً، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِداً، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ، وَإِلاَّ فَأَوْمِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "نماز کھڑے ہو کر پڑھو اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور بیٹھ کر پڑھنے کی استطاعت بھی نہیں تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔ ان میں سے کسی پر بھی عمل نہ ہو سکے تو اشارہ سے ہی پڑھ لو۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ فعلی جنب ﴾ اپنی دائیں جانب لیٹ کر۔ اس صورت میں پاؤں کا رخ قبلہ رخ نہ ہونا چاہئے بلکہ استقبال قبلہ کے وقت بائیں جانب ہونا چاہئے۔ ﴿ فاوم ﴾ ایماء' سے امر کا صیغہ ہے۔ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کسی صورت بھی معاف نہیں بجز مدہوشی کی حالت کے۔ نیز ثابت ہوا کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئے بامر مجبوری یا بیماری کی صورت میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا مشکل ہو تو بیٹھ کر پڑھ لے۔ اگر ایسا بھی کرنا دشوار ہو تو لیٹ کر پڑھ لے۔ ان حالتوں میں کسی پر بھی اگر قادر نہ ہو تو پھر اشاروں سے۔ گویا نماز کسی صورت بھی ترک نہ کرے۔

(٢٦١) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِمَرِيْضٍ - صَلَّى عَلَى وِسَادَةٍ، فَرَمَى بِهَا، - وقَالَ: «صَلِّ عَلَى الأَرْضِ إِنِ اسْتَطَعْتَ، وَإِلاَّ فَأَوْمِ إِيْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوعِكَ». رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ، وَلٰكِن صَحَّحَ أَبُو حَاتِمٍ وَقْفَهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مریض سے جس نے تکیہ پر نماز پڑھی تھی آپ نے اس کا تکیہ پھینک دیا اور فرمایا "اگر پڑھ سکتے ہو تو زمین پر نماز پڑھو ورنہ پھر اشارہ سے پڑھو البتہ اپنے سجدہ کو رکوع سے ذرا نیچے کرو۔" (اسے بیہقی نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے لیکن ابوحاتم نے اس کا موقوف ہونا صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ وسادة ﴾ میں "واؤ" پر تینوں اعراب آسکتے ہیں وسادة وسادة وسادة) تکیہ۔ جسے سونے والا اپنے سرہانے رکھتا ہے۔ ﴿ فرمی بھا ﴾ اس آدمی سے اسے دور ہٹا دیا۔ ﴿ فاوم ایماء ﴾ یعنی اشارہ سے نماز پڑھو۔ ﴿ اخفض ﴾ اسے اسفل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی اس سے نیچا۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ نمازی کا کسی اونچی چیز پر سجدہ کرنا درست نہیں۔ اسے زمین پر ہی سجدہ کرنا چاہئے۔ اگر کسی امر کی وجہ سے ایسا کرنا مشکل ہو تو پھر نمازی کو اشارہ ہی پر قناعت کرنی چاہئے۔

البتہ سجدہ اور رکوع کے اشارہ میں فرق کیا جائے۔ سجدہ کا اشارہ ذرا نیچے ہونا چاہئے بہ نسبت رکوع کے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا تعلق اس کے خالق و مالک سے کسی صورت اور کسی لمحہ بھی منقطع نہیں ہونا چاہئے۔ ہر آن اس کی یاد دل و دماغ میں رچی بسی رہنی چاہئے۔ یہی مقام عبدیت ہے۔

٨ - بَابُ سُجُودِ السَّهْوِ وَغَيْرِهِ　سجود سہو وغیرہ کا بیان

(٢٦٢) عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمُ الظُّهْرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الأُوْلَيَيْنِ، وَلَمْ يَجْلِسْ، فَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ، حَتَّى إِذَا قَضَى الصَّلَاةَ، وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيْمَهُ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، ثُمَّ سَلَّمَ. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَهَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: يُكَبِّرُ فِي كُلِّ سَجْدَةٍ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ النَّاسُ مَعَهُ، مَكَانَ مَا نَسِيَ مِنَ الْجُلُوسِ.

حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو نماز ظہر پڑھائی تو دو رکعتیں ادا کر کے تشہد میں نہ بیٹھے اور سیدھے کھڑے ہوگئے اور مقتدی بھی آپ کے ساتھ ہی کھڑے ہوگئے تاآنکہ جب آپ نے نماز پوری ادا کر لی' لوگ سلام پھیرنے کے انتظار میں تھے کہ آپ نے بیٹھے ہی اللہ اکبر کہا اور دو سجدے کئے۔ سلام پھیرنے سے پہلے۔ پھر سلام پھیرا۔ (اسے ساتوں (احمد' بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا۔ البتہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ہر سجدہ کیلئے اللہ اکبر کہتے تھے بیٹھے ہوئے اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا بھول جانے کے قائم مقام۔ (دو رکعت کے بعد تشہد میں بیٹھنا بھول گئے تھے اس کی تلافی کیلئے دو سجدے کئے۔

لغوی تشریح: ﴿ باب سجود السهو ﴾ سہو بھول کر کمی بیشی کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں نماز میں بھول مراد ہے۔ ﴿ فقام فی الرکعتین الاولیین ﴾ یعنی دو رکعتیں مکمل کرنے کے بعد۔ ﴿ ولم یجلس ﴾ پہلے تشہد کیلئے نہ بیٹھے۔ ﴿ قضی الصلاة ﴾ سلام کے ماسوا ارکان نماز سارے پورے کر لئے۔

حاصل کلام: عربی میں بھول کیلئے دو الفاظ مستعمل ہیں۔ ایک سہو اور دوسرا نسیان۔ پہلے کا اطلاق عموماً افعال کیلئے ہوتا ہے اور دوسرے کا بالعموم معلومات کیلئے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ہم معنی بھی آجاتے ہیں۔ علماء میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ کیلئے نسیان کا قائل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کو کبھی بھی ابلاغ احکام الٰہی اور شریعت کے پہنچانے میں

نسیان لاحق نہیں ہوا۔ لاحق ہونے کا امکان بھی نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (سنقرئک فلا تنسی) باقی سہو کا جہاں تک معاملہ ہے۔ اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ سہو کا امکان ہے اور عملاً ہوا بھی ہے۔ متعدد صحیح احادیث اس بارے میں کتب احادیث میں موجود ہیں اور بہت سے واقعات عملی طور پر اس کا ثبوت ہیں۔ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ بھی سہو کو نبی کریم ﷺ کیلئے ثابت سمجھتے ہیں۔ غالباً آج تک کسی نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا بلکہ اس کی تو بہت سی حکمتیں ہیں' جنہیں صاحب علم و بصیرت لوگ ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر تشہد اول بھول کر رہ جائے تو اس نقصان کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو جاتی ہے۔ سجدۂ سہو قبل از سلام کیا جائے یا بعد از سلام۔ احادیث سے آپؐ کا عمل دونوں طرح ثابت ہے۔ زندگی بھر ایک لگے بندھے طریقے پر آپؐ ﷺ کا عمل ثابت نہیں ہوتا کہ بس فلاں طریقہ پر ساری عمر عمل فرماتے رہے۔ البتہ جب ائمہ رحمہم اللہ کا دور آیا اور تقلید شخصی پر عمل درآمد شروع ہوا تو ائمہ کرام رحمہم اللہ کے مقلدین نے اپنے اپنے دائرہ میں صورتیں معین کر لیں۔ بہرحال ایک رائے یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے جس جس مقام پر جو طرز عمل اختیار فرمایا وہاں اسی طرح عمل کیا جائے۔ مگر باقی مواقع پر جس طرح تحقیق سے ثابت ہوا ہو اس پر عمل کرے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں اس طرز عمل کو بہتر قرار دیا ہے کہ نماز میں کمی واقع ہو جانے کی صورت میں سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے کیا جانا چاہئے اور اگر زیادتی واقع ہو جائے تو سلام پھیرنے کے بعد کیا جائے۔ البتہ ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ کرنا پھر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرنا' صحیح احادیث کی روشنی میں آنحضور ﷺ کے عمل سے ثابت نہیں۔

(٢٦٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ إِحْدَى صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ قَامَ إِلَى خَشَبَةٍ فِي مُقَدَّمِ الْمَسْجِدِ، فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَيْهَا وَفِي الْقَوْمِ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرَ، فَهَابَا، أَنْ يُكَلِّمَاهُ، وَخَرَجَ سَرَعَانُ النَّاسِ فَقَالُوا: أَقُصِرَتِ الصَّلَاةُ، وَرَجُلٌ يَدْعُوهُ النَّبِيُّ ﷺ ذَا الْيَدَيْنِ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَنَسِيْتَ أَمْ قَصُرَتِ الصَّلَاةُ؟ فَقَالَ: لَمْ أَنْسَ وَلَمْ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بعد از دوپہر کی دو نمازوں (ظہر و عصر) میں سے ایک میں دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا اور مسجد کے سامنے رکھی ہوئی لکڑی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور اپنے ہاتھ اس پر رکھ لئے۔ نمازیوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے' یہ دونوں آپؐ سے اس بارے میں بات کرنے سے ذرا خوفزدہ تھے۔ جلد باز لوگ مسجد سے نکل گئے تو لوگوں نے آپس میں سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کیا کہ کیا نماز میں کمی کر دی گئی ہے؟ ایک آدمی تھا جسے نبی ﷺ (اس کے لمبے ہاتھوں کی وجہ

تُقْصَرْ، قَالَ: بَلَى قَدْ نَسِيْتَ، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ كَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، ثُمَّ وَضَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

سے) ذوالیدین کہہ کر بلاتے تھے' نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ (آج) بھول گئے ہیں یا نماز کم کر دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا "نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی کی گئی ہے"۔ اس شخص نے پھر عرض کیا ہاں آپ ضرور بھول گئے ہیں۔ تو پھر آپ نے دو رکعتیں جو چھوٹ گئی تھیں پڑھیں اور سلام پھیرا پھر اللہ اکبر کہہ کر معمول کے سجدوں کی طرح سجدہ کیا یا اس سے ذرا لمبا پھر سجدہ سے اللہ اکبر کہہ کر سر اوپر اٹھایا پھر اللہ اکبر کہہ کر زمین پر رکھا اور معمول کے سجدہ کی طرح یا ذرا اس سے طویل سجدہ کیا اور پھر اللہ اکبر کہہ کر اپنا سر اٹھایا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «صَلَاةَ الْعَصْرِ». وَلِأَبِيْ دَاوُدَ: فَقَالَ: أَصَدَقَ ذُو الْيَدَيْنِ؟ فَأَوْمَئُوا أَيْ نَعَمْ. وَهِيَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ، لٰكِنْ بِلَفْظِ: «فَقَالُوا». وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ: «وَلَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَقَّنَهُ اللّٰهُ تَعَالَى ذٰلِكَ».

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ عصر کی نماز تھی اور ابوداؤد میں مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ "کیا ذوالیدین نے ٹھیک کہا ہے؟" تو لوگوں نے سر ہلا کر اشاروں سے کہا ہاں! یہ اضافہ صحیحین میں بھی ہے لیکن ان میں "فقالوا" کے لفظ کے ساتھ مروی ہے (یعنی زبان سے انہوں نے کہا) اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ کو جب تک اللہ کی جانب سے یقین نہ ہوا اس وقت تک سجدہ سہو نہیں کیا۔

لغوی تشریح: ﴿العشی﴾ عین پر فتحہ۔ شین کے نیچے کسرہ اور "یاء" پر تشدید۔ عشی زوال آفتاب سے لے کر غروب شمس تک کے درمیانے وقت کو کہتے ہیں۔ بعض روایات سے نماز ظہر کا تعین ثابت ہوتا ہے اور بعض سے نماز عصر کا مگر شک بدستور باقی رہا رفع نہیں ہوا۔ ﴿فی مقدم المسجد﴾ تقدیم سے اسم مفعول کے وزن پر ہے۔ معنی مسجد کے سامنے' آگے' دروازے پر۔ ﴿هابا﴾ دونوں خوفزدہ ہوئے۔ ﴿سرعان الناس﴾ ان نمازیوں میں جو جلدی میں تھے۔ "سرعان" میں سین پر فتحہ راء ساکن ہے اور فتحہ بھی

ہے اور ایک قراء ت کے مطابق سرعان کے سین پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ ﴿ اقصرت؟ ﴾ ہمزہ یہاں استفہام کیلئے ہے۔ یعنی سوالیہ۔ اس امرواقع میں یہ دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ کسی معاملہ کے بارے میں بغیر علم کے پختہ رائے قائم نہیں کرتے تھے۔ نبی ﷺ سے اس بارے میں پوچھنے کیلئے دوڑے۔ انہوں نے دریافت کرنے کا طرز عمل اس لئے اختیار کیا کہ وہ زمانہ نسخ کا زمانہ تھا کیونکہ نبی کی ذات گرامی بنفس نفیس موجود تھی۔ ایک فعل (عمل) کی جگہ دوسرے فعل کا حکم آسکتا تھا۔ ﴿ قصرت ﴾ قاف پر ضمہ اور راء کے نیچے کسرہ۔ صیغہ مجہول ہے اور ایک قراء ت کی رو سے قاف پر فتحہ اور صاد پر ضمہ صیغۂ معروف باب کرم یکرم کے وزن پر۔ معنی یہ ہوا کہ نماز مختصراور چھوٹی ہوگئی ہے۔ ﴿ ورجل یدعوہ ﴾ اسے نام لے کر بلاتے تھے۔ ﴿ ذا الیدین ﴾ ذوالیدین اس کو اس لئے کہتے کہ اس کے ہاتھ نسبتاً لمبے تھے اور اس کا نام تو خرباق بن عمرو تھا۔ ﴿ انسیت؟ ﴾ اس میں ہمزہ استفہامیہ ہے اور نسیت میں تا خطاب کیلئے ہے۔ ﴿ ام قصرت؟ ﴾ صیغہ واحد غائب صیغہ معروف بھی ہو سکتا ہے اور صیغہ مجہول بھی۔ ﴿ لم انس ﴾ انس میں ہمزہ اور سین دونوں پر فتحہ ہے۔ معنی ہے میں نہیں' بھولا۔ مضارع پر لم داخل ہو کر اسے ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے۔ یہ حدیث سجود سہو کے علاوہ اور مسائل پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جب نمازی کو گمان غالب ہو کہ اس نے نماز مکمل پڑھ لی ہے پھر سلام بھی پھیر دے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز نماز میں کمی و بیشی کی اطلاع دینے کی صورت میں دیدہ و دانستہ اور عمداً گفتگو کرنا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ ﴿ فاوموا ﴾ تو انہوں نے اشارہ کیا کہ ہاں۔ ﴿ ولکن بلفظ فقالوا ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں مروی روایت میں ﴿ فاوموا ﴾ کی جگہ فقالوا کا لفظ ہے۔ یعنی انہوں نے سر کے اشارہ سے نہیں بلکہ زبان سے بول کر۔ ذوالیدین کی بات کی تصدیق کی۔ ﴿ یقنہ اللہ ﴾ باب تفعیل سے دل میں اس کا یقین ڈال دیا۔ یقین پیدا کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سہو سرزد ہوا ہے اور یہ نبوت کے مخالف و متضاد نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ بھی انسان تھے۔ سہو وغیرہ ایک انسان سے ہی سرزد ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ عالم الغیوب نہ تھے اور نہ آپؐ نے کبھی عالم ما کان وما یکون ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر علم غیب ہوتا تو سہو کی تصدیق کیلئے لوگوں سے دریافت نہ فرماتے کہ کیا ذوالیدین نے ٹھیک اور سچ کہا ہے؟ سہو کی تصدیق ہونے پر اسے تسلیم کر لیا۔ اگر غلطی سرزد ہو جانے پر کوئی اصلاح کرے تو اسے صحیح ہونے پر مان لینا چاہئے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سجدۂ سہو کرتے اور اٹھتے وقت اللہ اکبر کہنا چاہئے۔ اس حدیث سے سجدہ سہو سلام سے پہلے ثابت ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلا تشہد بھول جائے تو اس کی تلافی سہو کے دو سجدوں سے ہو جاتی ہے۔

اس حدیث میں تو صرف "صلی النبی" ہے' مگر بعض روایات میں "صلی بناء" کا لفظ منقول ہے۔ یعنی ہمیں نماز پڑھائی۔ اس صورت میں راوی حدیث بھی ان نمازیوں میں شریک تھے۔ للٰہذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث قرآن مجید کی آیت (قوموا للہ قانتین) سے منسوخ نہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس

آیت کے نزول سے چار پانچ سال بعد اسلام لائے ہیں۔ صحابہؓ کی یہ گفتگو سہواً نہیں قصداً ہوئی ہے۔ للذا اصلاح نماز کیلئے اتنی سی بات نماز کو باطل قرار نہیں دیتی۔

راوی حدیث : ﴿ خرباق بن عمرو سلمی رضی اللہ عنہ ﴾ بنو سلیم سے ہونے کی وجہ سے سلمی کہلائے۔ سہیلی نے الروض الانف میں لکھا ہے کہ انہوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی اور ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ذی خشب مقام پر وفات پائی اور بعض روایات میں ذوالیدین کی بجائے ذوالشمالین بھی وارد ہے۔ بعض کا خیال ہے دونوں سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ یہ وہم ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ دو شخص تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ذوالشمالین بدر میں شہید ہوئے ہیں اور یہ واقعہ بیان کرنے والے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ دونوں تو اسلام غزوۂ خیبر کے سال لائے ہیں۔

(٢٦٤) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمْ فَسَهَا، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ تَشَهَّدَ، ثُمَّ سَلَّمَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں نماز پڑھائی تو آپ کو سہو ہو گیا (یعنی آپؐ بھول گئے) تو (پہلے) دو سجدے کئے پھر تشہد پڑھا اور پھر سلام پھیرا۔ (اسے ابوداؤد' ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : نماز میں بھول لاحق ہونے والا واقعہ وہی ہے جس میں ذوالیدین نے دریافت کیا تھا کہ کیا نماز کم ہوگئی ہے یا آپؐ بھول گئے ہیں؟ ذوالیدین والا واقعہ صحیحین اور سنن کی تمام کتب میں مذکور ہے۔ کسی کتاب میں مروی حدیث میں سجود سہو کے بعد تشہد کا کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ صحیح مسلم میں خود حضرت عمران کی اسی روایت میں تشہد کا ذکر نہیں۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ ترمذی کی اس روایت میں تشہد کا لفظ شاذ ہے جیسا کہ امام بیہقی وغیرہ نے کہا۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فی الجملہ تشہد کا ذکر ثابت ہے۔ جمہور کے نزدیک سلام سے پہلے سجدہ سہو ہو تو تشہد پڑھنے کی ضرورت نہیں' البتہ اگر سلام کے بعد سجدۂ سہو کیا جائے تو اختیار ہے خواہ تشہد پڑھے یا نہ پڑھے۔

(٢٦٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلَمْ يَدْرِ كَمْ صَلَّى أَثَلَاثًا أَمْ أَرْبعاً؟ فَلْيَطْرَحِ الشَّكَّ، وَلْيَبْنِ عَلَى مَا اسْتَيْقَنَ، ثُمَّ يَسْجُدْ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کسی کو جب نماز میں یہ شک ہو جائے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تین یا چار؟ تو ایسی صورت میں شک کو نظر انداز کر کے جس پر یقین ہو اس پر نماز کی بنا رکھے۔ پھر سلام پھیرنے سے پہلے سہو کے دو سجدے کر لے۔

سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، فَإِنْ كَانَ صَلَّى خَمْساً شَفَعْنَ لَهُ صَلاَتَهُ، وَإِنْ كَانَ صَلَّى تَمَاماً كَانَتَا تَرْغِيماً لِلشَّيْطَانِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

پس اگر تو اس نے پانچ رکعتیں پڑھی ہوں گی تو یہ دو سجدے اسے چھٹی رکعت کے قائم مقام ہو کر (طاق رکعات کو جفت بنا دیں گے) چھ بنا دیں گے اور اگر وہ پہلے ہی پوری نماز پڑھ چکا ہے تو یہ دو سجدے شیطان کیلئے باعث ذلت و رسوائی ہوں گے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: "فلم یدر" را کے نیچے کسرہ۔ درایۃ سے ماخوذ ہے مگر حرف علت (ھمزہ) حذف ہوگیا ہے مضارع پر لم کے داخل ہونے کی وجہ سے۔ معنی اسے علم نہیں' اسے معلوم نہیں۔ "فلیطرح" چھوڑ دے' ترک کر دے' دور پھینک دے۔ "ولیبن" بناء سے ماخوذ ہے۔ "علی ما استیقن" جس پر یقین ہو۔ مثلاً جب اسے شک ہوا کہ آیا اس نے تین رکعات پڑھی ہیں یا چار۔ تو اس صورت میں اسے تین شمار کرنی چاہئیں اور چوتھی کو پورا کرنے کیلئے کھڑے ہو کر ایک رکعت مزید پڑھ لے۔ ﴿ فان کان صلی خمسا ﴾ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ نمازی چار رکعت والی نماز پڑھے گا۔ "شفعن صلاتہ" تو دو سجدے نماز کو جفت بنا دیں گے اور یہ سجدے ایک رکعت کے قائم مقام ہوں گے۔ شفع وتر کے مقابلہ میں یعنی وتر کے معنی طاق جو جوڑا نہ بن سکے اور شفع کا معنی جفت جو جوڑا بن سکے۔

"تماما" تماما سے مراد چار رکعت جو نمازی کو مطلوب ہیں۔ "ترغیما تذلیلا" اور اھانۃ کے معنی میں ترغیم دراصل تو ناک کا مٹی کے ساتھ رگڑنا' خاک آلود کرنا' خاک آلودگی' ذلت' رسوائی اور اہانت کے معنی میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب نمازی کو رکعات کی تعداد میں اشتباہ پڑ جائے تو اسے کم پر بنا رکھنی چاہئے۔ اس میں یقین کا امکان ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نماز میں شک واقع ہونے کی صورت میں اسے تحری کرنی چاہئے۔ یعنی یاد کرنے کی انتہائی کوشش کر دیکھے اگر گمان غالب کسی طرف ہو جائے تو اس پر عمل کرے اور اگر تحری کے باوجود دونوں اطراف مساوی نظر آئیں تو پھر کم پر بنا رکھے۔

(٢٦٦) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَلَمَّا سَلَّمَ قِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللهِ أَحَدَثَ فِي الصَّلاَةِ شَيْءٌ؟ قَالَ: «وَمَا ذَاكَ؟» قَالُوا: صَلَّيْتَ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: فَثَنَى رِجْلَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ،

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ سلام پھیرا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول (ﷺ) کیا نماز میں کوئی نئی چیز رونما ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا "وہ کیا ہے؟" انہوں نے عرض کیا آپؐ نے تو اتنی اتنی نماز ادا فرمائی ہے۔ ابن مسعود کا بیان ہے کہ آنحضور نے اپنے دونوں پاؤں دوہرے کئے (اور

ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ: «إِنَّهُ لَوْ حَدَثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ أَنْبَأْتُكُمْ بِهِ، وَلٰكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي، وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ لِيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ان پر بیٹھ گئے) اور قبلہ رو ہو کر دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا پھر ہماری جانب متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا "اگر نماز میں کوئی نئی چیز پیدا ہوئی ہوتی تو میں خود تمہیں اس سے باخبر کرتا۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ میں بھی انسان ہوں' اسی طرح بھول جاتا ہوں جس طرح تم لوگ بھول جاتے ہو' لہٰذا جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد کرا دیا کرو اور تم میں سے جب کسی نماز میں شک واقع ہو جائے تو صحیح صورت حال تک پہنچنے کی کوشش کر لے پھر اپنی نماز اس بنیاد پر مکمل کر لے۔ پھر دو سجدے کر لے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لِّلْبُخَارِيِّ: «فَلْيُتِمَّ، ثُمَّ يُسَلِّمْ، ثُمَّ يَسْجُدْ». وَلِمُسْلِمٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ بَعْدَ السَّلَامِ وَالْكَلَامِ.

اور بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ " (پہلے) نماز مکمل کرنی چاہئے پھر سلام پھیرے اور پھر سجدہ کرے" اور مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے سجدہ سہو سلام و کلام کے بعد کئے ہیں۔

وَلِأَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ مَرْفُوعاً: مَنْ شَكَّ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

مسند احمد' ابوداؤد اور نسائی میں مروی عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت میں ہے کہ جس شخص کو نماز میں شک واقع ہو جائے تو اسے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کرنے چاہئیں۔ (اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے انا بشر مثلکم کے الفاظ اپنے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے نظریات و عقائد کی اصلاح کرنی چاہئے جو بشریت رسول اللہ ﷺ کے منکر ہیں اور قرآنی نصوص صریحہ کی یہ تاویل کرتے ہیں جو سراسر باطل اور لغو ہے کہ قرآن مجید میں تو منکروں کو خاموش کرنے کیلئے بشر کہا گیا ہے ورنہ درحقیقت تو وہ بشر نہیں تھے بشریت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا' لیکن ان عقلمندوں سے ذرا کوئی پوچھے کہ اس حدیث میں جن لوگوں کو (انا بشر کم مثلکم) کہہ کر مخاطب فرما رہے ہیں کیا وہ بھی کافر تھے کہ انہیں خاموش کرانا مقصود تھا یا وہ اہل ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن کی صداقت ایمانی پر قرآن خود شاہد ہے۔

اس حدیث میں تحری الی الصواب کا حکم ہے۔ تحری دراصل وہ ہے جسے عبدالرحمٰن بن عوف

رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا ہے کہ نمازی کو اگر ایک اور دو میں شبہ ہو تو ایک کو یقین سمجھے اور دو اور تین میں شک لاحق ہو تو دو رکعت کو درست قرار دے اور تین اور چار میں اگر اشتباہ پڑ جائے تو تین کو یقینی تصور کرے اور نماز سے فارغ ہو کر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے سہو کے کر لے۔ نیز یہ بھی مسئلہ معلوم ہوا کہ مقتدیوں کو امام کی اتباع کرنی چاہیئے خواہ امام بھول ہی کیوں نہ جائے۔ البتہ بھولنے کی صورت میں مقتدی امام کو سبحان اللہ کہہ کر متنبہ کرنے کی کوشش ضرور کریں۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما﴾ ابو جعفر ان کی کنیت ہے۔ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب نام ہے۔ ان کی والدہ کا نام اسماء بنت عمیس تھا۔ ہجرت حبشہ کے دوران اسلام میں سب سے پہلے یہی پیدا ہوئے تھے۔ ۷ھ کے اوائل میں اپنے والد کے ہمراہ مدینہ میں واپس آئے۔ بڑے سخی' بہادر' پاک دامن اور خوش مزاج تھے۔ کثرت سے سخاوت کرنے کی وجہ سے بحرالجود (سخاوت کا سمندر) کہلاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ۸۰ھ میں اسی برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

(٢٦٧) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، قَالَ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ، فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ، فَاسْتَتَمَّ قَائِماً، فَلْيَمْضِ، وَلاَ يَعُودُ، وَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَتِمَّ قَائِماً فَلْيَجْلِسْ، وَلاَ سَهْوَ عَلَيْهِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "تم میں سے جب کسی کو دو رکعتوں میں شک پیدا ہو جائے اور کھڑا ہو جائے بلکہ بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے تو اسے جاری رکھے اور واپس نہ لوٹے بعد میں اسے دو سجدے سہو کے کر لینے چاہئیں اور اگر بالکل سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو تو بیٹھ جائے تو اس صورت میں اس پر سجدہ سہو نہیں۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ اور دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ بھی اسی دار قطنی کے ہیں۔ اس کی سند ضعیف ہے)

۳۳۲

لغوی تشریح: "فقام فی الرکعتین" یعنی پہلے تشہد میں نہ بیٹھے۔ "فاستتم قائما" پوری طرح سیدھا کھڑا ہو جائے۔ "ضعیف" اس لئے ضعیف ہے کہاس روایت کے تمام طرق جابر جعفی پر مدار رکھتے ہیں اور یہ سخت ضعیف ہے۔

(٢٦٨) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کسی مقتدی پر سجدۂ سہو نہیں ہے۔ ہاں اگر امام

«لَيْسَ عَلَى مَنْ خَلْفَ الْإِمَامِ سَهْوٌ، فَإِنْ سَهَا الإِمَامُ فَعَلَيْهِ وَعَلَى مَنْ خَلْفَهُ». رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَالْبَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

بھول جائے تو پھر امام اور مقتدی دونوں پر سجدۂ سہو ہے" (اسے بزار اور بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: "ضعیف" یہ روایت اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی خارجہ بن معصب ہے' جو ضعیف ہے۔

(٢٦٩) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "ہر سہو کیلئے دو سجدے ہیں جو سلام پھیرنے کے بعد ہیں۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ دونوں نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لکل سھو سجدتان بعد مایسلم﴾ اس سے دو مسئلے مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز میں جتنی بار بھول ہوئی ہے تو ہر بھول کے عوض دو سجدے کئے جائیں۔ لیکن یہ حدیث چونکہ ضعیف ہے اس لئے اس سے احتجاج و استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ ذوالیدین والی حدیث اس کے معارض ہے جس میں ہے کہ نبی ﷺ نے سلام پھیرا اور پھر نادانستہ وہاں سے چل کھڑے ہوئے تو انہوں نے دو سجدے ہی کئے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ سجدۂ سہو کا موقع و محل سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ سجدۂ سہو کے محل وقوع میں احادیث مختلف ہیں۔ اس باب کی دو احادیث جو عبداللہ بن بحینہ اور ابوسعید الخدری سے مروی ہیں ان دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے مسنون ہے اور ذوالیدین اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن جعفر کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدۂ سہو کا محل اور موقع سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر ائمہ کرامؒ کی آراء میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ ہر قسم و نوع کا سجدۂ سہو صرف سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے سلام سے پہلے سجدہ کر لے اور چاہے سلام پھیرنے کے بعد کر لے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر سجدہ نماز میں کسی اضافہ کی وجہ سے کیا جائے تو پھر سلام پھیرنے کے بعد ہے اور اگر نماز میں کسی کمی واقع ہونے کی وجہ سے سجدہ کرنا پڑے تو پھر سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ کسی حدیث میں جس موقع پر جس طرح سجدہ ثابت ہے اسی طرح کرنا چاہئے۔ باقی کے بارے میں قیاس نہیں کیا جائے گا۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس سہو میں آنحضرت ﷺ نے پہلے سجدہ سہو کیا وہاں پہلے اور جہاں بعد میں کیا وہاں بعد میں کیا جائے۔ اس کے علاوہ نمازی کو اختیار ہے خواہ سلام سے پہلے کرے یا بعد میں۔ دونوں طرح درست ہے۔ جہاں تک اس حدیث کے ضعیف ہونے کا معاملہ ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی سند

میں اختلاف ہے اور اسماعیل بن عیاش متکلم فیہ ہے۔ جب یہ شامیوں سے روایت کرتا ہے تو وہ صحیح ہوتی ہے اور یہ روایت بھی شامیوں سے ہے اور ایک اور راوی ابوبکر بن عیاش اس میں ضعیف ہے۔ امام اثرم نے تو فرمایا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ ذوالیدین کی حدیث اس کے برعکس ہے جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔

(۲۷۰) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَجَدْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي «إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ» و«اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے سورہ اذا السماء انشقت و سورہ انشقاق و سورہ اقراء باسم ربک (سورۃ علق) میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سجدۂ تلاوت کیا ہے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے سجدۂ تلاوت کا مشروع ہونا ثابت ہے۔ اس کی مشروعیت پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ مگر اس کے وجوب میں اختلاف آراء ہے۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت مسنون ہے' واجب نہیں مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ واجب ہے۔ سجود قرآن کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سورۂ ص اور مفصل کی سورتوں میں سجدۂ تلاوت نہیں ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک ان کی کل تعداد گیارہ ہے۔ یہ حدیث ان کے خلاف جاتی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مفصل سمیت چودہ سجدے ہیں۔ سورۂ حج کے پہلے سجدے کے تو قائل ہیں مگر دوسرے کے قائل نہیں اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورۂ حج کے دونوں سجدوں سمیت کل پندرہ ہیں اور زیادہ وزنی اور قابل ترجیح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہی معلوم ہوتا ہے۔

(۲۷۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: (صٓ) لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُودِ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْجُدُ فِيْهَا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۂ ص کا سجدہ ان میں سے نہیں ہے جن کا کرنا ضروری ہے البتہ میں نے یقیناً رسول اللہ ﷺ کو اس میں سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ ص ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ سورۂ ص میں سجدہ تلاوت ہے۔ ﴿ ليست من عزائم السجود ﴾ یعنی یہ ان سجدوں میں سے نہیں ہے جن کے کرنے کیلئے تاکید کی گئی ہے' بلکہ حضرت داوٗد علیہ السلام سے جس سجدے کے کرنے کا ذکر ہے' اس میں صرف خبر و اطلاع دی گئی ہے کہ انہوں نے سجدہ کیا اور نبی کریم ﷺ نے ان کی اقتداء کے طور پر سجدہ کیا' اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ فبهدا هم اقتده ﴾ (ان کی راہ راست کی اقتداء کر) کی تعمیل میں۔ اس میں یہ دلیل ملتی ہے کہ مسنون اعمال میں بعض کی زیادہ تاکید ہے اور بعض کی کم۔ (سبل السلام)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ ص میں تو آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا ہے' البتہ آپؐ نے اس کا حکم نہیں فرمایا اور اس کی تاکید نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمال اگرچہ مسنون ہیں' مگر ان کے بارے میں تاکید نہیں۔ وہ بھی سنت خیر الانام کے زمرہ میں آتے ہیں۔

(۲۷۲) وَعَنْه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ بِالنَّجْمِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سورۂ نجم میں سجدۂ تلاوت کیا۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں سے سورۂ نجم کا سجدہ مشروع ہے۔ جو مفصل میں سجدۂ تلاوت کے قائل نہیں انہیں غور کرنا چاہئے۔

(۲۷۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَرَأْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ النَّجْمَ، فَلَمْ يَسْجُدْ فِيهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے روبرو سورۂ النجم کی قرأت کی' مگر آپؐ نے اس میں سجدۂ تلاوت نہیں کیا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نبی کریم ﷺ کا سورۂ نجم میں سجدہ نہ کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ النجم کا سجدہ مشروع نہیں ہے' بلکہ مقصود یہ واضح کرنا تھا کہ اس میں کبھی سجدہ آپؐ نے چھوڑ بھی دیا ہے۔ یہ سجود قرآن کے سنت ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ اگر واجب ہوتا تو پھر کبھی نہ چھوڑتے۔ کبھی کر لینا اور کبھی نہ کرنا ہی اس کے سنت ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ لہٰذا جمہور کا مسلک ہی صحیح ہے۔

راوی حدیث: ﴿زید بن ثابت رضی اللہ عنہ﴾ ابوسعید ان کی کنیت تھی یا ابوخارجہ۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ وحی کی سب سے زیادہ کتابت یہی کیا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ میں فرائض یعنی میراث کے بڑے ماہر تھے۔ خندق کا معرکہ وہ پہلا معرکہ ہے جس میں یہ شریک ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع قرآن کی خدمت انہی نے انجام دی تھی اور عہد خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں اس کی نقول بھی انہی نے تیار کی تھیں۔ نبی ﷺ کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں یہود کا رسم الخط صرف پندرہ دن میں سیکھ لیا تھا اور وہی آپؐ کے خطوط تحریر کیا کرتے تھے۔ کتابت کے بعد آپؐ کو پڑھ کر سنا دیا کرتے تھے۔ ۴۵ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ مدینہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ وفات پائی۔

(۲۷۴) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: فُضِّلَتْ سُوْرَةُ الْحَجِّ بِسَجْدَتَيْنِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ فِي الْمَرَاسِيلِ، وَرَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ مَوْصُولاً مِنْ حَدِيثِ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، وَزَادَ: «فَمَنْ لَمْ

حضرت خالد بن معدان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سورۂ حج کو دو سجدۂ تلاوت کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے۔ (اس کو ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے) اور احمد اور ترمذی نے عقبہ بن عامر کی حدیث سے اسے موصول قرار دیا ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے۔ جس

يَسْجُدْهُمَا فَلاَ يَقْرَأْهَا». وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

نے اس سورہ کے دونوں سجدے نہ کئے وہ اسے نہ پڑھے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح : ﴿ فصلت ﴾ غائب کا صیغہ ہے۔ تفضیل سے ماخوذ ہے۔ باب تفعیل ہے۔ مبنی للمفعول ہے۔ ﴿ فی المراسیل ﴾ سے مراد کتاب المراسیل ہے اور سنن کی کتب میں موصول بیان ہوئی ہے۔ ﴿ ومن لم یسجدھما ﴾ سورۂ حج کے دونوں سجدے جس نے نہ کئے۔ ﴿ فلا یقراھا ﴾ تو پھر وہ سورۂ حج نہ پڑھے اور اصول کی کتابوں میں تثنیہ کے ساتھ ہے یعنی ﴿ فلا یقراھما ﴾ یعنی دونوں آیات سجدہ نہ پڑھے۔ ﴿ وسندہ ضعیف ﴾ اس کی سند میں ابن لھیعہ نامی راوی ہے اس لئے یہ ضعیف ہے۔ لیکن اس حدیث کے ایسے شواہد موجود ہیں جو اس حدیث کی تائید کرتے ہیں۔ شیخ عبداللہ مبارک پوری نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث درجۂ حسن سے گری ہوئی نہیں ہے۔ اس کیلئے ملاحظہ ہو (مراعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ج ۲ ص ۱۴۸۔ طبع اول) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو مراسیل ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ سنن ابی داؤد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ حج کے دونوں سجدے کرنے چاہئیں۔ نہ کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ پھر اسے پڑھے ہی ناں۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت مستحب ہے اور سجدۂ تلاوت کرنا مسنون ہے۔ ترک سنت سے بہتر ہے کہ مستحب عمل ہی نہ کرے یعنی اس کی تلاوت نہ کرے' تاکہ ترک سنت کا مرتکب نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما' ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ' ابودرداء رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سورۂ حج میں دونوں سجدے کرتے تھے' اس لئے اس روایت کو ناقابل عمل کہنا غلط ہے۔

راوی حدیث : ﴿ خالد بن معدان رحمہ اللہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ کلاعی (کاف پر فتحہ) ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے۔ فقہاء تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ میں نے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی ہے۔ ان کی وفات ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ یا ۱۰۸ھ میں ہوئی۔ معدان کے میم پر فتحہ اور عین ساکن ہے۔

(۲۷۵) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: يَآ أَيُّها النَّاسُ! إِنَّا نَمرُّ بِالسُّجُودِ، فَمَنْ سَجَدَ فَقَدْ أَصَابَ، وَمَنْ لَّمْ يَسْجُدْ فَلاَ إِثْمَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

وَفِيهِ: إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَمْ يَفْرِضِ السُّجُودَ إِلاَّ أَنْ يَشَآءَ. وَهُوَ فِي الْمُوَطَّإِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا' لوگو! ہم آیات سجدہ کرتے ہوئے گزرتے ہیں جس نے سجدہ کیا اس نے درست کیا اور جس نے نہ کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (بخاری) اور موطا میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سجدۂ تلاوت فرض نہیں کیا مگر قاری اگر چاہے تو کر سکتا ہے

لغوی تشریح: ﴿لم یفرض السجود﴾ فرض' یفرض باب ضرب یضرب سے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اسے فرض نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس کی دلیل ہے کہ سجود تلاوت واجب نہیں۔

حاصل کلام: بعض نسخوں میں ان یشاء کی جگہ ان نشا جمع کے صیغہ سے بھی منقول ہے (ہم چاہیں تو سجدہ کریں) یعنی قاری کو اختیار ہے' فرض و واجب میں اختیار نہیں دیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام ؓ کی موجودگی میں یہ فرمایا تھا۔ سامعین صحابہ سب خاموش رہے۔ اس سے اجماع سکوتی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز لم یفرض اور ان یشاء بھی اس کی تائید مزید ہے۔ ائمہ اربعہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔ اہلحدیث بھی سجود تلاوت کو مسنون ہی قرار دیتے ہیں مگر احناف اسے واجب کہتے ہیں۔

(٢٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ، فَإِذَا مَرَّ بِالسَّجْدَةِ كَبَّرَ وَسَجَدَ، وَسَجَدْنَا مَعَهُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ فِيهِ لِيْنٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے سامنے قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے جب آیت سجدہ پر سے گزرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ ؐ کے ساتھ ہی سجدہ کرتے۔ (ابوداؤد نے اسے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فیه لین﴾ لام کے نیچے کسرہ اور "یاء" ساکن۔ معنی ضعف اور کمزوری' کیونکہ اس روایت کی سند میں عبداللہ عمری ہے جو ضعیف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدۂ تلاوت کیلئے اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرنا مشروع ہے۔ حاکم نے اس روایت کو عبیداللہ عمری کے حوالہ سے نقل کیا ہے جسے انہوں نے ثقہ کہا ہے اور اس حدیث کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط پر ہے اور ابوداؤد کی روایت جسے متن میں بیان کیا گیا ہے عبداللہ اکبر کی ہے' وہ ایک ضعیف راوی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ سامع پر بھی سجدہ مشروع ہے خواہ نماز میں مصروف و مشغول ہو۔ سجدۂ تلاوت کیلئے طہارت ضروری اور لازمی نہیں تاہم طہارت کا ہونا بہتر اور افضل ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' شعبی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ طہارت کو لازمی شرط قرار نہیں دیتے۔ سجدہ تلاوت میں یہ دعا پڑھنی چاہئے: سجد وجھی للذی خلقه وصوره وشق سمعه وبصره وبحوله وقوته "میرا سر اس ذات کے سامنے جھک گیا جس نے اسے پیدا کیا اور اسے صورت دی اور اسکو سماعت عطاء کی اور بینائی سے نوازا۔ طاقت و قوت بھی عنایت کی"۔ اور ایک روایت میں فتبارك الله احسن الخالقین بھی منقول ہے۔

(٢٧٧) وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا جَاءَهُ أَمْرٌ يَسُرُّهُ خَرَّ سَاجِداً لِلّٰهِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کو جب کوئی خوشخبری ملتی تو اللہ کے حضور سجدے میں گر پڑتے۔ (نسائی کے علاوہ پانچوں نے اسے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یسرہ ﴾ ایسا کام جو آپؐ کی خوشی، فرحت و سرور اور بشارت کا باعث ہوتا۔ ﴿ خر ﴾ گر پڑتے۔ اس میں دلیل ہے کہ کسی نعمت کے حصول اور ناپسندیدہ کام سے بچنے کے موقع پر سجدے میں گر پڑتے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایسے سجدوں کیلئے باوضو ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کیلئے طہارت شرط نہیں۔

حاصل کلام: کسی نئی نعمت کے حاصل ہونے پر، کسی مصیبت سے بچ نکلنے پر، کسی خوشی و مسرت کے موقع پر سجدۂ شکر بجالانا شریعت سے ثابت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نہ اسے مستحسن سمجھتے ہیں اور نہ مکروہ۔ حدیث سے تائید امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ہوتی ہے۔

(۲۷۸) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَجَدَ النَّبِيُّ ﷺ فَأَطَالَ السُّجُودَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَقَالَ: **إِنَّ جِبْرِيْلَ أَتَانِيْ، فَبَشَّرَنِيْ، فَسَجَدْتُ لِلّٰهِ شُكْراً.** رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سجدہ کیا اور لمبا سجدہ کیا پھر سجدے سے سر اٹھا کر فرمایا کہ "ابھی جبرئیلؑ ایک خوشخبری لے کر میرے پاس آئے تو وہ مژدہ سن کر میں نے اللہ کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: مسند احمد میں یہ حدیث متعدد اسانید سے مروی ہے اور اس میں یہ تفصیل بھی ہے کہ وہ بشارت اور خوشخبری یہ تھی کہ جو شخص حضور ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں اپنی طرف سے نازل فرمائے گا۔ یہ خوش کن اطلاع پا کر حضور ﷺ سجدۂ میں گر پڑے اور شکریہ ادا کیا۔ لہٰذا جب کسی کو ایسا موقع پیش آجائے تو اسے بھی سجدۂ شکر ادا کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابومحمد تھی۔ قریش کے زہرہ قبیلہ سے تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ بدر و احد کے علاوہ باقی سب غزوات وغیرہ میں شامل رہے۔ ان کا شمار ان خوش قسمت دس انسانوں میں ہوتا ہے جنہیں رسالت مآب ﷺ کی زبان مبارک سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی۔ یہ ان چھ افراد میں سے ایک تھے جنہیں خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے انتخاب کیلئے نامزد فرمایا تھا۔ عہد نبوی میں انہوں نے ایک مرتبہ چار ہزار اور پھر چالیس ہزار دینار صدقہ و خیرات کئے پھر انہوں نے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ جہاد کیلئے پیش کئے۔ امہات المؤمنینؓ کیلئے اپنے ایک حصہ کی وصیت کی کہ ان کی نذر کر دیا جائے، اس کی بعد میں قیمت لگوائی گئی تو وہ چار لاکھ دینار تھی۔ ۳۴ھ میں وفات پائی اور بقیع میں تدفین ہوئی۔

(۲۷۹) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا۔

بَعَثَ عَلِيّاً إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ. قَالَ: فَكَتَبَ عَلِيٌّ بِإِسْلَامِهِمْ، فَلَمَّا قَرَأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْكِتَابَ خَرَّ سَاجِداً، شُكْراً لِلّٰهِ عَلَى ذٰلِكَ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

راوی نے حدیث بیان کی جس میں اس نے کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کے اسلام میں داخل ہونے کی روداد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ارسال فرمائی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مکتوب پڑھا تو آپؐ اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے سجدہ ریز ہوگئے۔ (بیہقی نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں موجود ہے)

حاصل کلام: آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں اہل یمن کے اسلام قبول کرنے پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ باعث خوشی اور مقام مسرت ہے اور یہ بھی ایک عظیم نعمت الٰہی ہے اس لئے بطور شکریہ کے سجدۂ شکر بجا لانا مشروع ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب مسلمانوں کی کثرت تعداد باعث مسرت اور موجب انبساط ہوا کرتی تھی اور ایک یہ دور ہے کہ مسلمان بچوں کی پیدائش روکنے کی شب و روز سکیمیں اور عملی تدبیریں بروئے کار لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومتی سطح پر زور و شور سے اس مہم کو چلایا جا رہا ہے اور کروڑہا روپیہ اسے کامیاب بنانے پر صرف کئے جا رہے ہیں۔

٩ - بَابُ صَلَاةِ التَّطَوُّعِ

نفل نماز کا بیان

(٢٨٠) عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ كَعْبٍ الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِيَ النَّبِيُّ ﷺ: «سَلْ»، فَقُلْتُ: أَسْأَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ، فَقَالَ: «أَوَ غَيْرَ ذٰلِكَ؟» فَقُلْتُ: هُوَ ذَاكَ، قَالَ: «فَأَعِنِّي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (مخاطب کر کے) فرمایا "مانگ لے (جو کچھ مانگنا ہے)" میں نے عرض کیا میں جنت میں آپؐ کی رفاقت کا طلبگار ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "کچھ اس کے علاوہ مزید بھی۔" میں نے عرض کیا بس وہی مطلوب ہے۔ آپؐ نے فرمایا "تو پھر اپنے مطلب کے حصول کیلئے کثرت سجود سے میری مدد کر۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة التطوع﴾ یعنی نفلی نماز۔ اور نفلی عبادت یہ ہے کہ آدمی اپنی طرف سے ہی کوئی عبادت کرے جو کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے فرض نہیں کی گئی۔ ﴿سل﴾ سوال سے صیغہ امر ہے۔ معنی ہے کہ طلب کرو' مانگو۔ ﴿مرافقتک﴾ رفاقت و مصاحبت۔ ﴿فاعنی﴾ یہ "اعانۃ" سے امر کا صیغہ ہے اور اس میں "یا" یاء متکلم ہے۔ ﴿علی نفسک﴾ یعنی اپنے جی کی خواہش و مراد

کے حصول کیلئے۔ ﴿بکثرۃ السجود﴾ سجود سے یہاں نفل نماز مراد ہے۔ بعض نوافل کثرت سے پڑھا کر۔ سجدہ کی کثرت تو کثرت نماز کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ کثرت یا قلت تو نفل نماز ہی میں ہو سکتی ہے۔ (فرائض میں تو کمی بیشی ناممکن ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سجدہ سے مراد نفل نماز لی ہے اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ کو سارے ارکان نماز پر فضیلت حاصل ہے۔ سجدہ تقرب الٰہی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرب الٰہی اور نبی کریم ﷺ کی رفاقت کیلئے کثرت سے نوافل ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس ان لوگوں پر جو اتباع سنت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر نوافل سے اتنی رغبت نہیں جتنی تاکید ان کے بارے میں معلوم ہوتی ہے اور کچھ لوگ تو زبانی عاشق رسول ہونے کے دعویدار ہیں مگر نفل تو کجا فرائض بھی نہیں پڑھتے' رہتے پھر بھی وہ عاشق رسول ہی ہیں بلکہ نادان اور بے علم و جاہل لوگوں نے ان کو رتبۂ ولائت پر بٹھا رکھا ہے جنھوں نے کبھی نماز پڑھ کر نہ دیکھی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ﴾ ابو فراس ان کی کنیت ہے۔ اسلم قبیلہ سے تھے اس لئے اسلمی کہلائے۔ اصحاب صفہ میں سے تھے' مدینہ کے رہنے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ حضر و سفر میں آپؐ کے ساتھ رہتے تھے۔ ۶۳ھ میں وفات پائی۔

(۲۸۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَشْرَ رَكْعَاتٍ: رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ فِيْ بَيْتِهِ، وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الصُّبْحِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لَّهُمَا: وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ فِيْ بَيْتِهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے نبی ﷺ کی دس رکعتیں یاد ہیں۔ دو رکعتیں ظہر کی نماز سے پہلے اور دو بعد میں اور مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر پر ادا فرماتے تھے۔ اسی طرح دو رکعتیں عشاء کی فرض نماز کے بعد گھر پر اور دو رکعتیں صبح سے پہلے۔ (بخاری و مسلم)

اور بخاری و مسلم دونوں کی روایت میں یہ بھی ہے کہ دو رکعتیں نماز جمعہ کی (فرض) نماز کے بعد گھر پر پڑھتے تھے۔

وَلِمُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ لاَ يُصَلِّي إِلاَّ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ.

اور مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ صبح صادق کے بعد صرف ہلکی سی دو رکعتیں ادا فرمایا کرتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کی صرف دو رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور دو رکعتیں بعد کی ثابت ہوتی ہیں اور دوسری حدیث سے چار پہلے اور دو بعد میں کا ثبوت بھی موجود ہے۔

(۲۸۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لاَ يَدَعُ أَرْبَعاً قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الغَدَاةِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

نے ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں کبھی نہیں چھوڑیں اور دو رکعتیں نماز فجر کی بھی نہیں چھوڑیں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ لا یدع ﴾ نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ جملہ ہیشگی اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔ بہرحال اس سے مراد یہ ہے کہ ان رکعات کو بکثرت ادا فرمایا کرتے تھے۔ ﴿ اربعا قبل الظہر ﴾ ظہر سے قبل چار رکعتیں۔ یہ اس سے پہلے ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کے خلاف ہے (اس میں دو رکعتوں کا ذکر ہے اور اس میں چار کا) دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ آپؐ نے کبھی ظہر کے فرضوں سے پہلے چار رکعتیں پڑھی ہیں اور کبھی دو ادا فرمائی ہیں۔ اس جگہ صرف دونوں صورتوں کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ کی خبر دی گئی ہے کہ آپؐ کا طرز عمل دونوں طرح تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعتیں سنن رواتب میں سے نہیں بلکہ یہ تو زوال کا سایہ ڈھلنے کے وقت کی نماز تھی اور یہ ایسی گھڑی تھی جس میں آسمانوں کے دروازے کھولے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف نظر رحمت سے دیکھتا ہے جیسا کہ بزار نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ جب یہ نماز گھر پر ادا فرماتے تو چار رکعت ادا فرماتے اور جب ان کو مسجد میں پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔ راوی نے جو کچھ جس شکل میں ملاحظہ کیا ہے اسے بیان کر دیا ہے۔ پہلی صورت بہتر اور عمدہ ہے۔ ﴿ قبل الغداۃ ﴾ نماز فجر سے پہلے۔

حاصل کلام: روز و شب میں نبی کریم ﷺ فرائض کے علاوہ کچھ نوافل بھی ادا فرمایا کرتے تھے جن کا زیادہ اہتمام فرمایا اور اس کی ترغیب دی۔ ان کو سنت مؤکدہ اور جن پر دوام اور ہیشگی نہیں فرمائی ان کو سنت غیر مؤکدہ اور نوافل کا نام دے دیا گیا۔ ہیں یہ سب نوافل ہی۔ اس حدیث میں ظہر کے فرائض سے پہلے چار رکعت کا ذکر ہے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے جو پہلے گزری ہے دو رکعتیں پہلے اور دو بعد میں ثابت ہوتی ہیں۔ دونوں میں تطبیق کی صورت ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ظہر سے قبل دو رکعتیں قابل ترجیح ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چار رکعات قابل ترجیح ہے۔ اس سلسلہ کی ساری روایات سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا عمل دونوں طرح تھا۔ اس کے باوجود چار پڑھنا دو کے مقابلہ میں زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

(۲۸۳) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى شَيْءٍ مِّنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ تَعَاهُداً مِّنْهُ عَلَى رَكْعَتَيِ الفَجْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِمُسْلِمٍ: «رَكْعَتَا الفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نوافل میں سے سب سے زیادہ اہتمام فجر کی دو سنتوں کا رکھتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ہے کہ نماز فجر کی دو (رکعتیں) (سنتیں) دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔

لغوی تشریح: ﴿ علی شئی ﴾ کسی چیز کی اتنی حفاظت نہیں کرتے۔ ﴿ اشد ﴾ اکثر کے معنی میں یعنی بہت زیادہ۔ کثرت کے ساتھ۔ گرائمر میں یہ یا تو لم یکن کی خبر واقع ہو رہا ہے یا حال یا پھر مصدر اور اس صورت میں علی شئی کی خبر ہوگی۔ ﴿ تعاهدا ﴾ تحفظ کرنے اور اہتمام کرنے کے معنی میں۔ ﴿ منه ﴾ اس سے (معنی یہ ہے کہ آپؐ کے کسی چیز کا اہتمام و تحفظ کرنے کی بہ نسبت) یعنی نبی ﷺ کا فجر کی دو سنتوں پر التزام و دھیان دوسری سنتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا تھا۔

حاصل کلام: اس میں شک کی ذرا برابر گنجائش نہیں کہ حضور ﷺ نے سنن رواتب میں سے فجر کی دو سنتوں کا جتنا التزام فرمایا اتنا دوسری سنتوں کا اہتمام نہیں کیا۔ حتیٰ کہ حضر و سفر میں بھی انہیں کبھی نہیں چھوڑا۔ ان دو سنتوں کی اتنی تاکید کے پیش نظر احناف نے تو جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود ان کو پہلے پڑھنا لازمی قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ یہ صراحتاً حدیث کے مخالف ہے کیونکہ فرض جماعت کے ہوتے ہوئے دوسری کوئی نماز پڑھنا درست نہیں۔ چنانچہ آپؐ کا فرمان ہے کہ اذا اقیمت الصلوة فلا صلاة الا المکتوبة "کہ جب اقامت ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز نہیں"۔

(٢٨٤) وَعَنْ أُمِّ حَبِيبَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ صَلَّى اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً فِي يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ بُنِيَ لَهُ بِهِنَّ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ: «تَطَوُّعاً».

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ "جو شخص شب و روز میں بارہ رکعت نوافل پڑھے اس کیلئے ان کے بدلہ میں جنت میں گھر تعمیر کر دیا گیا۔" (مسلم) اور ایک روایت میں تطوعا بھی ہے (نفل کے طور پر پڑھے)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ نَحْوُهُ وَزَادَ: أَرْبَعاً قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْفَجْرِ.

اور ترمذی کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور اتنا اضافہ بھی ہے کہ "چار رکعت ظہر سے پہلے اور دو رکعت بعد میں اور دو رکعت نماز مغرب کے بعد اور دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت صبح کی نماز سے پہلے۔

وَلِلْخَمْسَةِ عَنْهَا: «مَنْ حَافَظَ عَلَى أَرْبَعٍ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَأَرْبَعٍ بَعْدَهَا، حَرَّمَهُ اللَّهُ تَعَالَى عَلَى النَّارِ».

اور پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت کیا ہے کہ "جس شخص نے ظہر کی پہلی چار رکعتوں کی حفاظت کی اور چار رکعت بعد میں باقاعدگی سے پڑھتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو آتش جہنم پر حرام کر دیا۔"

لغوی تشریح : ﴿ وللخمسة عنها ﴾ عنها کی ضمیر راجع ہے حضرت ام حبیبہؓ کی طرف یعنی پانچوں نے ان کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے ﴿ واربع بعدها ﴾ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ دو سنتیں پڑھنے کے بعد چار مزید مراد ہوں یعنی ظہر کے بعد چار رکعات اور یہ بھی احتمال ہے کہ دو پہلے جو عام طور پر پڑھی جاتی ہیں اور دو مزید ان میں شامل کر لی جائیں تو یہ چار بن جائیں گی ﴿ حرمه الله ﴾ تحریم سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم کی آگ میں داخل ہونے سے محفوظ کر دیا۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شب و روز میں بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ ان پر التزام کرنا چاہئے کیونکہ نبی ﷺ نے ان پر اہتمام فرمایا ہے۔ ظہر کی فرض نماز کے بعد دو کی بھی گنجائش اور چار کی بھی۔ چار کی فضیلت بڑی بیان ہوئی ہے اور اگر کوئی چھ پڑھ لیتا ہے تو یہ جائز ہے۔

راوی حدیث : ﴿ ام حبیبه رضی اللہ عنہا ﴾ ان کا نام رملہ تھا۔ ابوسفیان کی بیٹی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ قدیم الاسلام تھیں اور ہجرت حبشہ کرنے والوں میں شامل تھیں۔ ان کا شوہر عبیداللہ بن جحش بھی ان کے ساتھ تھا مگر وہ وہاں جا کر نصرانی بن گیا اور وہ وہیں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر کے اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ یہ نکاح کے وقت وہیں حبشہ ہی میں تھیں۔ پھر مہاجرین حبشہ کے ساتھ مدینہ تشریف لائیں۔ ۴۲ھ یا ۴۴ھ یا ۵۰ھ میں فوت ہوئیں۔

(۲۸۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «رَحِمَ اللَّهُ امْرَأً صَلَّى أَرْبَعاً قَبْلَ الْعَصْرِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے نماز عصر سے پہلے چار رکعت پڑھیں۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا ہے)

حاصل کلام : نماز عصر سے پہلے یہ چار رکعتیں سنن رواتب (موکدہ سنتیں) نہیں ہیں بلکہ نفل ہیں۔ اس کی فضیلت پر رحم اللہ امرا کے دعائیہ کلمات دلالت کرتے ہیں کہ جو یہ چار رکعتیں پڑھے اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

(۲۸۶) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ، صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ»، ثُمَّ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: لِمَنْ شَاءَ، كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "مغرب سے پہلے نماز پڑھو۔ مغرب سے پہلے نماز پڑھو پھر تیسری مرتبہ فرمایا یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جو پڑھنا چاہے" آپؐ نے یہ اس اندیشہ کے پیش نظر فرمایا کہ لوگ اسے سنت نہ بنا لیں۔" (بخاری)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لابْنِ حِبَّانَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى قَبْلَ المَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ.

ابن حبان کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے دو رکعت ادا فرمائیں

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ غُرُوبِ الشَّمْسِ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَرَانَا، فَلَمْ يَأْمُرْنَا، وَلَمْ يَنْهَنَا.

اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ غروب شمس کے بعد (فرض نماز سے پہلے) دو رکعت پڑھتے تھے اور نبی ﷺ ہمیں ملاحظہ فرما رہے ہوتے تھے' نہ تو آپ ہمیں اس کا حکم دیتے اور نہ منع فرماتے۔

لغوی تشریح: ﴿لمن شاء﴾ یعنی یہ حکم اس شخص کیلئے جو پڑھنا چاہے ﴿کراھیة﴾ تعلیل کی وجہ سے منسوب ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپؐ نے لمن شاء اس لئے فرمایا کہ آپؐ کو یہ اندیشہ تھا ﴿ان یتخذھا الناس﴾ کہ لوگ اسے چھ بنالیں۔ ﴿سنة﴾ ہمیشہ کیلئے مسنون طریقہ اور اسے چھوڑنا ناپسند کریں۔ اس سے یہ معنی نہیں کہ آپؐ نے اس کے استحباب کو ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو کام مستحب بھی نہ ہو اس کے لئے برانگیختہ کیا جائے اور اس میں ترغیب دی جائے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نماز مغرب کے فرائض سے پہلے دو رکعت پڑھنا مستحب ہے اور یہ حدیث قولی ہے اور جس روایت کو ابن حبان نے روایت کیا ہے وہ فعلی حدیث ہے اور جو روایت مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ تقریری ہے۔ پس مغرب سے پہلے نفل پڑھنا سنت کی تینوں قسموں (قولی' فعلی' تقریری) سے ثابت ہے اور صحیح مسلم کے حوالہ سے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿فلم یامرنا﴾ آپؐ نے ہم کو اس کا حکم نہیں دیا تو یہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایات کے منافی ہے۔ جنہیں ان کے پڑھنے کا حکم ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ حکم کی روایت نہ ملی ہو یا ان کا اس سے مراد تاکیدی حکم ہو۔

حاصل کلام: مغرب کے فرضوں سے پہلے دوگانہ پڑھنا سنن زائدہ میں شمار ہوتا ہے۔ سنن موکدہ میں نہیں۔ ان کا پڑھنا مستحب ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ﴾ مزنیہ قبیلہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر مزنی کہلائے۔ مغفل میں میم پر ضمہ' غین پر فتحہ اور "فاء" پر فتحہ اور تشدید۔ یہ اصحاب شجرہ میں شمار کئے گئے ہیں۔ پہلے مدینہ میں رہائش رکھی۔ بعد ازاں مصر میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ ان دس اصحابؓ میں شامل تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ کو تعلیم دینے کیلئے بھیجا۔ ۶۰ھ میں وفات پائی۔

(۲۸۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنها قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُخَفِّفُ الرَّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ قَبْلَ صَلاَةِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نماز فجر سے پہلے دو رکعت ہلکی پڑھتے تھے۔ میں خیال کرتی کہ کیا آپؐ نے صرف ام الکتاب (فاتحہ) ہی پڑھی

الصُّبْحِ ، حَتَّى إِنِّي أَقُولُ: أَقَرَأَ بِأُمِّ الكِتَابِ ؟ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ہے؟(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اقرا ﴾ اس میں همزہ استفہام کیلئے اور یہاں شک و تردد کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی کیا آپؐ نے ام القرآن کو پڑھایا نہیں؟ اور یہ شک اس لئے واقع ہوا کہ اس میں آپؐ کا قیام مختصر ہوتا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ صبح کی دو سنتیں مختصر ہلکی پڑھتے تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور علماءؒ نے اسی بنا پر کہا ہے کہ ان دو رکعتوں میں مختصر قیام افضل ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان میں بھی لمبا قیام افضل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان کے دو تلامذہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی مخالفت کی۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ آپؐ چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے جیسا کہ آئندہ حدیث میں ہے۔

(۲۸۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَرَأَ فِي رَكْعَتَيِ الفَجْرِ «قُلْ يَا أَيُّهَا الكَافِرُونَ» وَ «قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فجر کی دو رکعتوں میں سے پہلی میں قل یا ایھا الکفرون اور دوسری میں قل ھو اللہ احد پڑھی۔ (مسلم)

حاصل کلام: ان دو رکعتوں میں ان دونوں سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔ اتباع سنت کے جذبہ کے تحت ان کو پڑھنا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب معلوم نہیں ہوتا کہ دوسری کوئی سورۃ پڑھنا ممنوع ہے۔

(۲۸۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا صَلَّى رَكْعَتَيِ الفَجْرِ اضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الأَيْمَنِ . رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز فجر کی دو رکعت سنت پڑھ کر فارغ ہوتے تو اپنے دائیں پہلو کے بل لیٹ جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ علی شقه ﴾ پہلو کے بل۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز فجر سے پہلے دو سنتوں کو ادا کرکے آپؐ اپنے دائیں پہلو پر تھوڑا سا لیٹ کر استراحت فرمایا کرتے تھے بلکہ ایک روایت میں آپؐ نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے۔

(۲۹۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمُ الرَّكْعَتَيْنِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص جب نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں پڑھ چکے تو اسے اپنے دائیں پہلو

قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فَلْيَضْطَجِعْ عَلَى جَنْبِهِ الْأَيْمَنِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

کے بل لیٹ جانا چاہئے۔" (اس حدیث کو احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: ان دو احادیث سے فجر کی سنتوں کی ادائیگی کے بعد دائیں پہلو پر تھوڑا سا لیٹ کر استراحت حاصل کرنا مسنون ثابت ہوتا ہے۔ ایک حدیث سے حضور ﷺ کا عمل اور دوسری سے آپؐ کا حکم ثابت ہے۔ اس بنا پر اہل الظواہر کے نزدیک یہ لیٹنا واجب ہے جو نمازی اس پر دیدہ دانستہ عمل نہیں کرتا اس کی نماز فجر نہیں ہوتی۔ لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ بعض نے اسے مکروہ سمجھا ہے مگر صحیح حدیث کے مقابلے میں یہ رائے قطعاً درست نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا صبح کی سنتوں کے بعد لیٹنا سنت کی بنا پر نہ تھا۔ آپؐ چونکہ رات کو طویل قیام کرتے اس لئے سنتوں کے بعد استراحت کے لئے تھوڑا سا لیٹ جاتے۔ لیکن یہ ان کا قول سنداً صحیح نہیں ہے۔ اس مسئلے پر شارح ابوداؤد مولانا شمس الحق ڈیالوی رحمہ اللہ نے "اعلان اھل العصر باحکام رکعتی الفجر" میں بڑی تفصیل سے قابل دید بحث کی ہے بلکہ صبح کی سنتوں کے متعلقہ سب مسائل کے حل کیلئے اس رسالہ سے کوئی صاحب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

(٢٩١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، فَإِذَا خَشِيَ أَحَدُكُمُ الصُّبْحَ صَلَّى رَكْعَةً وَاحِدَةً، تُوتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلَّى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وِلِلْخَمْسَةِ - وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ - بِلَفْظِ «صَلَاةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مَثْنَى مَثْنَى». وَقَالَ النَّسَائِيُّ: هٰذَا خَطَأٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "رات کی نماز دو' دو رکعت کی صورت میں (پڑھی جائے) اور جب تم میں سے کسی کو صبح کے طلوع ہونے کا خدشہ و اندیشہ لاحق ہونے لگے تو (آخر میں) ایک رکعت پڑھ لے۔ پہلے پڑھی ہوئی اس کی ساری نماز وتر (طاق) بنا دی جائے گی۔" (بخاری و مسلم۔ اور پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) میں بھی یہ روایت اسی طرح ہے)

اور ابن حبان نے صلاۃ الیل والنھار مثنی' مثنی "دن رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔" کو صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ نسائی نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ مثنی مثنی ﴾ دو دو رکعتیں۔ یعنی ہر دو رکعت کی ادائیگی کے بعد سلام پھیرا جائے۔ ﴿ توترلہ ما قد صلی ﴾ اس کی ادا شدہ نماز وتر (طاق) بنا دی جائے گی۔ ﴿ ھذا خطا ﴾ یعنی روایت میں

دن کا ذکر خطا ہے۔ کسی ایک راوی کا وہم ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے اوقات میں پڑھی جانے والی نماز کو دو' دو رکعتوں کی صورت میں پڑھنا چاہئے اور دو کے بعد سلام پھیرنا چاہئے۔ امت کی غالب اکثریت نے اسی کو تسلیم کیا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک بھی ثابت ہے بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک ہی ہے۔ لیکن احادیث سے تین' پانچ' سات' نو اور گیارہ تک کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

جہاں تک امام نسائی رحمہ اللہ کے لفظ النھار (یعنی دن) کو خطا کہنے کا تعلق ہے۔ ان کی یہ رائے محل نظر ہے۔ اس لئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ' امام ابن حبان رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور علامہ البانی نے بھی سلسلہ الصحیحین میں اسے ذکر کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دن ہو یا رات نوافل دو' دو کی تعداد میں پڑھنا زیادہ ثواب کا موجب ہے کیونکہ دو دو رکعتوں کے پڑھنے کی صورت میں درود اور بعد از درود دعائیں زیادہ مرتبہ پڑھی جائیں گی۔ اس لئے ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ ویسے دن کو دو' دو کر کے پڑھے یا چار' چار دونوں طرح جائز ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دن کو چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا بھی ثابت ہے۔

ایک رکعت وتر پڑھنے کی صورت میں تو تشہد ایک ہی مرتبہ پڑھا جائے گا۔ اگر تین بار زائد پڑھے تو کیا صورت ہوگی؟ احمد' نسائی' بیہقی اور حاکم وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت نقل کی ہے اس میں تو صاف طور پر بیان ہوا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب تین وتر پڑھتے تھے تو صرف آخری رکعت میں ہی تشہد پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ تین رکعت وتر پڑھے جائیں تو درمیان میں تشہد نہ پڑھا جائے مگر احناف رات کے وتروں کو مغرب کی تین رکعات پر قیاس کر کے دو مرتبہ تشہد پڑھنے کے قائل ہیں۔ حالانکہ وتروں کو مغرب کی نماز کی طرح پڑھنے کی ممانعت حدیث سے صراحتاً وارد ہے۔

(۲۹۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الفَرِيضَةِ، صَلَاةُ اللَّيْلِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فرض نماز کے بعد افضل نماز رات کی نماز ہے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے تہجد کی نماز کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی فضیلت پر خود قرآن مجید کی شہادت کا واضح ثبوت ہے۔ کتب احادیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ فرض نماز کے بعد کونسی نماز افضل ہے؟ فرمایا رات کے آخری حصہ کی نماز۔ ترمذی میں عمرو بن عبسہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کو اپنے پروردگار سے تمام اوقات سے زیادہ تقرب رات کے آخری حصہ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے بندگان خدا کو چاہئے کہ خواصان خاص کے زمرہ میں شامل

ہونے کیلئے شب بیداری کو اپنا معمول بنانے کی کوشش کریں۔ یہ بارگاہ رب العزت میں حاضری اور سرگوشی و مناجات کا سب سے اچھا موقع ہوتا ہے۔

(۲۹۳) وَعَنْ أَبِيْ أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «الوِتْرُ حَقٌّ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ، مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِخَمْسٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِثَلاَثٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْيَفْعَلْ». رَوَاهُ الأَرْبَعَة إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ وَقْفَهُ.

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”وتر ہر مسلمان پر حق ہے (اس کا ادا کرنا ضروری ہے) جسے پانچ وتر پڑھنا پسند ہو تو ایسا کرے اور جسے تین وتر پسند ہوں تو وہ اس طرح کرے اور جسے ایک وتر پڑھنا پسند ہو تو وہ ایسا کرے۔“ (ترمذی کے علاوہ اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے البتہ نسائی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿الوتر حق﴾ ثابت ہے۔ شریعت میں اس کا ثبوت ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دادا نے المنتقی میں بیان کیا ہے کہ ابن منذر نے اس حدیث کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں۔ الوتر حق ولیس بواجب کہ وتر برحق ہے مگر واجب نہیں اور یہ الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس حدیث میں لفظ حق وتر کی مشروعیت پر دال ہے وجوب پر نہیں۔ لہٰذا جس نے لفظ ”حق“ کی بنیاد پر وتر کو واجب قرار دیا ہے اس کا یہ استدلال باطل ہے۔

حاصل کلام: وتر واجب ہے یا سنت؟ اس میں ائمہ ؒ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسے واجب کہتے ہیں مگر جمہور علماء اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ ”وتر کا پڑھنا حق ہے“ کے الفاظ وجوب پر تو دلالت نہیں کرتے۔ البتہ اس کی اہمیت پر ضرور دال ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں بھی ہے الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا ”وتر برحق ہے۔ جس نے وتر نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں“۔ اس حدیث میں بھی وتروں کو پڑھنے کی تاکید بیان کی گئی ہے مگر وجوب کا بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے سفر و حضر میں وتر پڑھے ہیں اور سواری پر بھی، سفر کے دوران وتر پڑھے ہیں جو اس کی دلیل ہے کہ وتر واجب نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وتر ایک، تین، پانچ سب درست ہیں۔ احناف کا صرف تین وتر پر اکتفا کرنا صحیح اور صریح روایات کی بنا پر درست نہیں۔

(۲۹۴) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ الوِتْرُ بِحَتْمٍ كَهَيْئَةِ الْمَكْتُوبَةِ، وَلَكِنْ

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ وتر فرضوں کی طرح حتمی اور لازمی نہیں ہے بلکہ سنت ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہے۔

سُنَّةٌ سَنَّهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرمِذِيُّ وَحَسَّنَهُ، وَالحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ. (اسے ترمذی اور نسائی نے بیان کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لیس بحتم ﴾ حتم کے معنی واجب اور ضروری کے ہیں۔ ﴿ کھیئۃ المکتوبۃ ﴾ فرض نماز کی طرح لازمی نہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث جمہور علماء کی دلیل ہے جو وتر کے وجوب کے قائل نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن اور امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عاصم بن ضمرہ کوئی متکلم فیہ ہے۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں اعدل الاقوال ذکر کیا ہے کہ وہ صدوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں انہوں نے امام ترمذی رحمہ اللہ اور حاکم رحمہ اللہ کی تحسین و تصحیح نقل کر کے کوئی کلام نہیں کیا۔

(٢٩٥) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَامَ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ، ثُمَّ انْتَظَرُوهُ مِنَ القَابِلَةِ فَلَمْ يَخْرُجْ، وَقَالَ: إِنِّي خَشِيْتُ أَن يُكْتَبَ عَلَيْكُمُ الوِتْرُ. رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ رمضان میں قیام فرمایا پھر اگلے دن کیلئے صحابہ آپ ؐ کا انتظار کرتے رہے اور آپ ؐ حجرے سے باہر تشریف نہ لائے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ وتر کی نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔ (اس روایت کو ابن حبان نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ القابلۃ ﴾ آئندہ آنے والی رات۔ ﴿ ان یکتب ﴾ فرض قرار دے دی جائے۔ یکتب یہاں مجہول واقع ہو رہا ہے۔ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شب معراج میں جب اللہ نے پانچ نمازیں فرض قرار دے کر ثواب پچاس کے برابر رکھا اور فرما دیا کہ میرے فرمان میں تبدیلی نہیں کی جاتی تو خوف اور اندیشہ کس بات کا لاحق ہوا؟ مصنف علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح بخاری میں اس کے تین جواب دیئے ہیں۔ ان جوابات کا خلاصہ یہ ہے: آپ ؐ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ نوافل جن کا رات کے اوقات میں ادا کرنا صحیح ہے کہیں ایسا نہ ہو نماز تہجد کو مسجد میں باجماعت ادا کرنا مقرر کر دیا جائے یا یہ خوف لاحق ہوا کہ قیام اللیل کو فرض عین کی طرح نہ سہی بہرحال فرض کفایہ کے طور پر لازمی قرار دے دیا جائے۔ جیسا کہ نماز عید کے سلسلہ میں لوگوں نے کہا ہے یا پھر یہ اندیشہ دامن گیر ہوا کہ قیام رمضان کو خصوصی طور پر فرض نہ کر دیا جائے اور اس صورت میں یہ پانچ نمازوں پر ایک زائد نماز نہ ہوئی کیونکہ سال بھر میں قیام رمضان ہر روز تو بار بار نہیں کیا جاتا۔ پھر مصنف نے خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ میری دانست میں تینوں جوابات میں سے پہلا جواب ہی قوی ہے اور یہ حدیث نماز تراویح باجماعت پڑھنے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد اندیشہ مذکور کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مصنف نے اس حدیث کو یہاں یہ بتانے کیلئے بیان کیا ہے کہ وتر واجب نہیں۔ ضمناً یہ مسئلہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ علم غیب نہیں رکھتے تھے۔ اگر آپ ؐ کو علم غیب ہوتا تو اندیشہ

اور خوف لاحق ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ نیز اس حدیث کی رو سے آپؐ نے نماز تراویح صرف ایک ہی روز پڑھائی ہے مگر دوسری احادیث میں تین رات۔ بلکہ صحیح ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ جن تین راتوں میں آپؐ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں تراویح کی تعداد آٹھ رکعت تھی۔

(۲۹٦) وَعَنْ خَارِجَةَ بْنِ حُذَافَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ أَمَدَّكُمْ بِصَلاَةٍ هِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ»، قُلْنَا: وَمَا هِيَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «الوِتْرُ، مَا بَيْنَ صَلاَةِ العِشَاءِ إِلَى طُلُوعِ الفَجْرِ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

وَرَوَى أَحْمَدُ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ نَحْوَهُ.

حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی نماز کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہت بہتر ہے۔" ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہ کونسی نماز ہے؟ فرمایا "وتر نماز جو نماز عشاء اور طلوع فجر کے درمیان ہے۔" (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ احمد نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اس کی مانند روایت نقل کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ امدکم ﴾ امداد سے ماضی کا صیغہ ہے۔ تمہاری مدد فرمائی ﴿ بصلاۃ ﴾ ایک نماز سے۔ یعنی تمہارے لئے ایک اور نماز کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہی اس کی دلیل ہے کہ وہ نماز لازم نہیں۔ اگر یہ واجب ہوتی تو عبارت بھی وجوب و التزام والی ہوتی۔ ﴿ حمر النعم ﴾ "حا" پر ضمہ اور میم ساکن۔ احمر کی جمع ہے اور نعم نون اور عین دونوں پر فتحہ۔ چوپایہ جانور کے معنی میں اور یہاں اس سے مراد اونٹ ہے اور اہل عرب کے نزدیک اونٹ ان کے اموال میں عزیز ترین اور معزز مال شمار ہوتا تھا۔

حاصل کلام: امداد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلے سے چیز تو موجود ہے اسے تقویت دینے کیلئے مدد دی ہے۔ اصل اور امدادی چیز کی شان یکساں تو نہ ہوگی اور نماز کو سرخ اونٹوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ ﴾ خارجہ بن حذافہ قرشی عدوی۔ (حذافہ کے حاء پر ضمہ اور ذال پر تخفیف)۔ یہ اتنے شجاع تھے کہ ایک ہزار سوار کے برابر تھے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تین ہزار شہ سواروں کی مدد طلب کی تو انہوں نے اس کے جواب میں تین بہادر و شجاع آدمی بھیج دیے جن میں ایک زبیر بن عوامؓ دوسرے مقداد بن اسودؓ اور تیسرے خارجہ بن حذافہؓ تھے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے کہنے پر مصر کے قاضی بنے۔ ۴۰ھ میں رمضان المبارک میں قتل ہوئے۔ انہیں ایک خارجی نے عمرو بن عاصؓ سمجھ کر قتل کیا تھا کیونکہ خوارج نے حضرت علیؓ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو بیک وقت قتل کرنے کی سازش کی تھی۔

﴿ عمرو بن شعیب ﴾ ابو ابراہیم ان کی کنیت تھی۔ عمرو بن شعیب بن عبداللہ بن عمرو بن عاص سہمی

قرشی مدنی۔ طائف میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ نسائی نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ۱۱۸ھ میں وفات پائی۔
﴿ شعیب ﴾ ثقہ تابعین میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد جن کا نام محمد تھا ان کے زمانہ صغر سنی میں وفات پا گئے تھے تو ان کی کفالت ان کے دادا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مشہور صحابی نے کی۔ اس سے ان کا سماع صحیح ہے۔ یہ اسناد نہ تو مرسل ہے اور نہ منقطع بلکہ متصل ہے اور حسن کے درجہ سے کم نہیں ہے۔ ان کے دادا کا تعارف پہلے گزر چکا ہے۔

(۲۹۷) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنَ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الوِتْرُ حَقٌّ، فَمَنْ لَمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ لَيِّنٍ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَلَهُ شَاهِدٌ ضَعِيفٌ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ عِنْدَ أَحْمَدَ.

حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وتر برحق ہے جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔" (ابوداؤد نے اسے کمزور سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے احمد کے نزدیک اس کا شاہد بھی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر وہ ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الوتر حق ﴾ حق کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں کہ یہ لفظ وجوب پر دلالت نہیں کرتا ﴿ فمن لم یوتر فلیس منا ﴾ جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض نے اس سے وتر کے واجب ہونے پر استدلال کیا ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں ابوالمنیب عبیداللہ بن عبداللہ عتکی متکلم فیہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور نسائی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے بلکہ امام ابن معین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے یعنی یہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے مرفوع حدیث نہیں۔ جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے کہا ہے کیونکہ خلیل بن مرۃ عن معاویہ بن قرۃ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور معاویہ بن قرہ کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ اس نے تو ان سے کچھ بھی نہیں سنا۔ اس لئے یہ منقطع روایت ہے اور خلیل بن مرۃ بذات خود منکر حدیث ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اور اس کی شاہد حدیث' دونوں ہی احتجاج کے لائق نہیں اور ان احادیث صحیحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو وتر کے سنت ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ابھی ایک حدیث کے تحت "الوتر حق" کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد وتر کی اہمیت ہے اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن بریدہ رحمہ اللہ ﴾ ان کی کنیت ابوسہل ہے۔ مرو میں منصب قضاء پر فائز رہے۔ مشاہیر اور ثقہ تابعین میں شمار کئے گئے۔ تیسرے طبقہ کے مشاہیر میں سے تھے۔ ۱۱۵ھ میں مرو ہی میں فوت ہوئے۔

(۲۹۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَا كَانَ رَسُولُ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے

اللهِ ﷺ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلاَ فِيْ غَيْرِهِ عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُصَلِّيْ أَرْبَعاً، فَلاَ تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعاً، فَلاَ تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّيْ ثَلاَثاً، قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوْتِرُ؟ قَالَ: **يَا عَائِشَةُ إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ، وَلاَ يَنَامُ قَلْبِي**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

زائد نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعتیں ایسی حسن خوبی سے ادا فرماتے تھے کہ ان کے حسن اور طوالت کا کیا کہنا۔ پھر چار رکعات ادا فرماتے بس ان کی خوبی اور طوالت کے بارے میں کیا پوچھتے ہو پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپؐ وتر ادا کئے بغیر سو جاتے ہیں۔ فرمایا "عائشہ (رضی اللہ عنہا) میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔" (بخاری و مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا عَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ عَشْرَ رَكْعَاتٍ، وَيُوتِرُ بِسَجْدَةٍ، وَيَرْكَعُ رَكْعَتَيِ الفَجْرِ، فَتِلْكَ ثَلاَثَ عَشْرَةَ.

اور بخاری و مسلم دونوں کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رات کو آپؐ دس رکعتیں پڑھتے تھے اور بعد میں ایک وتر اور اس کے بعد فجر کی دو رکعتیں۔ یہ سب ملا کر کل تیرہ رکعتیں ہوتیں۔

لغوی تشریح: ﴿ ما كان يزيد الخ ﴾ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ نماز تراویح کی رکعات کی تعداد گیارہ ہی مسنون ہے اور بس۔ تہجد اور تراویح دونوں ایک ہی چیز ہے۔ ﴿ يصلى اربعا ﴾ بظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ چاروں رکعتوں کو مسلسل ایک ہی سلام سے پڑھتے تھے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ آپؐ دو' دو رکعت پڑھتے۔ چار کے بعد کچھ توقف کرتے اس لئے انہیں چار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ آپؐ نے فرمایا رات کی نماز دو' دو رکعت ہے تو اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ﴿ فلا تسال عن حسنهن وطولهن ﴾ دریافت کرنے سے منع کر دیا گیا اور یہاں نہی مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود نماز کی تعریف کرنا ہے اور یہ انتہائی عمدہ و بہترین اور طوالت سے کنایہ ہے۔ ﴿ اتنام قبل ان توتر ﴾ اس میں ہمزہ استفہام کیلئے ہے۔ گویا آپؐ آٹھ رکعت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے۔ پھر کھڑے ہو کر تین وتر ادا فرماتے بغیر اس کے کہ سونے کے بعد اٹھنے کے وقت وضو فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال ہوگا کہ نیند نواقض وضو میں سے ہے اس لئے انہوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا' جس کا جواب آپؐ نے ان کو ﴿ ان عينى ﴾ کے فقرے میں دیا۔ عينى نون پر فتحہ اور "یا" پر فتحہ اور تشدید۔ عین کا تثنیہ ہے اور یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور معنی یہ ہیں حدث اگر واقع ہو تو اس کا تعین ہو جاتا ہے کیونکہ میرا دل بیدار رہتا ہے سوتا نہیں اور مجرد نیند ناقض وضو نہیں ہے۔ یہ تو ہوا کے خارج ہونے

کے احتمال کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا گمان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسئلے معلوم ہوتے ہیں: (۱) نبی ﷺ کا دل نہیں سوتا صرف آنکھیں سوتی تھیں اور یہ آپؐ کی خصوصیت تھی بلکہ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ تمام انبیاء کے دل جاگتے اور آنکھیں سوتی ہیں۔ (۲) گہری نیند جس میں دل غافل ہو جائے ناقض وضو ہے۔ (۳) نماز تہجد عمدہ طریقے پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھنی چاہئے۔ (۴) ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے نماز تراویح گیارہ رکعت ہی پڑھی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ آپؐ یہ نماز گھر ہی میں ادا فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ کے وہ اعمال جو آپؐ عموماً گھر میں سرانجام دیتے تھے بالخصوص رات کے ان کی صحیح خبر اہل خانہ ہی کو صحیح طور پر ہو سکتی ہے۔

بیس رکعت تراویح کے متعلق ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ عبد بن حمید اور طبرانی نے ابوشیبہ' ابراہیم بن عثمان' عن الحکم' عن مقسم' عن ابن عباس کے طریق سے جو روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بیس رکعت تراویح پڑھیں' وہ سخت ضعیف ہے کیونکہ ابوشیبہ کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ' ابن معین رحمہ اللہ' امام بخاری رحمہ اللہ' امام مسلم رحمہ اللہ' ابوداؤد رحمہ اللہ' ترمذی رحمہ اللہ اور نسائی رحمہ اللہ سبھی کی یہ رائے ہے کہ یہ شخص ضعیف ہے۔ شعبہ نے تو اسے کذاب قرار دیا ہے۔ اس کے مقابل صحیح مرفوع روایات میں آٹھ رکعت تراویح کا ذکر ہے۔ اس لئے تراویح آٹھ رکعت ہی سنت ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں کہا ہے کہ تراویح کی مسنون تعداد تو آٹھ رکعات ہے اور اس سے زائد مستحب اور نفل ہیں۔ اسی طرح علامہ محمد انور کاشمیری رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے "عرف الشذی" میں کہا ہے کہ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تراویح آٹھ رکعت پڑھی ہیں اور کسی روایت سے یہ بھی ثابت نہیں کہ آپؐ نے تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہوں۔ (۵) اس حدیث کے آخری حصے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے نماز تہجد کی دس رکعتیں بھی پڑھی ہیں اور آخر میں ایک وتر پڑھا یوں یہ کل گیارہ رکعتیں ہوئیں۔ (۶) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ نے کبھی تیرہ رکعت بھی پڑھیں ہیں۔ جس میں آٹھ نفل اور پانچ وتر پڑھتے تھے۔

(۲۹۹) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَلاَثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُوْتِرُ مِنْ ذَلِكَ بِخَمْسٍ، لاَ يَجْلِسُ فِيْ شَيْءٍ إِلاَّ فِي آخِرِهَا.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو تیرہ رکعت ادا فرماتے تھے۔ ان میں پانچ وتر ہوتے تھے اور ان پانچ وتروں میں تشہد کیلئے صرف آخری رکعت میں بیٹھتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿لا يجلس في شئی﴾ کہ پانچ وتر پڑھتے اور آخری رکعت کے علاوہ کسی رکعت کے بعد نہ بیٹھتے یعنی پانچویں رکعت متصل پڑھتے تھے درمیان میں تشہد نہیں پڑھتے تھے۔ اس حدیث سے

احناف کے مذہب کی تردید ہوتی ہے جو صرف تین رکعات کے تعین پر ہی اصرار کرتے اور درمیان میں تشہد پڑھتے ہیں۔

(۳۰۰) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ قَدْ أَوْتَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَانْتَهَى وِتْرُهُ إِلَى السَّحَرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِمَا.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کے ہر حصے میں وتر پڑھا ہے اور آپؐ کے وتر پڑھنے کی انتہا سحر تک تھی۔ (دونوں روایتوں کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿السحر﴾ سحر سے مراد صبح کاذب ہے۔ یہ وہ سفیدی ہے جو مشرقی افق میں طلوع فجر سے پہلے سیدھے ستون کی مانند نظر آتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے وتر رات کے شروع اور وسط شب اور رات کے آخری حصہ میں پڑھے ہیں۔ وتروں کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر طلوع فجر تک رہتا ہے جو لوگ نماز تہجد کے عادی ہوں انہیں وتر رات کے آخری حصہ میں پڑھنے چاہئیں اور جو سحری کے وقت اٹھ نہ سکتے ہوں وہ نماز عشاء کے بعد پڑھیں۔ کسی مجبوری اور عذر کی وجہ سے اگر وقت پر وتر نہ پڑھے جا سکیں تو فجر کی جماعت کھڑی ہونے تک انہیں پڑھ لے۔ ہاں! اگر سو جائے یا اسے یاد ہی نہ رہے تو جس وقت بیدار ہو یا جس وقت یاد آئے پڑھ لے' اس کا یہی وقت ہے۔

(۳۰۱) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا عَبْدَ اللهِ لاَ تَكُنْ مِثْلَ فُلاَنٍ، كَانَ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ. فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "اے عبداللہ! فلاں آدمی کی طرح تم نہ ہو جانا کہ وہ قیام اللیل کرتا تھا پھر بعد میں اسے ترک کر دیا۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قیام اللیل واجب نہیں مندوب ہے اور عمل خیر پر مداومت اور ہمیشگی پسندیدہ اور بہترین عمل ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب کسی مستحب و مندوب عمل کی عادت بنا لے تو پھر اس میں غفلت' تساہل اور سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے' اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ جب کوئی عمل شروع فرما لیتے تو اس پر دوام کرتے خواہ عمل معمولی سا ہوتا۔

اس حدیث سے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب کسی کی بری عادت کسی دوسرے کے سامنے بیان کرنی ہو تو اس کا نام پس پردہ رکھا جائے۔ حضور ﷺ نے لاتکن فی مثل فلان فرمایا' اس شخص کا نام نہیں لیا۔ اس آدمی کا نام ظاہر نہ فرما کر پردہ پوشی فرمائی ہے۔

(٣٠٢) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَوْتِرُوا يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ! فَإِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ، يُحِبُّ الْوِتْرَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے قرآن والو! وتر پڑھا کرو۔ اللہ خود بھی وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے۔" (اسے پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اوتروا﴾ یعنی وتر پڑھو۔ یہ امر وجوب کیلئے نہیں بلکہ ترغیب کیلئے ہے۔ ﴿یااھل القرآن﴾ سے مراد حفاظ قرآن ہیں اور یہ قرینہ ہے کہ وتر واجب نہیں' ورنہ محض اہل القرآن کو بالخصوص اسی کے پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ وتر سے مراد یہاں قیام اللیل ہے اور وتر بول کر اطلاق قیام اللیل پر کیا گیا ہے کیونکہ وہ تمام نمازوں کے آخر میں پڑھے جاتے ہیں اور وتر باقی ساری نماز کو بھی وتر (طاق) بنا دیتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے حفاظ قرآن کو ترغیب ہے کہ وہ قیام اللیل کا اہتمام کریں کیونکہ اس سے قرآن یاد رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

(٣٠٣) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اجْعَلُوا آخِرَ صَلاَتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْراً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنی رات کی آخری نماز کو وتر بناؤ۔" (بخاری اور مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں رات کی نماز کا آخری حصہ وتر بنانے کا امر وجوب کیلئے نہیں بلکہ مندوب ہے۔ اگر کسی نے رات کے اول حصہ میں وتر پڑھا ہے پھر رات کے درمیان میں یا رات کے آخری حصہ میں جاگ اٹھا تو وہ جو چاہے پڑھے وتر کو نہ پڑھے یعنی جوڑا (شفع) بنانے کی کوشش نہ کرے بلکہ اگر کوئی وتر کے ادا کرنے کے بعد دو رکعت پڑھ لے تو کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

(٣٠٤) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: لاَ وِتْرَانِ فِي لَيْلَةٍ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "ایک رات میں دو مرتبہ وتر نہیں۔" (اسے احمد نے اور تینوں (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک رات میں دو بار وتر نہیں پڑھنے چاہئے۔ بعض حضرات جو اس بات کے قائل ہیں کہ اگر اول رات میں وتر پڑھے ہوں پھر رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو تو

پہلے ایک رکعت پڑھ کر شفع بنا لے پھر نفل پڑھ کر آخر میں وتر پڑھ لے۔ یہ عمل اس حدیث کے خلاف ہے۔ مزید تفصیل کیلئے امام مروزی رحمۃ اللہ علیہ کی "قیام اللیل" ملاحظہ ہو۔

(۳۰۵) وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُوتِرُ «بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الأَعْلَى» وَ«قُلْ يَآ أَيُّهَا الكَافِرُوْنَ» و«قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ» رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ: وَلاَ يُسَلِّمُ إِلاَّ فِي آخِرِهِنَّ.

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین رکعات وتر کی صورت میں بالترتیب پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی دوسری میں قل یا ایہا الکفرون اور تیسری میں قل ھو اللہ احد پڑھتے تھے۔ (اس کو احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے) اور نسائی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے "اور سلام آخری رکعت میں پھیرتے تھے"۔

وَلأَبِيْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ نَحْوُهُ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، وَفِيْهِ: كُلُّ سُورَةٍ فِي رَكْعَةٍ، وَفِي الأَخِيْرَةِ «قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ» وَ«الْمُعَوِّذَتَيْنِ».

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے اور اس روایت میں ہے کہ ہر رکعت میں ایک سورۃ تلاوت فرماتے تھے اور آخری رکعت میں قل ھو اللہ احد اور معوذتین پڑھتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ کل سورۃ ﴾ ہر رکعت میں ایک سورۃ ۔ یعنی ایک رکعت میں "سبح اسم ربک الاعلی" اور دوسری میں "قل یایھا الکفرون" مکمل سورت پڑھے ﴿ فی رکعۃ ﴾ سے مراد پہلی اور دوسری رکعت میں ﴿ المعوذتین ﴾ تعویذ سے ماخوذ اسم مفعول کا صیغہ ہے ۔اس سے مراد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہے۔ معوذتین کا اضافہ پہلی روایت کے خلاف نہیں ہے۔ ان دونوں صورتوں کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی صرف سورہ اخلاص پڑھ لیتے اور کبھی معوذتین بھی شامل فرما لیتے۔

حاصل کلام: حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تین وتر ادا فرمایا کرتے تھے۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت بھی پڑھتے تھے اور آخری رکعت میں قرآن مجید کی آخری تین سورتیں پڑھتے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تین وتر دو تشہد سے پڑھتے تھے۔ اگر احناف نے ایسی احادیث سے استدلال کیا ہے تو یہ استدلال واضح نہیں ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ﴾ ابومنذر ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج کی شاخ نجار سے ہونے کی وجہ سے انصاری' نجاری خزرجی کہلائے۔ قراء کے سربراہ تھے اسی وجہ سے سید القراء کے لقب سے مشہور ہوئے۔ کاتبین وحی میں سے تھے اور ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جمع قرآن کا شرف پایا۔ عہد رسالت مآب ﷺ میں فتویٰ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں

شریک تھے۔ بدر اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ ان کی وفات کے سن میں اختلاف ہے۔ ۱۹ھ سے لے کر ۳۲ھ کے درمیان میں کوئی وقت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(٣٠٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَوْتِرُوا قَبْلَ أَنْ تُصْبِحُوا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

وَلِابْنِ حِبَّانَ: مَنْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ وَلَمْ يُوتِرْ، فَلاَ وِتْرَ لَهُ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "وتر صبح ہونے سے پہلے پڑھ لیا کرو" (مسلم)

اور ابن حبان میں ہے کہ "جس کسی نے صبح تک وتر نہ پڑھے اس کا کوئی وتر نہیں ہے۔"

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ وتر کا وقت صبح کے نمودار ہونے سے پہلے تک ہے۔ جب فجر طلوع ہوگئی تو ادائیگی، وتر کا وقت نکل گیا "لا وتر لہ" کے معنی ہیں کہ اس کا وتر ادا نہیں ہوگا۔ رہا اس کی قضاء کا مسئلہ تو وہ جب اور جس وقت چاہے پڑھ سکتا ہے جس پر آئندہ آنے والی حدیث دلالت کرتی ہے۔ وتر ہر وقت ادا کرنے کی بنا پر ہی آپؐ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔ اس لئے کہ جو لوگ صبح اٹھ نہ سکیں انہیں چاہئے کہ عشاء کی نماز کے ساتھ وتر بھی پڑھ لیا کریں۔

(٣٠٧) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ نَامَ عَنِ الوِتْرِ أَوْ نَسِيَهُ، فَلْيُصَلِّ إِذَا أَصْبَحَ أَوْ ذَكَرَ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو سو جائے بغیر وتر پڑھے یا اسے یاد نہ رہے ہوں تو اسے چاہئے کہ صبح کے وقت پڑھ لے یا پھر جب اسے یاد آئے۔" (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب وتر کسی بھی صورت پڑھنے سے رہ جائیں تو انہیں بہرصورت پڑھنا چاہئے۔ اس سے بھی نماز وتر کی بڑی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

(٣٠٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ خَافَ أَنْ لاَ يَقُومَ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوتِرْ أَوَّلَهُ، وَمَنْ طَمِعَ أَنْ يَقُومَ آخِرَهُ فَلْيُوتِرْ آخِرَ اللَّيْلِ، فَإِنَّ صَلاَةَ آخِرِ اللَّيْلِ مَشْهُودَةٌ، وَذَلِكَ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی کو یہ اندیشہ اور خوف لاحق ہو کہ وہ رات کے آخری اوقات میں بیدار نہیں ہو سکے گا اسے چاہئے کہ رات کے پہلے حصہ میں ہی وتر پڑھ لے اور جسے یہ توقع اور امید ہو کہ وہ بیدار ہو جائے گا تو اسے رات کے آخری حصہ میں وتر

أَفْضَلُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

پڑھنے چاہئیں کیونکہ رات کے آخری حصہ کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہ بہت بہتر ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مشهودة﴾ یعنی رات کی نماز کے وقت شب و روز کے ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی مخلوق ہیں۔ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے ہیں اور ان کی ڈیوٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ نیز ثابت ہوتا ہے کہ وتر آخری رکعت میں پڑھنے افضل ہیں بشرطیکہ شب بیداری کی عادت ہو ورنہ پہلی رات پڑھ کر ہی سونا چاہئے۔

(۳۰۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا طَلَعَ الفَجْرُ، فَقَدْ ذَهَبَ وَقْتُ كُلِّ صَلاَةِ اللَّيْلِ، والوِتْرِ، فَأَوْتِرُوا قَبْلَ طُلُوعِ الفَجْرِ». رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب فجر طلوع ہو جائے تو پھر رات کو پڑھی جانے والی ہر نماز کا وتروں سمیت وقت چلا جاتا ہے (ختم ہو جاتا ہے) لہٰذا تم طلوع فجر سے پہلے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿كل صلاة الليل﴾ رات کی ہر نماز سے مراد وہ نوافل ہیں جو مشروع ہیں یعنی جن نوافل کو ادا کیا جانا شریعت محمدیہؐ سے ثابت ہو۔ ﴿والوتر﴾ یہ رفعی صورت میں ہے۔ اس کا عطف "کل" پر ہوگا یعنی رات کی ہر نماز اور وتر بھی۔ یہاں وتر کے مزید مقام و مرتبہ کی بنا پر یہاں خاص کا عام پر عطف ہے۔

(۳۱۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحَى أَرْبَعاً، وَيَزِيدُ مَا شَاءَ اللَّهُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز ضحیٰ (چاشت کی نماز) چار رکعات پڑھا کرتے تھے اور جتنی اللہ چاہتا زیادہ بھی کرتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنْهَا أَنَّهَا سُئِلَتْ: هَلْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحَى؟ قَالَتْ: لاَ إِلاَّ أَن يَجِيءَ مِن مَغِيبِهِ.

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا کیا رسول اللہ ﷺ ضحیٰ کی نماز پڑھا کرتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں الاّ یہ کہ جب اپنے سفر سے واپس تشریف لاتے

وَلَهُ عَنْهَا: مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي سُبْحَةَ الضُّحَى قَطُّ، وَإِنِّي لأُسَبِّحُهَا.

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز ضحیٰ پڑھتے کبھی نہیں دیکھا اس کے باوجود میں یہ نوافل پڑھتی

ہوں۔

لغوی تشریح: ﴿ کان یصلی الضحی ﴾ اس مقام پر کان استمرار کا معنی نہیں دے رہا کہ آپؐ نماز ضحیٰ ہمیشہ بلاناغہ ادا فرماتے رہے۔ یہاں تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ضحیٰ کے نوافل پڑھتے تو ان کی تعداد چار ہوتی جہاں تک نماز ضحیٰ کا تعلق ہے وہ تو نفل نماز ہے' مستحب ہے جو چاشت کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس کی کم از کم رکعتیں دو ہیں اور زیادہ سے زیادہ کے بارے میں نبی ﷺ سے بارہ رکعتوں سے زیادہ کچھ بھی مروی نہیں ہے ﴿ مغیبة ﴾ اپنے سفر سے واپسی۔ ﴿ سبحة الضحی ﴾ سین پر ضمہ اور "با" ساکن یعنی نماز ضحیٰ کے نوافل ﴿ وانی لاسبحها ﴾ تسبیح سے ماخوذ ہے یعنی میں صلاۃ ضحیٰ پڑھتی ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل باوجودیکہ انہوں نے نبی ﷺ کو پڑھتے نہیں دیکھا اس کا سبب یہ ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نبی ﷺ کے ارشاد گرامی سے اس نماز کی فضیلت معلوم ہوگئی ہوگی یا پھر انہیں یہ بات پہنچی ہوگی کہ آپؐ نے یہ نماز پڑھی ہے۔ رؤیت کی عدم موجودگی اس کو تو مستلزم نہیں ہے کہ آپؐ نے اس کو مطلقاً پڑھا نہیں۔ یوں یہ حدیث پہلی دونوں احادیث کے معارض نہیں ہے اور ان کے درمیان تطبیق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پہلی حدیث تو مطلقاً اثبات پر دلالت کرتی ہے (یعنی آپؐ نے یہ نماز پڑھی ہے) اور تیسری مطلقاً نفی پر دلالت کرتی ہے یعنی آپؐ نے یہ عمل کیا ہی نہیں اور دوسری حدیث سفر سے واپسی کی قید سے مشروط ہے یعنی سفر سے واپسی کے وقت پڑھی ہے۔ ان کے درمیان جمع کی صورت یہ ہے کہ تیسری حدیث میں سبب کی کوئی قید نہیں ہے اور پہلی حدیث سبب کے ساتھ مقید ہے اور وہ ہے سفر سے واپسی۔ جمع کی یہ صورت پہلی سے بہتر اور اولیٰ ہے۔ اس باب کی آخری حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔

حاصل کلام: نماز اشراق' صلاۃ ضحیٰ اور صلاۃ اوابین تین الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک ہی نماز کا تین الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ عربی زبان کا دامن بہت وسیع اور کشادہ ہے اس میں ایک ہی چیز بے شمار الفاظ سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ طبرانی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی چچا زاد بہن ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر نماز پڑھی اور ام ھانی رضی اللہ عنہا کو بلا کر بتایا کہ یہ اشراق کی نماز ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں اس کا نام صلاۃ ضحیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہ نماز طلوع آفتاب سے لے کر دن کے چوتھائی حصہ تک پڑھی گئی ہے اور اوابین کی نماز کا وقت جب آفتاب کی تمازت سے زمین گرم ہو جائے کہ اونٹنی کا بچہ گرمی محسوس کرنے لگے۔ اونٹ کا بچہ معمولی حرارت کی پروا نہیں کرتا بلکہ ذرا تپش زیادہ ہو تو وہ گرمی محسوس کرتا ہے۔ گویا اس نماز کا وقت سورج کے کافی اوپر چڑھنے کے بعد ہے۔ اس طرح بعض کے نزدیک تینوں نمازیں دراصل ایک ہی ہیں نام مختلف ہیں۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ اشراق اور ضحیٰ ایک ہی نماز کے دو نام ہیں البتہ صلاۃ اوابین ان سے الگ ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ نماز ضحیٰ کی رکعت کتنی ہیں؟ تو اس کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات کا حدیث سے ثبوت ملتا ہے۔

(۳۱۱) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «صَلاَةُ الأَوَّابِينَ حِينَ تَرْمَضُ الفِصَالُ». رَوَاه التِّرْمِذِيُّ.

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اوابین کی نماز کا وقت وہ ہے جب اونٹنی کے بچے تپش و حرارت اور گرمی محسوس کریں۔" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿ الاوابين ﴾ اواب کی جمع ہے۔ اس میں "واو" پر تشدید ہے معنی اس کے بکثرت رکوع کرنے والے ہیں اور منکرات و سیئات کو چھوڑنے اور ترک کرنے والے ہیں۔ ﴿ حين ﴾ وقت کے معنی میں۔ یہ جب جملہ کی طرف مضاف ہو تو اکثر و بیشتر مبنی بر فتح ہوتا ہے ﴿ ترمض ﴾ سمع يسمع باب سے یعنی گرمی اور تمازت کی وجہ سے جلن محسوس کرے اور یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب سورج کی گرم شعاعیں زمین پر پڑتی ہیں اور یہ وہی وقت ہے جب سورج کافی اونچا ہو اور نصف النہار کے قریب پہنچ چکا ہو ﴿ الفصال ﴾ "فا" کے نیچے کسرہ فصیل کی جمع ہے۔ اونٹنی کے بچہ کیلئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے گویا کنایہ مقصود ہے کہ صلاۃ اوابین کا وقت اس وقت ہوتا ہے جب اونٹنی کے چھوٹے بچے دن کی حرارت و تمازت سے جلن اور تپش محسوس کریں اس وقت پڑھی جانے والی نماز کا نام صلاۃ اوابین اس لئے ہے کہ اس وقت طبیعت انسانی آرام و استراحت اور سکون کی جانب مائل ہوتی ہے مگر یہ نماز پڑھنے والا نفس کی مراد پوری کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

(۳۱۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ صَلَّى الضُّحَى ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً، بَنَى اللَّهُ لَهُ قَصْراً فِي الجَنَّةِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَغْرَبَهُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے صلوٰۃ الضحیٰ کی بارہ رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں محل تعمیر فرمائے گا۔" (اسے ترمذی نے روایت بھی کیا ہے اور اسے غریب بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے غریب کہا ہے۔ اس سے نماز ضحیٰ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث اس کی فضیلت میں منقول ہیں مگر وہ بھی ضعیف ہیں۔

(۳۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بَيْتِي، فَصَلَّى الضُّحَى ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ. رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ فِي صَحِيحِهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف لائے اور نماز ضحیٰ کی آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں۔ (ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے حضور ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں آٹھ رکعت نماز ضحیٰ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے' ممکن ہے اس نماز سے مراد سفر سے واپسی پر پڑھی گئی نماز ہو۔ نماز ضحیٰ کا بڑا فائدہ مسلم کی روایت

میں منقول ہے کہ انسان کے ہر جوڑ پر ایک حق واجب ہے' انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہوتے ہیں۔ اس نماز کی دو رکعت ادا کرنے سے وہ حقوق ادا ہو جاتے ہیں جو ان تمام جوڑوں پر واجب ہوتے ہیں۔

١٠ - بَابُ صَلاةِ الجَمَاعَةِ وَالإمَامَةِ نماز باجماعت اور امامت کے مسائل کا بیان

(٣١٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: صَلاةُ الجَمَاعَةِ أَفْضَلُ مِنْ صَلاةِ الفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِينَ دَرَجَةً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلَهُمَا عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: «بِخَمْسٍ وَعِشْرِينَ جزءًا» وَكَذَا لِلْبُخَارِيِّ عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ، وَقَالَ: «دَرَجَةً».

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "باجماعت نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "پچیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے" اور بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اس میں جزء کی جگہ درجۃ کا لفظ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ باب صلاۃ ....الخ ﴾ امامت کا عطف صلاۃ پر ہے۔ جماعت کے لفظ پر نہیں ہے۔ ﴿ من صلاۃ الفذ ﴾ "فا" پر فتحہ اور ذال پر تشدید۔ "فذ" کے معنی تنہا اور منفرد "جزء" همزہ پر نصب۔ درجہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس مقام پر درجہ اور جزء سے مراد نماز ہے ﴿ وکذا للبخاری ﴾ یعنی بخاری کی روایت میں بھی پچیس گنا ہے ﴿ وقال درجۃ ﴾ جزء کی جگہ درجۃ کا لفظ ہے۔ رہا یہ دونوں عددوں کا اختلاف تو اس بارے میں کہا گیا ہے کہ دونوں کے مابین کوئی منافات نہیں۔ یہاں عدد کا مفہوم مراد نہیں ہے۔ ستائیس میں پچیس شامل ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے آپؐ نے پچیس گنا ثواب کا ذکر کیا ہو بعد میں ستائیس گنا کا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرق مسجد کے قریب و بعید ہونے کی وجہ سے ہے اگر مسجد دور ہوگی تو اجر زیادہ اور قریب ہونے کی صورت میں کم اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے خشوع کی قلب و کثرت مراد ہے اگر نماز میں خشوع زیادہ ہوگا تو ثواب زیادہ ملے گا اور اگر خشوع کم ہوگا تو اجر کم ملے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرق جماعت کی تعداد کی کثرت و قلت کی وجہ سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پوری نماز میں شمولیت ہوگی تو زیادہ ثواب ملے گا اور اگر تھوڑی سی نماز میں شمولیت ہوگی تو اجر کم ملے گا۔ واللہ اعلم۔

حاصل کلام: اس حدیث سے بظاہر ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نماز باجماعت پڑھنا

واجب نہیں کیونکہ انفرادی اور اجتماعی میں مختلف اسباب کی وجہ سے درجات میں کمی و بیشی ہوتی ہے تو گویا منفرد کی بھی نماز ہوگئی خواہ مراتب اور درجات کم ہی ہوں۔ اگر جماعت نماز واجب ہوتی تو پھر منفرد کی نماز تو جائز نہ ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ للذا معلوم ہوا کہ نماز جماعت سے پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔

(٣١٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِحَطَبٍ فَيُحْتَطَبَ، ثُمَّ آمُرَ بِالصَّلاَةِ فَيُؤَذَّنَ لَهَا، ثُمَّ آمُرَ رَجُلاً فَيَؤُمَّ النَّاسَ، ثُمَّ أُخَالِفَ إِلَى رِجَالٍ لاَ يَشْهَدُونَ الصَّلاَةَ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ يَعْلَمُ أَحَدُهُمْ أَنَّهُ يَجِدُ عَرْقاً سَمِيناً، أَوْ مِرْمَاتَيْنِ حَسَنَتَيْنِ لَشَهِدَ العِشَاءَ».
مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اس ذات گرامی کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیوں کے جمع کرنے کا حکم دوں پھر نماز کیلئے اذان کا حکم دوں پھر کسی کو نماز پڑھانے کیلئے کہوں پھر میں خود ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں شریک نہیں ہوتے ان کے گھروں میں موجود ہونے کی صورت میں ان کے گھروں کو ان پر آگ لگا کر جلا دوں۔ قسم اس ذات گرامی کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ ان میں سے کسی کو اگر یہ علم ہو جائے کہ اس کو گوشت سے پر موٹی ہڈی مل جائے گی یا دو پائے مل جائیں گے تو نماز عشاء میں لپک کر شامل ہو جائے گا۔ (بخاری و مسلم) متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ هممت ﴾ میں نے ارادہ کیا' قصد کیا ﴿ بحطب ﴾ "حا" اور "طا" پر فتحہ خشک لکڑی جو جلانے کے کام آسکے ﴿ فیحتطب ﴾ لکڑیاں جمع کی جائیں۔ صیغہ مجہول ہے۔ منصوب اس لئے ہے کہ اس سے پہلے واقع فعل منصوب کا جواب ہے ﴿ فیوذن ﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ اذان دی جائے ﴿ فیوم الناس ﴾ جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ یعنی لوگوں کا امام بن کر نماز باجماعت پڑھائے ﴿ ثم اخالف الی رجال ﴾ پھر میں ان کے پیچھے سے آؤں یا محض یہ معنی ہے کہ میں ان کی طرف چلا جاؤں۔ ﴿ فاحرق ﴾ تحریق سے ماخوذ ہے' یعنی میں آگ لگا کر جلا ڈالوں یہاں مضارع کے تمام صیغے منصوب واقع ہوئے ہیں سوائے صیغہ جمع مذکر کے۔ ﴿ عرقا ﴾ عین پر فتحہ "را" ساکن۔ وہ ہڈی جس پر کچھ گوشت باقی ہو اور اس کا زیادہ حصہ اخذ کر لیا گیا ہو اور اصمعی کا قول ہے کہ عرق گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ زیادہ عمدہ۔ اس جگہ پہلا ہی معنی مراد ہے کیونکہ لوگوں کی بد ترین خصلت و عادت کو زیادہ شدید مبالغہ کے اظہار کیلئے ہے ﴿ سمینا ﴾ سمانۃ سے ماخوذ ہے۔ لاغر کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ موٹا تازہ اس کے معنی

ہیں۔ کیونکہ اس میں چکنائی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے چبانے میں رغبت زیادہ ہوتی ہے ﴿ مرماتین ﴾ مرماۃ کا تثنیہ ہے۔ میم کے نیچے کسرہ ہے اور کبھی فتحہ سے بھی پڑھا گیا ہے۔ بکری کا کھر یا وہ گوشت جو دونوں کھروں کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ اس قسم کی سخت و شدید وعید تو صرف واجب کے ترک پر ہوتی ہے اور جس نے اس وعید کو زجر و توبیخ پر محمول کیا ہے اور واجب تسلیم نہیں کیا ہے اس نے تاویل سے کام لیا ہے۔ اس کی حقیقت یہاں مراد نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ سمجھا گیا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض عین ہے۔ فرض کفایہ یا سنت مؤکدہ نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ تارکین جماعت کیلئے اتنی سخت اور شدید وعید اور دھمکی نہ دی جاتی اگر یہ فرض عین نہ ہوتی۔ ظاہریہ' عطاء' اوزاعی' امام احمد' ابوثور' ابن خزیمہ' ابن منذر اور ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ فرض کفایہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اگر جماعت کے ساتھ ادا کرلیں تو باقی لوگوں سے عدم ادائیگی کی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ متقدمین شافعیہ اور بعض احناف اور مالکیہ کا بھی یہی قول ہے البتہ صاحبین اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ فرض کفایہ تو اس لئے نہیں کہ جب کچھ لوگ جماعت میں شامل ہوگئے پھر شامل نہ ہونے والوں کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کفایہ تو چند لوگوں کے ادا کرنے سے پورا ہو جاتا ہے۔

(٣١٦) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **أَثْقَلُ الصَّلَاةِ عَلَى الْمُنَافِقِينَ صَلَاةُ الْعِشَاءِ وَصَلَاةُ الْفَجْرِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِيهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْواً»**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "منافقین پر سب سے ثقیل و بوجھل نمازیں' نماز عشاء اور نماز فجر ہیں اگر ان کو علم ہو جائے کہ ان دونوں میں حاضر ہونے کا کتنا (عظیم) اجر و ثواب ہے تو یہ لازماً ان میں شامل ہوتے خواہ ان کو گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑتا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لاتوھما ﴾ اس میں لام تاکید کیلئے ہے یعنی ضرور آتے اتیان سے ماخوذ ہے "ولو حبوا" خواہ انہیں گھٹنوں پر گھسٹ کر ہی آنا پڑے۔ حبو "حا" پر فتحہ اور "با" ساکن ہے۔ بچے کا اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھٹنا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بچے کا اپنی سرین پر گھسٹ کر آگے بڑھنا۔

حاصل کلام: ان دونوں نمازوں کو نہایت بوجھل اور بھاری کہا گیا ہے۔ عشاء تو اس لئے ثقیل ہے کہ اس وقت تھکے ماندے لوگ سو جانے کی کوشش کرتے ہیں یا اکیلے ہی نماز ادا کر کے سو جاتے ہیں۔ جماعت کو خاص اہمیت ہی نہیں دیتے اور فجر اس لئے گراں ہوتی ہے کہ شیطان نیند کے مارے ہوئے لوگوں کو

اٹھنے ہی نہیں دیتا۔

(۳۱۷) وَعَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ رَجُلٌ أَعْمَى فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّهُ لَيْسَ لِيْ قَائِدٌ يَقُودُنِيْ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَرَخَّصَ لَهُ، فَلَمَّا وَلَّى دَعَاهُ فَقَالَ: «**هَلْ تَسْمَعُ النِّدَآءَ بِالصَّلَاةِ؟**» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «**فَأَجِبْ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا : اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں جو مجھے پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ آپؐ نے اسے رخصت عنایت فرما دی (کہ وہ گھر پر ہی نماز پڑھ لیا کرے) مگر جب وہ واپس جانے لگا تو آپؐ نے اسے واپس بلا کر فرمایا کہ "تم اذان سنتے ہو؟ اس نے عرض کیا جی ہاں' تو آپؐ نے فرمایا "تو پھر اذان کا جواب دے (یعنی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھ)" (مسلم)

لغوی تشریح: "رجل اعمی" نابینا آدمی سے یہاں مراد عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔ غالباً اس ارشاد کے بعد مسجد میں اتنی باقاعدگی سے حاضری دی کہ بالآخر مسجد کے منصب اذان پر مقرر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ﴿ قائد ﴾ وہ آدمی جو نابینا کا ہاتھ تھام کر جہاں وہ جانا چاہے وہاں اسے لے جائے ﴿ ولی ﴾ تولیت سے ماخوذ ہے۔ واپس ہوا۔ واپس جانے کیلئے مڑا اور اپنا رخ پھیرا۔ ﴿ النداء ﴾ اذان ﴿ فاجب ﴾ اجابۃ سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی اذان کا جواب دے۔ اس سے مراد نماز باجماعت ادا کرنا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اذان کی آواز سننے کے بعد معذور آدمی کو بھی مسجد میں آنا چاہیے۔ معذور کی نماز گھر پر پڑھنے سے ادا تو ہو جائے گی مگر جماعت کا ثواب تو نہیں ملے گا۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذان کی آواز نہ سننا قابل قبول عذر ہے۔ سننے کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہتا۔ بارش' سخت آندھی' باد صرر' شدید بھوک' قضائے حاجت' بیماری اور دشمن کا خوف وغیرہ ایسے عذرات ہیں جنہیں جماعت میں عدم شمولیت کیلئے تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے جماعت میں شمولیت کو فرض عین کہنے والوں نے فرضیت عین پر استدلال کیا ہے اور سنت مؤکدہ کہنے والوں نے اس حدیث کو تاکید مزید پر محمول کیا ہے۔ دونوں کیلئے اپنے اپنے نظریہ کی رو سے گنجائش موجود ہے۔

(۳۱۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُذْرٍ**». رَوَاهُ ابْنُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اذان سنے اور پھر نماز باجماعت میں شامل نہ ہو اس کی کوئی نماز نہیں' الا یہ کہ کوئی عذر مانع ہو۔" (اسے ابن ماجہ' دارقطنی' ابن حبان' حاکم

مَاجَهْ والدَّارَقُطْنِيُّ وَابنُ حِبَّانَ وَالحاكِمُ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، لَكِن رَجَّحَ بَعْضُهُمْ وَقْفَهُ.

نے روایت کیا ہے اور اس کی سند مسلم کی شرط کے مطابق ہے لیکن بعض نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے بھی نماز باجماعت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ابوداؤد میں اسی حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا وہ عذر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "خوف اور بیماری" نیز اس میں لا صلاۃ کی بجائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی وہ نماز قبول نہیں کرتا مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ باد و باراں' باد صرصر اور خوف وغیرہ کے ساتھ یہ عذر بھی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے کچا پیاز' لہسن' مولی اور گندنا وغیرہ تازہ ہی کھائے ہوں تو وہ مسجد میں نہ آئے کیونکہ ان کے استعمال سے منہ میں ایسی ناخوشگوار بساند پیدا ہو جاتی ہے جو ملائکہ اور نمازیوں کیلئے باعث اذیت ہوتی ہے۔ اسی طرح تمباکو نوش بھی کم از کم نماز کے اوقات میں تمباکو نوشی سے مکمل پرہیز کریں' تاکہ خدا کی مخلوق کو اذیت دینے کا موجب نہ بنیں۔

(٣١٩) وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ الأَسْوَدِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ صَلاَةَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ، إِذَا هُوَ بِرَجُلَيْنِ لَمْ يُصَلِّيَا، فَدَعَا بِهِمَا، فَجِيءَ بِهِمَا، تَرْعَدُ فَرَائِصُهُمَا، فَقَالَ لَهُمَا: **«مَا مَنَعَكُمَا أَنْ تُصَلِّيَا مَعَنَا»**؟ قَالاَ: قَدْ صَلَّيْنَا فِيْ رِحَالِنَا، قَالَ: **«فَلاَ تَفْعَلاَ، إِذَا صَلَّيْتُمَا فِي رِحَالِكُمَا ثُمَّ أَدْرَكْتُمَا الإِمَامَ وَلَمْ يُصَلِّ فَصَلِّيَا مَعَهُ، فَإِنَّهَا لَكُمَا نَافِلَةٌ»**. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَالثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابنُ حِبَّانَ.

حضرت یزید بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو دو ایسے آدمیوں پر نظر پڑی جنہوں نے نماز (آپؐ کے ساتھ) نہیں پڑھی۔ آپؐ نے دونوں کو اپنے پاس بلوایا۔ دونوں آپؐ کی خدمت میں حاضر کئے گئے تو (خوف کے مارے) ان کے شانے کانپ رہے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "تمہیں ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا؟" دونوں نے عرض کیا: ہم اپنے گھروں پر نماز پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا "ایسا مت کیا کرو۔ اگر تم اپنے گھروں پر نماز پڑھ چکے ہو پھر تم امام کو پالو اور امام نے ابھی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کے ساتھ تم نماز پڑھو' یہ تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ بھی اسی کے ہیں۔۔ اس کے علاوہ تینوں (ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا ھو ﴾ ھو سے یہاں مراد نبی ﷺ ہیں ﴿ برجلین ﴾ ان سے مراد دو آدمی ہیں جو لوگوں کے آخر میں بیٹھے ہوئے تھے ﴿ فجئی ﴾ اس میں "فا" تعقیب کے لئے اور "جئی" فعل ماضی ہے' صیغہ مجہول ہے مجیئۃ سے۔ معنی ہے ان دونوں کو لایا گیا ﴿ ترعد ﴾ صیغہ مجہول۔ معنی ہیں مضطرب ہونا' کانپنا' خوف اور ڈر کی وجہ سے لرزہ براندام ہونا ﴿ فرائصھما ﴾ جمع فریصۃ ' اس گوشت کو کہتے ہیں جو پہلو اور بازو کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے لرزہ براندام ہونے اور کانپنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت و ہیبت ہے' حالانکہ آپ کی طبیعت میں تواضع' نرمی اور شفقت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ﴿ رحالنا ﴾ رحل کی جمع ہے "راء" پر فتح اور "حاء" ساکن ہے۔ معنی جائے سکونت گھر کے ہیں۔ ﴿ فلا تفعلا ﴾ ایسا نہ کرنا یا ایسا تمہیں نہیں کرنا چاہئے۔ یعنی ابھی جو جماعت میں حاضر ہونے کے باوجود تم نے ترک جماعت کا عمل کیا ہے (یہ نہ ہونا چاہئے) ﴿ فانھا لکما نافلۃ ﴾ اس سے وہ نماز مراد ہے جو انہوں نے امام کے ساتھ ادا کی تھی۔ اس لئے کہ فرض نماز تو پہلی نماز کی صورت میں ادا ہوگئی' اب فرض نماز تو کوئی باقی رہی نہیں جو ادا کی جاتی لہٰذا دوسری نماز جو امام کے ساتھ ادا کی تھی وہ نفل نماز قرار پائے گی۔ ابوداؤد اور دارقطنی میں ہے کہ امام کے ساتھ جو نماز پڑھی وہ فرض ہوگی اور جو پہلے اکیلے پڑھی وہ نفل ہوگی۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اور یزید بن اسود کی اس صحیح حدیث کے خلاف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص پہلے نماز پڑھ چکا ہو اور پھر جماعت کے ساتھ شامل ہونے کا موقع بھی میسر آجائے تو اسے جماعت کے ساتھ شامل ہونا چاہئے خواہ کوئی نماز ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صرف ظہر اور عشاء دو نمازوں میں کر سکتا ہے باقی میں نہیں' لیکن جب دوبارہ نماز پڑھنے کی دلیل یہی حدیث ہے تو پھر صبح کی نماز دوبارہ کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ اس لئے امام شافعی کا موقف ہی درست ہے۔

راوی حدیث: ﴿ یزید بن اسود رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوجابر سوائی عامری ہے۔ان کے قبیلے کے قریش سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ مشہور صحابی ہیں۔ طائف میں فروکش ہوئے۔ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔ ان سے ان کے لڑکے جابر رحمہ اللہ نے اس روایت کو بیان کیا ہے۔

(۳۲۰) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «إِنَّمَا جُعِلَ الإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَلاَ تُكَبِّرُوا حَتَّى يُكَبِّرَ، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا، وَلاَ تَرْكَعُوا حَتَّى يَرْكَعَ وَإِذَا قَالَ: «سَمِعَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "امام کو اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے لہٰذا جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور تم اللہ اکبر نہ کہا کرو' تاآنکہ امام اللہ اکبر کہے اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور تم رکوع اس وقت تک نہ کرو جب

اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ» فَقُولُوا: «اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمْدُ» وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا، وَلاَ تَسْجُدُوا حَتَّى يَسْجُدَ، وَإِذَا صَلَّى قَائِماً فَصَلُّوا قِيَاماً، وَإِذَا صَلَّى قَاعِداً فَصَلُّوا قُعُوداً أَجْمَعِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَهٰذَا لَفْظُهُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ.

تک کہ امام رکوع نہ کرے اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور اس سے پہلے سجدہ نہ کرو تاوقتیکہ وہ سجدہ کرے اور جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بھی بیٹھ کر پڑھو۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور اس کی اصل صحیحین (بخاری و مسلم) میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لیوتم ﴾ تاکہ اس کی اتباع و پیروی اور اقتدا کی جائے ﴿ حتی یرکع ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ رکوع میں جھک جائے' یہ معنی نہیں کہ رکوع پورا کرے (پھر تم رکوع کرو) ﴿ واذا قال سمع اللہ الخ ﴾ بعض علمائے احناف نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی صرف حمد و ثنا کرے لیکن یہ حدیث اس بارے میں واضح نہیں ہے' بلکہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ربنا لک الحمد بھی کہتے تھے۔ اسی طرح مقتدی کا سمع اللہ لمن حمدہ کہنا بھی درست ہے کیونکہ یہ وظیفہ انتقال ہے۔ اس حدیث میں دراصل امام اور مقتدی کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ وہ امام کی اقتدا کس طرح کرے۔ راوی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی مقتدی کیلئے تسبیح و تحمید پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے جو ان کے فتاویٰ الحاوی میں مطبوع ہے۔ ﴿ فصلوا قعودا ﴾ تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حکم نبی ﷺ کی مرض کے دوران نماز سے منسوخ ہو چکا ہے' اس لئے کہ آپؐ نے اس وقت امام کی حیثیت سے بیٹھ کر نماز ادا فرمائی تھی اور باقی سب نمازیوں نے کھڑے ہو کر' لیکن امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اپنے حال پر باقی ہے' منسوخ نہیں۔ جب امام کے عذر کے دور ہونے کی توقع نہ ہو تو اس وقت مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہئے بشرطیکہ قبلہ کا امام مستقل ہو اور نماز کی ابتدا بیٹھ کر کرتا ہو۔ ورنہ مقتدیوں کیلئے قیام ہی متعین ہے۔ مولانا صفی الرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امر دراصل وجوب کیلئے ہے۔ اگر حکم کو اس بارے میں کھڑے ہونے پر محمول کریں تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ کے آخری عمل سے یہ منسوخ ہے اور رہا اس کا مندوب ہونے پر محمول کرنا اور مذکورہ شرائط کی قید لگانا تو پھر حدیث سے ایسی کوئی دلیل نہیں کہ نبی ﷺ نے جب اس کا حکم ارشاد فرمایا اس وقت خود ان شرائط کو ملحوظ رکھا۔ بلکہ نبی ﷺ کا ارشاد "واذا صلی قاعدا فصلوا قعودا اجمعین" مطلق حکم کا مقتضی ہے اور شرائط مذکورہ کی بھی کوئی قید نہیں۔ لہٰذا اس حکم کے منسوخ ہونے اور مقتدیوں کیلئے قیام کی

تعین میں ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ حکم منسوخ ہوگیا اور مقتدیوں کیلئے قیام کرنا جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتدیوں کو امام کی پیروی و اتباع کرنی چاہیئے۔ کسی چیز میں امام سے آگے نہ بڑھے۔ تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک امام کے پیچھے پیچھے رہنے کی کوشش کرے۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ جب آپؐ سجدہ میں سر مبارک رکھ لیتے تو ہم سجدہ کیلئے جھکتے تھے۔ البتہ امام جب سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو مقتدی ربنا لک الحمد کہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے اور احناف کا یہی مسلک ہے، لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردان رشیدان صاحبین اور اہل حدیث اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مقتدی بھی سمع اللہ کہہ کر ربنا لک الحمد الخ تک کہیں۔

(۳۲۱) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى فِيْ أَصْحَابِهِ تَأَخُّراً، فَقَالَ «تَقَدَّمُوْا، فائْتَمُّوا بِيْ، وَلْيَأْتَمَّ بِكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو پیچھے ہٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا "آگے آجاؤ اور میری پیروی کرو اور تمہارے پیچھے والے تمہاری پیروی کریں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ تاخرا ﴾ پیچھے رہ جانا، دور رہ جانا۔ یعنی وہ آپؐ کے قریب نہیں پیچھے دور ہو کر کھڑے تھے۔ آپؐ نے آگے بڑھنے کا حکم فرمایا۔ ﴿ فاتموابی ﴾ میری اقتدا کرو یہ ائتمام سے امر کا صیغہ ہے۔ اقتداء، پیروی اور اتباع کے معنی میں۔ "ولیاتم" اس میں لام امر کا ہے۔ یہ گرائمر کے اعتبار سے ساکن بھی ہو سکتا ہے اور مکسور بھی ﴿ من بعدکم ﴾ تمہارے پیچھے والے۔ یعنی تم پہلی صف والے امام کے افعال، حرکات و سکنات اور احکام نماز کو پہلے نبی ﷺ سے حاصل کر لو پھر یہی افعال و احکام اور آداب و صفات نماز تم سے بعد والے یعنی پچھلی صف میں شریک نمازی سیکھ لیں اور اسی طرح ان سے پچھلی صف میں شامل لوگ اپنے سے پہلی میں شریک نمازیوں سے ان آداب و صفات کی تعلیم حاصل کر لیں۔ علی ھذا القیاس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نماز باجماعت میں پہلی صف کا درجہ اور مرتبہ دوسری صفوں سے زیادہ ہے اور افضل ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پہلی صف والوں کو امام کی اقتداء کرنی چاہیئے۔ اس ضرورت کیلئے امام کو دیکھنا جائز ہے اور دوسری صف والوں کو پہلی صف کے مقتدیوں کی اسی طرح اقتداء کرنی چاہیئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو نمازی براہ راست امام کو نہ دیکھ سکتا ہو اور نہ اس کی آواز سن سکتا ہو تو وہ دوسرے مقتدی کی پیروی کرے۔ اس سے اشارتاً یہ بھی مسئلہ نکلتا ہے کہ جس کے پاس براہ راست کسی چیز کا علم نہ ہو تو اسے دوسرے صاحب علم سے معلوم کر لینا چاہیئے۔

(۳۲۲) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اِحْتَجَرَ رَسُولُ

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھاس پھوس سے بنی ہوئی چٹائی

اللهِ ﷺ حُجْرَةً مُخَصَّفَةً، فَصَلَّى فِيْهَا، فَتَتَبَّعَ إِلَيْهِ رِجَالٌ، وَجَاءُوْا يُصَلُّوْنَ بِصَلاَتِهِ، اَلْحَدِيْثَ. وَفِيْهِ: «أَفْضَلُ صَلاَةِ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهِ، إِلاَّ الْمَكْتُوبَةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سے ایک چھوٹا (خیمہ نما) حجرہ بنایا اور اس میں نماز پڑھنے لگے۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا تو وہ آئے اور آپؐ کے ساتھ نماز میں شامل ہوگئے۔ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ مرد کی اپنے گھر میں نماز افضل ہے (سوائے فرض نماز کے)۔ (بخاری، مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ احتجر ﴾ حجرہ کی طرح کا ایک خیمہ سا بنایا ﴿ مخصفة ﴾ تخصیف سے اسم مفعول ہے۔ چٹائی سے بنایا ہوا۔ ﴿ فتتبع الیه رجال ﴾ لوگ تلاش کی جستجو اور کاوش کر کے اس جگہ پہنچ گئے جہاں آپؐ نماز ادا فرما رہے تھے۔ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز کی جماعت کرانا مشروع ہے۔

حاصل کلام: یہ ماہ رمضان کا موقع تھا کہ آپؐ نے اپنے لئے مسجد میں الگ سے ایک مختصر سی مخصوص جگہ بنالی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مقتدیوں اور نمازیوں کیلئے ایسا کرنا باعث ضرر اور تکلیف نہ ہو تو مسجد میں مخصوص جگہ بنائی جاسکتی ہے۔ مکمل روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ جب نماز پڑھتے تھے تو صحابہ کرامؓ کو علم ہوا تو انہوں نے آپؐ کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ آنحضرت ﷺ ایک رات دیر سے اس حجرہ سے باہر نکلے اور فرمایا "میں نے تمہارا حال دیکھ لیا ہے اپنے گھروں میں نماز پڑھو کیونکہ فرض نماز کے علاوہ مردوں کی نماز گھر میں افضل ہے۔"

(۳۲۳) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى مُعَاذٌ بِأَصْحَابِهِ الْعِشَاءَ، فَطَوَّلَ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «أَتُرِيْدُ أَنْ تَكُونَ يَا مُعَاذُ فَتَّانًا؟ إِذَا أَمَمْتَ النَّاسَ فَاقْرَأْ «بِالشَّمْسِ وَضُحَاهَا» وَ«سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى» وَ«اَقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ» «وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے مقتدیوں کو عشاء کی نماز پڑھائی۔ انہوں نے قرأت لمبی کر دی۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اے معاذ! کیا تو نمازیوں کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ جب تو لوگوں کو امامت کرائے تو والشمس وضحاھا اور سبح اسم ربک الاعلی (سورۃ شمس وسورۃ اعلی) واقراء باسم واللیل اذا یغشی (سورہ علق وسورہ لیل) پڑھنی چاہئیں۔" (بخاری و مسلم دونوں نے اسے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فطول ﴾ تطویل (باب تفعیل) سے ماضی کا صیغہ ہے "فا" برائے تعقیب ہے۔ یعنی قراءت لمبی کر دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ پہلی رکعت میں اور سورۂ نساء

دوسری رکعت میں پڑھی۔ ﴿ اتریید ﴾ ھمزہ اس میں سوالیہ ہے (استفہام کیلئے ہے) اور استفہام بھی انکاری ﴿ فتانا ﴾ فا پر فتحہ اور "تا" پر تشدید یعنی تو عذاب اور آزمائش میں مبتلا کرنے والا ہے ﴿ اممت ﴾ پہلی میم پر فتحہ اور دوسری میم ساکن۔ باب نصر ینصر معنی یہ ہوئے کہ جب لوگوں کی امامت کر رہے ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ امام کو قرأت اتنی لمبی اور طویل نہیں کرنی چاہئے کہ نمازی تنگ آجائیں اور جماعت سے گریز کریں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرأت اتنی کم ہو کہ مقصد قرأت ہی فوت ہو جائے بلکہ ادائیگی ارکان اور تلاوت کلام مجید میں اعتدال اور توازن ہونا چاہئے اور مسنون طریقے سے نماز پڑھانی چاہئے۔ طویل قرأت بھی جائز ہے' جبکہ نمازی متحمل ہوں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی نماز کا واقعہ بخاری نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک روز حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے اور انہوں نے قراءت معمول سے زیادہ لمبی کر دی۔ ایک راہ چلتا مسافر جس کے پاس دو اونٹنیاں بھی تھیں وہ اپنی اونٹنیاں باہر چھوڑ کر نماز میں شامل ہوگیا جب اس نے دیکھا کہ قراءت بہت طویل ہے تو اس نے نماز توڑ کر الگ بغیر جماعت کے نماز پڑھی اور اپنی راہ لی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو کہا کہ یہ منافق ہے۔ وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ سے نصیحت فرمائی۔ فتنہ میں مبتلا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ مقتدیوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بوڑھے' کمزور و ناتواں' ضرورت مند' تھکے ماندے وغیرہ تو ان سب کا لحاظ ملحوظ خاطر رکھنا امام کیلئے ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ لوگ اکتا کر نماز باجماعت سے گریز کرنے لگیں۔ دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرض نماز پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں پڑھ کر پھر جا کر محلہ کی مسجد میں نمازیوں کو فرض نماز پڑھاتے اور خود نفل ادا کرتے تھے۔ عبدالرزاق' شافعی اور طحاوی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ (دوسری) نماز نفل ہوتی تھی۔ ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ امام اور مقتدی کی نیت اگر مختلف ہو تب بھی دونوں کی نماز صحیح ہوگی۔ مثلاً امام کی نیت نفل پڑھنے کی ہے اور مقتدی کی فرض کی یا امام نماز ظہر اور مقتدی نماز عصر کی نیت کرے یا اس کے برعکس تو دونوں صورتوں میں دونوں کی نماز جائز ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی اشارتاً نکلتا ہے کہ مقتدی اگر امام کا کوئی فعل ناپسند سمجھتا ہے اور نماز توڑ کر الگ اپنی نماز ادا کر لیتا ہے (اسی جگہ) تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ اگر نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور تنبیہہ فرماتے کہ آئندہ ایسا مت کرنا اور نماز بھی دوبارہ پڑھو۔ ایسا چونکہ نہیں فرمایا اس لئے یہ جائز ہے۔

(٣٢٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، فِيْ قِصَّةِ صَلَاةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ بِالنَّاسِ وَهُوَ مَرِيْضٌ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز کے ضمن میں فرماتی ہیں جو انہوں نے لوگوں کو اس حالت میں پڑھائی کہ آپ بیمار تھے کہ آپؐ تشریف لائے اور

قَالَتْ: فَجَاءَ حَتَّى جَلَسَ عَنْ يَسَارِ أَبِي بَكْرٍ، فَكَانَ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ جَالِساً، وَأَبُو بَكْرٍ قَائِماً، يَقْتَدِيْ أَبُو بَكْرٍ بِصَلَاةِ النَّبِيِّ ﷺ، وَيَقْتَدِي النَّاسُ بِصَلَاةِ أَبِيْ بَكْرٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکرؓ کی بائیں جانب بیٹھ گئے۔ پس آپؐ لوگوں کو بیٹھے بیٹھے نماز پڑھا رہے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نبی ﷺ کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ ابوبکرؓ کی پیروی (میں نماز پڑھ رہے تھے) (بخاری، مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وھو مریض ﴾ یہاں "واؤ" حالیہ ہے۔ ایسی حالت میں تشریف لائے جبکہ آپؐ بیمار تھے اور یہ مرض الموت کا واقعہ ہے اور غالب گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ آخری نماز ہے جو آپؐ نے باجماعت لوگوں کو پڑھائی۔ اس کے بعد مرض کی شدت کی وجہ سے گھر سے باہر تشریف نہیں لا سکے اور یہ نماز ظہر تھی۔ نبی ﷺ کا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بائیں طرف بیٹھنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ امام تھے کیونکہ امام کے محل و مقام پر کھڑے تھے اور یہ حدیث ان حضرات کی دلیل ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی اقتدا میں جائز ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت کے موقع پر نماز پڑھانے کے بارے میں ہے۔ واقعہ کی مختصر صورت یہ تھی کہ آپؐ بیمار ہوگئے۔ بیماری نے شدت اختیار کی۔ اس اثناء میں آپؐ ہی کے ارشاد کے بموجب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھانے پر مامور ہوگئے۔ ایک دن آپؐ کو قدرے افاقہ ہوا تو آنجناب ﷺ دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپؐ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں جانب بیٹھ گئے اور نماز پڑھانا شروع کی۔ آپؐ امام تھے اس لئے بائیں طرف بیٹھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ مقتدی تھے اس لئے دائیں جانب رہے۔ بیماری کی وجہ سے کمزوری زیادہ ہوگئی تھی اس لئے تکبیروں کیلئے آواز بلند نہیں نکلتی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکبر کا کام دیتے تھے اور آپؐ کی تکبیروں کو بلند آواز سے لوگوں کو پہنچاتے تھے تو وہ ارکان نماز ادا کرتے تھے۔ اس حدیث سے شوافع نے استدلال کیا ہے کہ راتب اور افضل امام کے آنے پر دوسرے امام کو اپنی جگہ دے دینی چاہئے۔ مگر ابن عبدالبر نے اسے آنحضرت ﷺ کا ہی خاصہ قرار دیا ہے۔

(۳۲۵) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَمَّ أَحَدُكُمُ النَّاسَ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الصَّغِيرَ وَالكَبِيرَ والضَّعِيفَ وَذَا الحَاجَةِ، فَإِذَا صَلَّى وَحْدَهُ فَلْيُصَلِّ كَيْفَ شَاءَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دے تو اسے قراءت میں تخفیف کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ مقتدیوں میں بچے، بوڑھے، کمزور اور حاجت مند لوگ ہوتے ہیں ہاں جب تنہا نماز پڑھے تو پھر جس طرح چاہے پڑھے۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب فرائض امامت ادا کر رہا ہو تو اس وقت نماز

میں لمبی لمبی قراءت سے احتیاط کرنی چاہئے اس لئے کہ اس میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ سب کی ضروریات و حاجات پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ البتہ جب ایک آدمی اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اسے اپنے اشغال' ضروریات اور حالات کا اچھی طرح علم ہوتا ہے تو ایسے آدمی کو فرصت اور قوت کے اوقات میں جتنی چاہے لمبی قراءت کرے اسے اختیار ہے مگر بیماری اور ضرورت کے وقت اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا کسی صورت میں بھی درست اور جائز نہیں۔ شریعت نے نفس کا بھی حق رکھا ہے۔

(٣٢٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ سَلَمَةَ قَالَ: قَالَ أَبِي: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ ﷺ حَقًّا، قَالَ: «فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ أَحَدُكُمْ، وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْثَرُكُمْ قُرْآنًا»، قَالَ: فَنَظَرُوا، فَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَكْثَرَ قُرْآنًا مِنِّي، فَقَدَّمُونِي، وَأَنَا ابْنُ سِتٍّ أَوْ سَبْعِ سِنِينَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میرے والد نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کے ہاں سے حق لے کر آرہا ہوں ان کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے کوئی ایک اذان کہے اور امامت ایسا شخص کرائے جو قرآن حمید کا زیادہ عالم ہو۔" عمرو نے کہا (میری قوم نے دیکھا میرے سوا کوئی دوسرا قرآن کا عالم نہیں ہے تو انہوں نے مجھے آگے کر دیا۔ اس وقت میری عمر چھ' سات برس کی تھی۔) (بخاری' ابوداؤد اور نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ قال ابی : جئتكم من عند النبی صلی الله علیه وسلم حقا ﴾ یہ صاحب فتح مکہ کے بعد اپنی قوم کے آنے والے وفد میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے فتح (فتح مکہ) کا اسی طرح انتظار کر رہے تھے جس طرح باقی ماندہ عرب منتظر تھا کہ اس معرکہ آرائی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ پس جب فتح مکہ کا عمل اپنے انجام کو پہنچ گیا (مکہ فتح ہوگیا) اور اہل عرب کو خوب معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ جو پیغام لے کر تشریف لائے ہیں مبنی بر صداقت اور سراسر حق ہے تو یہ لوگ پے در پے اسلام لانے کیلئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے ﴿ فلم یکن احد اکثر قرآنا منی ﴾ ان میں مجھ سے زیادہ ایک بھی قرآن کا عالم نہیں تھا۔ اس کا سبب اس نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے جا رہے تھے کہ راستہ میں ہمارے پاس سے لوگ گزرتے تھے اور ہمیں یہ اطلاع دیتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا' اس طرح فرمایا۔ میں چونکہ ابھی بچہ تھا ان کی زبان سے سن سن کر قرآن مجید کا کافی حصہ ازبر کر چکا تھا اس لئے میرے قافلہ والوں نے مجھے اپنے لئے بطور امام منتخب کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ نابالغ فرض نمازوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ جب فرض نماز کی امامت درست اور صحیح ہے تو نوافل کی جماعت بالاولیٰ کرا سکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث نے امام کیلئے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ جو قرآن مجید زیادہ جانتا ہو' امامت کے منصب کیلئے اسی کا انتخاب کیا جائے۔ جیسا کہ عمرو رضی اللہ عنہ کو اس کی قوم کے لوگوں نے منتخب کیا۔ اس حدیث سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ امامت کا منصب اذان کے منصب سے افضل ہے اس لئے کہ مؤذن کیلئے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی گئی صرف حسن صوت اور بلند آواز والا ہونا چاہئے۔ چھ سات سالہ بچے کو امام مقرر کرنا صرف اسی وجہ سے تھا کہ اسے دوسروں کے مقابلہ میں قرآن زیادہ یاد تھا۔ حسن بصری رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ' ابن راھویہ رحمہ اللہ اور اہلحدیث اس کے قائل ہیں کہ نابالغ لڑکے کی امامت میں بڑے بوڑھے لوگوں کی نماز درست ہے مگر امام مالک رحمہ اللہ اور امام ثوری رحمہ اللہ وغیرہ اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے دو قول منقول ہیں دونوں میں مشہور قول یہ ہے کہ بچہ (نابالغ) کی امامت میں نفل نماز درست ہے اور فرض نماز جائز نہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کو امام نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے تحت مقرر کیا گیا اور نہ ہی آپؐ سے پوچھ کر اس کا انتخاب کیا گیا۔ یہ دلیل اتنی وزنی نہیں کہ اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔ اس کا تقرر و انتخاب اگر درست نہ ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی لازماً اسے آئندہ کیلئے روک دیتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ چونکہ اس کا تعلق اسلام کے بڑے اہم رکن نماز سے ہے اس لئے اگر یہ درست نہ ہوتا تو اسے ضرور ممنوع قرار دے دیا جاتا یا پھر نفلی اور فرضی امامت کی وضاحت کر دی جاتی کہ نفل میں اس کی گنجائش ہے اور فرض میں نہیں۔ ایسا بھی کہیں نہیں لہٰذا قرین صواب یہی ہے کہ ضرورت کے وقت ایسا کرنا بلا کراہت درست ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

راوی حدیث: ﴿عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ﴾ سلمہ کے لام کے نیچے کسرہ ہے۔ جرم قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے جرمی کہلائے۔ ابویزید یا ابوبرید کنیت تھی۔ اپنے والد کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' اس وقت ان کی عمر چھ سات برس تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ عمرو بن سلمہ اور قبیلہ بنو سلمہ کے علاوہ باقی تمام جگہ سلمہ کے لام پر فتحہ ہے اور ان دونوں پر لام کے نیچے کسرہ ہے۔

(٣٢٧) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَى، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِلْماً - وَفِي رِوَايَةٍ «سِنا» - وَلاَ يَؤُمَّنَّ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لوگوں کا امام ایسا آدمی ہو جسے قرآن حمید کا علم زیادہ ہو۔ اگر اس وصف میں لوگ مساوی ہوں پھر وہ امام بنے جسے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم زیادہ ہو اور اگر سنت کے علم میں بھی لوگ مساوی ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے ہجرت پہلے کی۔ اگر اس وصف میں سب برابر ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے پہلے اسلام قبول کیا ہو اور ایک روایت

الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ، وَلاَ يَقْعُدُ فِي بَيْتِهِ عَلَى تَكْرِمَتِهِ، إلاَّ بِإِذْنِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

میں سلما (اسلام) کی بجائے سنا (عمر) کا لفظ بھی ہے یعنی اگر مذکورہ بالا اوصاف میں سبھی برابر ہوں تو پھران میں جس کی عمر زیادہ ہو اسے امام بنایا جائے۔ کوئی آدمی کسی آدمی کے دائرہ اقتدار میں امامت نہ کرائے اور نہ گھر میں اس کی مخصوص نشست (بستر) پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اقروھم لکتاب اللہ ﴾ اس جملہ کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ ایسا آدمی امام بنے جسے قرآن کا زیادہ حصہ حفظ ہو اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو زیادہ جاننے والا یعنی احکام شریعت سے زیادہ واقف ہو لیکن ﴿ فان کانوا فی القراۃ سواء فاعلمھم بالسنۃ ﴾ سے پہلے مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ ﴿ سلما ﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام ساکن۔ اسلام کے معنی ﴿ وفی روایۃ سنا ﴾ ایک دوسری روایت میں سلما کی جگہ لفظ "سنا" بھی منقول ہے ﴿ ولا یومن ﴾ امامت سے ماخوذ ہے صیغہ مجہول ہے اور نون اس جگہ نون تاکید ہے (یعنی نون ثقیلہ) ﴿ الرجل الرجل ﴾ پہلا الرجل فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور دوسرا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ فی سلطانہ ﴾ اس کے دائرہ اقتدار میں' ہ کی ضمیر اس میں دوسرے آدمی کی طرف راجع ہے اور اسی طرح (فی بیتہ) اور ﴿ فی تکرمتہ ﴾ کے قول میں بھی ہ کی ضمیر دوسرے شخص کی طرف جاتی ہے ﴿ التکرمۃ ﴾ "تا" پر فتحہ' کاف ساکن اور "را" پر کسرہ۔ ایسے بستر وغیرہ اور تکئے جو صاحب خانہ کیلئے مخصوص ہوتے ہیں ﴿ الا باذنہ ﴾ بظاہر یہ استثناء دونوں صورتوں کیلئے ہے' امامت اور بستر مخصوص پر بیٹھنا اجازت کے ساتھ مشروط ہے اگر اجازت مل جائے تو دونوں جائز ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے امامت ایسے شخص کے سپرد کی جانی چاہئے جو قرآن کو زیادہ یاد رکھتا ہو' سنت سے باخبر ہو' دین کی خاطر ترک وطن کی سعادت' قبول اسلام میں اولیت رکھتا ہو اور عمر رسیدہ ہو کیونکہ زیادہ امید ہے کہ جس کی عمر دراز ہوگی اس کے اعمال حسنہ بھی زیادہ ہوں گے۔

(۳۲۸) وَلابْنِ مَاجَهْ مِنْ حَدِيْثِ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «وَلاَ تَؤُمَّنَّ امْرَأَةٌ رَجُلاً، وَلاَ أَعْرَابِيٌّ مُهَاجِراً، وَلاَ فَاجِرٌ مُؤْمِناً»، وَإِسْنَادُهُ وَاهٍ.

ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ سے مروی ہے کہ "کوئی عورت کسی مرد کی امام نہ بنے اور نہ کوئی بدوی دیہاتی کسی مہاجر کی امامت کرائے اور نہ کوئی فاجر کسی مومن کا امام بنے۔" اس روایت کی سند (واہ) ضعیف ہے۔

لغوی تشریح: اس روایت میں دیہاتی و بدوی کا مہاجر کی امامت کی ممانعت کو کراہت پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ بدوی لوگ ابتداء اسلام میں مہاجرین کے مقابلہ میں قرآن کی تعلیم اور علم دین سے کم واقف تھے

﴿ واسنادہ واہ ﴾ واہ کا معنی ضیعف و کمزور ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن محمد عدوی ایسا ہے جسے وکیع نے وضع حدیث کے الزام سے متہم کیا ہے اور عبداللہ بن محمد کے شیخ استاد علی بن زید بھی ضعیف ہیں یہ روایت ایک اور سند سے بھی منقول ہے مگر ان میں ایک راوی عبدالملک بن حبیب ایسا ہے جسے احادیث کی چوری کرنے اور سندوں کو خلط ملط کرنے کے الزام سے متہم کیا گیا ہے۔

حاصل کلام : یہ روایت نہایت ہی کمزور سند سے منقول ہے' اس لئے اس سے مسائل کا استنباط کرنا درست نہیں۔

(٣٢٩) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «رُصُّوا صُفُوفَكُمْ، وَقَارِبُوا بَيْنَهَا، وَحَاذُوا بِالأَعْنَاقِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "اپنی صفوں کو مضبوطی سے ملاؤ اور ان کے درمیان فاصلہ کم رکھو اور اپنی گردنوں کو ایک محاذ پر رکھو (برابر برابر رکھو) " (اسے ابوداؤد' نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح : ﴿ رصوا ﴾ "را" پر ضمہ اور صاد پر تشدید "رص الجدار او البناء" سے امر ہے یعنی دیوار یا عمارت کی ایک اینٹ کو دوسری کے ساتھ ملا کر یا جوڑ کر اس طرح مضبوط اور پختہ کیا جائے کہ درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑی جائے۔ اس سے "رص الصف" ہے جس کا مطلب ہے کہ نمازی اپنی صفوں کو ایک دوسرے سے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھے کو ملا کر درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑ کر ایسی مضبوطی سے بنائیں کہ چنی ہوئی مضبوطی اور پختہ دیوار معلوم ہوں ﴿ وقاربوا بینھا ﴾ بایں طور کہ دو صفوں کے درمیان ضرورت سے زیادہ فاصلہ نہ چھوڑیں ﴿ وحاذوا بالاعناق ﴾ گردنوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل رکھیں۔ بایں طور پر کہ سب نمازیوں کی گردنیں ایک ہی صف میں سیدھی معلوم ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نمازی کی گردن امام کی طرف نکلی ہوئی معلوم ہو اور کسی کی پیچھے نکلی ہوئی۔

حاصل کلام : اسلام میں صف بندی اور شیرازہ بندی کی بڑی تاکید اور اہمیت ہے۔ اس کی تربیت و ٹریننگ اسلام کے اہم ترین بنیادی رکن' نماز میں صف بندی کے ذریعہ سے دی گئی ہے۔ جہاد میں بنیان مرصوص کی جتنی ضرورت و اہمیت ہے۔ اس کے بیان کرنے کی اس مقام پر چنداں ضرورت نہیں' اشارہ ہی کافی ہے۔ صف بندی میں اگر رخنہ پڑ جائے یا صفوں میں خلل واقع ہو جائے تو باہمی ربط و ضبط اور محبت میں بھی خلل پڑ جاتا ہے۔ اسلام دلوں کو جوڑنے اور باہمی تعلقات کو استوار کرنا چاہتا ہے اور اسلامی برادری میں مساوات کے ذریعہ ایک ہی صف میں محمود و ایاز کو کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ شیطانی دخل اندازی سے اسے

بچانا اور محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ صحیحین میں روایت ہے کہ نماز کھڑی ہونے کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے نمازیوں کی طرف رخ موڑ کر فرمایا کہ "اپنی صفوں کو سیدھا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کجی و ٹیڑھ اور مخالفت ڈال دے گا۔" راوی کا بیان ہے کہ میں نے نمازیوں کو دیکھا کہ جماعت میں اپنا کندھا دوسرے کے کندھے سے اور اپنا قدم ساتھ والے کے قدم سے ملایا کرتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا "قسم ہے مجھے اس ذات اقدس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ شیطان صفوں کے درمیان بھیڑ کے بچہ کی صورت میں گھس جاتا ہے" یعنی وہ نمازیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خشوع و خضوع سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ توجہ الی اللہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز میں صفوں کی درستگی کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث منقول ہیں الغرض نماز باجماعت کی صورت میں صف بندی کی بہت تاکید ہے۔ مل کر کھڑا ہونا چاہئے اور درمیان میں قطعاً جگہ نہیں چھوڑنی چاہئے۔

(٣٣٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «خَيْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوْفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردوں کی بہترین اور سب سے زیادہ خیروبھلائی والی صف' ان کی پہلی صف ہے اور بدترین اور بری صف ان کی آخری صف ہے اور خواتین کی بہترین اور خیروبھلائی ان کی آخری صف ہے اور بدترین اور بری صف ان کی پہلی صف ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اولھا ﴾ پہلی صف سے مراد وہ صف ہے جو امام کے متصل ہوتی ہے۔ ﴿ وشرھا آخرھا ﴾ جس میں خیرو بھلائی اور اجر و ثواب کم ہو وہ صف ہے جو سب سے آخر میں ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جو اس صف میں شامل ہوگا وہ گناہ گار ہوگا۔ آخری صف کو شرالصفوف اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ پہلی صف میں شریک نمازی سے اس کا معاملہ برعکس ہوتا ہے اور خواتین کی آخری صف کو بہترین اور خیرو بھلائی والی صف قرار دیا گیا ہے برعکس مردوں کی صفوف کے کیونکہ خواتین کا آخری صف میں ہونا مردوں سے دور رہنے کا موجب ہے نیز ان کے دیکھنے اور ان کی گفتگو سننے سے دور رہتی ہیں۔

حاصل کلام: جماعت میں مردوں اور عورتوں کی صفوں میں تفاوت اپنے اندر بھلائی اور بہتری کے کئی پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلی صف میں شریک نمازی عموماً وہی ہوں گے جو مسجد میں پہلے آئے ہوں۔ مسجد میں پہلے آنا بھی باعث ثواب ہے نیز پہلی صف میں شامل لوگ صاحب علم' بزرگ اور دینی فہم زیادہ رکھنے والے ہوں گے۔ امام کے دوسرے نمازیوں کی بہ نسبت زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے براہ راست فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تلاوت قرآن' تکبیرات سنتے ہیں۔ خواتین سے دور رہنے کی وجہ سے خلل انداز ہونے والے وسوسوں اور برے خیالات سے بچے رہتے ہیں۔ مردوں کی سب سے پچھلی صف میں شریک نمازی ان سے

محروم رہتے ہیں۔ اس لئے اجر و ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ برائی اور بھلائی دونوں نسبتی معاملات ہیں۔ خواتین کی سب سے آخری صف اس لئے بہتر ہے کہ ایک عورتیں دیر سے مسجد میں آئیں گی۔ مردوں سے دور ہوں گی کیونکہ مرد و زن کا اختلاط اچھے نتائج و ثمرات بر آمد نہیں کرتا۔ یہ حکم ایسی صورت واقعہ کیلئے ہے جہاں مردوں اور عورتوں کی صفیں آگے پیچھے ہوں ورنہ اگر عورتیں الگ جگہ میں ہوں تو پھر ان کی بھی پہلی صف بہتر شمار ہوگی یا یہ صورت ہو کہ عورتوں کی جماعت الگ سے ہو اور ان کی امامت (پہلی صف کے درمیان میں کھڑے ہو کر) عورت ہی کر رہی ہو تو ایسی صورت میں بھی خواتین کی پہلی صف بہترین اجر و ثواب کی مستحق ہے اور آخری کم ثواب کی۔

(۳۳۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ، فَأَخَذَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِرَأْسِيْ مِنْ وَّرَائِيْ، فَجَعَلَنِيْ عَنْ يَمِينِهِ، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی میں آپ کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پیچھے سے میرا سر پکڑا اور مجھے اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جماعت سے نماز پڑھنے والے دو ہی شخص ہوں تو مقتدی کو امام کے دائیں طرف کھڑا ہونا چاہئے اور اگر غلطی و نادانی سے مقتدی بائیں طرف کھڑا ہو جائے تو امام اسے اپنے دائیں طرف کھینچ کر (یا اشارہ سے) کر لے۔ اتنے سے عمل سے نماز فاسد نہیں ہوتی کیونکہ یہ فعل بھی نماز ہی کیلئے کیا گیا ہے۔ نماز سے باہر کے کسی کام کیلئے نہیں۔ مقتدی کو بھی فوراً تعمیل کر کے بائیں سے دائیں جانب آجانا چاہئے۔ تبدیلی مکان و جگہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی جو تبدیلی نماز کی اصلاح و درستگی کیلئے کی گئی ہو۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت دو افراد سے بھی ہو جاتی ہے۔ گویا دو کی تعداد جماعت کی تعریف میں آجاتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ نفل نماز کی جماعت بھی جائز ہے۔

(۳۳۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، فَقُمْتُ أَنَا وَيَتِيْمٌ خَلْفَهُ، وَأُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی میں اور یتیم دونوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی اور ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ہمارے پیچھے (تنہا) نماز ادا کی۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ نفل نماز کی جماعت جائز ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت اگر اکیلی ہو تو وہ اکیلی ہی صف میں کھڑی ہوگی۔ مردوں یا بچوں کے ساتھ کھڑی نہیں ہوگی۔ مرد پہلے' بعد میں بچوں کی صف اور آخر میں عورتوں کی صف ہونی چاہئے۔ البتہ ایک آدمی ہو تو بچے کو

ساتھ کھڑا کر کے ایک ہی صف بنانی چاہئے۔ خیر و برکت کے حصول کے نقطہ نظر سے گھر میں کسی نیک شخصیت کی امامت میں نماز نفل پڑھنی جائز ہے۔ ام سلیم راوی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گاری کیلئے پیش کیا تھا۔ اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ عورت اپنے لخت جگر کے ساتھ بھی نماز ادا کرنے کیلئے ایک صف میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔

(٣٣٣) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ أَنَّهُ انْتَهى إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ رَاكِعٌ، فَرَكَعَ قَبْلَ أَنْ يَصِلَ إِلَى الصَّفِّ، ثم مشي إلى الصف وَذَكَرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ - ﷺ -: «زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصاً، وَلاَ تَعُدْ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ فِيهِ: «فَرَكَعَ دُوْنَ الصَّفِّ، ثُمَّ مَشَى إِلَى الصَّفِّ».

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے نے بتایا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عین اس وقت پہنچے جبکہ آپؐ رکوع فرما رہے تھے۔ پس انہوں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ تیری حرص و طمع میں اضافہ فرمائے آئندہ ایسا مت کرنا" (بخاری)

ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے رکوع کیا صف میں شامل ہونے سے پہلے پھر حالت رکوع ہی میں چل کر صف میں شامل ہوئے۔

لغوی تشریح: ﴿ ولا تعد ﴾ بظاہر یہ "عود" سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کہ آئندہ ایسا مت کرنا۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے منفرد کی نماز صف کے پیچھے پڑھنا جائز ہے کیونکہ ابوبکرہ نے اپنی نماز کا آغاز صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد لا تعد اس فعل کی عدم صحت پر دلالت کرتا ہے اور رہا یہ معاملہ کہ آپؐ نے اسے نماز کے لوٹانے اور دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا تو وہ اس لئے نہیں دیا کہ اس وقت وہ اس کی حکمت نہیں جانتا تھا اور کسی چیز کا علم نہ ہونا عذر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر بایں صورت نماز صحیح ہونا تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک تنہا آدمی صف کے پیچھے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہوگی۔ اس قسم کے معمولی سے فعل کو تو درگزر اور نظرانداز کر دیا جاتا ہے بالخصوص جبکہ دوڑ کر کوشش سے پہلی صف میں داخل ہونے کی نیت پہلی مرتبہ کی ہو اور جب فعل ہمیشہ اور مسلسل ہو تو پھر مستقل حکم کا تقاضا کرتا ہے جو صحت پر مبنی ہو یا فساد پر اور جس کی ابتدا اور آغاز درست اور صحیح ہو کوئی ضروری اور لازمی نہیں کہ اس کو باقی رکھنا بھی صحیح ہو۔ بہت سی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منفرد کی نماز صف کے پیچھے نہیں ہوتی جیسا کہ آئندہ حضرت وابصہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جس آدمی نے امام کے ساتھ رکوع پا لیا اس نے رکعت پا لی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس رکعت کے اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ مگر یہاں اس بات کا احتمال ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ اس مسئلہ سے بخوبی آگاہ ہوں کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی رکعت

نہیں ہوتی اور یوں انہوں نے رکعت پوری کر لی ہو تو اس صورت میں نماز کو دہرانے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

(٣٣٤) وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى رَجُلاً يُصَلِّيْ خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَهُ، فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيْدَ الصَّلاَةَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نظر ایسے آدمی پر پڑی جو صف کے پیچھے تنہا کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ آپؐ نے اسے نماز کو دوبارہ پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ (احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

وَلَهُ عَنْ طَلْقٍ: لاَ صَلاَةَ لِمُنْفَرِدٍ خَلْفَ الصَّفِّ. وَزَادَ الطَّبْرَانِيُّ فِي حَدِيْثِ وَابِصَةَ: أَلاَ دَخَلْتَ مَعَهُمْ أَوِ اجْتَرَرْتَ رَجُلاً؟

اور اس طرح طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی اور طبرانی نے وابصہ کی حدیث میں اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ "تو ان کے ساتھ ہی داخل کیوں نہ ہو گیا یا پھر تو کسی نمازی کو پہلی صف میں سے پیچھے کھینچ لیتا۔"

لغوی تشریح: "الادخلت" ھمزہ استفہام کا ہے ساتھ ہی معنی نفی کا دے رہا ہے یا پھر ھمزہ پر فتحہ ہے اور لام پر تشدید ہے۔ اس صورت میں اسے حرف تحضیض قرار دیا گیا ہے۔ ابھارنے اور برانگیختہ کرنے والا حرف ﴿ اجتررت رجلا ﴾ اگلی صف میں سے ایک آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیتا۔ یہ دونوں احادیث صفؔ کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز کو باطل قرار دیتی ہیں۔

حاصل کلام: اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ صف کے پیچھے منفرد (اکیلے) آدمی کی نماز درست ہے یا نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر اہل علم کے نزدیک صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔ دلیل اس کی یہی حدیث ہے کہ جس میں حضور ﷺ نے ایسے آدمی کو دوبارہ نماز پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی نماز ہو جاتی ہے۔ اس آدمی کو تو آپؐ نے بطور تنبیہہ نماز دوبارہ پڑھنے کی تلقین فرمائی تھی۔ اس بارے میں صحیح احادیث سے جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگلی صف کو مکمل اور پورا کیا جائے اگر پہلی صف میں جگہ نہ ہو تو اکیلے ہی پڑھ لو کیونکہ درمیان میں سے آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملانے کی صورت میں پہلی صف میں خلا پیدا ہو جائے گا جسے پر کرنے کیلئے نمازیوں کو حرکت کرنا پڑے گی اور ایک کنارے سے آدمی کو کھینچ کر لائے گا تو نماز کی حالت میں اتنا چلنا بہتر معلوم نہیں ہوتا۔ پس بہتر یہی ہے کہ وہ اکیلا ہی پڑھ لے۔ ائمہ رحمۃ اللہ علیہم میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔ طبرانی وغیرہ

میں جو پہلی صف سے آدمی کھینچنے کا حکم ہے وہ سنداً ضعیف ہے۔

راوی حدیث: ﴿ وابصه بن معبد رضی اللہ عنہ ﴾ معبد میں "میم" کے نیچے کسرہ "عین" ساکن اور "با" پر فتحہ۔ ان کی کنیت ابو قرصافہ ہے۔ انصار کے قبیلہ اسد بن خزیمہ سے تھے۔ قرصافہ میں قاف کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن۔ ۹ھ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نمائندہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ کوفہ فروکش ہوئے۔ بعد ازاں حیرہ کی طرف چلے گئے۔ ۹۰ھ میں رقہ میں وفات پائی۔

(۳۳۵) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا سَمِعْتُمُ الإِقَامَةَ فَامْشُوا إِلَى الصَّلاَةِ، وَعَلَيْكُمُ السَّكِيْنَةُ وَالوَقَارُ، وَلاَ تُسْرِعُوا، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا»، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا "جب تم نماز کی اقامت سنو تو نماز کی طرف اطمینان و سکون اور وقار کے ساتھ چل کر آؤ' جلدی اور عجلت مت کرو۔ جتنی نماز جماعت کے ساتھ پالو اتنی پڑھ لو اور باقی جو رہ جائے اسے (بعد میں) پورا کر لو۔" بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ السكينة ﴾ یعنی حرکات میں سکون ہو اور عبث حرکات سے اجتناب ہو ﴿ والوقار ﴾ وقار کا معنی سکینت کے قریب قریب ہے۔ وقار انسان کی ہیئت میں ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے دائیں بائیں التفات کئے بغیر نگاہیں بچاتے ہوئے دھیمی آواز سے گفتگو کرنے اور چال ڈھال میں شریفانہ انداز اختیار کرنے کو وقار کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے نمازی جب مسجد میں نماز باجماعت کیلئے آئے تو بڑے آرام و سکون' وقار و عزت کے ساتھ آئے۔ دوڑتا ہوا نہ آئے۔ چلتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھے۔ بولنے کی ضرورت ہو تو دھیمی اور پست آواز سے بولے۔ یوں اطمینان سے آنے کے بعد امام کو جس حالت میں پائے نماز میں شریک ہو جائے باقی نماز کو بعد میں کھڑا ہو کر پورا کر لے۔ ایسی صورت میں مقتدی نے جو نماز امام کے ساتھ پڑھی وہ اس نمازی کی پہلی رکعتیں شمار ہوں گی یا پچھلی۔ اس میں ائمہ رحمہم اللہ کا اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس مقتدی کی پچھلی رکعتیں شمار ہوں گی' جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مقتدی کی یہ پہلی شمار ہوں گی۔ یہی بات حدیث کے الفاظ "فاتموا" کے موافق ہے۔ نیز یہ بھی مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی یہ رکعت شمار ہوگی یا نہیں۔ محتاط ترین اور قرین صواب بات یہ ہے کہ رکعت نہیں ہوگی۔ کیونکہ رکوع میں شامل ہونے کی صورت میں سورۂ فاتحہ اور قیام کی ادائیگی نہیں ہو پاتی' یہ دونوں فرض ہیں۔ دونوں کے فقدان سے نماز کیسے ہوگی؟

(۳۳۶) وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک آدمی کا دوسرے آدمی کے

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلاَةُ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ أَزْكَى مِنْ صَلاَتِهِ وَحْدَهُ، وَصَلاَتُهُ مَعَ الرَّجُلَيْنِ أَزْكَى مِنْ صَلَاتِهِ مَعَ الرَّجُلِ، وَمَا كَانَ أَكْثَرُ فَهُوَ أَحَبُّ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

ساتھ مل کر نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور اجر و ثواب کا موجب ہے اور دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا (پہلی صورت سے بھی) زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اسی طرح جتنے افراد زیادہ ہوں اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب ہے۔" (اسے ابوداوُد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ازكى ﴾ اطہر کے معنی ہیں نہایت پاکیزہ اور بہت ہی اجر و ثواب کا موجب۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی کم از کم تعداد دو ہے۔ ایک امام اور دوسرا مقتدی (اور زیادہ کی کوئی حد نہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں نمازیوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ نماز اللہ کے نزدیک محبوب ہوگی اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے گا۔

(۳۳۷) وَعَنْ أُمِّ وَرَقَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهَا أَنْ تَؤُمَّ أَهْلَ دَارِهَا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اسے اپنے گھر والوں کی امامت کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ (اسے ابوداوُد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت فرائض امامت انجام دے سکتی ہے مگر کن کی؟ اس سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے کہ گھر کے افراد میں تو مرد بھی ہوتے ہوں گے۔ لہٰذا اس سے تو عورت کا مرد کی امام بننا بھی ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ قطعاً درست نہیں۔ اولاً تو اس حدیث کا راوی عبدالرحمٰن بن خلاد مجہول ہے۔ ثانیاً بعض روایات میں "نساء اهل دارها" کی صراحت ہے کہ گھر کی عورتوں کو نماز پڑھائے۔ مردوں پر فرض نماز کیلئے مسجد میں حاضری ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اس لئے یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ مرد حضور اکرم ﷺ کی اقتداء کو چھوڑ کر عورت کی اقتداء و امامت میں نماز پڑھتے ہوں۔ مردوں اور عورتوں کی صفوں میں فاصلہ والی حدیث بھی اس کی تائید میں ہے کہ مردوں کا عورتوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ اور یتیم اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب آپؐ نے جماعت کرائی تو ام سلیم اپنے بچوں کے ساتھ بھی کھڑی نہیں ہوئی۔ جب اپنے لخت جگر کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی تو امامت کیسے کرائے گی۔ عورت جماعت کی امامت کے وقت مرد امام کی طرح الگ صف میں تنہا کھڑی نہیں ہوگی بلکہ بقول امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ عورتوں کے ساتھ ہی پہلی صف میں وسط صف میں کھڑی ہوگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اسی طرح نماز پڑھاتی تھیں۔

راوی حدیث: ﴿ام ورقہ رضی اللہ عنہا﴾ بنت نوفل یا بنت عبداللہ بن حارث۔ انصار میں سے تھیں۔ انہوں نے سارا قرآن سینے میں جمع کر رکھا تھا۔ غزوۂ بدر میں شریک ہونے کی آپؐ سے اجازت طلب کی مگر آپؐ نے ان کو اجازت نہیں دی کیونکہ ان کو اپنے گھر ہی شہادت کا مرتبہ ملنے والا تھا۔ آپؐ اس سے ملاقات کیلئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کو شہید کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ اس کے دو غلام (غلام اور لونڈی) تھے جن کو انہوں نے مدبر کر رکھا تھا (ان کی موت کے بعد از خود آزاد ہو جائیں گے) مگر ان دونوں نے مل کر رات کے وقت ان کے گلے میں چادر کا پھندا ڈال کر مار دیا اور خود راتوں رات فرار ہوگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو گرفتار کروایا اور دونوں کو سولی پر چڑھا دیا۔ مدینہ منورہ میں یہ پہلے مصلوب ہیں۔ یہ خاتون تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے اہل محلہ کی امامت کراتی تھیں۔ اس لئے کہ ان کو قرآن مجید ازبر تھا۔

(٣٣٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَخْلَفَ ابْنَ أُمِّ مَكْتُومٍ، يَؤُمُّ النَّاسَ وَهُوَ أَعْمَى. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَنَحْوُهُ لِابْنِ حِبَّانَ عَنْ عَائِشَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنایا وہ لوگوں کی امامت کراتے تھے جبکہ وہ نابینا تھے۔ (اس روایت کو احمد' ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے بھی اسی طرح کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے نقل کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کو اپنا نائب مقرر کرنا جائز ہے جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ نابینا کی امامت درست اور جائز ہے۔ تیسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ نابینا دوسروں کی بہ نسبت علم شریعت کا زیادہ عالم ہو سکتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ افضل کی موجودگی میں دوسرا بھی نائب مقرر کیا جا سکتا ہے۔ یہ نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ تھے۔ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عدم موجودگی میں غالباً تیرہ مرتبہ اپنا نائب مقرر فرمایا اور غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انتظامی امور وغیرہ کیلئے اپنا نائب مقرر فرمایا اور عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں نماز کی امامت کیلئے مقرر فرمایا۔

(٣٣٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلُّوا عَلَى مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَصَلُّوا خَلْفَ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کسی نے لا الہ الا اللہ زبان سے کہا اس کی نماز جنازہ پڑھو اور جو لا الہ الا اللہ کہے اس کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیا کرو۔" (اسے دار قطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿صلوا علی من ... الخ﴾ جس آدمی نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیا خواہ وہ نیک ہو یا بد اس کی نماز جنازہ پڑھو اور اسی طرح ہر اس شخص کے پیچھے نماز پڑھ لو جس نے کلمۂ شہادت کہا۔ حدیث

سند کے اعتبار سے اگرچہ کمزور اور ضعیف ہے مگر محققین کے نزدیک اس پر عمل کرنا قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ اصول اور روایات اس کی صحت کی تائید کرتی ہیں کہ جس شخص کی نماز صحیح ہے' اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ ہاں یہ مناسب ہے کہ فاجر آدمی کو امامت کیلئے آگے نہ کیا جائے کیونکہ اس کے مکروہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھنا ثابت ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فرائض کی پروا نہ کرنے والے کلمہ گو آدمی کی نماز جنازہ درست ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے تو قائل ہیں مگر راہزن اور باغی کی نماز جنازہ کے قائل نہیں۔ بہرحال علماء اور بزرگ لوگوں کو فاسق و فاجر اور خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ "جاؤ تم اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔"

(٣٤٠) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الصَّلَاةَ، وَالإِمَامُ عَلَى حَالٍ، فَلْيَصْنَعْ كَمَا يَصْنَعُ الإِمَامُ**». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کیلئے آئے تو امام کو جس حالت میں پائے اسی میں امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔" (ترمذی نے اسے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ بعد میں شامل ہونے والا نمازی جس حالت میں امام کو پائے اسی میں شامل ہو جائے۔ امام اگر رکوع میں ہے تو اسے بھی رکوع میں اللہ اکبر کہہ کر چلے جانا چاہئے اور امام کو سجدہ کی حالت میں پائے تو اس کو سجدہ میں اللہ اکبر کہہ کر چلے جانا چاہئے اور اگر امام بیٹھا ہو تو مسبوق کو بھی اسی حالت میں بیٹھ جانا چاہئے۔ ترمذی کی یہ حدیث گو سنداً ضعیف ہے مگر دوسری صحیح احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

١١ - بَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِ وَالْمَرِيضِ

مسافر اور مریض کی نماز کا بیان

(٣٤١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَوَّلُ مَا فُرِضَتِ الصَّلَاةُ رَكْعَتَانِ، فَأُقِرَّتْ صَلَاةُ السَّفَرِ، وَأُتِمَّتْ صَلَاةُ الْحَضَرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ابتدا میں دو رکعات فرض کی گئی تھیں (سفر و حضر میں) جتنی نماز فرض کی گئی وہ دو رکعت تھی۔ اسے (سفر کی نماز کو) باقی رکھا اور حضر (مقیم) کیلئے نماز مکمل کر دی گئی۔ (چار رکعتیں کر دی گئیں) (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ: ثُمَّ هَاجَرَ، فَفُرِضَتْ أَرْبَعاً، وَأُقِرَّتْ صَلاَةُ السَّفَرِ عَلَى الأَوَّلِ.

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ پھر آپؐ نے ہجرت کی تو چار رکعت فرض کر دی گئیں اور سفر کی نماز پہلی حالت پر برقرار رکھی گئی۔

وَزَادَ أَحْمَدُ: إِلاَّ المَغْرِبَ، فَإِنَّهَا وِتْرُ النَّهَارِ، وَإِلاَّ الصُّبحَ، فَإِنَّهَا تُطَوَّلُ فِيهَا القِرَاءَةُ.

احمد نے اتنا اضافہ کیا ہے "سوائے نماز مغرب کے کیونکہ وہ دن کے وتر ہیں اور بجز صبح کی نماز کے کیونکہ اس نماز میں قرأت لمبی کی جاتی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿اول ما فرضت الصلاۃ﴾ حضر و سفر دونوں میں رکعتان دو' دو رکعتیں مغرب کی نماز کے علاوہ۔ گرائمر کے اعتبار سے اول مبتداء ہے اور رکعتان اس کی خبر ہے اور ایک نسخہ میں رکعتین ہے' یعنی منصوب ہے اور اس کا منصوب ہونا اس لئے درست اور صحیح ہے کہ یہ قائم مقام خبر کا حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿فاقرت﴾ اقرار سے ماخوذ ہے' صیغۂ مجہول' معنی ہے کہ ان کو دو رکعت کی حالت پر برقرار رکھا گیا یا ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا۔ ﴿واتمت﴾ یہ بھی صیغۂ مجہول ہے۔ یعنی مکمل کر دی گئی۔ ﴿صلاۃ الحضر﴾ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور وہ چار پوری ہوگئیں۔ الحضر میں "حا" اور "ضاد" دونوں پر فتحہ ہے۔ سفر کے مقابلہ میں حضر کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ سفر میں قصر کرنا فرض ہے اور اسے پورا پڑھنا جائز نہیں بعینہ جس طرح حضر میں چار رکعت پر اضافہ جائز نہیں۔ مدار استدلال لفظ "فرضت" اور "اقرت" ہے یعنی فرض کی گئی' برقرار رکھی گئی کیونکہ یہ دونوں الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ دو رکعتیں فرض ہیں رخصت نہیں اور فرائض میں نہ کمی و بیشی کرنا جائز ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ مگر یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ "فرضت" کا لفظ "قدرت" کے معنی کا احتمال رکھتا ہے' اس صورت میں اس میں کوئی دلیل نہیں بنتی بلکہ یہ تو تعبیر کے انواع میں سے ایک نوع (قسم) ہے جو محض حضر و سفر کے فرق کے بیان کرنے کیلئے آیا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس میں کوئی اشارہ رخصت یا عزیمت کی طرف پایا جاتا ہو' خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو اس حدیث کی راویہ ہیں انہوں نے سفر میں قصر نماز بھی پڑھی ہے اور پوری بھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضر و سفر کی نماز دو' دو رکعت فرض تھی' بعد میں سفر کی نماز کو علی حالہ رکھا گیا البتہ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں نماز قصر کا جو بیان ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں قصر نماز پڑھنا جائز ہے واجب نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے کہ سفر میں قصر واجب ہے جبکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اسے سنت قرار دیتے ہیں اور اسے رخصت پر محمول کرتے ہیں اور یہی قول راجح ہے۔ دار قطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بسند حسن مروی ہے کہ دوران سفر میں نے پوری نماز پڑھی۔ آپؐ کو اس کی خبر دی تو آپؐ نے میری تحسین کی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی اتباع میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر متاخرین نے اس حدیث کو ضعیف

قرار دیا ہے جو صحیح ہے جبکہ امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔

(٣٤٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْصُرُ فِي السَّفَرِ وَيُتِمُّ، وَيَصُومُ وَيُفْطِرُ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَرُوَاتُه ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ مَعْلُولٌ، وَالمَحْفُوظُ عَنْ عَائِشَةَ مِنْ فِعْلِهَا، وَقَالَتْ: إِنَّهُ لاَ يَشُقُّ عَلَيَّ. أَخرَجَهُ البَيْهَقِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ سفر میں قصر اور اتمام دونوں پر عمل فرماتے تھے نیز روزہ رکھتے بھی تھے اور افطار بھی کر لیتے تھے۔ (دار قطنی) اس کے راوی ثقہ ہیں' مگر حدیث معلول ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذاتی فعل کی صورت میں محفوظ ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "روزہ مجھ پر گراں نہیں۔" (بیہقی نے اس کی تخریج کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ یقصر ﴾ قصر فرماتے۔ یعنی کبھی چار رکعتوں والی نماز' دو رکعتیں ہی ادا فرماتے۔ قصر' یقصر۔ باب نصر ینصر کے وزن پر ہے۔ ﴿ ویتم ﴾ پوری نماز ادا فرماتے۔ یعنی چار رکعتیں پوری ادا فرماتے۔ ﴿ ویصوم ﴾ سفر میں بھی کبھی روزہ رکھتے اور ﴿ یفطر ﴾ کبھی افطار فرما لیتے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا مسافر کیلئے دونوں طرح رخصت ہے اور اسے اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے سفر میں قصر و افطار پر عمل کرے چاہے نہ کرے۔ امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے البتہ فرمایا ہے کہ یہ معلول ہے۔ غالباً علت یہ ہے کہ صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کے معارض ہے کہ آپؐ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ علت صحیح نہیں دونوں میں تطبیق ممکن ہے کہ کبھی اتمام کرتے اور اکثر و بیشتر قصر کرتے۔ ویسے بھی طے شدہ اصول ہے کہ مثبت' نافی پر مقدم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(٣٤٣) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى رُخَصُهُ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتَى مَعْصِيَتُهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ، وَفِي رِوَايَةٍ: «كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى عَزَائِمُهُ».

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کو یہ اسی طرح پسند ہے کہ جن کاموں میں اس نے رخصت عنایت فرمائی ہے' ان میں رخصت پر عمل کیا جائے' جس طرح اسے یہ ناپسند ہے کہ معصیت والے کاموں کو کیا جائے۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے) اور ایک روایت میں ہے کہ "جیسا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس کے تاکیدی احکام (فرائض) کو ادا کیا جائے"

لغوی تشریح: ﴿ ان توتی ﴾ گرائمر میں یہ مجہول واقع ہوا ہے اور ﴿ رخصہ ﴾ فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور "را" پر ضمہ اور "خا" پر فتحہ' رخصۃ کی جمع ہے' یعنی جن امور میں رخصت کی گنجائش دی گئی ہے ان میں رخصت پر عمل کیا جائے۔ ﴿ عزائمہ ﴾ عزیمۃ کی جمع ہے اور یہ رخصت کے بالمقابل ہے۔ رخصت کا مفہوم یہ ہے کہ شارع نے بعض واجبات کی ادائیگی میں شدت اور تکلیف کی وجہ سے یا کسی عذر کی بنا پر چھوڑنے کی اجازت دے دی ہے اور بعض محرمات کو ضرورتاً مباح قرار دے دیا ہے اور عزیمت' رخصت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں نماز قصر کر کے پڑھنا بہتر ہے۔ عملاً یہ اگرچہ تعداد میں مکمل چار رکعتیں پڑھنے سے کم ہے مگر افضل یہی دو رکعتیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت کو قبول کرنا اللہ کے ہاں اسی طرح محبوب ہے جیسے عزیمت پر عمل کرنا محبوب اور پسندیدہ ہے۔

(٣٤٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا خَرَجَ مَسِيْرَةَ ثَلاثَةِ أَمْيَالٍ أَوْ ثَلاثَةِ فَرَاسِخَ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تین میل یا تین فرسخ کی مسافت پر' سفر کیلئے تشریف لے جاتے تو دو رکعتیں (نماز قصر) ادا فرماتے تھے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امیال او فراسخ ﴾ اس حدیث کے سند کے ایک راوی شعبہ نے "او" بیان کر کے اپنے شک کا اظہار کیا ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ مختلف احوال بیان کرنا مقصود ہے۔ "امیال" میل کی جمع ہے۔ میل کی مقدار کیا ہے' کتنی ہے اس بارے میں اختلاف پایا گیا ہے۔ اس بارے میں تین اقوال مشہور ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد چھ ہزار ہاتھ جتنی مسافت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چار ہزار ہاتھ اور ایک ہاتھ کی لمبائی ان دونوں اقوال میں۔ چوبیس انگشت ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ تین ہزار ہاتھ کے برابر اور ہاتھ سے مراد ہے بتیس انگشت۔ دوسرے اور تیسرے قول میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ تقریباً ایک ہی مقدار بنتی ہے۔ فقط تعبیر کا فرق ہے۔ رہا "فراسخ" تو یہ فرسخ کی جمع ہے۔ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اور یہ لفظ فارسی زبان کے فرسنگ سے معرب ہے اور تین فرسخ ساڑھے چوبیس کلومیٹر کے مساوی ہوتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک میل چھ ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے یا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ چار ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے تو پھر تین فرسخ کا فاصلہ پونے سترہ کلومیٹر فاصلہ کے مساوی بنتا ہے۔ یہ فاصلہ کا تعین اندازاً ہے یقینی اور حتمی نہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے نو میل کی مسافت سے سفر پر نکلنے کا عزم کیا ہو اس کیلئے قصر نماز پڑھنا صحیح ہے۔ وہ مسافت جس میں نماز قصر پڑھی جائے کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ مسافت چار برد ہے (اڑتالیس میل) اس کی دلیل آئندہ آئے گی۔ رہی یہ حدیث تو اس کے مطابق کسی فقیہہ کا قول ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر کوئی

فقیہہ اس طرف جاتا تو اس کیلئے بڑی قوی وجہ موجود تھی۔ ہمارے زمانے کے علماء اہلحدیث کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ نو میل کی مسافت پر قصر کرنا جائز ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں وارد الفاظ "میل، فرسخ" کی تعریف تو اوپر ہو چکی ہے کہ نماز قصر کیلئے کتنی مسافت ہونی چاہئے۔ اس کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ قصر نماز کیلئے کوئی مسافت محدود و متعین نہیں ہے۔ مطلق سفر سے اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور جب کوئی کسی مسافت کو سفر خیال کرے وہاں قصر نماز پڑھے۔ بلاشبہ قرآن مجید میں قصر کیلئے مطلقاً سفر کا ذکر ہے، جیسے سفر میں تیمم کے لئے سفر کی کوئی تعین نہیں مگر اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تین میل کا سفر بھی شرعی سفر شمار ہوتا ہے لیکن راوی حدیث امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ تین میل یا تین فرسخ کے قائل تھے۔ جس سے علماء نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ یہاں تین فرسخ مراد لئے جائیں اور تین فرسخ سے نو میل مسافت بنتی ہے لہذا نو میل مسافت پر نماز قصر ادا کی جا سکتی ہے۔ ظاہریہ نے تو تین میل تک مسافت کو نماز قصر کے لئے جائز قرار دیا ہے بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایک میل پر بھی جائز ہے۔ مگر ان کی پشت پر مضبوط عقلی و نقلی ثبوت نہیں ہے اور بعض حضرات نے ۳۶ میل اور بعض نے ۴۸ میل اور بعض نے ۵۲ میل کی مسافت مقرر کی ہے۔ بہرحال یہ سب قیاسات پر مبنی ہیں کسی کی تائید میں صحیح حدیث موجود نہیں۔ رہی چار برد والی روایت کہ چار برد (اڑتالیس میل) سے کم مسافت پر قصر جائز نہیں، سو یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے نیز اس کے ایک راوی عبدالوہاب بن مجاہد بن جبیر مکی کی روایت کو ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے بلکہ ثوری نے تو اس کو کذاب کہا ہے، اس لئے یہ استدلال کے لائق نہیں۔

(۳۴۵) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ مِنَ الْمَدِيْنَةِ إِلَى مَكَّةَ، فَكَانَ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ، حَتَّى رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکل کر مدینہ سے مکہ تک کا سفر کیا، آپؐ مدینہ واپسی تک دو، دو رکعتیں ہی ادا فرماتے رہے۔ (بخاری و مسلم۔ البتہ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب ایک آدمی اپنے گھر سے سفر کی نیت سے نکل پڑے تو وہ مسافر کی تعریف میں آجاتا ہے۔ حدود شہر یعنی موجودہ اصطلاح میں میونسپلٹی کی حدود سے نکلنے کے بعد خواہ ایک میل کا سفر طے کیا ہو نماز قصر ادا کرنا شروع کر سکتا ہے اور واپسی تک دوگانہ نماز پڑھ سکتا ہے۔

(۳۴۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْماً يَقْصُرُ وَفِيْ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ۱۹ روز قیام فرمایا آپؐ قصر ہی فرماتے رہے اور ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں ۱۹ روز قیام

لَفْظٍ: «بِمَكَّةَ، تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْماً». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَفِي رِوَايَةٍ لأَبِي دَاوُدَ: «سَبْعَ عَشْرَةَ». وَفِي أُخْرَى: «خَمْسَ عَشْرَةَ».

فرمایا۔ (بخاری) اور ابوداؤد کی روایت میں ۱۷ روز ہے اور ایک دوسری روایت میں ۱۵ روز ہے۔

وَلَهُ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ: «ثَمَانِيَ عَشْرَةَ». وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ: أَقَامَ بِتَبُوكَ عِشْرِينَ يَوْماً يَقْصُرُ الصَّلاَةَ. وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِي وَصْلِهِ.

اور ابو داؤد میں ہی عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ہے کہ آپؐ کی مدت قیام اٹھارہ دن تھی اور اسی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آپؐ نے تبوک میں بیس دن قیام فرمایا اور نماز قصر ادا کرتے رہے' اس روایت کے راوی ثقہ ہیں' مگر اس کے موصول ہونے میں اختلاف ہے۔

حاصل کلام: مکہ میں مدت قیام کے بارے میں جو مختلف روایات منقول ہیں کہ آپؐ ایک روایت کی رو سے وہاں ۱۹ روز یا ۱۸ روز اور ایک روایت کی رو سے ۱۷ روز یا پندرہ روز قیام پذیر رہے۔ ان میں سے ہر مدت قیام کے حق میں کچھ نہ کچھ لوگوں کی رائے ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ مدت قیام میں اختلاف فتح مکہ کے موقع کا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع کا نہیں ہے۔ کیونکہ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ وہ تو صرف دس روز تھا۔ ان روایات میں جمع و تطبیق کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹ روز والی روایت دوسری روایات کے مقابلہ میں صحیح ترین اور قوی ترین ہے۔ اس کی تائید اہل مغازی کا وہ بیان ہے کہ نبی ﷺ مکہ میں بروز منگل صبح داخل ہوئے وہ رمضان کی سترہ تاریخ تھی اور حنین کی جانب بروز ہفتہ چھ شوال روانہ ہوئے۔ پس ان ایام کی تعداد' دخول اور خروج کے ایام سمیت ۱۹ روز بنتے ہیں اور ۱۸ روز والی روایت تو اپنے ضعف کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس احتمال کے باوجود کہ راوی کے ذہن میں راتوں کی تعداد ہو' دنوں کی تعداد نہ ہو کیونکہ آپؐ مکہ میں داخل تو دن کو ہوئے تھے اور یہاں سے نکلے رات کو تھے۔ یوں ۱۹ دن کی تعداد پوری ہوگئی اور راتوں کی تعداد ۱۸ ہوئی۔ اس طرح ان دونوں میں کوئی فرق اور منافاۃ باقی نہ رہا اور اس تاویل کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ۱۸ شب والی روایت میں لفظ لیل (شب) موجود ہے اور سترہ یوم والی روایت کی صورت میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ راوی نے مکہ میں دخول اور خروج کے دونوں دن شمار نہیں کئے لہٰذا دو یوم انیس میں سے نکال دیں تو باقی سترہ ہی رہ جاتے ہیں اور رہی پندرہ یوم والی روایت تو وہ روایت شاذ ہے اور ثقہ راویوں کی روایت کردہ روایات کے مخالف ہے' لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ راوی نے سترہ یوم والی روایت کو اصل قرار دے کر مکہ میں آپؐ کے داخل اور خارج ہونے کا دن نکال دیا ہو اس طرح سترہ میں سے دو نکال دیئے جائیں تو باقی پندرہ دن رہ جاتے ہیں۔ ان روایات سے ہر نماز کی مدت کے تعین کا استدلال کرنا ہی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ سفر تو آپؐ کا غزوہ اور لڑائی کا سفر تھا۔ محارب کو ہر لمحہ ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں کہ اسے آگے بھی بڑھنا پڑے اور پیچھے بھی ہٹنا اور واپس ہونا پڑے۔ یہ صورت حال بذات خود

نبی ﷺ کو بھی پیش آئی کہ فتح مکہ کے فوراً بعد آپؐ کو ایک چھوٹا سا دستہ مجاہدین کا عزیٰ کے انہدام کیلئے روانہ کرنا پڑا اور اس دستہ کی قیادت اور امارت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دی۔ پھر معاً بعد دوسرا دستہ سواع بت کے انہدام کیلئے روانہ فرمایا اس لشکر کی قیادت و امارت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی۔ پھر تیسرا دستہ مناۃ بت کے انہدام کیلئے روانہ فرمایا اس کی امارت پر سعد بن زید کو مقرر فرمایا اور پھر چوتھا دستہ جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا اس کی قیادت بھی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تفویض فرمائی۔ اس کے بعد تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ قبائل ثقیف و ھوازن کے اجتماع کی اطلاع ملی تو آپؐ نے خود آگے بڑھ کر ان کا سامنا کیا کہ وادی حنین میں ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ یہاں پر پھر وہ معرکہ آرائی ہوئی اور گھمسان کا رن پڑا جو مشہور و معروف ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مجاھد و سپاہی اگر قیام کا ارادہ کرے خواہ فتح یابی و کامرانی کے بعد ہی ہو اس کی نیت معتبر تسلیم نہیں کی جائے گی۔ بلکہ اس کی تو کیفیت اس مسافر کی سی ہوگی جو اس تذبذب و تردد میں مبتلا ہو کہ آج واپسی ہوتی ہے یا کل۔ پس ایسا متردد و متذبذب مسافر ہمیشہ قصر نماز ہی ادا کرتا رہے گا خواہ یہ کیفیت سالوں اور مہینوں پر محیط ہو۔ پس صحیح بات یہی ہے کہ نبی ﷺ کا فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے مواقع پر قصر نماز ادا فرمانا' قصر نماز کی مدت متعین پر دلالت ہی نہیں کرتا۔ اس بارے میں راجح مسلک وہی ہے جسے ائمہ ثلاثہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے کہ جو آدمی داخل اور خارج ہونے کے دونوں ایام کو چھوڑ کر صرف چار روز قیام کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہئے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ اور گرد و نواح میں دس دن گزارے تھے تو آپؐ ان ایام میں قصر نماز ادا فرماتے رہے۔ آپؐ مکہ میں ذی الحجہ کی چار تاریخ کو صبح داخل ہوئے اور مکہ سے آٹھ ذی الحجہ کے شروع دن سے نکلے تھے۔ اس دوران آپؐ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے کہ مناسک کی تکمیل فرمالی۔ اس اعتبار سے آپؐ کے قیام کی مدت صرف تین دن بنتی ہے داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے دو دن اس سے خارج ہیں۔ آپؐ کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے اس مدت سے زیادہ قیام فرمایا ہو اور آپؐ نے قصر نماز ادا کی ہو' یا اس سے کم مدت قیام فرمایا ہو اور قصر نماز ادا نہ فرمائی ہو۔ مناسک حج کی تکمیل کے بعد حضور ﷺ کا مہاجرین کو مکہ میں تین دن سے زائد قیام کرنے سے منع فرمانا بھی ان کی دلیل ہے کہ مسافر اگر چار دن کا ارادہ کرے گا تو مقیم سمجھا جائے گا نیز ان کا استدلال اس سے بھی ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہود کو حجاز سے جلا وطن کیا پھر ان میں جو تاجر کی حیثیت سے حجاز میں آنا چاہے اسے بھی تین دن قیام کی اجازت دی تھی۔ مصنف نے اسے اپنی کتاب التلخیص الحبیر میں نقل کیا ہے اور ابوزرعہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں ۱۹' ۱۸' ۱۷ اور ۱۵ روز قصر نماز پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی تطبیق اور روایات کے مابین جمع کی صورت تو اوپر مذکور ہے۔ اس لیے مختلف مکاتب فکر کے ہاں مدت قیام بھی مختلف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تین دن۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ۱۵ دن۔ مگر جب مسافر حالت تردد میں مبتلا ہو جائے اور واپسی کا حتمی فیصلہ نہ کرپائے تو ایسی صورت

میں بھی اختلاف آراء پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے اصحاب سمیت اور ایک قول کی رو سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ایسا متردد و متذبذب مسافر تادم زیست یا واپسی تک قصر کر سکتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے آذر بائیجان میں چھ ماہ تک قصر نماز پڑھی اور اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کو نیشاپور سال یا دو سال حالت تردد میں رہنا پڑا تو قصر ہی کرتے رہے۔ اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رامہرمز میں نو ماہ تک رکنا پڑا تو وہ قصر ہی کرتے رہے۔ ان واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ تردد اور تذبذب کی حالت میں قصر کی مدت مقرر نہیں ہے' بلکہ جب تک ضرورت کا تقاضا ہو اتنی مدت تک قصر جائز ہے۔

(٣٤٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ أَنْ تَزِيْغَ الشَّمْسُ، أَخَّرَ الظُّهْرَ إِلَى وَقْتِ الْعَصْرِ، ثُمَّ نَزَلَ فَجَمَعَ بَيْنَهُمَا، فَإِنْ زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَن يَرْتَحِلَ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَكِبَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب زوال آفتاب سے پہلے سفر کا آغاز فرماتے تو ظہر کی نماز کو عصر کی نماز تک مؤخر کر لیتے تھے۔ پھر سواری سے نیچے تشریف لاتے اور ظہر و عصر دونوں نمازوں کو اکٹھی ادا فرماتے اور جب آفتاب آغاز سفر سے پہلے زوال پذیر ہو جاتا تو پھر نماز ظہر ادا فرما کر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةِ الْحَاكِمِ فِي الْأَرْبَعِيْنَ بِالإِسْنَادِ الصَّحِيحِ: صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ ثُمَّ رَكِبَ.

اور حاکم کی اربعین میں سند صحیح ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر و عصر کی نمازیں پڑھیں پھر سواری پر سوار ہوئے۔

وَلِأَبِيْ نُعَيْمٍ فِيْ مُسْتَخْرَجِ مُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا كَانَ فِيْ سَفَرٍ فَزَالَتِ الشَّمْسُ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيْعاً، ثُمَّ ارْتَحَلَ.

اور ابونعیم کی "مستخرج" میں ہے کہ جب آپ ﷺ سفر میں ہوتے اور آفتاب زوال پذیر ہو جاتا تو آپ ظہر اور عصر دونوں اکٹھی ادا فرما کر وہاں سے کوچ کرتے۔

لغوی تشریح: ﴿ارتحل﴾ سفر میں آرام اور استراحت کے بعد دوبارہ سفر کا آغاز کرنا۔ ﴿تزیغ الشمس﴾ آفتاب کا نصف النہار سے مغرب کی جانب زوال پذیر ہونا "صلی الظہر ثم رکب" بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ صرف نماز ظہر ادا فرماتے تھے' عصر کی نماز کو اس کے ساتھ نہیں ملاتے تھے لیکن حاکم اور ابونعیم کی روایت میں صاف صاف ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر و عصر دونوں نمازوں کو ظہر کے وقت میں اکٹھے پڑھا۔ **حاصل کلام:** اس حدیث کی رو سے سفر میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو جمع کر کے پڑھنا جائز ثابت ہوتا ہے۔ اس میں جمع تقدیم ہو یا تاخیر دونوں طرح ثابت ہے۔ احناف جمع حقیقی کے قائل نہیں جمع صوری کے قائل ہیں۔ مگر ترمذی کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جمع

صوری نہیں بلکہ جمع حقیقی تھی۔ چنانچہ اس کا مفہوم ہے کہ جب آفتاب زوال پذیر ہونے سے پہلے آپ سفر پر روانہ ہوتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر کا آغاز فرماتے تو عصر کو ظہر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے اور مستخرج ابونعیم کی حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے جسے مصنف مرحوم نے ذکر کیا ہے۔

(٣٤٨) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَكَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ وَالعَصْرَ جَمِيْعاً. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکلے تو آپ ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھتے اور مغرب و عشاء اکٹھی پڑھتے تھے۔ (مسلم)

(٣٤٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا تَقْصُرُوا الصَّلَاةَ فِي أَقَلَّ مِنْ أَرْبَعَةِ بُرُدٍ، مِنْ مَكَّةَ إِلَى عُسْفَانَ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ مَوقُوفٌ، كَذَا أَخْرَجَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار برد سے کم فاصلہ پر نماز قصر نہ کرو چار برد مکہ سے عسفان تک فاصلہ ہے۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ ابن خزیمہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ برد ﴾ "باء" اور "راء" دونوں پر ضمہ ہے۔ برید کی جمع ہے۔ ایک برید بارہ میل کا ہوتا ہے۔ لہٰذا چار برد کی مسافت کی مقدار اڑتالیس میل ہوئی۔ ﴿ عسفان ﴾ عین پر ضمہ بروزن عثمان ہے۔ بڑا قصبہ ہے مکہ سے تقریباً سو کلومیٹر فاصلہ پر واقع ہے۔ جس آدمی نے استدلال کیا کہ چار برد سے کم فاصلہ پر نماز قصر جائز نہیں اس نے اس حدیث سے احتجاج کیا ہے۔ مگر اس سے یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس کا راوی عبدالوہاب بن مجاہد متروک الحدیث ہے اور امام ثوری رحمہ اللہ نے تو اسے کذاب تک کہا ہے اور ازدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے روایت کرنا حلال نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس کا اپنے باپ سے سماع ہی ثابت نہیں۔ لہٰذا یہ حدیث منقطع اور ضعیف ہے اور ناقابل استدلال ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما خود مکہ اور طائف کے مابین جتنے فاصلہ پر قصر کرتے تھے۔ نیز مکہ اور عسفان اور مکہ اور جدہ کے مابین جتنے فاصلہ پر بھی قصر کرتے تھے اسے امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی مؤطا میں نقل کیا ہے مگر اس میں موقوف روایت سے فاصلہ کی تعیین نہیں ہوتی۔

(٣٥٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «خَيْرُ أُمَّتِي الَّذِين إِذَا أَسَاءُوا اسْتَغْفَرُوا، وَإِذَا سَافَرُوا قَصَرُوا وَأَفْطَرُوا». أَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الأَوْسَطِ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَهُوَ فِي مَرَاسِيلِ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عِنْدَ الْبَيْهَقِيِّ مُخْتَصَراً.

فرمایا کہ ”میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جو برائیاں کر کے بخشش کے طلبگار ہوتے ہیں اور جب سفر پر ہوتے ہیں تو نماز قصر کا اہتمام کرتے ہیں اور روزہ نہیں رکھتے۔“ (اسے طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ اپنی اوسط میں روایت کیا ہے اور یہ بیہقی کے ہاں مختصراً سعید بن مسیب کی مراسیل سے ہے۔ بیہقی نے اسے مختصر بیان کیا ہے)

راوی حدیث: ﴿ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ ﴾ کبار تابعین کے سردار تھے۔ علم کے اعتبار سے ان سب سے وسیع علم رکھتے تھے۔ انہوں نے فقہ' حدیث' زہد' عبادت اور تقویٰ و ورع کے بارے میں بہت کچھ جمع کیا ہوا تھا۔ یعنی جمع العلوم شخصیت تھے۔ ان کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال بعد ہوئی تھی اور ۹۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔ (مسیب) اس میں ”یاء“ پر تشدید اور فتحہ اور تشدید اور کسرہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

(۳۵۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: كَانَتْ بِيْ بَوَاسِيْرُ، فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الصَّلاةِ، فَقَالَ: «صَلِّ قَائِماً، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِداً، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا۔ اس صورت میں میں نے نبی ﷺ سے نماز پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا ”کھڑے ہو کر پڑھو اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو پھر بیٹھ کر پڑھو اور اس کی بھی طاقت و استطاعت نہ ہو تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر پڑھ لو۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ بواسیر ﴾ یہ بہت برا مرض ہے۔ مقعد کے امراض سے تعلق رکھتا ہے۔ مقعد کی رگوں کا پھیل جانا اس کا سبب ہے اور بسا اوقات خون اس میں سے بہتا ہے۔ بواسیر جمع ہے اس کا واحد باسور ہے۔

حاصل کلام: بیٹھنے کی صورت بعض کے نزدیک چار زانو ہے اور بعض کے نزدیک تشہد کی سی صورت۔ دراصل بات یہ ہے کہ مریض جس طرح آسانی سے بیٹھ سکتا ہے اسی طرح بیٹھے اسے ہر طرح اجازت ہے۔ چت لیٹ کر پڑھنے کی بھی گنجائش ہے۔ اگر کسی حالت اور کسی پہلو بھی ممکن نہ ہو تو پھر جو صورت اختیار کر سکتا ہو کر لے۔

(۳۵۲) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَادَ النَّبِيُّ ﷺ مَرِيْضاً، فَرَآهُ يُصَلِّي عَلَى وِسَادَةٍ فَرَمَى بِهَا، وَقَالَ: «صَلِّ عَلَى الْأَرْضِ إِنِ اسْتَطَعْتَ، وَإِلاَّ فَأَوْمِ إِيْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوعِكَ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَصَحَّحَ أَبُو حَاتِمٍ وَقْفَهُ.

ایک مریض کی عیادت فرمائی تو دیکھا کہ وہ تکیہ پر نماز پڑھ رہا ہے آپؐ نے وہ تکیہ دور پھینک دیا اور فرمایا کہ "زمین پر نماز پڑھ اگر تمہارے بس میں ہے ورنہ سر کے اشارہ سے پڑھ لے۔ ہاں اپنے سجدوں کیلئے رکوع کی بہ نسبت ذرا نیچے جھکو۔" (بیہقی نے اسے روایت کیا ہے اور ابو حاتم نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عاد ﴾ عیادت سے ماخوذ ہے۔ عیادت کہتے کسی مریض سے ملاقات کرنے یا دریافت احوال کو ﴿ وسادۃ ﴾ تکیہ جو سونے والا اپنے سر کے نیچے رکھتا ہے۔ یہی حدیث اس سے پہلے بھی گزر چکی ہے۔

(۳۵۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْها قالت: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّيْ مُتَرَبِّعاً. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو متربعا (چار زانو) ہو کر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ متربعا ﴾ تربع سے ماخوذ ہے ہے۔ بیٹھنے کی ایک قسم ہے وہ اس طرح کہ اپنا دایاں پاؤں اپنی بائیں ران کے نیچے اور اپنا بایاں پاؤں اپنی دائیں ران کے نیچے بٹھا کر مقعد پر بیٹھنا۔

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ چار زانو بیٹھ کر بھی نماز جائز ہے۔

١٢ - بَابُ صَلاَةِ الْجُمُعَةِ — نماز جمعہ کا بیان

(٣٥٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، وَأَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ، أَنَّهُمَا سَمِعَا رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ عَلَى أَعْوَادِ مِنْبَرِهِ: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ الْجُمُعَاتِ، أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ، ثُمَّ لَيَكُونُنَّ مِنَ الْغَافِلِينَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (دونوں) سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر کی سیڑھیوں پر یہ فرماتے سنا ہے کہ "لوگ نماز جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ لازماً غافل لوگوں میں شمار ہوں گے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب صلاۃ الجمعۃ ﴾ جمعہ کے جیم اور میم پر ضمہ اور میم پر فتح اور جزم بھی جائز

ہے۔ ﴿اعواد﴾ عود کی جمع جس کے معنی لکڑی ہیں' یہاں مراد منبر کی لکڑی سے ساختہ سیڑھیاں یا یہ بھی معنی ہو سکتا ہے کہ اس منبر پر تشریف فرماتے تھے جو عود سے بنا ہوا تھا۔ یہ منبر ۷ھ یا ۸ھ میں انصاری خاتون کے غلام میمون نامی نے تیار کیا تھا۔ اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ پھر بعد میں مروان نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت میں پہلے منبر کے نچلے حصہ میں چھ سیڑھیاں مزید بنا دیں۔ یہ منبر ۶۵۴ھ تک باقی رہا اور مسجد نبوی جب ۶۵۴ھ میں آگ لگنے سے جل گئی تو یہ منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی آگ کی لپیٹ میں آکر خاکستر ہوگیا۔ (سبل السلام) ﴿عن ودعهم﴾ "واؤ" پر فتحہ اور "دال" ساکن' مصدر ہے اور فاعل کی طرف مضاف ہے۔ ﴿الجمعات﴾ اس کا مفعول ہے یعنی ان لوگوں کا جمعہ کو چھوڑنے کی وجہ سے ﴿اولیختمن الله﴾ اللہ تعالیٰ لازماً مہر لگا دے گا۔ ﴿علی قلوبهم﴾ ان کے دلوں پر بایں طور کہ دلوں پر زنگ چڑھا دے گا تو یہ لوگ جمعہ کے لطف اور اس کی فضیلت کے حصول سے محروم رہ جائیں گے اور ان کے دلوں میں سختی اور سنگ دلی پیدا فرما دے گا۔ ﴿ثم لیکونن﴾ پہلے نون پر ضمہ اور دوسرے پر تشدید۔ جمع کا صیغہ ہے۔ نون ثقیلہ برائے تاکید یعنی "پھر وہ لازماً ہو جائیں گے۔"

حاصل کلام: جمعہ کے لغوی معنی ایک جگہ جمع ہونے کے ہیں جسے دور جاہلیت میں "عروبہ" کہتے تھے۔ اسلام نے اس کا نام جمعہ رکھا کہ مسلمان ایک مخصوص دن میں مخصوص اوقات میں عبادت الٰہی کیلئے مجتمع ہوں اور مل کر سب اکٹھے عبادت کریں اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر بھی ہوں اور اجتماعی فیصلے بھی کئے جا سکیں۔

اس حدیث سے جمعہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے' اسے بغیر کسی عذر شرعی کے ترک کرنے پر دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں اور آدمی دین سے بے بہرہ ہو جاتا ہے آخر کار منافقین و غافلین کے زمرہ میں شامل ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا نماز جمعہ کو معمولی سمجھ کر اس بارے میں تساہل اور سستی کا مظاہرہ کرنا رسوائی اور خذلان کا موجب ہے اور توفیق الٰہی سے محروم رہنے کا باعث ہے۔

(۳۵۵) وَعَنْ سَلْمَةَ بْنِ الأَكْوَعِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ الجُمُعَةَ، ثُمَّ نَنْصَرِفُ وَلَيْسَ لِلْحِيْطَانِ ظِلٌّ نَسْتَظِلُّ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

وَفِي لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ: كُنَّا نُجَمِّعُ مَعَهُ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ نَرْجِعُ، نَتَتَبَّعُ الفَيْءَ.

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ ادا کرتے تھے۔ جمعہ سے فارغ ہو کر جب ہم اپنے گھروں کو جاتے تو اس وقت دیواروں کا سایہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم سایہ میں بیٹھ کر آرام کر لیتے (یا سایہ میں چل کر گھر پہنچ جاتے) ۔ (بخاری و مسلم) متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم میں ہے کہ آپ کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرتے جب زوال ہو جاتا پھر واپس ہوتے۔

لغوی تشریح: ﴿حیطان﴾ حائط کی جمع' دیوار کے معنی ہیں۔ ﴿ظل نستظل به﴾ دیواروں کا اپنا

اصلی سایہ اتنا بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم اس میں قدرے آرام کر سکتے۔ اس سے اصل سایہ کی نفی مراد نہیں ہے۔ اس حدیث سے قبل از زوال آفتاب نماز جمعہ ادا کرنا صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں جمعہ کو جلدی ادا کرنے کی دلیل ضرور ہے کہ جونہی زوال آفتاب ہو جمعہ کی نماز ادا کر لی جائے۔ ﴿ کنا نجمع ﴾ تجمیع سے ماخوذ ہے ہم نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ ﴿ نتتبع ﴾ جستجو کر کے تلاش کرتے تھے۔ ﴿ الفیئی ﴾ سایہ' ایسا اس لئے ہم کرتے تھے کہ زوال کے آغاز ہی پر جلد ہم نماز ادا کر لیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں نماز جمعہ بہت جلد ادا کی جاتی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز جمعہ زوال سے پہلے بہرحال نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وقت بھی نماز ظہر کا وقت ہی ہے۔ علماء اسلام کی اکثریت اسی طرف ہے البتہ امام احمد رحمہ اللہ اور اسحٰق بن راھویہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ جمعہ زوال سے پہلے بھی ہو جاتا ہے۔ نیز امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک خطبہ جمعہ تو زوال سے پہلے جائز ہے مگر نماز درست نہیں وہ زوال آفتاب کے بعد ہی ہے۔ اس دور میں جمعہ کی نماز ظہر کی نماز سے بھی زیادہ دیر سے پڑھتے ہیں جو سراسر حضور ﷺ کے عمل کے مخالف ہے۔ خطباء و ائمہ مساجد کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ ﴾ ابو مسلم ان کی کنیت ہے۔ سلمہ بن عمرو بن اکوع اور اکوع کا نام سنان بن عبداللہ اسلمی مدنی ہے۔ صحابہ کرام ؓ میں نہایت بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔ اتنے تیز رفتار تھے کہ دوڑنے میں گھوڑے سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ بہت سخی' فاضل اور بھلائی کا پتلا تھے۔ مدینہ منورہ میں ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(٣٥٦) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا كُنَّا نَقِيلُ وَلاَ نَتَغَدَّى إِلاَّ بَعْدَ الْجُمُعَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ: فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (جمعہ کے روز) ہم دوپہر کا قیلولہ اور کھانا نماز جمعہ کے بعد کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں ہے "یہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں تھا۔"

لغوی تشریح: ﴿ نقیل ﴾ قیلولہ سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ قیلولہ دوپہر کے وقت ذرا ستانے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ نیند نہ آئے ﴿ نتغدی ﴾ غداء سے ماخوذ۔ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دوپہر کے وقت کھایا جاتا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نصف النہار سے قبل نماز جمعہ پڑھنا صحیح ہے۔ مگر اس حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے' اس لئے کہ "قیلولہ" اور "غداء" کا اطلاق زوال کے بعد پر مجازاً کیا گیا ہے اور مدینہ و مکہ میں لوگ قیلولہ اور دوپہر کا کھانا نماز ظہر کے بعد ہی ہوتا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری سے ثابت ہوتا ہے۔ ﴿ وحین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ ﴾ (۲۴/ ۵۸) یعنی جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیا کرتے تھے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں نماز جمعہ جلدی ادا کی جاتی تھی۔ صحابہ کرامؓ نماز جمعہ کے بعد گھر واپس جا کر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے پھر دوپہر کا آرام (قیلولہ) کرتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوالعباس ہے۔ خزرجی ساعدی انصاری ہیں۔ ان کا اسم گرامی حزن تھا۔ اسلام لانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے سھل رکھ دیا۔ معلوم ہوا کہ برا نام ہو تو اسے بدل دینا چاہئے۔ جب آپؐ کی وفات ہوئی اس وقت سھل پندرہ برس کے تھے۔ ۹۱ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ مدینہ منورہ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہی صحابی تھے۔ ان سے تقریباً ایک سو احادیث مروی ہیں۔

(۳۵۷) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَخْطُبُ قَائِماً، فَجَاءَتْ عِيرٌ مِنَ الشَّامِ، فَانْفَتَلَ النَّاسُ إِلَيْهَا، حَتَّى لَمْ يَبْقَ إِلاَّ اثْنَا عَشَرَ رَجُلاً. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ جمعہ کا خطبہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ شام سے ایک تجارتی قافلہ آگیا۔ سب لوگ اس قافلہ کی طرف چھٹ گئے صرف بارہ آدمی خطبہ سننے کیلئے باقی رہ گئے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ عیر ﴾ عین کے نیچے کسرہ اور "یاء" ساکن۔ ساز و سامان سے لدے ہوئے اونٹ۔ مراد اس جگہ تجارتی قافلہ ہے۔ ﴿ فانفتل ﴾ جلدی سے لوگ اس کی طرف بھاگ گئے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ مسنون یہی ہے اور خطبہ نماز سے پہلے ہوتا تھا۔ نماز کے بعد نہیں۔ نیز ثابت ہوا کہ بارہ افراد بھی ہوں تو جمعہ درست ہے۔ شوافع نے جو چالیس کی تعداد کو ضروری قرار دیا ہے وہ صحیح نہیں۔

(۳۵۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنْ صَلاَةِ الْجُمُعَةِ وَغَيْرِهَا فَلْيُضِفْ إِلَيْهَا أُخْرَى، وَقَدْ تَمَّتْ صَلاَتُهُ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، لٰكِنْ قَوَّى أَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے نماز جمعہ اور دیگر نمازوں میں سے کسی کی ایک رکعت (جماعت کے ساتھ) پالی تو وہ دوسری اس کے ساتھ ملا لے۔ تو بس اس کی نماز پوری ہوگئی" (اسے نسائی' ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ اس کی سند صحیح ہے لیکن ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو قوی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فلیضف ﴾ اضافہ سے ماخوذ ہے۔ لام اس میں امر کا ہے۔ مطلب ہے کہ اسے ساتھ ملالے ﴿ اخری ﴾ دوسری رکعت۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ جمعہ کی ایک رکعت پالینے والا دوسری رکعت ساتھ ملا کر دوسری رکعت پوری مکمل کر لے۔ ظاہر ہے جو شخص ایک رکعت ہی پاسکے گا اس کا خطبہ جمعہ تو فوت ہوگا۔ مگر جمعہ اس کا صحیح ہوگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ دونوں کی یہی رائے ہے۔ خطبہ جمعہ میں شریک ہونا ضروری نہیں۔ مصنف رحمہ اللہ نے گو یہاں اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے مگر التلخیص میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے' لیکن (من ادرک الرکعۃ فقد ادرک الصلاۃ) کی صحت میں تو کسی کو کلام نہیں۔ جس کے عموم میں جمعہ بھی شامل ہے۔

(۳۵۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَخْطُبُ قَائِماً، ثُمَّ يَجْلِسُ، ثُمَّ يَقُوْمُ فَيَخْطُبُ قَائِماً، فَمَنْ أَنْبَأَكَ أَنَّهُ كَانَ يَخْطُبُ جَالِساً فَقَدْ كَذَبَ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے پھر درمیان میں تھوڑا سا بیٹھ جاتے پھر کھڑے ہو کر خطاب فرماتے۔ پس جس کسی نے تمہیں یہ اطلاع دی کہ آپؐ بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے اس نے جھوٹ بولا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ انباک ﴾ انباء (باب افعال) سے ماخوذ ہے۔ جو تمہیں خبر دے' اطلاع دے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ جمعہ کے دو خطبے ہیں۔ دونوں کے درمیان بیٹھنا مسنون ہے اور آپؐ دونوں خطبے کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے تھے۔ شرعی عذر کے بغیر ان میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی اگر مسنون سمجھ کر کی جائے تو بدعت ہوگی۔ ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ سب کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ بعض احادیث سے آپؐ کا منبر پر چڑھ کر مقتدیوں کے رخ ہو کر السلام علیکم فرمانا بھی ثابت ہے۔

(۳٦۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهما قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا خَطَبَ احْمَرَّتْ عَيْنَاهُ، وَعَلاَ صَوْتُهُ، وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ، حَتَّى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُوْلُ: «صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ»، وَيَقُوْلُ: «أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ خَيْرَ الحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ،

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ ارشاد فرماتے تو رخ انور سرخ ہو جاتا۔ آواز بلند ہو جاتی اور جوش بڑھ جاتا (جس سے غصہ کے آثار نمایاں ہوتے۔ بس اسی طرح کی کیفیت ہو جاتی) جیسے کسی لشکر کو ڈانٹ رہے ہیں کہ "دشمن کا لشکر صبح کو پہنچا یا شام کو پہنچا" اور فرماتے "حمد و صلاۃ کے بعد۔ بہترین بات اللہ کی

وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ کاموں میں بدترین کام نئے کام ہیں (بدعت کے کام) اور ہر بدعت گمراہی و ضلالت ہے۔ (مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: كَانَتْ خُطْبَةُ النَّبِيِّ ﷺ يَومَ الْجُمُعَةِ: يَحْمَدُ اللَّهَ، وَيُثْنِي عَلَيْهِ، ثُمَّ يَقُولُ عَلَى إِثْرِ ذَلِكَ، وَقَدْ عَلاَ صَوْتُهُ.

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے جمعہ کے روز نبی ﷺ کا خطبہ (یوں) ہوتا تھا کہ اللہ کی حمد اور اللہ کی ثنا بیان کرتے پھر اس کے بعد (خطبہ) فرماتے تو آپؐ کی آواز بلند ہوتی۔

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلاَ هَادِيَ لَهُ». وَلِلنَّسَائِيِّ: «وَكُلُّ ضَلاَلَةٍ فِي النَّارِ».

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے "جسے اللہ راہ ہدایت دکھا دے یا جسے راہ ہدایت پر گامزن فرما دے اسے پھر کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ جسے وہ گمراہ کر دے پھر اسے راہ ہدایت دکھانے اور چلانے والا کوئی نہیں۔" اور نسائی میں ہے "وکل ضلالۃ فی النار" ہر گمراہی انجام کار آگ میں داخلہ کا موجب ہے۔

لغوی تشریح: ﴿کانہ منذر﴾ یعنی اس شخص کی طرح جو اپنی قوم کو لشکر عظیم سے ڈراتا ہے جو غارت گری کرنے والا ہے۔ ﴿یقول﴾ وہ ڈرانے اور متنبہ کرنے والا اس قوم سے مخاطب ہے ﴿صبحکم﴾ باب تفعیل سے یعنی دشمن صبح سویرے تم پر یلغار کر کے ٹوٹ پڑے۔ ﴿مساکم"﴾ یہ بھی باب تفعیل سے ہے یعنی دشمن شام کے وقت تم پر حملہ آور ہو۔ دونوں کا مفہوم ہے کہ بالکل قریب ہے کہ دشمن تم پر نازل ہو جائے۔ ﴿الھدی﴾ "ھاء" پر فتحہ اور دال ساکن۔ راستہ اور طریق کے معنی۔ ﴿محدثاتھا﴾ نئی نئی چیزیں' بدعتیں۔ جن کا نہ ثبوت کلام الٰہی میں ہو اور نہ سنت نبویؐ میں۔ ﴿یثنی علیہ﴾ اثنی یثنی' باب افعال سے ثناء سے ماخوذ ہے "یاء" پر ضمہ اور نون پر کسرہ۔ تعریف اچھے اوصاف و اعمال پر ﴿ثم یقول علی اثر ذالک﴾ یعنی اس کے بعد خطبہ ارشاد فرماتے "اثر" ھمزہ پر فتحہ بھی ہے اور کسرہ بھی آسکتا ہے۔ ﴿من یھد اللہ﴾ یہ جملہ آپ حمد کے بعد اور شہادت سے پہلے ادا فرماتے ﴿وکل ضلالۃ﴾ کو ﴿کل بدعۃ ضلالۃ﴾ کے بعد کہتے۔ اس حدیث سے یہ تقسیم ثابت نہیں ہوتی کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک بدعت سیئہ اور دوسری بدعت حسنہ۔ بلکہ ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہی ہے خواہ حسنہ ہو۔ سطحی عقل و خرد کے مالک حضرات کے نزدیک۔ اس کی بنیاد دراصل اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو شارح بنانا ہے اور یہ تو کھلی گمراہی و بدراہی ہے اور جو حسنہ (نیکی و بھلائی) ہے کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بدعت ہو اور جو بدعت ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ حسنہ (نیکی و بھلائی) ہو۔

حاصل کلام: یہ وہ خطبہ مسنونہ ہے جو رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ثابت ہے۔ خطبہ کے دوران خطیب پر مختلف واردات ہوتی ہیں جس کی وجہ سے کسی وقت چہرے پر ایسے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں اس سے سامعین کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ خطبہ میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثنا ہونی چاہئے۔ خطبہ مختصر مگر جامع ہو۔ خطبہ میں ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سامعین اس سے متاثر بھی ہوں اور محظوظ بھی' لیکن تکلف سے اجتناب کرنا چاہئے۔ خطبہ کو طول دینے سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ مختصر' مگر جامع خطبہ سامعین کی سمع خراشی کا موجب نہیں بنتا بلکہ اسے یاد رکھنا سہل اور آسان ہوتا ہے اور اپنا بہترین اثر چھوڑتا ہے۔

(٣٦١) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ طُولَ صَلاَةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "آدمی کی نماز لمبی اور خطبہ مختصر اس کی فقاہت کی نشانی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿قصر﴾ قاف کے نیچے کسرہ اور "صاد" پر فتحہ ہے۔ مختصر کے معنی میں ﴿مئنة﴾ میم پر فتحہ اور ھمزہ کے نیچے کسرہ اور نون پر فتحہ اور تشدید۔ معنی علامت' نشانی۔ یہ انسان کے فقیہہ و دانا ہونے کی علامت و نشانی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں خطیب کی عقلمندی کی علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کی نماز لمبی اور خطبہ چھوٹا ہوتا ہے۔ مختصر بات یاد رکھنی' ذہن نشین کرنی آسان ہوتی ہے۔ آنجناب ﷺ کے خطبات جمعہ عام طور پر مختصر مگر جامع ہوتے تھے جنہیں یاد رکھنا یا حفظ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا' با سانی نوک زبان ہو جاتے تھے۔ مگر صد افسوس کہ اس دور میں ہمارے خطباء کی عموماً گنگا الٹی چلتی ہے یعنی خطبہ لمبا اور نماز مختصر' خلاف سنت اس طریقہ کی بہرنوع اصلاح ضروری ہے۔

(٣٦٢) وَعَنْ أُمِّ هِشَامِ بِنْتِ حَارِثَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَا أَخَذْتُ ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ﴾ إِلاَّ عَنْ لِسَانِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، يَقْرَأُهَا كُلَّ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ إِذَا خَطَبَ النَّاسَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ام ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے سورہ ق لسان مآب ﷺ سے سن سن کر ازبر کرلی آپؐ ہر جمعہ اس سورۃ کو منبر پر کھڑے ہو کر خطاب جمعہ میں تلاوت فرماتے تھے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں سامعین کو قرآن مجید سنانا اور سمجھانا چاہئے۔ اس حدیث میں وارد ہے کہ آپؐ نے عموماً سورۃ ق خطبہ جمعہ میں تلاوت فرمائی۔ یہاں تک کہ

حضرت ام ھشام رضی اللہ عنہا نے سن سن کر ساری سورۂ زبانی یاد کرلی۔ اس سورۂ میں چونکہ موت' قیامت' جنت' دوزخ اور پند و نصائح کا ذکر ہے اس لئے عموماً آپؐ اس کی تلاوت کرتے' تاکہ آخرت یاد آئے اور فکر و عمل کی طرف طبیعت مائل رہے۔ خطبہ میں لایعنی قصے' بے مقصد باتیں شعرو شاعری حتیٰ کہ شرکیہ اشعار مزاج شریعت کے منافی ہے۔ جس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ ام ھشام رضی اللہ عنہا ﴾ حارثہ بن نعمان کی بیٹی' عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی ماں جائی بہن۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق کی وجہ سے انصاریہ نجاریہ کہلائیں۔ کہتے ہیں کہ یہ خاتون بیعت الرضوان میں شریک تھیں۔

(٣٦٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الجُمُعَةِ وَالإِمَامُ يَخْطُبُ، فَهُوَ كَمَثَلِ الحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً، وَالَّذِي يَقُولُ لَهُ: أَنْصِتْ، لَيْسَتْ لَهُ جُمُعَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ بِإِسْنَادٍ لاَ بَأْسَ بِهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے جمعہ کے روز اس وقت بات کی جب امام منبر پر کھڑا خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو وہ شخص اس گدھے کی طرح ہے جس نے کتابیں اٹھائی ہوئی ہیں اور اس کا بھی جمعہ نہیں جس نے اسے کہا کہ خاموش رہ (اسے احمد نے ایسی سند سے روایت کیا جس کے متعلق (لاباس بہ) کہا گیا ہے)

وَهُوَ يُفَسِّرُ حَدِيثَ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مَرْفُوعاً: «إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ: أَنْصِتْ، يَوْمَ الجُمُعَةِ، وَالإِمَامُ يَخْطُبُ، فَقَدْ لَغَوْتَ».

اور یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی تفسیر کرتی ہے جو صحیحین میں منقول ہے "جب تو نے اپنے ساتھی سے کہا کہ چپ رہ اور امام اس وقت خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو تو نے بھی لغو بات کی یا اپنا جمعہ لغو کر دیا۔

لغوی تشریح: ﴿ اسفارا ﴾ سفر کی جمع ہے۔ سفر کے سین کے نیچے کسرہ۔ سفر کے معنی کتاب اور صحیفہ کے ہیں اور اسفار کتابوں کے معنی میں ﴿ انصت ﴾ انصات سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے' معنی ہے خاموش رہ۔ ﴿ لیست لہ جمعۃ ﴾ یعنی اسے جمعہ کی فضیلت نہیں ملے گی بلکہ اس سے محروم رہے گا۔ یہ معنی نہیں کہ اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ اس کی نماز جمعہ تو ادا ہو جائے گی مگر وہ جمعہ کی فضیلت سے محروم رہے گا۔ (سبل) جو آدمی دوسرے کو دوران خطبہ بات کرنے سے منع کرتا ہے' اس کا حال یہ ہے تو جو گفتگو کرنے کا مرتکب ہوتا ہے اس کی حرمان نصیبی کے کیا کہنے اور اس دھمکی و وعید کا کتنا مستحق ہے۔ ایسے شخص کو گدھے سے تشبیہہ دی گئی جو کتابوں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہے کہ وہ صرف بوجھ تلے دبا ہوا ہے ورنہ ان سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ شخص ہے جو اپنا قیمتی وقت' کاروبار' گھر چھوڑ کر نماز جمعہ کیلئے دور سے چل کر آتا ہے مگر اپنی نادانی اور بیوقوفی کی وجہ سے

دوران خطبہ گفتگو کا ارتکاب کر کے ثواب اور اجر سے محروم رہ جاتا ہے اور جمعہ کا ثواب اسے نہیں ملتا۔ ﴿ وهو يفسر ﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی متن والی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایات میں لفظ لغو کی وضاحت کرتی ہے کہ لغو کا کیا معنی ہے۔ ﴿ لغوت ﴾ یعنی تو نے لغو کام کیا اور بے فائدہ کام کا ارتکاب کیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ نمازیوں کو پورے سکون و اطمینان سے پورے انہماک اور توجہ سے بغور سننا چاہئے۔ کسی قسم کی ناروا حرکت نہیں کرنی چاہئے حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی بولنے اور گفتگو کرنے کی حماقت بھی کرتا ہے تو اسے بھی منع نہیں کرنا چاہئے۔ پورا دھیان خطبہ کے مضامین کی طرف ہو۔

(٣٦٤) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: دَخَلَ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ يَخْطُبُ، فَقَالَ: «صَلَّيْتَ»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «قُمْ فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جمعہ کے روز ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپؐ نے آنے والے سے دریافت فرمایا نماز پڑھی ہے؟ وہ بولا' نہیں۔ آپؐ نے فرمایا تو پھر اٹھ اور دو رکعت نماز ادا کر۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قم فصل ﴾ قم اور صل دونوں امر کے صیغے جس آدمی نے پہلے دو رکعت نماز نہ پڑھی ہو اسے دوران خطبہ بھی دو رکعت پڑھنی چاہئیں۔ یہ مستحب ہیں اور یہ حدیث اس کے استحباب پر دلیل ہے۔ یہ دونوں رکعتیں یا جمعہ سے پہلے کی ہیں یا پھر تحیۃ المسجد کی۔ اگر یہ تحیۃ المسجد کی شمار ہوں تو پھر یہ دلیل ہے اس بات کی کہ تحیۃ المسجد کسی کے پہلے بیٹھ جانے سے فوت نہیں ہو جاتیں۔ اس لئے کہ آپؐ کا اس آدمی کو فرمانا کہ کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھو اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص مسجد میں آکر بیٹھ گیا تھا اور نماز نہیں پڑھی تھی۔

حاصل کلام: معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ کے دوران بھی دو رکعت نماز پڑھی جا سکتی ہے اور اس میں استماع خطبہ کے عام حکم کی تخصیص ہے۔ دوسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ جمعہ کے علاوہ بھی ضرورت کے وقت بات چیت کر سکتا ہے بلکہ نئے آنے والے کو دو رکعت نماز پڑھنے کی تلقین بھی کر سکتا ہے۔ احناف ان دو رکعتوں کے قائل نہیں۔ یہ حدیث ان کی تردید کرتی ہے۔

(٣٦٥) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِي صَلاَةِ الْجُمُعَةِ سُورَةَ الْجُمُعَةِ وَالْمُنَافِقِينَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عموماً جمعہ کی نماز میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقین پڑھا کرتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ كَانَ يَقْرَأُ فِيْ الْعِيْدَيْنِ وَفِيْ الْجُمُعَةِ «بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الأَعْلَى» «وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ».

اور مسلم ہی کی روایت میں' جس کے راوی نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہیں آپؐ نماز عیدین اور جمعہ کی نماز میں سبح اسم ربک الاعلی (سورۃ اعلیٰ) اور وھل اتاک حدیث الغاشیۃ (سورۂ غاشیہ) پڑھتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بعض نمازوں میں آپؐ بالعموم مخصوص سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے اسوۂ کی پیروی میں وہی سورتیں انہیں نمازوں میں پڑھنی چاہئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سورتوں کے علاوہ دوسری سورتیں پڑھنی ممنوع ہیں۔ مذکورہ بالا سورتوں کا نماز عیدین اور جمعہ میں پڑھا جانا اپنے اندر بہت سی حکمتیں پنہاں رکھتا ہے۔ ان سورتوں میں سے سورۂ جمعہ کا پڑھنا یہ حکمت رکھتا ہے کہ اس میں نماز جمعہ کیلئے آنے کی سعی و کوشش کرنے کی ترغیب ہے جو جمعہ کی اہمیت پر دلالت ہے۔ نماز جمعہ میں مخلص مسلمانوں کے ساتھ منافقین بھی آتے تھے اس لئے ان کی گوشمالی کیلئے سورۂ منافقین پڑھتے تھے کہ ان کی ڈانٹ ڈپٹ ہو۔ نیز سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ میں احوال و اموال آخرت بکثرت بیان ہوئے ہیں۔ آخرت کی یاددہانی تازہ کرنے کیلئے پڑھتے تھے۔ سورۂ جمعہ میں نبوت کی فضیلت اور اس کی چار حکمتیں بھی مذکور ہیں اور امت پر حضور ﷺ کے احسان کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔ نیز ذکر الٰہی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور اور سورۂ منافقین میں نفاق پر زجر و توبیخ کے ساتھ صدقہ و خیرات کرنے کی طرف راغب کیا گیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ۔ انصار میں سے تھے۔ ہجرت کے ۱۴ ویں مہینے انصار میں پیدا ہونے والا پہلا بچہ۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ پھر ان کو کوفہ کا والی بنایا گیا اس کے بعد حمص کا۔ ۶۴ھ راھط کے دن خالد بن خلی کلاعی نے ان کو قتل کر کے منصب شہادت پر فائز کیا۔

(٣٦٦) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ الْعِيْدَ، ثُمَّ رَخَّصَ فِيْ الْجُمُعَةِ، فَقَالَ: «مَنْ شَآءَ أَنْ يُصَلِّيَ فَلْيُصَلِّ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نماز عید پڑھی اور جمعہ کے بارے میں رخصت و اجازت دے دی اور فرمایا ''جو پڑھنا چاہے پڑھ لے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ بجز ترمذی کے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی دن میں جمعہ اور عید آجائیں تو آپؐ نے نماز عید ادا فرمائی اور جمعہ کو ہر آدمی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ ابوداؤد میں حضرت ابوھریرہ ﷺ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''اس دن دو عیدوں کا اجتماع ہوگیا ہے پس جو چاہے عید کی نماز کو کافی سمجھ لے البتہ ہم جمعہ ضرور ادا کریں گے۔'' اس میں یہ دلیل ہے کہ اگر عید کے روز جمعہ ہو تو عید پڑھنے کے بعد جمعہ ادا کرنا فرض نہیں رہتا بلکہ ظہر کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ مگر احناف اس کے قائل نہیں۔ نیز عوام

کالانعام کا یہ تصور کہ عید اور جمعہ اکٹھے ایک ہی دن آجائیں تو برسر اقتدار حکومت کا زوال ہوتا ہے تو یہ سراسر وہم پر مبنی ہے۔ آپؐ نے تو اسے دو عیدوں کا دن قرار دیا ہے مگر بے خبری میں عوام اس سے بدشگونی لیتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔

(٣٦٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمُ الجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا أَرْبَعاً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی جمعہ پڑھے تو اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بلکہ اکثر علماء رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کے بعد آپ ﷺ دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اس سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ گھر پر جمعہ کے بعد دو اور مسجد میں چار رکعتیں پڑھی جائیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی یوں ہی کرتے تھے۔ احناف جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کے قائل ہیں مگر کسی بھی صحیح مرفوع روایت سے یہ ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔

(٣٦٨) وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ أَنَّ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ لَهُ: إِذَا صَلَّيْتَ الجُمُعَةَ فَلاَ تَصِلْهَا بِصَلاَةٍ حَتَّى تَتَكَلَّمَ أَوْ تَخْرُجَ، فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَمَرَنَا بِذَلِكَ: أَنْ لاَ نُوصِلَ صَلاَةً بِصَلاَةٍ حَتَّى نَتَكَلَّمَ أَوْ نَخْرُجَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سائب بن یزید رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تم نماز جمعہ پڑھو تو پھر دوسری کوئی نماز اس کے ساتھ نہ ملاؤ تاوقتیکہ تم سے کوئی بات کر لے یا وہاں سے نکل جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی طرح حکم دیا تھا کہ ہم نماز جمعہ کے ساتھ دوسری نماز نہ ملائیں تاوقتیکہ ہم کوئی بات نہ کرلیں یا وہاں سے نکل جائیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: "فلا تصلها" "وصل" سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب یضرب ہے۔ نہ ملا اس کے ساتھ فرض جمعہ کے ساتھ۔ "تخرج" نکل جا۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ مسجد سے باہر نکل جا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں فرض نماز ادا کی ہے اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کے بعد اسی جگہ فوراً کھڑے ہو کر سنتیں نہیں پڑھنی چاہئے۔ یہ حکم صرف جمعہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر نماز کے نفل اور فرض میں فرق بذریعۂ انتقال جگہ یا گفتگو کر لینی چاہئے۔ تاکہ نفل کا فرض پر اشتباہ نہ ہو۔ نبی ﷺ نوافل و سنن بالعموم گھر پر ادا فرمایا کرتے تھے اور بہتر بھی یہی ہے۔ نوافل و فرائض ایک ہی جگہ نہ پڑھنے کی حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مختلف جگہوں پر نماز پڑھنا نامۂ اعمال میں درج ہو جائے اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے۔

راوی حدیث: ﴿ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت مشہور قول کے مطابق ابویزید کندی ہے۔ ۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے باپ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ ۸۰ھ میں فوت ہوئے۔

(٣٦٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنِ اغْتَسَلَ، ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ، فَصَلَّى مَا قُدِّرَ لَهُ، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتَّى يَفْرُغَ الإِمَامُ مِنْ خُطْبَتِهِ، ثُمَّ يُصَلِّي مَعَهُ، غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الأُخْرَى، وَفَضْلُ ثَلاَثَةِ أَيَّامٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو آدمی غسل کر کے جمعہ کیلئے آئے پھر نماز پڑھے جتنی اس کیلئے مقدر ہو۔ پھر خاموشی سے اس وقت تک بیٹھا رہے کہ امام خطبہ جمعہ سے فارغ ہو پھر امام کے ساتھ فرض نماز ادا کرے تو اس کے دونوں جمعوں کے درمیان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے بلکہ مزید تین دن کے اور بھی۔" (مسلم)

لغوی تشریح: "ما قدر لہ" تقدیر سے ماخوذ ہے۔ صیغۂ مجہول ہے یعنی نماز پڑھے جتنی اللہ اسے توفیق دے اور اس کے مقدر میں ہو۔ "انصت" فعل ماضی۔ خاموش رہا۔ جمہور کے نزدیک صغائر گناہوں کی بخشش مراد ہے کیونکہ کبائر توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز جمعہ کی بڑی ترغیب ہے۔ جو شخص غسل کر کے آئے خطیب کے آنے سے پہلے ذکر و عبادت میں مصروف رہے۔ امام خطبہ شروع کرے تو خاموشی سے خطبہ سنے اور نماز جمعہ پڑھے تو اس کے جمعہ سے جمعہ تک کے تمام صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

(٣٧٠) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ ذَكَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَقَالَ: «فِيهِ سَاعَةٌ لاَ يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي يَسْأَلُ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ شَيْئاً، إِلاَّ أَعْطَاهُ إِيَّاهُ». وَأَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «وَهِيَ سَاعَةٌ خَفِيفَةٌ».

یہ حدیث بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز جمعہ کا ذکر فرمایا کہ اس میں ایک ایسی گھڑی ہے جو بندۂ مسلم اس گھڑی میں نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عنائت فرماتا ہے اور آپ ؐ نے اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا کہ وہ وقت بہت تھوڑا سا ہے۔" (بخاری و مسلم)
اور مسلم کی مروی روایت میں ہے کہ وہ وقت خفیف سا ہوتا ہے

لغوی تشریح: "یقللھا" تقلیل سے ماخوذ ہے۔ قلت وقت کی جانب اشارہ فرما رہے تھے "خفیفہ" کے معنی بھی قلیل، تھوڑا سا۔ وہ گھڑی بہت ہی مختصر سی ہے جس میں دعا کی قبولیت ہوتی ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے روز ایک مخصوص وقت ایسا ہے جس میں بندے کی ہر دعا (بجز قطع رحمی اور گناہ) شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی تعیین بیان نہیں فرمائی۔ اس گھڑی کو بھی شب قدر کی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا تاکہ لوگ اس کو تلاش کرنے میں اپنا زیادہ سے زیادہ قیمتی وقت صرف کریں۔ اس طرح ان کا شوق جستجو بڑھے اور ان کی نیکیوں میں اضافہ ہو۔

(۳۷۱) وَعَنْ أَبِيْ بُرْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ أَبِيْهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**هِيَ مَا بَيْنَ أَنْ يَجْلِسَ الْإِمَامُ إِلَى أَنْ تُقْضَى الصَّلَاةُ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَرَجَّحَ الدَّارَقُطْنِيُّ أَنَّه مِنْ قَوْلِ أَبِي بُرْدَةَ.

حضرت ابوبردہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے بیان کیا کہ ان کے والد نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "وہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت سے لے کر اختتام جماعت تک کے دوران میں ہے۔" (مسلم) اور دار قطنی نے تو اس کو ترجیح دی ہے کہ یہ ابوبردہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

وَفِيْ حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ سَلَامٍ عِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ، وَجَابِرٍ عِنْدَ أَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ: أَنَّهَا مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلَى غُرُوبِ الشَّمْسِ.

اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ نے اور جابر رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد اور نسائی نے روایت نقل کی ہے کہ وہ گھڑی نماز عصر سے غروب آفتاب تک کے درمیانی عرصہ میں ہے۔

وَقَدِ اخْتُلِفَ فِيْهَا عَلَى أَكْثَرَ مِنْ أَرْبَعِيْنَ قَوْلاً أَمْلَيْتُهَا فِي شَرْحِ الْبُخَارِيِّ.

اس میں مختلف علماء کے چالیس اقوال ہیں۔ میں نے ان سب کو فتح الباری شرح بخاری میں لکھ دیا ہے۔

لغوی تشریح : ﴿ ھی ﴾ اس سے مراد جمعہ کے روز ایسی گھڑی ہے جس میں دعائیں شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ ﴿ املیتھا ﴾ یہ سارے اقوال میں نے وہاں تحریر کر دیئے ہیں "املاء" دراصل اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی لکھوائے اور دوسرا اسے لکھے۔ اس گھڑی کے بارے میں دو اقوال زیادہ مشہور ہیں (۱) عصر سے لے کے غروب آفتاب تک کے وقت میں (۲) آغاز خطبہ سے اختتام نماز کے دوران وہ گھڑی ہو سکتی ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے قابل ترجیح کونسا قول ہے؟ بعض نے ان کے مابین بایں طور پر جمع و تطبیق کی بھی کوشش کی ہے کہ یہ گھڑی ان دو وقتوں میں باری باری منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جمع و تطبیق کی صورت میں یہ تطبیق سب سے اچھی ہے۔ لیکن جمع و تطبیق کی اس صورت میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ان اوقات میں تو نماز پڑھنا ممنوع ہے اور گذشتہ حدیث میں ﴿ وھو قائم یصلی ﴾ کے الفاظ ہیں کہ وہ اس وقت نماز پڑھ رہا ہو تو گویا اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کا انتظار کرنے

والا گویا نماز ہی میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

راوی حدیث : ﴿ ابوبردہ رحمۃ اللہ علیہ ﴾ عامر بن ابی موسیٰ اشعری۔ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث سنی۔ اسی برس سے زیادہ عمر پا کر ۱۰۴ھ میں فوت ہوئے۔ بردہ کا اعراب۔ "با" پر ضمہ اور "را" ساکن۔

﴿ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو یوسف ہے۔ علماء یہود میں سے بڑے معتبر عالم تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ بنو قینقاع سے تعلق تھا۔ مدینہ منورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ ان خوش بخت و خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنہیں دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی گئی۔ مدینہ منورہ میں ۴۳ھ میں وفات پا کر جنت میں آرام فرما رہے ہیں۔

(۳۷۲) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَضَتِ السُّنَّةُ أَنَّ فِي كُلِّ أَرْبَعِينَ فَصَاعِداً جُمُعَةً. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سنت طریقہ یہ جاری رہا ہے کہ چالیس یا اس سے کچھ اوپر کی تعداد پر جمعہ ہے۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف و کمزور سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ مضت السنۃ ﴾ سنت طریقہ جاری ہے نافذ چلا آرہا ہے۔ ﴿ فصاعدا ﴾ چالیس کی تعداد سے زائد ﴿ باسناد ضعیف ﴾ یہ سند اس لئے ضعیف ہے کہ اس میں ایک راوی عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن ضعیف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے مروی احادیث کے متعلق کہا ہے کہ ان پر لکیر پھیر دو۔ اس لئے کہ وہ جھوٹ کا پلندہ ہیں اور اس کی اپنی گھڑی ہوئی ہیں (موضوع ہیں) نسائی نے کہا ہے کہ یہ راوی ثقہ نہیں اور دارقطنی نے اسے منکر حدیث قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے کہا کہ اس کے ساتھ احتجاج ہی جائز نہیں۔ جب تجھے یہ معلوم ہوگیا تو جمعہ کیلئے کوئی متعین مقدار کی شرط لگانا ایسی حدیث کے ذریعہ جائز ہی نہیں۔

حاصل کلام : نماز جمعہ کیلئے نمازیوں کی تعداد کے بارے میں کسی صحیح حدیث میں کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے علماء کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ مثلاً کسی نے چار' کسی نے سات اور کسی کے نزدیک نو' بارہ اور کسی نے بیس اور چالیس اور پچاس اور ستر کی رائے دی ہے۔ ان میں سے کسی کی بنیاد و اساس مرفوع حدیث صحیح پر نہیں ہے۔ جماعت تو دو آدمی بھی کر سکتے ہیں چنانچہ آپ ؐ کا ارشاد ہے کہ سفر میں دو آدمی ہوں تو ایک اذان کہے اور جو زیادہ علم شریعت اور قرآن زیادہ جانتا ہو وہ جماعت کرائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز جمعہ کیلئے چالیس کی تعداد ہونا ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امام کے علاوہ دو مزید آدمیوں کا ہونا کافی ہے۔ البتہ وہ جمعہ کیلئے بڑے شہر کی شرط عائد کرتے ہیں جو قطعاً صحیح نہیں۔ اسلام میں پہلا جمعہ جواثی بستی میں ادا کیا گیا جو بڑے شہر کی تعریف سے خارج ہے۔

(۳۷۳) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ. رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ لَيِّنٍ.

ﷺ ہر جمعہ مومن مردوں اور عورتوں کیلئے بخشش کی دعا فرمایا کرتے تھے۔ (اسے بزار نے کمزور سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطیب کو جمعہ میں اپنے لئے اور دوسرے مسلمان مردوں اور عورتوں کیلئے دعاء مغفرت کرنا مسنون و مشروع ہے۔ اس کی سند میں یوسف بن خالد بستی ضعیف ہے جسے بعض نے کذاب بھی کہا ہے۔

(۳۷٤) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ فِيْ الْخُطْبَةِ يَقْرَأُ آيَاتٍ مِّنَ الْقُرْآنِ ، يُذَكِّرُ النَّاسَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ قرآن حمید کی چند آیات خطبہ جمعہ میں تلاوت فرما کر لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے۔ (ابوداؤد اور اس کی اصل مسلم میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ میں قرآن مجید کی آیات پڑھنی مسنون ہیں۔ خطیب کو ان آیات کے ذریعہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی ترغیب' اخلاق و کردار کی درستگی کی طرف توجہ دلانی چاہئے۔ جتنی اصلاح آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہؐ کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں موضوع احادیث' من گھڑت قصوں کہانیوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

(۳۷۵) وَعَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «الْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ، إِلاَّ أَرْبَعَةً: مَمْلُوكٌ، وَامْرَأَةٌ وصبيٌّ ومَرِيضٌ» رواه أبو داود وقال: لَمْ يَسْمَعْ طَارِقٌ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ، وَأَخْرَجَهُ الحَاكِمُ مِنْ رِوَايَةِ طَارِقٍ المَذْكُورِ عَن أَبِي مُوسَى.

حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جمعہ کو باجماعت ادا کرنا ہر مسلم پر واجب ہے مگر چار قسم کے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ غلام' عورت' بچہ اور مریض۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ طارق براہ راست نبی ﷺ سے سماع نہیں کرتا۔ طارق کی یہی روایت حاکم نے ابوموسیٰ کے حوالہ سے ذکر کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام' عورت' بچہ اور مریض پر جمعہ فرض نہیں۔ اگر پڑھ لیں تو پھر ان کو ظہر نہیں پڑھنا پڑے گی۔ ورنہ نماز ظہر ادا کریں گے۔

راوی حدیث: ﴿طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ﴾ یہ کوفہ کے باشندے تھے۔ قبیلہ بجیلہ سے تعلق تھا اس لئے کوفی اور بجلی کہلائے۔ نبی ﷺ کی زیارت ہوئی مگر آپؐ سے کچھ سنا نہیں' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے دور

خلافت میں ۳۳ یا ۳۴ غزوات میں شریک ہوئے۔ ۸۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے دونوں دور پائے۔ دور جاہلیت بھی اور دور اسلام بھی اس لئے ان کو مخضرم کہا جاتا ہے۔

(٣٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيْسَ عَلَى مُسَافِرٍ جُمُعَةٌ». رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی مسافر پر جمعہ نہیں۔" (طبرانی نے اسے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسافر پر بھی جمعہ فرض نہیں۔ یہ حدیث گو سنداً ضعیف ہے مگر اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوران حج جمعہ نہیں پڑھا۔ (سبل)

(٣٧٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا اسْتَوَى عَلَى الْمِنْبَرِ، اسْتَقْبَلْنَاهُ بِوُجُوهِنَا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثِ الْبَرَاءِ عِنْدَ ابْنِ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب منبر پر کھڑے ہو جاتے تو ہم اپنے رخ آپ کی طرف موڑ لیتے۔ (اسے ترمذی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔ اس کا شاھد ابن خزیمہ میں موجود ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے سامعین کو اپنا رخ خطیب کی طرف کرنا چاہئے۔ قبلہ کی طرف ضروری نہیں۔ اس مسئلہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اجماع ہے۔ (سبل) اس حدیث کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں محمد بن فضل بن عطیہ ایسا راوی ہے جسے متروک الحدیث قرار دیا گیا ہے مگر خود مصنف نے ذکر کیا ہے کہ اس کا شاہد موجود ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔

(٣٧٨) وَعَنِ الْحَكَمِ بْنِ حَزْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْنَا الْجُمُعَةَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَامَ مُتَوَكِّئاً عَلَى عَصاً أَوْ قَوْسٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت حکم بن حزن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' ہم نبی ﷺ کے ساتھ جمعہ میں حاضر تھے۔ آپؐ لاٹھی یا کمان کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے۔ (ابوداؤد)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے خطیب خطبہ جمعہ کے وقت کسی چیز کا سہارا لے سکتا ہے۔ یہ مستحب ہے۔ حکمت اس کی یہ ہے کہ بولنے والے کیلئے ڈھارس کا کام دیتا ہے۔ ہاتھ بے فائدہ حرکت کرنے سے بچے رہتے ہیں اور آدمی میں تھکاوٹ کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿حکم بن حزن رضی اللہ عنہ﴾ حکم میں "حا" اور "کاف" دونوں پر فتحہ۔ بن حزن "حا" پر فتحہ اور "زا" ساکن۔ ان کا پورا نام یہ ہے حکم بن حزن بن ابی وھب مخزومی۔ ان کے اسلام کے بارے میں

ایک قول یہ ہے کہ جنگ یمامہ سے پہلے اسلام قبول کیا اور صحیح یہ ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کی ہے۔

١٣ - بَابُ صَلاَةِ الخَوْفِ

نماز خوف کا بیان

(٣٧٩) عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ رحمه الله، عَمَّنْ صَلَّى مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَومَ ذَاتِ الرِّقَاعِ صَلاَةَ الخَوْفِ: أَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهُ، وَطَائِفَةً وِجَاهَ العَدُوِّ، فَصَلَّى بِالَّذِيْنَ مَعَهُ رَكْعَةً، ثُمَّ ثَبَتَ قَائِماً، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ انْصَرَفُوْا، فَصَفُّوا وِجَاهَ العَدُوِّ، وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الأُخرَى، فَصَلَّى بِهِمُ الرَّكْعَةَ الَّتِيْ بَقِيَتْ، ثُمَّ ثَبَتَ جَالِساً، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. وَوَقَعَ فِي المَعْرِفَةِ لابْنِ مندَه: عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ، عَنْ أَبِيْهِ.

حضرت صالح بن خوات رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص سے روایت کیا ہے جس نے ذات الرقاع کے دن نبی ﷺ کے ساتھ صلوٰۃ خوف پڑھی تھی۔ اس شخص نے بیان کیا کہ ایک گروہ نے آپ کے ساتھ نماز کیلئے صف بندی کی اور ایک دوسرا گروہ دشمن کے مقابلہ کیلئے اس کے روبرو صف بند ہوگیا۔ آپؐ نے ان لوگوں کو جو آپؐ کے ساتھ صف باندھ کر کھڑے تھے ایک رکعت پڑھائی اور آپؐ سیدھے کھڑے رہے اور انہوں نے اپنے طور پر باقی نماز مکمل کرلی اور چلے گئے۔ جا کر دشمن کے سامنے صف بند ہوگئے۔ پھر دوسرا گروہ آیا۔ آپؐ نے اسے باقی اپنی ایک رکعت پڑھائی اور بیٹھے رہے انہوں نے اس دوران میں اپنے طور پر نماز مکمل کرلی پھر آپؐ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ (بخاری و مسلم۔ مگر متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔ ابن مندہ کی "المعرفة" میں ہے کہ صالح بن خوات اپنے والد سے بیان کرتے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ باب صلاۃ الخوف ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ خوف کی حالت میں نماز پڑھنا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر کفار کے لشکر کے بالمقابل ہو۔ ہنوز باہمی جنگ و جدال شروع نہ ہوئی ہو۔ نیزے پھینکنے اور شمشیر زنی کی نوبت نہ آئی ہو۔ رہی یہ صورت کہ فریقین میں مڈبھیڑ ہو چکی ہو' بندوقوں کے منہ کھل گئے ہوں' توپوں کے دھانے گولوں کی آگ اپنے دھانوں سے اگل رہے ہوں۔ ٹینک گولے برسا رہے ہوں۔ جنگی طیاروں کے ذریعہ بم گرائے جا رہے ہوں۔ تو ایسے وقت میں مخصوص طریقہ

سے نماز ادا کرنا ضروری نہیں بلکہ اس وقت تو جس طرح ٹولیوں کی صورت میں یا تن تنہا جس طرح ممکن ہو کھڑے ہو کر' چلتے ہوئے اور سوار ہو کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ ﴿ عمن صلی الخ ﴾ جس نے آپؐ کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس سے کون شخص مراد ہے۔ مسلم کی روایت میں تو سھل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ کا نام آیا ہے اور یہ بھی قول ہے کہ راوی کا باپ خوات رضی اللہ عنہ ہی مراد ہے جیسا کہ مصنف نے ابن مندہ کے حوالہ سے حدیث کے آخر میں نقل کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس وقت سھل ابھی بچہ ہی تھا۔ غزوات میں شریک ہونے کے قابل ہی نہیں تھا۔ ﴿ ذات الرقاع ﴾ "راء" کے نیچے کسرہ اور قاف مخفف۔ ﴿ نجد ﴾ میں غطفان کے علاقہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ غزوۂ جیسا کہ صحیح روایت میں مذکور ہے ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد واقع ہوا ہے۔ اس کو ذات الرقاع کہنے کی وجہ ایک قول کے مطابق یہ تھی کہ مسلمان مجاہدین کے پاؤں ننگے ہونے کی وجہ سے زخمی ہوگئے تھے۔ انہوں نے جوتوں کی جگہ پاؤں پر پٹیاں باندھ لی تھیں۔ ﴿ وجاہ العدو ﴾ "واؤ" کے نیچے کسرہ۔ دشمن کے روبرو' بالمقابل۔ دشمن کے سامنے۔ واتمواو لانفسھم اپنے طور پر نماز پوری کی یعنی دوسری رکعت پوری کر کے سلام پھیرا۔

حاصل کلام: صلاۃ خوف کئی طریقہ سے پڑھی گئی ہے جیسا موقع محل ہوتا تھا اس کی مناسبت سے نماز ادا کی گئی۔ مذکورہ بالا حدیث میں وہی صورت ذکر ہوئی ہے جسے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے یعنی امام نے ہر ایک گروہ کو ایک ایک رکعت پڑھائی اور ایک' ایک رکعت انہوں نے اپنے طور پر پڑھی۔ پہلے گروہ نے تو خود سلام پھیرا مگر دوسرے گروہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ' امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور کے نزدیک خوف کی صورت میں سفر و حضر دونوں میں نماز خوف پڑھنا جائز ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ صلاۃ خوف کیلئے سفر کی شرط لگاتے ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت "اذا ضربتم فی الارض ......الایہ" میں دو شرطیں ہیں۔ ایک سفر اور دوسری خوف دشمن۔ مگر جمہور کا مسلک یہ ہے کہ نماز خوف اور نماز قصر دونوں الگ الگ نمازیں ہیں۔ سفر میں قصر کیلئے خوف دشمن کی شرط نہیں اور صلاۃ خوف کیلئے سفر کی شرط نہیں۔ دونوں نمازوں کے ساتھ کوئی شرط لگانا بے معنی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ صالح بن خوات ﴾ خوات بن جبیر بن نعمان انصاری مدنی۔ "خا" پر فتحہ اور واو پر فتحہ اور تشدید۔ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ بہت سے صحابہ کرامؓ سے حدیث سنی ہے۔ یہ حدیث انہوں نے یا تو حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ صحابیؓ سے سنی ہے یا پھر اپنے والد سے۔ جس طرح اسی حدیث کے آخر سے واضح ہو رہا ہے۔

﴿ خوات رضی اللہ عنہ ﴾ جلیل القدر صحابی ہیں۔ پہلا غزوۂ جس میں یہ شریک ہوئے غزوۂ احد ہے اور ایک قول کے مطابق غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے۔ ۴۰ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ یا ۷۱ سال کی تھی۔

(۳۸۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نجد کی

تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ قِبَلَ نَجْدٍ فَوَازَيْنَا العَدُوَّ، فَصَافَفْنَاهُمْ، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَصَلَّى بِنَا، فَقَامَتْ طَائِفَةٌ مَّعَهُ، وَأَقْبَلَتْ طَائِفَةٌ عَلَى العَدُوِّ، وَرَكَعَ بِمَنْ مَّعَهُ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ انْصَرَفُوا مَكَانَ الطَّائِفَةِ الَّتِي لَمْ تُصَلِّ، فَجَاءُوْا، فَرَكَعَ بِهِمْ رَكْعَةً، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ، فَرَكَعَ لِنَفْسِهِ رَكْعَةً وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

طرف نبی ﷺ کی معیت میں کسی غزوہ میں گیا۔ ہم دشمن کے بالکل مقابل صف بستہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور ہمیں نماز پڑھائی۔ ایک جماعت نماز ادا کرنے آپؐ کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور ایک جماعت دشمن کے سامنے صفیں باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ جو جماعت آپؐ کے ساتھ نماز میں شریک تھی اس نے آپؐ کے ساتھ ایک رکوع اور دو سجدے کئے اور ان گروہ کی جگہ واپس چلی گئی جس نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تھی۔ اس جماعت کے افراد آئے آپؐ نے ان کو بھی ایک رکعت پڑھائی دو سجدوں کے ساتھ۔ پھر آپؐ نے سلام پھیر دیا مگر دونوں گروہوں نے اٹھ کر الگ الگ اپنی رکعت پوری کی۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ قبل ﴾ قاف کے کسرہ اور فتحہ دونوں سے۔ طرف' جہت کے معنی میں۔ ﴿ نجد ﴾ بلاد عرب کی سطح مرتفع جو حجاز کے مشرق میں واقع ہے۔ ﴿ فوازینا ﴾ مقابلہ پر آئے۔ بالمقابل ﴿ فصاففنا ﴾ صف بندی کی ہم نے۔ ہم دو صفوں میں کھڑے ہوئے اور یہ موقع نماز عصر کا تھا ﴿ ثم انصرفوا ......الخ ﴾ پہلی رکعت مکمل کر کے واپس چلے گئے۔ ابھی دوسری رکعت نہیں پڑھی تھی اور سلام بھی نہیں پھیرا تھا اور اس وقت نبی ﷺ سیدھے کھڑے رہے ﴿ فجاووا ﴾ اس گروہ کے لوگ آئے جو پہرہ دے رہے تھے دشمن کے سامنے یا حفاظت کر رہے تھے ﴿ ثم سلم ﴾ پھر نبی ﷺ نے تنہا سلام پھیرا۔ ﴿ فقام کل واحد ....الخ ﴾ ہر گروہ الگ الگ اٹھا۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی بقیہ رکعت ایک دوسرے کے بعد پوری کی اور ابوداؤد میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ نے پہلے پوری دونوں رکعتوں کو ملا کر اکٹھے پڑھ لیا۔ پھر پہلے گروہ کی جگہ پر چلا گیا اور پہلا واپس آیا اور اس نے ایک رکعت مزید پڑھ کر سلام پھیرا اس طرح اس کی بھی نماز کی دو رکعتیں پوری ہوگئیں۔

حاصل کلام: امام احمد رحمہ اللہ کے بقول نماز خوف کے سلسلہ میں چھ یا سات صحیح احادیث بھی ثابت ہیں۔ ان میں سے جس کے مطابق پڑھی جائے جائز ہے۔ کوئی مخصوص طریقہ نہیں۔ حالات کے مطابق جس طور

پر پڑھنا ممکن ہو پڑھ لی جائے۔ اس نماز کے مسنون و مشروع ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے نیل الاوطار میں اور صاحب زاد المعاد نے بھی اس نماز کی چھ یہی کیفیتیں بیان کی ہیں اور جن حضرات نے اس سے زیادہ کی ذکر کی ہیں۔ انہوں نے جہاں کہیں بیان واقعہ میں اختلاف دیکھا اسے الگ شمار کر لیا۔ حقیقت میں وہ الگ نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کو قابل اعتماد قرار دیا ہے۔

(٣٨١) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ صَلاَةَ الخَوْفِ، فَصَفَفْنَا صَفَّيْنِ، صَفٌّ خَلْفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَالعَدُوُّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ القِبْلَةِ، فَكَبَّرَ النَّبِيُّ ﷺ، وَكَبَّرْنَا جَمِيعاً، ثُمَّ رَكَعَ، وَرَكَعْنَا جَمِيعاً، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَرَفَعْنَا جَمِيعاً، ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُودِ، وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيْهِ، وَقَامَ الصَّفُّ المُؤَخَّرُ فِي نَحْرِ العَدُوِّ، فَلَمَّا قَضَى السُّجُودَ قَامَ الصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ، فَذَكَرَ الحَدِيْثَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز خوف میں حاضر تھا۔ ہم نے دو صفیں بنائیں ایک صف رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑی ہوئی جبکہ دشمن ہمارے اور قبلہ کے درمیان میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور ہم سب نے بھی اللہ اکبر کہا۔ پھر آپؐ نے رکوع کیا اور ہم سب نے بھی رکوع کیا۔ پھر آپؐ نے رکوع سے سر اوپر اٹھایا اور ہم سب نے بھی اپنے سر اٹھائے پھر آپؐ سجدے میں گر گئے اور آپؐ کے ساتھ والی صف بھی اور دوسری صف دشمن کے مقابلے کیلئے کھڑی رہی۔ جب آپؐ نے سجدہ پورا کر لیا تو وہ صف جو آپؐ کے قریب تھی کھڑی ہو گئی۔ پھر راوی نے ساری حدیث بیان کی۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ: ثُمَّ سَجَدَ، وَسَجَدَ مَعَهُ الصَّفُّ الأَوَّلُ، فَلَمَّا قَامُوْا سَجَدَ الصَّفُّ الثَّانِيْ، ثُمَّ تَأَخَّرَ الصَّفُّ الأَوَّلُ، وَتَقَدَّمَ الصَّفُّ الثَّانِيْ، وَذَكَرَ مِثْلَهُ، وَفِي آخِرِهِ: ثُمَّ سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ، وَسَلَّمْنَا جَمِيعاً.

ایک روایت میں ہے کہ پھر آپؐ نے سجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ پہلی صف نے بھی سجدہ کیا اور جب یہ سب کھڑے ہو گئے تو دوسری صف سجدے میں چلی گئی اور پھر پہلی صف پیچھے ہٹ گئی اور دوسری صف آگے آ گئی اور پہلے کی طرح ہی ذکر کیا اور آخر پر نبی ﷺ نے سلام پھیرا اور ہم سب نے بھی سلام پھیر دیا۔ (مسلم)

رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أَبِي عَيَّاشٍ الزُّرَقِيِّ مِثْلُهُ، وَزَادَ: إِنَّهَا كَانَتْ بِعُسْفَانَ.

اور ابوداؤد نے ابوعیاش زرقی سے اس طرح روایت نقل کی ہے لیکن اس میں یہ اضافہ ہے کہ "وہ عسفان مقام پر (ادا کی گئی) تھی۔"

وَلِلنَّسَائِيِّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنْ جَابِرٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِطَائِفَةٍ مِّنْ أَصْحَابِهِ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ صَلَّى بِآخَرِينَ أَيْضاً رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ. وَمِثْلُهُ لِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي بَكْرَةَ.

اور نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر دیا پھر ایک دوسرے گروہ کو اسی طرح دو رکعات پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ ابوداؤد میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی ایک روایت ہے۔

لغوی تشریح: ﴿صف خلف رسول الله ﷺ﴾ یعنی اس صف کے پیچھے ایک دوسری صف مراد ہے۔ ﴿ثم انحدر﴾ پھر جھکے سجدہ کرنے کیلئے۔ ﴿والصف الذی یلیه﴾ پھر وہ صف سجدہ کیلئے جھکی جو آپؐ کے قریب تھی اور پہلی تھی ﴿فی نحر العدو﴾ دشمن کے مقابل میں کھڑی ہو گئی۔ ہر چیز کا اول حصہ اس کا نحر کہلاتا ہے یہ دشمن جہینہ قبیلہ کے افراد تھے ﴿فلما قضی السجود﴾ جب سجدہ پورا کر لیا اور صحیح طور پر ادا کر لیا ﴿فذکر﴾ راوی حدیث نے ذکر کیا۔ ﴿الحدیث﴾ ذکر کا مفعول ہے یعنی ساری حدیث بیان کی اور اس میں ہے کہ دوسری صف سجدے میں گر گئی۔ ﴿بعسفان﴾ عسفان بروزن عثمان۔ غزوۂ عسفان ۶ھ میں عمرہ حدیبیہ کے موقع پر واقع ہوا اس میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ مشرکین نے یہ کوشش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکیں۔ چنانچہ انہوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دو سو گھوڑ سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ مکہ کے راستہ میں حائل ہوگیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو نماز ظہر میں دیکھا تو سوچا کہ اب مسلمان اس وقت بے خبری کے عالم میں ہیں۔ کاش! ہم ان پر حملہ آور ہوئے تو کامیاب ہو کر ان کو قتل کر سکتے ہیں پھر نماز عصر میں بھی ہجوم برقرار رہا تو اللہ تعالیٰ نے نماز خوف کا حکم نازل فرمایا اور یوں خالد بن ولید کو حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا راستہ ہی تبدیل کر لیا اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ اس مقام پر صلح ہوئی۔ جسے صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ پس عسفان وہ پہلا غزوۂ ہے جہاں نماز خوف پڑھی گئی اور پہلی نماز جو اس جگہ نماز خوف کی صورت میں ادا کی گئی وہ نماز عصر تھی جس کا مذکورہ بالا حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ ﴿من وجه آخر﴾ دوسری سند سے ﴿صلی بطائفة﴾ یعنی ایک جماعت نے فرض ادا کئے اور دوسری نے نفل۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مفترض کے پیچھے متنفل کی نماز جائز ہے اور یہ نماز مذکورہ نماز کے علاوہ دوسری نماز ہے۔ یہ نماز تو عسفان کے موقع پر پڑھی گئی اور یہ بطن نخلہ میں۔ نماز خوف کی صورتیں احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہیں۔ خوف کے موقع پر ان انواع میں سے جس نوعیت کی نماز پڑھے' جائز ہوگی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز خوف کی ایک اور صورت ہے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ نماز خوف اقوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف طریقوں سے پڑھی گئی ہے۔ نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے دونوں جماعتوں کو الگ الگ دو' دو رکعتیں پڑھائیں۔ اس

طرح آنجناب ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں۔ تو گویا آپؐ نے دو تو فرض پڑھے اور دو نفل ہوں گے۔ کیونکہ دو مرتبہ دو' دو فرض تو نہیں ہوتے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے مقتدی فرض پڑھ سکتے ہیں۔ احناف نے اس مقام پر انصاف سے کام نہیں لیا بجائے اس کے قیاس کو چھوڑ کر حدیث صحیح کا اتباع کرتے بلکہ طحاوی ایسے صاحب علم و فضل نے تو الٹا اس حدیث کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ حالانکہ اس کے منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابو عیاش زرقی﴾ ان کا نام زید بن ثابت ہے انصاری زرقی مشہور ہیں۔ زرقی کے "زا" پر ضمہ اور "را" پر فتحہ ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ ۴۰ھ کے بعد وفات پائی۔

(٣٨٢) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى صَلَاةَ الْخَوْفِ بِهٰؤُلَاءِ رَكْعَةً، وَهٰؤُلَآءِ رَكْعَةً، وَلَمْ يَقْضُوْا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَمِثْلُهُ عِنْدَ ابْنِ خُزَيْمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو بھی ایک رکعت پڑھائی اور ان کو بھی ایک ہی رکعت۔ انہوں نے نماز کو پورا نہیں کیا۔ (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن خزیمہ نے ابن عباس کے حوالہ سے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے)

حاصل کلام: یہ دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نماز خوف کم از کم ایک رکعت ہے۔ سلف میں سے ایک گروہ اس نظریئے کا قائل ہے۔ تابعین میں سے حسن بصری رحمہ اللہ' ضحاک رحمہ اللہ' ابن راھویہ رحمہ اللہ' عطاء رحمہ اللہ' طاؤس رحمہ اللہ اور مجاھد رحمہ اللہ' حکم بن عتیبہ رحمہ اللہ' قتادہ رحمہ اللہ اور ثوری رحمہ اللہ صحابہ کرام میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما' ابوھریرہ رضی اللہ عنہ' ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شدت خوف کے وقت اشاروں سے صرف ایک رکعت پڑھی جائے گی۔ ان کے نظریئے کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہوتی ہے۔ جسے مسلم اور ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبان مبارک پر حضر میں چار رکعتیں اور اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے وقت ایک رکعت فرض فرمائی ہے۔ مگر جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کہتے ہیں تعداد رکعات میں خوف کی کوئی تاثیر نہیں۔

ان حضرات نے پہلی احادیث کی بہت دور کی تاویلات کی ہیں مگر الفاظ حدیث ان کی تردید کرتے ہیں۔ جمہور کہتے ہیں جس حدیث میں ایک رکعت کا ذکر ہے اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے دونوں رکعتیں امام کے ساتھ پوری نہیں کیں' بلکہ ایک رکعت اکیلے اکیلے پڑھی اور دو پوری کر لیں۔

(٣٨٣) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلَاةُ الْخَوْفِ رَكْعَةٌ عَلَى أَيِّ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز خوف ایک رکعت ہی ہے جس طرح بھی ادا ہو جائے۔" (اسے بزار نے ضعیف

وَجْهٍ كَانَ». رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے بعض حضرات امام اور مقتدی دونوں کیلئے ایک ہی رکعت کے قائل ہیں۔ چنانچہ سفیان اسی کے قائل ہیں۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمٰن الیمانی راوی سخت ضعیف ہے۔ اس حدیث میں "جس طرح بھی ادا ہو جائے گی" سے مراد ہے قبلہ رخ ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ سوار ہو یا پیدل۔

(٣٨٤) وَعَنْهُ مَرْفُوعاً: لَيْسَ فِي صَلاَةِ الْخَوْفِ سَهْوٌ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ نماز خوف میں سجدۂ سہو نہیں۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باسناد ضعیف﴾ ضعیف سند کے ساتھ کیونکہ یہ روایت عبدالحمید بن السری سے مروی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ امیر الیمانی نے ذکر کیا ہے کہ علماء میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ (السبل)

١٤ - بَابُ صَلاَةِ الْعِيدَيْنِ — نماز عیدین کا بیان

(٣٨٥) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْفِطْرُ يَوْمَ يُفْطِرُ النَّاسُ، وَالأَضْحَى يَوْمَ يُضَحِّي النَّاسُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس روز لوگ روزے پورے کر کے آخری افطار کرتے ہیں' اس دن عید ہے اور عید الاضحیٰ اس روز ہے جس دن لوگ قربانیاں کرتے ہیں۔" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة العیدین﴾ عیدین سے مراد عید قربان اور عید فطر ہے۔ عید عربوں کے ہاں اظہار مسرت کیلئے ہر موسمی اجتماع کو کہتے ہیں۔ عید اسے اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ہر سال کے بعد واپس لوٹ کر آتی ہے اور بار بار آتی رہتی ہے یا پھر یہ معنی ہیں کہ اس کے واپس آنے کی وجہ سے مسرت و سرور لوٹ آتا ہے۔ دراصل عید' عود سے ماخوذ ہے۔ عید کے عین کے نیچے کسرہ اور "یا" ساکن ہے واؤ کو "یا" میں تبدل کر دیا گیا "یا" کے ساکن ہونے کی وجہ سے اس کے ماقبل کسرہ واقع ہے (تو ایسی "یا" کو "واؤ" میں بدل دیتے ہیں) عید کی جمع اعیاد ہے "یا" کے ساتھ یہ اس لئے کہ اعواد جس کا معنی خشک لکڑیاں ہوتا ہے کے اور اعیاد کے درمیان فرق واقع ہو جائے (اور لوگوں کے ذہن نشین بھی رہے) عیدالفطر کا آغاز ۲ھ میں ہوا اور عیدالاضحیٰ جیسا کہ ایک قول ہے کہ اس کی ابتدا بھی ۲ھ میں ہوئی۔ ترمذی اور مسند احمد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دس سال قیام فرمایا۔ قربانی کرتے رہے۔ یہ حدیث تو اس کی مقتضی ہے کہ قربانی کا آغاز ہجرت کے پہلے سال سے ہی ہوا ہے لیکن

اس کا بھی احتمال ہے کہ لفظ عشر بطور غلبہ بولا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ﴿ یفطر الناس ﴾ افطار سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے یہاں عیدالفطر کو بطور عید بتانا مقصود ہے۔ ﴿ یضحی الناس ﴾ یضحی تضحیۃ سے ماخوذ ہے اور یہ دراصل قربانی کے جانور کے ذبح کرنے کو کہتے ہیں اور پھر یوم اضحی (قربانی کا دن) کو عید بتانے کیلئے بغیر کسی شرط کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ وہ دن ہوں گے جن میں لوگ یہ دونوں عیدیں منائیں گے۔ بالفاظ دیگر معنی یہ ہوئے کہ اگر لوگ چاند دیکھنے میں غلطی یا خطا کر جائیں تو پھر رمضان اور ذوالقعدہ دونوں کی تعداد تیس دن مکمل کر لیں۔ پھر عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کیلئے باہر نکلیں اور مناسک حج بھی انہی تین دنوں کے حساب سے ادا کریں۔ اس کے بعد اگر ان کے سامنے یہ واضح اور ثابت ہو جائے کہ انہوں نے چاند دیکھنے میں غلطی کی اور خطا کھائی ہے اور مہینہ اگرچہ ۲۹ روز کا پورا ہوگیا ہو تو ایسی صورت میں ان پر کوئی گناہ اور عتاب نہیں ہے بلکہ وہ صحیح ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ ہو چکا۔ یہ تو محض اللہ سبحانہ تعالیٰ کی جناب سے اپنے بندوں کیلئے تخفیف اور نرمی ہے اور یہ بھی قول ہے کہ اگر کسی شخص واحد نے اپنے طور پر عید کا چاند دیکھ لیا تو قاضی صرف اس ایک کی شہادت پر فیصلہ نہیں کرے گا لہٰذا تنہا یہ آدمی اپنی رؤیت کے یقینی ہونے کی بنیاد پر کوئی عمل نہیں کرے گا نہ وہ روزہ رکھے گا اور نہ افطار کرے گا اور نہ قربانی کرے گا۔ بلکہ ان تمام امور میں وہ عام لوگوں کے ساتھ ہی رہے گا یا پھر غالب اکثریت کے ساتھ رہے گا۔ مگر جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں جس پر اسے ذاتی طور پر یقین ہو اس کے مطابق وہ اس بارے میں فیصلہ کرے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اہل اسلام کی صرف دو ہی عیدیں ہیں۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ ان دونوں کے علاوہ تیسری یا چوتھی کسی عید کا تصور اور نشان اسلام میں کہیں دور دور تک بھی نہیں پایا جاتا۔ بعض مسلمانوں نے جو اور عیدیں منانا شروع کر رکھی ہیں ان کی شریعت اسلامیہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عیدیں اجتماعیت کا سبق دیتی ہیں۔ اسلامی عبادات میں اجتماعیت کا تصور ہے۔ تنہا ایک آدمی چاند دیکھ کر کوئی عید اپنے طور پر نہیں منا سکتا۔ بلکہ اسے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ ادا کرنے میں لوگوں کی غالب اکثریت کی موافقت کرنی چاہئے اور اگر اسے یقین کامل ہو جائے تو پھر بھی عیدین کی نماز عام لوگوں کے ساتھ ہی ادا کرے گا البتہ روزہ افطار کر سکتا ہے۔

(۳۸۶) وَعَنْ أَبِي عُمَيْرِ بْنِ أَنَسٍ، عَنْ عُمُومَةٍ لَهُ مِنَ الصَّحَابَةِ، أَنَّ رَكْباً جَاءُوا، فَشَهِدُوْا أَنَّهُمْ رَأَوْا الهِلاَلَ بِالأَمْسِ، فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يُفْطِرُوْا، وَإِذَا أَصْبَحُوا أَنْ يَغْدُوا إِلَى مُصَلاَّهُمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَهَذَا

حضرت ابو عمیر بن انس رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک چچا صحابیؓ سے روایت کیا ہے کہ چند سوار آپؐ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے شہادت دی کہ انہوں نے کل شام چاند دیکھا تھا۔ آپؐ نے حکم دے دیا کہ "روزہ افطار کر دو اور کل صبح نماز عید کیلئے عید گاہ میں آجاؤ۔" (اسے احمد' ابوداؤد نے روایت کیا ہے یہ الفاظ

لَفْظُهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ. ابو داؤد کے ہیں اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عمومة ﴾ عم کی جمع ہے۔ جس کے معنی چچا کے ہیں ﴿ من الصحابة ﴾ صحابہ میں سے۔ یہ عمومۃ کی صفت واقع ہو رہا ہے یعنی یہ چچا صحابی تھے۔ یہ حدیث متصل ہے اس کی سند میں کسی قسم کا ضعف نہیں۔ صحابی کا نام نہ لینا نقصان دہ نہیں۔ ﴿ ركبا ﴾ "را" پر فتحہ اور کاف ساکن' راکب کی جمع ہے سواروں کی جماعت ﴿ يغدوا ﴾ "یا" پر فتحہ' صبح چلیں دن کے اول حصہ میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ۲۹ رمضان کو ایسی جگہ چاند نظر آجائے جہاں کا مطلع مختلف نہ ہو تو دوسرے روز صحیح قابل اعتبار ذرائع سے اطلاع ملنے پر روزہ اسی وقت افطار کر دیا جائے گا۔ اگر قبل از زوال خبر ملی تو اسی روز نماز عید بھی ادا کر لی جائے ورنہ دوسرے روز عید کی نماز ادا کی جائے گی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز عید عید گاہ میں پڑھنی چاہئے اور اجتماعی طور پر پڑھنی چاہئے۔ اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ چاند کی رؤیت کا اعلان سرکاری طور پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اعلان جانی پہچانی شخصیت کے توسط سے کیا جانا چاہئے۔ فی زمانہ شہادتوں کے بعد ریڈیو' ٹی۔ وی سے اعلان کیا جا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو عمیر بن انس رحمہ اللہ ﴾ ان کا نام عبداللہ بن مالک الانصاری تھا۔ انس کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ صغار تابعین میں شمار ہوتا ہے' ثقہ تھے۔ چوتھے درجے کے راوی ہیں' اپنے باپ کے بعد کافی دیر زندہ رہے۔

(۳۸۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لاَ يَغْدُو يَومَ الفِطْرِ حَتَّى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ يأْكُلُهُنَّ وِتْرَاتٍ. أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ، وَفِي رِوَايَةٍ مُعَلَّقَةٍ - وَوَصَلَها أَحْمَدُ -: (وَيَأْكُلُهُنَّ إِفْرَاداً).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید فطر کیلئے نکلنے سے پہلے چند کھجوریں تناول فرمایا کرتے تھے اور طاق عدد میں کھجوریں کھایا کرتے تھے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور ایک معلق روایت میں بھی ایسا ہے) اور احمد نے موصول روایت میں ذکر کیا ہے کہ آپؐ ان کھجوروں کو ایک ایک کر کے تناول فرماتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) نماز عید کیلئے باہر جانا مسنون ہے۔ (۲) عیدالفطر کیلئے جانے سے پہلے کھجوریں طاق صورت میں کھانی مسنون ہیں۔ (۳) کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانا چاہئے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ زیادہ کھجوریں منہ میں ٹھونس لی جائیں یہ تو تہذیب و اخلاق کے منافی ہے۔ اگر کسی کو کھجوریں دستیاب نہ ہو سکیں تو پھر کوئی میٹھی چیز طاق صورت میں استعمال کر لینی چاہئے۔

کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی حریص و لالچی نہ بنے اور اللہ

تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور طاق ہی کو پسند کرتا ہے۔ طبی اعتبار سے بھی ایک ایک کو خوب اچھی طرح چبا چبا کر لعاب دہن شامل کر کے نگلتے' تا کہ نظام انہضام میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

(۳۸۸) وَعَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لاَ يَخْرُجُ يَوْمَ الفِطْرِ حَتَّى يَطْعَمَ، وَلاَ يَطْعَمُ يَوْمَ الأَضْحَى حَتَّى يُصَلِّيَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید فطر کیلئے کچھ نہ کچھ کھائے بغیر نہ نکلتے تھے البتہ عید قربان کے دن جب تک نماز ادا نہ فرما لیتے کچھ تناول نہ فرماتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ولا يطعم يوم الاضحى حتى يصلى ﴾ آپؐ عیدالاضحیٰ کو نماز سے پہلے کچھ نہیں کھاتے تھے۔ بیہقی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا کہ نماز سے فراغت کے بعد واپسی پر آپؐ اپنی قربانی کی کلیجی اور جگر وغیرہ تناول فرماتے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتاتی ہے کہ عید الفطر کے روز نماز سے پہلے کچھ کھانا اور عید قربان کے روز بغیر کچھ کھائے نماز ادا کرنا سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں کسی خاص چیز کی ہدایت نہیں ہے۔ البتہ کھجوروں' چھواروں کو مسنون سمجھ کر کھائے تو سونے پر سہاگہ ہے۔

(۳۸۹) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ العَوَاتِقَ والحُيَّضَ فِيْ العِيْدَيْنِ، يَشْهَدْنَ الخَيْرَ وَدَعْوَةَ المُسْلِمِيْنَ، وَتَعْتَزِلُ الحُيَّضُ المُصَلَّى. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جوان لڑکیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی عیدین میں ساتھ لے کر نکلیں تا کہ وہ بھی مسلمانوں کے امور خیر اور دعاؤں میں شریک ہوں۔ البتہ حائضہ عورتیں عید گاہ کے کنارے پر رہیں۔ (نماز میں شامل نہ ہوں صرف دعا میں شرکت کریں) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امرنا ﴾ صیغہ مجہول ہے۔ مجہول کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا کہ حکم دینے والے کا علم ہو سکے اور وہ رسول اللہ ﷺ ہی ہیں اور بخاری کی ایک روایت تو صاف طور پر امرنا نبينا کے الفاظ ہیں۔ یعنی ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا ﴿ "ان نخرج" ﴾ اخراج سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم انہیں لے کر عید گاہ کی طرف نکلیں۔ ﴿ العواتق ﴾ نوجوان بالغ لڑکیاں۔ جو بالغ ہونے کی عمر کے قریب پہنچ چکی ہوں اور یہ عاتق کی جمع ہے اور نخرج کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿ والحيض ﴾ "حا" پر ضمہ اور "یا" پر فتحہ اور تشدید' حائض کی جمع ہے۔ وہ عورتیں مراد ہیں جنہیں ایام حیض آ رہے ہوں۔

عواتق پر اس کا عطف ہے۔ ﴿ یشھدن الخیر ﴾ اس روز کی برکت اور بھلائی اور فضیلت میں حاضر ہو کر حصہ دار بنیں۔ ﴿ ودعوۃ المسلمین ﴾ دعوت کا یہاں معنی دعا کے ہیں کہ سب عورتیں مسلمانوں کی دعا میں شامل ہوں۔ ﴿ وتعتزل ﴾ الگ رہیں۔ جائے نماز سے۔

حاصل کلام: نماز عید کیلئے خواتین کا گھروں سے نکل کر جانا اس حدیث کی رو سے ثابت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خود اپنی ازواج مطہرات اور اپنی بیٹیوں کو عید گاہ میں لے جاتے تھے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ' عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ خواتین کا نماز عید میں حاضر ہونا واجب سمجھتے تھے۔

احناف نے اس حدیث کی تاویل کی ہے اور اسے ابتداء اسلام کا واقعہ بتایا ہے' تاکہ اہل اسلام کی تعداد زیادہ معلوم ہو اور کثرت تعداد اہل کفر و شرک کیلئے باعث اذیت ہو اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھے۔ مگر یہ تاویل جس پر علامہ طحاوی نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے' قابل لحاظ معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گواہی دیتے ہیں کہ ازواج مطہرات وغیرہ عید پڑھنے جاتی تھیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کم عمر کے تھے ظاہر ہے کہ ان کی یہ گواہی فتح مکہ کے بعد کی ہے جس وقت اظہار قوت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس لئے عورتوں کو عید گاہ میں بہرنوع حاضر ہونا چاہئے۔

(۳۹۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرَ يُصَلُّونَ العِيْدَيْنِ قَبْلَ الخُطْبَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ عیدین کی نماز خطبہ عیدین سے پہلے پڑھتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدین میں نماز پہلے ادا کی جائے اور خطبہ بعد میں۔ بنو امیہ کے دور میں مروان وہ پہلا حکمران ہے جس نے نماز سے پہلے خطبہ پڑھنے کی بدعت کا آغاز کیا۔ اسی وقت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اس پر احتجاج کیا اور برملا کہا کہ تو نے سنت کے خلاف کیا ہے۔ (صحیح مسلم)

(۳۹۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى يَوْمَ العِيْدِ رَكْعَتَيْنِ، لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهُما وَلاَ بَعْدَهُمَا. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے عید کے روز دو ہی رکعتیں ادا فرمائیں نہ پہلے کچھ پڑھا اور نہ بعد میں کوئی نماز پڑھی۔ (اسے ساتوں (احمد' بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے عید گاہ میں سوائے دو رکعت نماز کے اور کوئی نماز پہلے یا بعد پڑھنا حضور ﷺ سے ثابت نہیں۔ البتہ واپس جب گھر تشریف لاتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

(۳۹۲) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ نبی

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى العِيْد بِلاَ أَذَانٍ وَلاَ إِقَامَةٍ. أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَصْلُهُ فِي البُخَارِيِّ.

ﷺ نے نماز عید بلا اذان و اقامت ادا فرمائی۔ (اسے ابوداوٗد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز عید بغیر اذان و اقامت کے ادا کی جائے گی بلکہ عیدین کیلئے اذان و اقامت کو بدعت کہا گیا ہے۔ اذان اور اقامت کی قائم مقام کوئی دوسری صورت بھی غیر مسنون ہے۔

(۳۹۳) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لاَ يُصَلِّيْ قَبْلَ العِيْدِ شَيْئاً، فَإِذَا رَجَعَ إِلَى مَنْزِلِهِ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ البتہ جب واپس گھر تشریف لے آتے تو دو رکعت نماز نفل ادا فرماتے۔ (اسے ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدگاہ میں نہیں البتہ گھر میں دو رکعت نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

(۳۹٤) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْرُجُ يَوْمَ الفِطْرِ وَالأَضْحَى إِلَى المُصَلَّى، وَأَوَّلُ شَيْءٍ يَبْدَأُ بِهِ الصَّلاَةُ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُومُ مُقَابِلَ النَّاسِ - وَالنَّاسُ عَلَى صُفُوفِهِمْ - فَيَعِظُهُمْ وَيَأْمُرُهُمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عیدالفطر اور عید قربان کیلئے عیدگاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور پہلی چیز جس کا آپؐ آغاز فرماتے وہ نماز ہوتی۔ ادائیگی نماز کے بعد رخ پھیر کر لوگوں کی طرف کھڑے ہوتے لوگ اس وقت اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے اور آپؐ ان کو وعظ و نصیحت فرماتے اور نیکی کا حکم کرتے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) عیدین کی نماز سے پہلے کوئی عمل آپؐ سے ثابت نہیں۔ (۲) خطبہ نماز کے بعد ہونا چاہئے۔ (۳) خطیب کا رخ سامعین کی طرف ہونا چاہئے۔ (۴) خطبہ کھڑے ہو کر دینا چاہئے نیز خطیب کو اپنے خطاب میں وعظ و نصیحت کرنا چاہئے۔ ادھر ادھر کے بے فائدہ قصے کہانیاں بیان نہیں کرنے چاہئیں۔ (۵) سامعین کو اپنی صفوں میں بیٹھے رہنا چاہئے اور رخ امام کی جانب ہونا چاہئے۔ (٦) نماز عیدین مسجد میں نہیں بلکہ عیدگاہ میں پڑھنی مسنون ہے۔ آج کل بلاعذر مسجدوں میں پڑھنے کا عام رواج ہوگیا ہے جو بہرحال ختم ہونا چاہئے۔ (۷) حضور ﷺ نے نماز عید میں منبر استعمال نہیں فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سب سے پہلے مروان نے عیدگاہ میں منبر رکھوا دیا اور اس پر خطبہ دیا۔ البتہ نبی کریم ﷺ نے ابن حبان کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ اونٹنی پر بیٹھ کر خطبہ عید ضرور ارشاد

فرمایا ہے۔ جس سے سواری پر بیٹھ کر خطبہ دینا جائز ثابت ہوتا ہے۔

(۳۹۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ نَبِيُّ اللهِ ﷺ: «التَّكْبِيرُ فِي الفِطْرِ سَبْعٌ فِي الأُولَى، وَخَمْسٌ فِي الأُخْرَى، وَالقِرَاءَةُ بَعْدَهُمَا كِلْتَيْهِمَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَنَقَلَ التِّرْمِذِيُّ عَنِ البُخَارِيِّ تَصْحِيحَهُ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "عیدالفطر کی نماز کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ ہیں۔ دونوں رکعتوں میں قراءت تکبیرات کے بعد ہے۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کی صحت نقل کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سبع فی الاولی ﴾ پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دعاء افتتاح خواہ تکبیرات سے پہلے پڑھے یا بعد میں دونوں طرح جائز ہے۔ ﴿ وخمس فی الاخرة ﴾ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں اور قیام کی تکبیران کے علاوہ' اس طرح چھ تکبیریں ہوئیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدین کی بارہ تکبیریں زائد ہیں۔ مگر اس کی سند میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے کہ عن ابیه عن جده سے اگر عمرو کا باپ شعیب اور عمرو کا دادا محمد بن عبداللہ مراد ہے تو یہ روایت مرسل ہے کیونکہ محمد بن عبداللہ تابعی ہیں اور اگر شعیب کے دادا عبداللہ مراد ہیں تو شعیب کا ان سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت منقطع ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے' امام دارقطنی وغیرہ نے تردید کی ہے کہ شعیب کا اپنے دادا سے سماع ثابت ہے اور یہاں "جدہ" سے مراد شعیب ہی کا دادا ہے۔ جمہور ائمہ جرح و تعدیل اس سند کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ' امام علی بن مدینی رحمہ اللہ' امام اسحٰق رحمہ اللہ' امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ' امام بخاری رحمہ اللہ' امام دارقطنی رحمہ اللہ' امام دارمی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ بلکہ فقہاء اربعہ بھی اس سند سے استدلال کرتے اور اسے صحیح کہتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ سے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اس کے بارے میں صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں عمرو بن شعیب کی روایت ہی نقل نہیں کی۔ معلوم نہیں امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہاں نقل کیا ہے۔ مگر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے وضاحت کردی ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی "العلل الکبیر" میں یہ روایت نقل کی ہے۔ حافظ زیلعی نے "نصب الرایہ' ص ۲۱۷' ج ۲" میں بھی اسی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس حدیث کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا' حضرت سعد رضی اللہ عنہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات سے بھی ہوتی ہے مگر ان میں کلام ہے۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین اور فقہاء مدینہ کے علاوہ امام احمد رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا بھی اسی حدیث کے مطابق عمل ہے۔ شارح ترمذی رحمہ اللہ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری کا اس سلسلے میں مستقل رسالہ "القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید" قابل دید ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض

دیگر فقہاء کوفہ چھ تکبیروں کے قائل ہیں۔ تین پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں رکوع جانے سے پہلے۔ مگر اس بارے میں کوئی صحیح مرفوع روایت ثابت نہیں۔ جمہور صحابہؓ و تابعین کا عمل ہی راجح اور دلیل کے اعتبار سے قوی ہے۔ امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عیدین کی زائد تکبیروں میں بھی رفع الیدین مسنون ہے۔

(٣٩٦) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الأَضْحَى وَالفِطْرِ بِـ «قٓ، وَاقْتَرَبَتْ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کی نماز میں سورۂ ق اور سورۂ اقتربت الساعۃ تلاوت فرماتے تھے۔ (مسلم)

حاصل کلام: عیدین کی نمازوں میں ان سورتوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ دوسری سورتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

(٣٩٧) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا كَانَ يَوْمُ العِيْدِ خَالَفَ الطَّرِيقَ. أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ، وَلأَبِي دَاوُدَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوُهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے روز عید گاہ کیلئے جانے اور واپسی کیلئے راستہ تبدیل کرتے تھے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت ہے)

لغوی تشریح: ﴿ خالف الطریق ﴾ مطلب اس کا یہ ہے کہ عیدگاہ کو جاتے وقت ایک راستہ اختیار کیا جائے اور واپسی کیلئے دوسرا راستہ۔ نبی ﷺ کی اقتداء میں مسلمانوں کو بھی راستہ تبدیل کر کے آنا جانا چاہئے' تاکہ اس سے مختلف مقامات ان کی عبادت کے گواہ بنیں اور شوکت اسلام کا مظاہرہ بھی ہو۔

(٣٩٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَدِمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ المَدِيْنَةَ، وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُونَ فِيهِمَا، فَقَالَ: قَدْ أَبْدَلَكُمُ اللَّهُ بِهِمَا خَيْراً مِّنْهُمَا: يَوْمَ الأَضْحَى، وَيَوْمَ الفِطْرِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ کے دو روز کھیل کود کیلئے مقرر تھے۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں کے بدلہ میں ان سے بہتر دو دن عنایت فرما دیئے ہیں۔ ایک عیدالاضحیٰ کا دن اور دوسرا عیدالفطر کا۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ولھم ﴾ ان کیلئے' سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ ﴿ یومان ﴾ دو دن' عید کے۔ فرحت اور مسرت کیلئے۔ اہل مدینہ جو دو دن کھیل کود کر مناتے تھے وہ یوم نیروز اور یوم مہرجان۔ یہ دونوں کلمے فارسی

سے معرب کئے گئے ہیں۔ دراصل پہلا نو روز یعنی نیا اور جدید دن۔ اصل ہیئت کے نزدیک یہ شمسی سال کا پہلا دن ہوتا۔ اور پہلا دن وہ ہے جس روز سورج برج حمل میں منتقل ہوتا ہے اور دوسرے کلمے کی اصل مھرگان ہے یعنی گاف کے ساتھ۔ اس سے مراد وہ دن ہے جب سورج برج میزان میں منتقل ہوتا ہے اور اہل فارس نے اس مہینے کا اس نام کے ساتھ نام موسوم کر دیا ہے۔ یہ دونوں دن نہایت معتدل ہوتے ہیں' نہ ان میں گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔ شب و روز بھی ان دونوں میں مساوی ہوتے ہیں اور یہ دونوں دن فارسیوں کے عید کے روز تھے بلکہ ہنوز بھی عید کے دن ہیں۔ بعض عربوں نے اس بارے میں فارسیوں کی تقلید اور نقالی کی ہے۔ مگر شارع علیہ السلام ان دنوں کی عید منانے سے منع فرماتے ہیں کیونکہ کفار کی عید کی تعظیم مکروہ یا حرام ہے بلکہ بعض نے مبالغہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ کفر ہے یا پھر کفر کے بالکل قریب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عیدین کے روز کھیلنا کودنا' اظہار مسرت و فرحت کرنا جائز ہے۔ البتہ مشرکوں اور کافروں کی عیدوں پر خوشی اور مسرت و انبساط کا اظہار کرنا مکروہ ہے یا بقول بعض حرام ہے۔

(۳۹۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ يَخْرُجَ إِلَى العِيْدِ مَاشِياً. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **عید گاہ کی جانب پیدل چل کر جانا سنت ہے۔** (اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ **ثابت** ہوا کہ عیدگاہ میں پیدل چل کر جانا مسنون ہے۔ جتنے قدم اٹھیں گے اتنی نیکیاں زیادہ لکھی جائیں گی۔ اگر عیدگاہ دور ہو تو سواری پر جانا بھی ناجائز نہیں۔

(٤٠٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُمْ أَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِي يَوْمِ عِيْدٍ، فَصَلَّى بِهِمُ النَّبِيُّ ﷺ صَلَاةَ العِيْدِ فِي الْمَسْجِدِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ لَيِّنٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ **ایک موقع پر عید کے روز مسلمانوں کو بارش نے آلیا تو نبی** ﷺ نے **انہیں نماز عید مسجد میں پڑھائی۔** (اسے ابوداؤد نے کمزور سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معقول شرعی عذر کی وجہ سے مسجد میں نماز عید پڑھی جا سکتی ہے۔ آپؐ عموماً نماز عید باہر عیدگاہ میں جا کر ہی پڑھتے تھے۔ باران رحمت کی وجہ سے مسجد میں پڑھائی۔ مسئلہ کی نوعیت اپنے مقام پر ہے مگر اس کی سند میں ایک راوی عیسیٰ بن عبدالاعلیٰ بن ابی فروہ مجہول ہے۔ اس وجہ سے یہ روایت باعتبار سند کمزور ہے۔ علماء میں اختلاف ہے کہ نماز عید وسیع و کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے یا باہر نکل کر عیدگاہ میں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وسیع و فراخ اور کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے زندگی بھر نماز عید باہر عیدگاہ میں ادا فرمائی ہے

ہاں ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے عذر پیش آگیا تو آپؐ نے نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ اس لئے عید گاہ میں پڑھنا افضل ہے۔ یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ حضور ﷺ نے حتیٰ الوسع ہمیشہ افضل کام پر مداومت و محافظت فرمائی ہے۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ نماز عید کیلئے عید گاہ تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اگر باہر نکل کر نماز عید پڑھنا مسنون نہ ہوتا تو میں مسجد میں پڑھتا۔ اس لئے عید گاہ میں نماز پڑھنا ہی مسنون اور افضل ہے۔

١٥ - بَابُ صَلَاةِ الْكُسُوفِ

نماز کسوف کا بیان

(گرہن والی نماز)

(٤٠١) عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَوْمَ مَاتَ إِبْرَاهِيمُ، فَقَالَ النَّاسُ: انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ لِمَوْتِ إِبْرَاهِيمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ، لاَ يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلاَ لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَادْعُوا اللَّهَ وَصَلُّوا، حَتَّى تَنْكَشِفَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «حَتَّى تَنْجَلِيَ».

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں جس روز ابراہیم کی وفات ہوئی اس دن سورج گرہن لگا۔ لوگوں نے کہا کہ سورج گرہن ابراہیم کی وفات کی وجہ سے لگا ہے۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "شمس و قمراللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ ان کو گرہن کسی کی موت و حیات کی وجہ سے نہیں لگتا۔ چنانچہ جب تم (ان کو) اس حالت میں دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور نماز پڑھو یہاں تک کہ سورج گرہن کھل جائے۔" (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں ہے' "نماز پڑھتے رہو تاوقتیکہ وہ روشن ہو جائے۔"

وَلِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي بَكْرَةَ: «فَصَلُّوا، وَادْعُوا، حَتَّى يَنْكَشِفَ مَا بِكُمْ».

اور بخاری میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ "نماز پڑھو' دعا مانگو تاآنکہ وہ کیفیت تمہارے سامنے سے دور ہو جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة الكسوف﴾ کسوف کہتے ہیں رنگت کی سیاہی مائل تبدیلی کو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ﴿كسفت الشمس وانكسفت﴾ یعنی سورج بالکل سیاہ ہوگیا اس کی شعاعیں غائب ہوگئیں اور خسوف کے بھی یہی معنی ہیں۔ اہل لغت نے کہا ہے سورج گرہن کیلئے کسوف اور چاند گرہن کیلئے خسوف کا لفظ بولنا زیادہ فصیح ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے کیلئے ان الفاظ کا استعمال بھی صحیح ہے۔ ﴿يوم مات

ابراھیم ﴾ ابراهیم نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے کا نام ہے۔ ۱۰ھ کے ۲۹ ویں شوال کا واقعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں جو سورج گرہن تھا وہ اسی روز صبح ساڑھے آٹھ بجے لگا تھا۔ ﴿ انکسفت لموت ابراھیم ﴾ یہ ان کے دور جاہلیت کے نظریہ و تخیل کے مطابق تھا کہ کسوف و خسوف دونوں کسی عظیم انسان کی موت یا اس کی ولادت کے موقع پر لگتا ہے۔ ﴿ آیتان ﴾ نشانیاں' علامات۔ ﴿ من آیات اللہ ﴾ اللہ کی وہ نشانیاں جو اس کی قدرت' وحدانیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں یا اپنے بندوں کو ڈرانے' خوف دلانے کیلئے یا یہ نشانیاں اس پر دال ہیں کہ دونوں کو اس نے اپنی قدرت و طاقت سے مسخر کیا ہوا ہے۔ جب یہ دونوں اپنے نفع و نقصان اور دفع ضرر کے مالک و مختار نہیں تو پھر دوسروں کو کیا نفع و نقصان اور ضرر پہنچا سکیں گے۔ ﴿ حتی تنکشف ﴾ یہاں تک صاف ہو جائیں اور روشن ہو جائیں کہ ان پر چھائی ہوئی سیاہی اور بے نور پن دور ہو جائے۔ حتیٰ یکشف صیغۂ مجہول ہے یعنی بلند ہو جائے اور اس پر وارد کیفیت گرہن دور ہو جائے' زائل ہو جائے۔ ﴿ حتی تنجلی ﴾ یہاں تک صاف اور روشن ہو جائے۔ ﴿ حتی یکشف ﴾ صیغۂ مجہول ہے' یعنی بلند ہو جائے اور ڈھل جائے۔

حاصل کلام: آفتاب و ماہتاب کا گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو عظیم نشانیاں ہیں۔ اپنی قدرت کے اظہار اور بندوں کے خوف اور ڈرانے کیلئے اتنی بڑی مخلوق کو خدا کے حضور پر مارنے اور جنبش کرنے کی مجال نہیں نہ وہ اپنی آزاد مرضی سے طلوع ہو سکتے ہیں اور نہ غروب۔ وہ ضابطۂ خداوندی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس ضابطہ سے سرمو انحراف ان کے بس میں نہیں۔ جب ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے تو پھر یہ نفع و ضرر کے مالک کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ دور جاہلیت کے نظریہ و خیال کی تردید ہے۔

اس موقع پر نماز و دعا مسنون ہے نماز کی دو رکعتیں جماعت کے ساتھ آپؐ سے ثابت ہیں ہر رکعت میں دو رکوع (واذا رایتموھا) اور جب تم انہیں دیکھو کے حکم سے معلوم ہوا کہ یہ نماز اوقات مکروہہ میں بھی پڑھنا جائز ہے۔ اس صورت کے علاوہ نماز کسوف و خسوف کی اور بھی کئی صورتیں منقول ہیں۔ یہ نماز سنت ہے یا واجب۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور دوسری رائے ہے کہ یہ واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وجوب کے قائل ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دو ہی رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں دو قیام' دو مرتبہ قراءت اور دو رکوع پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے میں اتفاق ہے مگر دوسرے قیام میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو دوسرے قیام میں بھی فاتحہ پڑھنا واجب قرار دیتے ہیں ورنہ ان کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوگی۔

رہا یہ مسئلہ کہ قراءت بلند آواز سے کی جائے گی یا آہستہ آواز سے۔ اس میں بھی چار اقوال ہیں۔ ایک قول کی رو سے بلند آواز سے پڑھی جائے گی۔ اس رائے کے حق میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' اسحٰق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں آہستہ پڑھ لی جائے یہ رائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔ ایک تیسرا قول ہے کہ دونوں میں اختیار ہے جس طرح چاہے پڑھ لی جائے اور ایک چوتھا قول یہ ہے کہ آفتاب کو گرہن لگے تو آہستہ

پڑھی جائے اور اگر ماہتاب کو گرہن لگے تو بلند آواز سے پڑھنی چاہیے۔

راوی حدیث: ﴿ ابراھیم رضی اللہ عنہ ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے۔ ان کی والدہ کا نام ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ۔ اسکندریہ اور مصر کے حکمران نے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیۃً دیا تھا۔ آپؐ کے بیٹے ابراھیمؓ جمادی الاولیٰ ۹ھ کو پیدا ہوئے اور اٹھارہ ماہ کے بعد ۲۹ شوال ۱۰ھ کو وفات پائی۔ بقیع میں دفن ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت میں ایک دودھ پلانے والی نے اس کی مدت رضاعت کو پورا کیا ہے۔"

(٤٠٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ فِي صَلاَةِ الْكُسُوفِ بِقِرَاءَتِهِ، فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ، فِي رَكْعَتَيْنِ وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: فَبَعَثَ مُنَادِياً يُنَادِي «اَلصَّلاَةُ جَامِعَةٌ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گرہن کی نماز میں قرأت بلند آواز سے پڑھی اور دو رکعتوں میں چار رکوع اور چار ہی سجدے کئے۔ (بخاری و مسلم) اور اس حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے منادی کرنے والے کو بھیجا جو "الصلاۃ جامعۃ" کی منادی کرتا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ اربع رکعات ﴾ رکعات سے یہاں رکوع مراد ہیں ﴿ فی رکعتین ﴾ ہر رکعت میں دو رکوع ﴿ واربع سجدات ﴾ منصوب ہے اس وجہ سے کہ اس کا عطف اربع رکعات پر ہے۔ یہ اس بات پر متنبہ کرنے کیلئے ذکر کیا گیا ہے کہ سجود میں اضافہ و زیادتی نہیں ان کی تعداد ہر رکعت میں دو ہی رہے گی ﴿ الصلاۃ جامعۃ ﴾ دونوں مرفوع واقع ہو رہے ہیں' اس لئے کہ ایک مبتداء اور دوسرا اس کی خبر واقع ہو رہا ہے اور منصوب ہونے کی صورت میں پہلا فعل محذوف کا مفعول ہوگا جو احضروا ہو سکتا ہے اور دوسرا پھر حال واقع ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اذان کے علاوہ نماز کسوف کیلئے کسی اور طرح اعلان کرنا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف میں قراءت بلند آواز سے فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک مرفوع روایت جہری (بلند) آواز سے قراءت کی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نماز عام نمازوں کی طرح نہیں ہے بلکہ رکوع کا اضافہ ہے۔ اس روایت کی رو سے آپؐ ایک رکعت میں دو رکوع فرماتے۔ ظاہر ہے ہر رکوع سے اٹھ کر نئے سرے سے قراءت کی ہوگی۔ اس طرح قراءت کا بھی اضافہ ہوا۔ نیز اس کا خاص وقت مقرر و متعین نہیں ہے' جب آفتاب کو گرہن ہوگا اسی وقت نماز پڑھی جائے گی۔ عام نمازوں کیلئے تو اذان مقرر ہے اور صلاۃ کسوف و خسوف کیلئے "الصلاۃ جامعۃ" کہنا مشروع ہے۔ نماز کیلئے یہ کہنا ثابت نہیں ہے۔

(٤٠٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَصَلَّى، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً نَحْواً مِّنْ قِرَاءَةِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ قَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ انصَرَفَ، وَقَدِ انْجَلَتِ الشَّمْسُ، فَخَطَبَ النَّاسَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں سورج گرہن ہوا۔ آپؐ نے نماز کسوف ادا فرمائی' اس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کے برابر قیام کیا۔ پھر رکوع بھی بہت لمبا کیا۔ پھر کھڑے ہوئے تو قیام بھی طویل کیا مگر پہلے قیام سے کم۔ پھر لمبا رکوع کیا لیکن پہلے رکوع سے کم' پھر سجدہ ریز ہوئے (اس کے بعد) پھر لمبا قیام کیا اور وہ پہلے قیام سے کچھ کم تھا پھر ایک لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم تھا پھر (رکوع سے) اپنا سر مبارک اٹھایا اور ایک لمبا قیام کیا جو پہلے قیام سے کچھ کم تھا اس کے بعد پھر ایک اور لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم (لمبا) تھا' پھر اپنا سر مبارک (رکوع سے) اٹھایا۔ پھر سجدہ کیا پھر آخر کار سلام پھیر دیا تو (اس دوران) سورج روشن ہو چکا تھا۔ پھر آپؐ نے لوگوں کو وعظ بھی کیا۔ (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: صَلَّى حِيْنَ كُسِفَتِ الشَّمْسُ ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ فِيْ أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے سورج گرہن کے موقع پر آٹھ رکوع چار سجدوں کے درمیان ادا کئے۔

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُ ذَلِكَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى سِتَّ رَكَعَاتٍ بِأَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یوں بھی ہے کہ آپؐ نے چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ ادا کئے ہیں۔

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى، فَرَكَعَ

اور ابوداؤد میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے نماز کسوف پڑھی اور پانچ

خَمْسَ رَكَعَاتٍ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، وَفَعَلَ فِي الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذَلِكَ. رکوع اور دو سجدے پہلی رکعت میں کئے اسی طرح دوسری رکعت میں کیا۔

لغوی تشریح: ﴿ نحوا من قراءة سورة البقرة ﴾ تقریباً سورۂ بقرہ کی قرأت کے برابر۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ نماز کسوف میں سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھی گئی ہے بلند آواز سے نہیں۔ اس لئے کہ اگر نبی ﷺ نے سورۂ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی ہوتی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے سنا ہوتا۔ روایات سے یہ معلوم ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس موقع پر نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے خود اپنے کانوں سے سنا ہوتا تو اسے اندازاً اور تخمیناً بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری روایات جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہونے کے بارے میں ہیں تمام کی تمام ضعیف اور نہایت کمزور ہیں۔ ایسی روایات سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما آپؐ کے قریب ہی کھڑے تھے پھر بھی اس کا احتمال ہے کہ جو تلاوت حضور ﷺ نے فرمائی ہوگی۔ بعینہ وہ اسے یاد نہ رکھ سکے ہوں اور اس کی مقدار کو یاد رکھ لیا ہو تو ان کو اندازے اور تخمینے کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور انہوں نے سورۂ بقرہ کی قرأت کا اندازہ لگایا ہو۔ اس کے باوجود بلند آواز سے پڑھنے والی روایت صحیح ترین ہے اور باعتبار تعداد بھی زیادہ ہیں۔ ان روایات کے راوی مثبت ہیں اور یہ اصول ہے کہ مثبت منفی پر مقدم ہوتا ہے۔ ﴿ دون القيام الاول ﴾ یعنی پہلے قیام سے کم۔ دون القيام الاولى اور دون الركوع الاول کہنے کا مطلب ہے کہ ہر قیام اور ہر رکوع اپنے سے پہلے والے قیام اور رکوع سے کم ہوتا۔

حاصل کلام: تعداد رکوع میں روایات مختلف ہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ تمام روایات کو جمع کرنے کے بعد نتیجہ نکلتا ہے کہ دو دو رکوع تین تین رکوع چار چار رکوع اور پانچ پانچ رکوع ایک رکعت میں ثابت ہوتے ہیں۔ بعض نے ان کو جمع کر کے اس پر محمول کیا ہے کہ کسوف کی نماز آپؐ کی زندگی میں متعدد بار ہوئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ کسوف حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوا ہے۔ بعض علمائے کرام نے ان احادیث کو راجح قرار دیا ہے۔ جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر آیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے ہم اس جگہ چند امور کا بالاختصار اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ صحیح صورت حال واضح ہو جائے اور اس مسئلہ کی تنقیح و تحقیق ہو جائے۔

چنانچہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ محقق مؤرخین' پیچیدہ و باریک مسائل کی تحقیق کرنے والے ہیئت دان اور ماہرین فلکیات کا اس پر اتفاق ہے کہ ابراھیم رضی اللہ عنہ جس روز فوت ہوئے وہ ۱۰ھ ماہ شوال کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ تھی۔ جبکہ انگریزی ۶۳۲ء جنوری کی ۲۷ تاریخ بنتی ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا اور اس پر بھی سب متفق نظر آتے ہیں کہ سورج گرہن نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کے بعد پھر نہیں ہوا البتہ اس سے پہلے وقوع کے متعلق محقق کبیر علامہ قاضی محمد سلمان

منصور پوری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب سیرت "رحمت للعالمین" میں ذکر کیا ہے کہ سورج گرہن کی تعداد نبی ﷺ کے مکی و مدنی دور اور بالخصوص ہجرت کے بعد دس بنتی ہے۔ اس میں وہ سورج گرہن بھی شامل ہے جو آپؐ کے لخت جگر ابراہیم کی وفات کے موقع پر لگا تھا۔ یہ گرہن ان سب کے آخر میں واقع ہوا ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے نہ تو ان کے اوقات کا ذکر فرمایا ہے اور نہ ان جگہوں اور علاقوں کا کہ کہاں واقع ہوئے ہیں' تاکہ مدینہ منورہ میں جو سورج گرہن ملاحظہ کیا گیا اس سورج گرہن سے ممیّز ہو جاتا جو وہاں ملاحظہ نہیں کیا گیا۔ رہا احادیث کا معاملہ تو مسلم نے عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے نبی ﷺ کی زندگی میں مدینہ منورہ میں اپنے تیروں سے تیز اندازی کر رہا تھا کہ سورج کو گرہن لگ گیا۔ میں نے تیروں کو پھینک مارا اور دل میں کہا کہ سورج گرہن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو جو حادثہ پیش آیا ہے بخدا اسے ضرور میں دیکھوں گا۔ یہ سیاق دلالت کرتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کیلئے پہلا موقع تھا کہ سورج کو گرہن لگا۔ کم از کم اس وقت تک گرہن کے بارے میں کوئی حکم ثابت نہیں اور یہ تو معلوم ہے کہ عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے ہیں۔ یہ بات اس کا تعین تو کر دیتی ہے کہ نبی ﷺ کی زندگی میں پہلی مرتبہ جو سورج گرہن مشاہدہ کیا گیا وہ فتح مکہ کے بعد کا ہے' پہلے کا نہیں۔ مسلم اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ گرہن کا واقعہ شدید گرمی کے دن ہوا اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ گرہن جو ابراہیم کی وفات پر لگا تھا وہ جنوری کے مہینے میں لگا تھا اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں سردی شدید ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں واقعات الگ ہیں اور ایک واقعہ نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ اس کے بعد جب ہم فلکیات کے حساب پر نظر ڈالتے ہیں جسے علامہ قاضی محمد سلیمان نے نمایاں کیا ہے تو فتح مکہ کے بعد ہمیں تین مرتبہ گرہن کا ثبوت ملتا ہے پہلا گرہن ۹ھ یا ۲۸ ربیع الاخر بمطابق ۱۴ اگست ۶۳۰ء کو اور اگست کا مہینہ جیسا کہ سب جانتے ہیں سخت گرمی کا مہینہ ہے اور بارش کی کمی کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں دوسرے ملکوں اور علاقوں کے مقابلہ میں گرمی کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور دوسرا گرہن ۹ھ ۲۹ شوال بمطابق فروری ۶۳۱ء میں واقع ہوا اور تیسرا گرہن ۱۰ھ ۲۸ شوال بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو لگا اور جب ہم فلکیات کے حساب اور احادیث میں مذکور کسوف کو باہم ملاتے ہیں۔ تو ثابت ہوتا ہے کہ گرہن دو ہوئے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ایک گرہن تو اگست کے مہینہ میں پہلا گرہن یہ شدید گرمی میں واقع ہوا اور ابراہیم کی وفات پر جو جنوری کے مہینہ میں ہوا وہ تیسرا سورج گرہن ہے اور جو ۹ھ شوال کے مہینہ میں (فروری) میں واقع ہوا وہ دوسرا گرہن ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مدینہ میں اس گرہن کا ملاحظہ کرنا ممکن بھی تھا یا نہیں؟ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ متعدد مرتبہ گرہن کے ہونے کا مقتضیٰ ہے۔ لیکن یہ تعدد روایات کے اختلاف اور رکوعات کی تعداد کی تلاش میں سود مند نہیں ہے کیونکہ دونوں واقعات سے متعلقہ روایات ہر رکعت میں دو رکوعوں کی صراحت کرتی ہیں۔ پھر باقی کون سے سورج گرہن رہ جاتے ہیں جن کی نماز میں تین تین' چار چار اور پانچ پانچ رکوع کئے۔ ابراہیم کی وفات کے روز گرہن کے بارے میں بھی روایات میں صریح تعارض ہے۔

عام طور پر روایات میں ہے کہ اس روز نماز کسوف ہر رکعت میں دو رکوع سے پڑھی گئی ہے جبکہ مسلم کی روایت سے نماز میں ہر رکعت تین رکوعوں سے پڑھی گئی ثابت ہے۔ پس احادیث کا باہمی تعارض بجز ترجیح کے دور کرنا ممکن ہی نہیں۔ پس ہمارے نزدیک خواہ ہم متعدد واقعات سے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ وہ روایات جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر ہے وہ قوی ترین ہیں سب سے زیادہ ان کا ثبوت ہے اور قطعی طور پر سب سے صحیح ہونے کی وجہ سے راجح بھی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ' امام بخاری رحمہ اللہ' شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے کہ دو رکوع کی احادیث راجح ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کسوف کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا مگر صاحب ہدایہ نے اس کا انکار کیا ہے کہ نماز کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں صاف طور پر اس کا ذکر موجود ہے کہ آپؐ نے سامعین کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔

(٤٠٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا هَبَّتِ الرِّيحُ قَطُّ، إِلاَّ جَثَا النَّبِيُّ ﷺ عَلَى رُكْبَتَيْهِ، وَقَالَ: «اللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رَحْمَةً، وَلاَ تَجْعَلْهَا عَذَاباً». رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالطَّبَرَانِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ہوا تیز و تند چلتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر یوں (بارگاہ الٰہی میں) عرض کرتے۔ اے الٰہی! اس ہوا کو رحمت بنا' عذاب نہ بنا۔ (اسے شافعی اور طبرانی دونوں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ هبت ﴾ هبوب سے ماخوذ ہے۔ نصر ینصر باب سے ہے' ہوا کا تیز و تند چلنا ﴿ ریح ﴾ مطلق ہوا کو بھی کہتے ہیں یا تیز و تند ہوا کو۔ ﴿ قط ﴾ "طاء" پر تشدید۔ اس پر ہمیشہ ضمہ ہی آتا ہے (مبنی بالضم) ہے اور یہ ماضی میں نفی کے استمرار کی تاکید کیلئے آتا ہے جس طرح ابدا کا لفظ مستقبل کیلئے آتا ہے ﴿ جثا ﴾ نصر ینصر باب سے ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھنے کیلئے بولا جاتا ہے۔ خوف کے موقع پر اس طرح بیٹھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اندھیری کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! اسے ہمارے لئے باعث رحمت بنا' باعث عذاب نہ بنا۔ ایک دوسری حدیث میں "ریح" کی بجائے "ریاح" کا لفظ بھی آیا ہے کہ یا الٰہی! اس تیز و تند آندھی کو ریاح بنا دے اور ریح نہ بنا کیونکہ قرآن کے بیان کی رو سے ریاح کا لفظ رحمت کیلئے ہے اور ریح کا لفظ عذاب کیلئے۔ معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں دونوں کا معنی ہوا ہے۔

(٤٠٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے یہ حدیث بھی مروی

عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى فِي زَلْزَلَةٍ سِتَّ رَكَعَاتٍ، وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ، وَقَالَ: هٰكَذَا صَلاَةُ الآيَاتِ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلَه، دُوْنَ آخِرِهِ.

ہے کہ انہوں نے زلزلے کے موقع پر نماز چار سجدوں اور چھ رکوعوں سے پڑھی اور فرمایا کہ آیات الٰہی کی نماز اسی طرح پڑھی جاتی ہے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور شافعی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے اسی طرح کی روایت ذکر کی ہے البتہ اس میں روایت کے آخری الفاظ نہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فی زلزلۃ ﴾ اس میں فی سبب بیان کرنے کیلئے ہے ("فاء" سببی ہے) معنی ہے زلزلہ کی وجہ سے ﴿ ست رکعات ﴾ ' ﴿ اربع سجدات ﴾ چھ رکوع اور چار سجدے یعنی اس طرح نماز پڑھی کہ ہر رکعت میں تین رکوع اور دو سجدے ہوتے تھے ﴿ صلاۃ الایات ﴾ آیات سے یہاں مراد ناگہانی اور پریشان کن واقعات ہیں ﴿ دون آخرہ ﴾ یعنی حدیث کے آخری الفاظ یعنی "ھکذا صلاۃ لہ الایات" نہیں ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناگہانی حادثہ' ارضی و سماوی مصیبت کے نزول کی صورت میں فی الفور نماز پڑھنی چاہئے۔ اسے "صلاۃ الایات" کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے دور کرنے کیلئے رجوع صرف اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا چاہئے غیر اللہ کی جانب متوجہ ہونا ان کو مصائب و آلام دور کرنے کا ذریعہ سمجھنا شرک ہے جو ناقابل معافی جرم ہے جس کی بخشش نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ تمام کئے کرائے اعمال اکارت جائیں۔

١٦ - بَابُ صَلاَةِ الاسْتِسْقَاءِ

نماز استسقاء کا بیان

(بارش مانگنے کیلئے نماز)

(٤٠٦) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنهما قَالَ: خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ مُتَوَاضِعاً، مُتَبَذِّلاً، مُتَخَشِّعاً، مُتَرَسِّلاً، مُتَضَرِّعاً، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، كَمَا يُصَلِّي فِي العِيْدِ، لَمْ يَخْطُبْ خُطْبَتَكُمْ هٰذِهِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ بڑی تواضع کے ساتھ' سادہ لباس میں نہایت عاجزی و انکساری' بہت خشوع اور بڑی زاری اور تضرع کرتے ہوئے نماز کیلئے باہر نکلے۔ عید کی نماز کی طرح لوگوں کو دو رکعات نماز پڑھائی۔ تمہارے خطبہ کی طرح خطبہ ارشاد نہیں فرمایا۔ (اس روایت کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی' ابو عوانہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاۃ الاستسقاء﴾ استسقاء کے معنی ہیں باران رحمت کی طلب کرنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے قحط کے وقت بارش کی دعا کرنا۔ سقایہ اور سقی۔ پانی اور بارش کو کہتے ہیں اس لئے کہ پینے اور سیراب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿خرج﴾ عیدگاہ کی طرف نکلے ﴿متواضعا﴾ تواضع سے ماخوذ ہے تواضع کہتے ہیں بڑائی اور تکبر کی ضد کو۔ بڑائی اور تکبر اظہار شان و آن ہوتی ہے' تواضع میں عاجزی و انکساری۔ ﴿متبذلا﴾ تبذل سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب ہے زیب و زیبائش کو چھوڑ دینا اور پھٹا پرانا کپڑا زیب تن کرنا اور ﴿متخشعا﴾ یعنی خشوع کو ظاہر کرنے والا اور اس کے بدن' نظر اور آواز سے دھیما پن نمایاں ہوتا ہے۔ باطنی طور پر خوف زدہ اور جھکا ہوا ہو تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ چیز حاصل کر لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ﴿مترسلا﴾ جلد باز نہ ہو آرام و سکون سے چلنے والا۔ ﴿متضرعا﴾ تضرع کو نمایاں اور ظاہر کرنے والا۔ یعنی تذلل اور دست سوال دراز کرنے میں مبالغہ کرنے والا اور اپنی حاجت و ضروریات طلب کرنے والا۔ تمام صیغے اسم فاعل کے ہیں اور منصوب اس بنا پر ہے کہ حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿لم یخطب خطبتکم ھذہ﴾ تمہارے خطبہ کی طرح آپؐ خطبہ نہیں دیتے تھے بلکہ آپؐ خطبہ کی حالت میں دعا تضرع اور اللہ کی بڑائی و کبریائی بیان فرماتے جیسا کہ ابوداؤد میں روایت میں ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ نماز استسقاء رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ استسقاء کے لغوی معنی پانی کیلئے درخواست کرنا' دعا کرنا۔ شرعی اصطلاح کی رو سے ایک مخصوص کیفیت سے نماز پڑھنا۔ استسقاء کی تین قسمیں ممکن ہیں۔ ادنیٰ' اوسط اور اعلیٰ۔ ادنیٰ کی صورت یہ ہے کہ صرف دعا کی جائے اور اوسط کی صورت یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد باجماعت ادا کی جائے اور اعلیٰ کی صورت یہ ہے کہ طلب بارش کیلئے باہر نکل کر عاجزی و انکساری' خشوع و خضوع کی حالت میں نماز استسقاء ادا کی جائے اور خوب عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر دعا کی جائے۔

نبی ﷺ سے صرف دعا بھی ثابت ہے جیسا کہ خطبہ جمعہ ارشاد فرمانے کے دوران ایک آدمی نے آپؐ سے بارش کیلئے دعا کی درخواست کی تو آپؐ منبر پر کھڑے ہوئے اور دعا فرمائی جس کے نتیجہ میں بارش شروع ہوگئی اور آئندہ جمعہ تک مسلسل ہوتی رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ کے دوران دعا کر سکتا ہے اس وقت قبلہ رو ہونا بھی ضروری نہیں۔ خطبہ کے دوران خطیب سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ خطیب دوسرے کی درخواست پر عمل کرنے کا مجاز ہے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ آپؐ نے نماز استسقاء عید کی نماز کی طرح ادا فرمائی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز استسقاء کی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیریں بھی کہی تھیں۔ اس روایت کی سند میں اگرچہ محمد اور اس کا والد عبدالعزیز دونوں کو ضعیف قرار دیا گیا ہے مگر مذکورہ بالا حدیث اس کی تائید کر رہی ہے۔

خطبہ نماز استسقاء مختصر مگر جامع ہونا چاہئے۔ خطیب مقاصد خطبہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ بے موقع و

خلاف موقع گفتگو کر کے لمبا اور طویل بھی نہ کرے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں لکھا ہے کہ نبی ﷺ سے نماز استسقاء ادا کرنے کے کئی طریقے منقول ہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سارے لوگ شہر سے یا آبادی سے باہر جمع ہوں۔ لباس پھٹا پرانا ہو' ڈرتے ہوئے اللہ کے حضور گریہ و زاری کرے۔ اس کے بعد امام ان کو دو رکعت نماز باجماعت پڑھائے اور قرأت بلند آواز سے کریں۔ اس کے بعد خطبہ پڑھے اور قبلہ رو ہو کر دعا مانگے اس دوران چادر کو الٹا کرے۔

(٤٠٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: شَكَا النَّاسُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ قُحُوطَ المَطَرِ، فَأَمَرَ بِمِنْبَرٍ، فَوُضِعَ لَهُ فِي المُصَلَّى، وَوَعَدَ النَّاسَ يَوْماً يَخْرُجُونَ فِيهِ، فَخَرَجَ حِينَ بَدَا حَاجِبُ الشَّمْسِ، فَقَعَدَ عَلَى المِنْبَرِ، فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللَّهَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَدْبَ دِيَارِكُمْ، وَقَدْ أَمَرَكُمُ اللَّهُ أَنْ تَدْعُوهُ، وَوَعَدَكُمْ أَنْ يَسْتَجِيبَ لَكُمْ، ثُمَّ قَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ، اللَّهُمَّ أَنْتَ اللَّهُ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ أَنْتَ، أَنْتَ الغَنِيُّ، وَنَحْنُ الفُقَرَاءُ، أَنْزِلْ عَلَيْنَا الغَيْثَ، وَاجْعَلْ مَا أَنْزَلْتَ عَلَيْنَا قُوَّةً وَبَلاَغاً إِلَى حِيْنٍ. ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ، فَلَمْ يَزَلْ حَتَّى رُئِيَ بَيَاضُ إِبِطَيْهِ، ثُمَّ حَوَّلَ إِلَى النَّاسِ ظَهْرَهُ، وَقَلَّبَ رِدَاءَهُ، وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، وَنَزَلَ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کی شکایت کی۔ آپؐ نے عیدگاہ میں منبر لے جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ چنانچہ منبر عیدگاہ میں لا کر رکھ دیا گیا۔ لوگوں سے ایک دن کا وعدہ کیا جس میں وہ سارے باہر نکلیں۔ آپؐ خود اس وقت نکلے جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوا۔ تشریف لا کر آپؐ منبر پر بیٹھ گئے اور اللہ اکبر کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی پھر (لوگوں سے مخاطب ہو) کر فرمایا "تم لوگوں نے اپنے علاقوں کی خشک سالی کا شکوہ کیا ہے' اللہ تعالیٰ تو تمہیں یہ حکم دے چکا ہے کہ اس سے دعا کرو وہ تمہاری دعا کو قبول فرمائے گا" پھر فرمایا' تعریف اللہ ہی کیلئے سزاوار ہے جو کائنات کا پروردگار ہے۔ لوگوں کے حق میں بڑا مہربان اور ہمیشہ ہر وقت مہربان ہے۔ روز جزاء کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الٰہ نہیں جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ الٰہی! تو ہی اللہ ہے تیرے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ تو غنی ہے اور ہم فقیر و محتاج ہیں۔ ہم پر باران رحمت کا نزول فرما جو کچھ تو ہم پر نازل فرمائے اسے ہمارے لئے روزی اور مدت دراز تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس کے بعد آنجناب ﷺ نے اپنے دونوں دست مبارک اوپر

وَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَأَنْشَأَ اللّٰهُ تَعَالَى سَحَابَةً، فَرَعَدَتْ، وَبَرَقَتْ، ثُمَّ أَمْطَرَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: غَرِيبٌ، وَإِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

اٹھائے کہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے گئے یہاں تک کہ آپؐ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر لوگوں کی جانب اپنی پشت کر کے کھڑے ہوگئے اور اپنی چادر کو پھیر کر پلٹایا۔ آپؐ اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی لمحہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر بادل پیدا کیا وہ بدلی گرجی اور چمکی اور بارش برسنے لگی۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اسے غریب کہا ہے اور اس کی سند نہایت عمدہ و جید ہے)

وَقِصَّةُ التَّحْوِيلِ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ، وَفِيهِ: فَتَوَجَّهَ إِلَى الْقِبْلَةِ يَدْعُو، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ، جَهَرَ فِيهِمَا بِالْقِرَاءَةِ.

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ مِنْ مُرْسَلِ أَبِي جَعْفَرٍ الْبَاقِرِ: وَحَوَّلَ رِدَاءَهُ لِيَتَحَوَّلَ الْقَحْطُ.

صحیح بخاری میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں (تبدیلیٔ چادر) کا قصہ اس طرح ہے پھر آپؐ نے قبلہ کی طرف رخ کیا اور دعا فرماتے رہے پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ ان میں قرأت بلند آواز سے کی۔" اور دارقطنی میں ابوجعفر باقر کی مرسل روایت میں ہے کہ آپؐ نے اپنی چادر اس لئے پھیر کر بدلی کہ قحط سالی بھی اسی طرح پھر جائے۔

لغوی تشریح: ﴿ قحوط المطر ﴾ قحوط میں "قاف" پر ضمہ۔ قحط کی طرح یہ بھی مصدر ہے۔ معنی بندش بارش' باران رحمت کا نازل نہ ہونا ﴿ ووعد الناس یوما ﴾ یعنی ایک دن مقرر فرما دیا ﴿ بدا ﴾ نمایاں ہونا ظاہر ہے ﴿ حاجب الشمس ﴾ سورج کا ابرو' سورج کا پہلا حصہ ایک کنارہ یا آفتاب کی روشنی بھی ہو سکتی ہے۔ ﴿ جدب دیارکم ﴾ اپنے علاقوں کی قحط سالی کی کیفیت ﴿ ان یستجب لکم ﴾ دعا کو قبول فرماتا ہے اپنے ارشاد کے مطابق جس میں ہے ﴿ ادعونی استجب لکم ۔ ۴۰/ ۶۰ ﴾ مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا تمہاری پکار دعا کو اور فرمایا ﴿ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان : ۱۸۶/ ۲ ﴾ میں تو پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ ﴿ الغیث ﴾ بارش۔ ﴿ بلاغا الی حین ﴾ یعنی ایسی روزی عطاء فرما جو ہمیں لمبے عرصہ تک چلے۔ ﴿ البلاغ ﴾ کے معنی ہیں جو کسی کو اس کے مطلوب و مقصود تک پہنچا دے۔ ﴿ حتی رئی...الخ ﴾ صیغۂ مجہول ہے ﴿ الابط ﴾ جو حصہ' جسم' بازو اور کندھے کے نیچے ہے ﴿ حول ﴾ تحویل سے ماخوذ ہے معنی ہے کہ اس نے پلٹایا' پھیرا ﴿ الی الناس ظهره ﴾

لوگوں کی طرف پشت کی اور رخ قبلہ کی طرف ﴿ وقلب ردائہ ﴾ یعنی چادر کی بائیں طرف کو دائیں طرف اور نچلے حصہ کو اوپر کیا اور ظاہری حصہ کو باطن بنایا اور اس کی ہر کیفیت کو برعکس بھی کیا۔ کیفیت اس کی یوں ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ (دائیں) سے بائیں طرف سے نچلی طرف کو پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دائیں طرف کے نچلے حصہ کو پکڑا پھر دائیں ہاتھ سے دائیں کندھے پر لے آئے اور بائیں ہاتھ سے بائیں کندھے پر لے آئے یوں تو اس عمل سے چادر تبدیل کرنے کی مذکورہ بالا کیفیت پوری ہو جاتی ہے۔ ﴿ وھو رافع یدیہ ﴾ یعنی جب لوگوں کی طرف پشت کی تو اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے ﴿ فانشئا ﴾ پیدا فرمایا ﴿ فرعدت ﴾ اس میں کڑک' گرج پیدا ہوئی۔ یہ بادل کی آواز ہے۔ ﴿ وبرقت ﴾ بادل کا چمکنا ﴿ فی الصحیح ﴾ اور صحیح بخاری میں ہے ﴿ من حدیث عبداللہ بن زید ﴾ اس سے عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری مازنی مراد ہے وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ مراد نہیں جن سے اذان کا واقعہ منقول ہے۔ ﴿ لیتحول القحط ﴾ تاکہ پلٹ جائے اور تبدیل ہو جائے یعنی قحط سالی اور خشک سالی سرسبزی و شادابی میں تبدیل ہو جائے۔

حاصل کلام : اس سے معلوم ہوا کہ نماز عید کے برعکس نماز استسقاء کے موقع پر منبر باہر لے جانا جائز ہے۔ نیز عید کی طرح خطبہ' استسقاء نماز کے بعد پڑھا گیا اور استسقاء کیلئے دعا میں ہاتھ اتنے اوپر اٹھائے کہ بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ میں نے رسول اللہ کو کسی موقع پر اتنے بلند ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں تیس احادیث جمع کی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی مسنون ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خطبہ کا آغاز بسم اللہ سے نہیں بلکہ الحمد للہ سے کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ بھی کسی دوسرے لفظ سے آغاز صحیح نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ ابوجعفر باقر ﴾ ابوجعفر محمد الباقر (قاف کے نیچے کسرہ) کی کنیت ہے۔ محمد بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب' امامیہ شیعہ کے عقیدے کے مطابق بارہ ائمہ میں سے ان کا پانچواں نمبر ہے۔ باقر ان کو اس لئے کہتے ہیں کہ ان کا علم بڑا وسیع تھا' بڑے ماہر و متبحر عالم تھے۔ ۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۷ھ میں تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(٤٠٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلاً دَخَلَ الْمَسْجِدَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ قَائِمٌ يَخْطُبُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! هَلَكَتِ الأَمْوَالُ، وَانْقَطَعَتِ السُّبُلُ، فَادْعُ اللَّهَ يُغِيثُنَا، فَرَفَعَ يَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ أَغِثْنَا، اللَّهُمَّ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوا' اس وقت نبی ﷺ کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے' وہ بولا یا رسول اللہ (ﷺ)! اموال (مویشی) ہلاک ہوگئے اور آمدورفت کے راستے بند ہوگئے ہیں۔ اللہ کے حضور دعا فرمائیں کہ وہ ہم پر بارش نازل فرمائے۔ آپ نے اسی وقت اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور دعا فرمائی۔ یا الٰہی! بارش

أَغِثْنَا، اللَّهُمَّ أَغِثْنَا»، فَذَكَرَ الحَدِيْثَ، وَفِيْهِ الدُّعَاءُ بِإِمْسَاكِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سے ہماری فریاد رسی فرما۔ یاالٰہی! باران رحمت سے ہماری فریاد رسی فرما۔ ساری حدیث بیان فرمائی۔ اس میں بارش کے بند کروانے کی دعا کا بھی ذکر ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ السبل ﴾ سبیل کی جمع ہے جس کا معنی راستہ ہے۔ "سین" اور "باء" پر ضمہ ہے۔ راستوں کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے بارش نہ ہونے کی وجہ سے سفر کرنا چھوڑ دیا کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے سواری کے جانوروں کیلئے چارہ پیدا نہیں ہوا تھا اور یہ جانور اتنے کمزور ہوگئے کہ سفر کے قابل ہی نہ رہے یا یہ مفہوم ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ چیزیں ہی پیدا نہیں ہوئیں جنہیں اٹھا کر منڈی میں لایا جاتا ہے' جب چیزیں ہی نہیں تو باربرداری کے تمام جانور بے کار ہو کر رہ گئے اور راستے بے آباد اور آمدورفت سے خالی ہو کر رہ گئے۔ ﴿ یغیثنا ﴾ "یاء" پر ضمہ یعنی ہمیں فوری طور پر بارش سے نواز دے تا کہ ہماری تکلیف دور ہو۔ ﴿ فرفع یدیه ﴾ بخاری نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپؐ کے ساتھ لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اوپر اٹھانا آداب دعا میں شامل ہے۔ ﴿ اغثنا ﴾ اغاثه سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ ہمیں باران رحمت سے سیراب فرما۔ ﴿ فذکر الحدیث ﴾ اس نے ساری حدیث بیان کی جس میں مذکور ہے۔ اس دعا کے بعد بارش مسلسل و لگاتار نازل ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ دوسرے جمعہ کے روز پھر ایک آدمی دوران خطبہ میں کھڑا ہوا اور کثرت بارش کی وجہ سے اموال کے ہلاک ہونے اور راستوں کے منقطع ہونے کا شکوہ کرنے لگا۔ تو نبی ﷺ نے پھر بارش کے رکنے کی دعا فرمائی تو بادل چھٹ گئے اور آفتاب روشن ہوگیا اور مصنف نے ﴿ وفیه الدعاء بامساکها ﴾ کے فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں بارش کے رکوانے کی دعا بھی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انبیاء کرامؑ بلکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ بھی ہر چیز اللہ رب العالمین سے براہ راست طلب فرماتے تھے۔ بیچ میں کسی کو واسطہ یا ذریعہ بنانا صحیح نہیں سمجھتے تھے ورنہ نبی کریم ﷺ بھی ابوالانبیاء یا ابوالبشر یا کسی دوسرے اولوالعزم پیغمبر کا واسطہ دے کر بارش طلب فرماتے۔ نیز صحابہ کرامؓ بھی یہی سمجھتے تھے کہ نبی ازخود نہیں بلکہ اللہ کے حضور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بارش برسا کر لوگوں کو قحط سالی سے نجات دیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کان وما یکون کا علم بھی نہیں رکھتے تھے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ قحط سالی کی وجہ سے بیرون شہر لوگوں کا کیا حال ہے۔ اس آدمی کے بتانے پر معلوم ہوا۔

وہ آدمی کون تھا' اس میں اختلاف ہے کسی نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے حالانکہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس وقت دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ انداز گفتگو اور طرز کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ سائل

ضرور کوئی مسلمان ہے ورنہ آج کل کے نام نہاد مسلمانوں کی طرح آپؐ کو مشکل کشا سمجھ کر آپؐ ہی سے درخواست کرتا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمیں قحط سالی کی مصیبت سے نجات دلا۔ مسند احمد میں ہے کہ کعب بن مرہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے صرف دعا ہی فرمائی ہے بارش کیلئے نماز نہیں پڑھی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے غالبًا اسی سے استدلال کیا ہے استسقاء کیلئے صرف دعا کرنا سنت ہے مگر دوسری احادیث سے نماز استسقاء پڑھنا بھی ثابت ہے۔

اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بارش کیلئے چھ طرح مختلف اوقات میں دعا کی ہے۔ (۱) ایک دفعہ تو آپؐ لوگوں کو عیدگاہ میں لے گئے' نماز پڑھائی' خطبہ بھی دیا اور دعا بھی فرمائی۔ (۲) ایک دفعہ خطبہ جمعہ کے دوران ہی صرف دعا ہی منبر پر کھڑے ہوئے فرمائی۔ (۳) ایک مرتبہ آپؐ نے باقاعدہ منبر منگوایا اور اس پر بیٹھ کر صرف دعا فرمائی یہ الفاظ مروی ہیں بلکہ حدیث میں اس کے برعکس خطبہ کے لفظ بھی کہے اور نماز نہیں پڑھی۔ (۴) ایک مرتبہ نماز سے فارغ ہو کر سب لوگوں کے ساتھ اجتماعی دعا کی۔ (۵) ایک دفعہ آبادی سے باہر نکل کر احجار الزیت مقام میں جا کر دعا فرمائی۔ (۶) اور ایک دفعہ جنگ کے دوران بارش کیلئے دعا فرمائی۔ ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ (زاد المعاد۔ السبل)

(٤٠٩) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ كَانَ إِذَا قَحِطُوا اسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ، وَقَالَ: اللَّهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَسْقِيْ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا ، وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فاسْقِنَا ، فَيُسْقَوْنَ . رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش طلب فرماتے اور یوں دعا کرتے کہ اے اللہ! ہم تجھ سے تیرے نبی ﷺ کے واسطہ سے بارش طلب کرتے تھے تو ہمیں باران رحمت سے نواز دیتا تھا اور اب ہم تیرے حضور تیرے نبی ﷺ کے چچا کو بطور وسیلہ لائے ہیں لہٰذا تو ہمیں بارش سے سیراب فرما دے (اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں) ان کو بارش سے سیراب کیا جاتا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قحطوا ﴾ صیغہ مجہول وہ قحط کا شکار ہوگئے۔ ﴿ یستسقی بالعباس بن عبدالمطلب ﴾ عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اور ان سے شفاعت و سفارش کرا کر بارش طلب کرتے تھے اس لئے کہ وہ نبی ﷺ کے چچا تھے اور چچا والد کے مثل ہوتا ہے۔ ﴿ اللھم انا کنا نستسقی الیک بنبینا ﴾ یا الٰہی! ہم نبی ﷺ کی زندگی میں ان سے دعا اور سفارش کے ذریعہ سے بارش طلب کرتے تھے۔ ان کی ذات سے نہیں ﴿ وانا نتوسل الیک ﴾ اور اب ان کی وفات کے بعد آپؐ کے چچا

عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر لائے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما دونوں منبر پر تشریف لے گئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا پوری کر چکے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رب العزت سے عرض کیا۔ الٰہی! مصیبت اور بلائیں گناہ کے سبب سے نازل ہوتی ہیں اور توبہ کے بغیر وہ دور نہیں ہوتیں۔ اب لوگوں نے تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ مجھے تیری جناب میں متوجہ کیا ہے' یہ ہمارے ہاتھ تیرے حضور اٹھے ہوئے ہیں' گناہوں سے لبریز ہیں۔ ہم تیری جناب سے توبہ کے ذریعہ فریاد رسی کے طلبگار ہیں تیرے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ پیشانیاں تیرے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہمیں بارش سے سیراب فرما دے۔ بس پھر کیا تھا پہاڑوں کی مانند بادل اٹھے اور آسمان پر چھا گئے۔ خوب بارش برسی' زمین سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگی۔ لوگوں میں زندگی آ گئی۔ اس واقعہ کو زبیر بن بکار نے اپنی الانساب میں ذکر کیا ہے۔ (مرعاۃ' ج: ۲' ص: ۳۹۹ اور سبل السلام)

حاصل کلام: قبہ و قبر پرستوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ وسیلہ پکڑنا جائز ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو طلب بارش کیلئے وسیلہ بنایا اور ان کے توسل سے بارش کیلئے دعا مانگی۔ حالانکہ یہ سراسر لغو اور مردود ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات تو زندہ و مردہ' حاضر و غائب بلکہ ان کے ناموں کا بھی وسیلہ پکڑتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث سے تو صرف زندہ انسانوں کی دعا کا وسیلہ پکڑنا ثابت ہوتا ہے۔ ان کے ناموں کو وسیلہ بنانا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر ان حضرات کی طرح وسیلہ اور توسل پکڑنا جائز ہوتا تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے چچا کی عدم موجودگی میں بھی جائز ہوتا حالانکہ ایسا کسی حدیث سے اور قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

یہ حدیث ہمارے لئے تین باتوں کا ذکر کرتی ہے ایک تو یہ کہ بارش کی دعا کیلئے خیر اور خاندان نبوت کے کسی فرد کو جو نیکی و تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتا ہو' ساتھ لے جانا چاہئے۔ اس حدیث سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی فضیلت و بزرگی نمایاں ہوتی ہے کہ خاندان نبوت میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں تواضع و انکساری کس قدر پائی جاتی تھی اور اہل بیت کے کتنے قدر شناس و حق شناس تھے۔ نیز یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہو رہا ہے کہ زندہ آدمی خواہ فوت شدہ سے مرتبے و منصب میں کم تر ہو' دعا اسی سے کرانی چاہئے۔ فوت شدہ کا وسیلہ اور توسل شریعت میں نہ ثابت ہے اور نہ ہی معتبر ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ﴾ حضورؐ کے چچا' ان کی کنیت ابوالفضل تھی۔ بیت اللہ کی آبادکاری اور حجاج کو پانی پلانے کا منصب ان کے پاس تھا۔ بیعت عقبہ میں حاضر تھے تا کہ انصار کو عہد وفا کرنے کی تاکید کریں۔ اگرچہ اس وقت وہ مسلمان نہ تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر قیدیوں میں شامل تھے۔ فتح مکہ سے تھوڑا سا عرصہ پہلے اسلام قبول کیا اور اس غزوۂ میں شریک بھی ہوئے۔ غزوۂ حنین کے روز ثابت قدم رہے۔ ۳۲ھ میں رجب یا رمضان میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(٤١٠) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَصَابَنَا - وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ - مَطَرٌ، قَالَ: فَحَسَرَ ثَوْبَهُ حَتَّى أَصَابَهُ مِنَ المَطَرِ، وَقَالَ: إِنَّهُ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِرَبِّهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ ہم ایک دفعہ بارش کی لپیٹ میں آگئے اور رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ تھے۔ آنجناب ﷺ نے اپنے بدن اطہر سے کپڑا اوپر اٹھایا کہ بارش آپؐ کے جسم اطیب پر پڑنے لگی اور ارشاد فرمایا کہ "یہ اپنے آقاو مالک کے ہاں سے نئے نئے تحفہ کی صورت میں آرہی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فحسر ثوبه﴾ حضور ﷺ نے اپنے بدن مبارک سے کچھ کپڑا اٹھالیا۔ ﴿حتی اصابه من المطر﴾ کہ بارش کے کچھ قطرے آپؐ کے جسم پر پڑ گئے۔ ﴿حدیث عهد بربه﴾ اپنے مالک کے ارشاد کے مطابق نئی نئی نازل ہوئی ہے یا یہ معنی ہے کہ اپنے مالک کے ایجاد کرنے سے برسی ہے۔ یعنی بارش رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ابھی ابھی نازل فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کے ذریعہ سے برکت حاصل کی جائے۔

حاصل کلام: حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بارش عالم قدس سے نازل ہوئی ہے۔ ہنوز یہ ایسی حالت میں ہے کہ کسی گنہگار کا ہاتھ اسے نہیں لگا ہے اور نہ ابھی ایسے مقام تک پہنچی ہے جہاں لوگ گناہ میں ملوث ہوتے ہیں۔ نیز اس میں خیر اور برکت والی اشیاء سے تبرک حاصل کرنے کی جانب رغبت دلائی گئی ہے۔ بارش کے پانی میں نہانا مفید اور جائز ہے۔

(٤١١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى المَطَرَ قَالَ: «اللَّهُمَّ صَيِّباً نَافِعاً». أَخْرَجَاهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب بارش کو دیکھتے تو اس طرح دعا مانگتے۔ "اے اللہ! اس بارش کو منافع بخش و سود مند بنا دے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿صیبا﴾ صاد پر فتحہ "یاء" کے نیچے کسرہ اور تشدید۔ بہت بارش۔ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب واقع ہوا ہے یعنی اس بارش کو نفع بخش بنا دے۔ ﴿اخرجاه﴾ ان دونوں سے بخاری و مسلم مراد ہیں۔

(٤١٢) وَعَنْ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَعَا فِي الاسْتِسْقَاءِ: «اللَّهُمَّ جَلِّلْنَا سَحَاباً كَثِيفاً، قَصِيفاً، دَلُوقاً، ضَحُوكاً،

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے دعاء استسقاء میں یہ دعا مانگی۔ "یا الٰہی! ہمیں ایسے بادل سے جو ساری زمین پر چھایا ہوا ہو، گہرا ہو، کڑکنے والا، زور سے برسنے والا، چمکنے گرجنے والا، تہ

تُمْطِرُنَا مِنْهُ رُذَاذاً، قِطْقِطاً، سَحْلاً، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالإِكْرَامِ». رَوَاهُ أَبُو عَوَانَةَ فِي صَحِيحِهِ.

بہ تہ ہو' سے بارش کی باریک بوندیں بہت زیادہ برسا دے۔ اے بزرگی اور عزت کے مالک!" (مسند ابی عوانہ)

لغوی تشریح: ﴿ جللنا ﴾ تجلیل سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ یہ بادل روئے زمین پر چھا جائے۔ ﴿ کثیفا ﴾ گاڑھا تہ بہ تہ ﴿ قصیفا ﴾ ایسا بادل جس کی کڑک شدید ہو۔ یہ زور دار بارش کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دونوں لفظ فعیل کے وزن پر ہیں ﴿ دلوقا ﴾ دال پر فتحہ اور لام پر ضمہ زور سے برسنے والا۔ جیسے کہتے ہیں سیلاب لوگوں پر ٹوٹ پڑا۔ ﴿ ضحوکا ﴾ "ضاد" پر فتحہ اور "حاء" پر ضمہ ہے۔ چمکنے والا۔ جس میں بجلی ہو۔ ﴿ رذاذا ﴾ "راء" پر ضمہ۔ چھوٹے چھوٹے قطرے' باریک باریک بوندیں ﴿ قطقطا ﴾ دونوں "قاف" پر کسرہ اور پہلا "طاء" ساکن۔ باریک بوندیں حتیٰ کہ رائی کے دانوں کے برابر۔ ﴿ سجلا ﴾ سین پر فتحہ' جیم ساکن۔ زور دار بارش۔ مصدر ہے۔ بادل کی تعریف کی گئی ہے۔ مبالغہ کے طور پر موسلا دھار برسنے والا۔

حاصل کلام: رسول اللہ ﷺ سے دعائے استسقاء کی کئی دعائیں مختلف الفاظ سے منقول ہیں۔ یہ دعا ان میں سے ایک ہے' جو دعا چاہے پڑھے۔

(٤١٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: خَرَجَ سُلَيْمَانُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَسْتَسْقِي، فَرَأَى نَمْلَةً مُسْتَلْقِيَةً عَلَى ظَهْرِهَا، رَافِعَةً قَوَائِمَهَا إِلَى السَّمَاءِ، تَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنَّا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِكَ، لَيْسَ بِنَا غِنًى عَنْ سُقْيَاكَ، فَقَالَ: «ارْجِعُوا فَقَدْ سُقِيتُمْ بِدَعْوَةِ غَيْرِكُمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام بارش طلب کرنے کیلئے باہر نکلے تو انہوں نے ایک چیونٹی کو پشت کے بل ٹانگیں آسمان کی جانب اٹھائے ہوئے دیکھا جو بارگاہ رب العزت میں عرض کر رہی تھی۔ الٰہی ہم تیری مخلوق ہیں تیری دوسری مخلوق کی طرح۔ ہم بھی تیری بارش سے بے نیاز و مستغنی نہیں ہیں۔ یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا چلو واپس چلیں تمہیں بارش سے سیراب کر دیا گیا' غیروں کی دعا کی بدولت۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ مستلقیۃ علی ظھرھا ﴾ اپنی گدی پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی ﴿ قوائمھا ﴾ قائمۃ کی جمع ہے۔ پاؤں کے معنی میں۔ ﴿ خلق ﴾ "خاء" پر فتحہ اور لام ساکن۔ اس کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق۔ ﴿ سقیاک ﴾ سین پر ضمہ اور "قاف" ساکن۔ تیری بارش ﴿ سقیتم ﴾ صیغہ

مجہول۔ بارش کے ساتھ سیراب کر دیئے گئے تم لوگ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سابقہ پیغمبر بھی بارش کی بندش کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر بارش طلب کرنے جاتے تھے۔ چھوٹی مخلوق کے ذریعہ انسان کو بارش سے سیراب کیا جاتا ہے۔ للذا دعاء استسقاء یا نماز استسقاء آبادی سے باہر ہی کرنی چاہئے۔ اس طرح آبادی کی گہما گہمی' ہنگامہ خیزی اور شور و شغف سے دور توجہ زیادہ ہو جاتی ہے۔

(٤١٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اَسْتَسْقَى فَأَشَارَ بِظَهْرِ كَفَّيْهِ إِلَى السَّمَاءِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے **بارش کیلئے دعا فرمائی تو اپنے دونوں ہاتھ الٹی حالت میں آسمان کی طرف اٹھا کر ارشاد فرمایا۔** (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اشار بظهر كفيه الى السماء ﴾ ہاتھوں کی پشت چہرے کی طرف کی۔ یہ صورت معمول کے مطابق دعا مانگنے کی صورت کے برعکس ہے۔ جب کسی ضرر کو دور کرنا مطلوب و مقصود ہو تو اس طرح دعا کرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں الٹے ہاتھوں دعا مانگنے کا ذکر ہے حالانکہ عموماً آپؐ سیدھے ہاتھوں سے دعا کرتے تھے۔ ان دونوں میں علماء نے یہ تطبیق دی ہے کہ رحمت کی طلب کرنے کیلئے سیدھے ہاتھوں سے دعا کرنی چاہئے اور ضرر و مصیبت کو دور کرنے کیلئے دعا مانگی جائے تو الٹے ہاتھوں سے کی جائے۔ اس سے تفاءل مراد ہوتا ہے کہ حالت کو اس طرح تبدیل فرما دے۔ دعائے استسقاء کے وقت چادر کو الٹانے اور پھیرنے میں بھی غالباً یہی حکمت کارفرما ہے اور ہتھیلیوں کے نیچے کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادلوں کے منہ بھی نیچے کر دیئے تاکہ بارش خوب برسے اور خشک سالی کو سرسبزی سے بدل دیا۔

١٧ - بَابُ اللِّبَاسِ — لباس کا بیان

(٤١٥) عَنْ أَبِيْ عَامِرٍ الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْحِرَ وَالْحَرِيرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ **رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میری امت میں لازماً کچھ ایسی قومیں ہوں گی جو (زنا) اور ریشم کو حلال سمجھیں گی۔"** (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب اللباس ﴾ لباس جو حرام اور حلال ہیں' ان کا بیان ہے۔ اور کتاب الصلوٰۃ میں اس کا ذکر اس لیے کر دیا ہے کہ نماز کے ساتھ اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ﴿ الحر ﴾ شیخ احمد محمد شاکر نے "الباعث الحثیث ص ۴۴" پر لکھا ہے کہ "حر" "حا" کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن کی صورت میں

زنا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی یہ لوگ زنا کو حلال قرار دیں گے۔ یہ صحیح روایت بخاری وغیرہ کے تمام نسخوں میں موجود ہے۔ بعض نے یہ لفظ ﴿ خز ﴾ "خاء" اور "زاء" کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ جس سے مراد ریشم ہے۔ مگر یہ دراصل حر سے تخفیف ہے۔ جیسا کہ حافظ ابوبکر بن عربی نے کہا ہے' ملاحظہ ہو: (فتح الباری ج: ۱۰' ص: ۴۵'۴۵'۴۹)۔ ﴿ الحریر ﴾ ریشم کی تمام اقسام کیلئے حریر کا لفظ مستعمل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو چیزیں حرام کی گئی ہیں ایک ریشم کا پہننا دوسرا زنا و بدکاری کرنا۔ ریشم کا لباس زیب تن کرنا انسان کے اندر رعونت اور کبر و نخوت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ متکبرین کا لباس ہے۔ اسی لئے اسے امت پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ زینت و لطافت کا لباس ہے جو مردوں کے برعکس عورت کا لباس شمار ہوتا ہے اور مردوں کیلئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔ بخاری میں اس کی اصل ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری نے اسے معلق روایت کیا ہے۔ معلق بایں طور کہ عبدالرحمٰن جو اس کے راوی ہیں کو شک و تردد ہے کہ انہوں نے یہ حدیث ابوعامر رضی اللہ عنہ سے سنی ہے یا ابومالک سے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عبداللہ بن ھانی یا عبید بن وھب رضی اللہ عنہ ہے۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(٤١٦) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ نَشْرَبَ فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ، وَأَنْ نَأْكُلَ فِيهَا، وَعَنْ لُبْسِ الحَرِيرِ وَالدِّيْبَاجِ ، وَأَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ . رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے' باریک اور گاڑھا ریشم پہننے اور ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ دیباج ﴾ گاڑھے ریشم کا ساختہ کپڑا۔ یہاں خاص کا عام پر عطف ہے۔

(٤١٧) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ لُبْسِ الحَرِيْرِ، إِلاَّ مَوْضِعَ أُصْبُعَيْنِ أَوْ ثَلاَثٍ أَوْ أَرْبَعٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا۔ سوائے دو یا تین یا چار انگشت۔ (بخاری و مسلم۔ اور متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: مردوں کیلئے ریشم پہننا شرعی طور پر حرام ہے البتہ خارش وغیرہ عذر کی صورت میں وقتی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ دو' چار انگشت کے برابر اگر کسی کپڑے پر ریشم لگا ہوا ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

(٤١٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَخَّصَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران سفر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور زبیر بن

لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرِ فِي قَمِيْصِ الحَرِيْرِ، فِي سَفَرٍ، مِنْ حِكَّةٍ كَانَتْ بِهِمَا . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

عوام رضی اللہ عنہ کو ریشمی قمیص پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس وجہ سے کہ ان کو خارش تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی سفر ﴾ غزوہ کیلئے جاتے ہوئے دوران سفر میں من حکہ خارش کی وجہ سے "حا" کے نیچے کسرہ اور کاف پر تشدید۔ خارش کی ایک قسم۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے جوؤں کی شکایت کی تھی تو آپ ؐ نے ریشم زیب تن کرنے کی اجازت عنایت فرما دی اور یہ بھی ممکن ہے کہ خارش جوؤں کی وجہ سے ہی ہوتی ہو۔ ان کو ریشم کی رخصت اس لئے دی کہ ریشم میں نرمی اور گداز پن ہوتا ہے جو خارش کی تکلیف میں کمی کا باعث ہے نیز اس کپڑے میں جوئیں بھی کم ہی پڑتی ہیں۔ گویا دفع ضرر کی حد تک ریشم کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زبیر رضی اللہ عنہ ﴾ یہ زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد قرشی اسدی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی ساتھی، آپ ؐ کی پھوپھی صفیہ کے لخت جگر اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ غزوات میں اسلام کی جری اور بہادروں میں شمار ہونا۔ جنگ جمل سے واپسی کے بعد ۳۶ھ کو فوت ہوئے۔

(٤١٩) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَسَانِي النَّبِيُّ ﷺ حُلَّةً سِيَراءَ، فَخَرَجْتُ فِيْهَا، فَرَأَيْتُ الغَضَبَ فِيْ وَجْهِهِ، فَشَقَقْتُهَا بَيْنَ نِسَائِيْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سیراء کا پٹے دار، ریشمی جوڑا عنایت فرمایا۔ میں اسے پہن کر باہر نکلا تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ انور پر غصہ اور ناراضگی کے آثار دیکھے تو میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی گھریلو خواتین میں تقسیم کر دیا۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ کسانی ﴾ مجھے پہنایا یعنی عنایت فرمایا ﴿ حلۃ ﴾ "حاء" پر ضمہ اور لام پر تشدید۔ نیا کپڑا، نیا لباس۔ حلۃ دراصل ایک رنگ کے دونوں کپڑے ازار (تہبند) اور چادر کو کہتے ہیں۔ جو سارے بدن کو ڈھانپ لے۔ ﴿ سیراء ﴾ نصب کی صورت میں حلۃ کی صفت ہے اور جر کی صورت میں حلۃ کی جانب مضاف۔ اور سیراء کی سین کے نیچے کسرہ اور "یاء" پر فتحہ۔ چادر جس میں دھاریاں ہوں یا جس میں ریشم استعمال ہوا ہو۔ فخرجت فیھا" میں اسے پہن کر باہر نکلا۔ ﴿ فرایت الغضب فی وجھہ ﴾ میں نے آپ ؐ کے رخ انور پر غصہ و ناراضگی کے آثار دیکھے اس لئے کہ یہ حلۃ ریشم ساختہ تھا۔ ﴿ فشققتھا ﴾ ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دیا یا بانٹ دیا۔ ﴿ بین نسائی ﴾ اپنے گھر کی خواتین میں ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کی اہلیہ، والدہ، چچا زاد بہن اور بھاوج ہیں (عقیل کی بیوی) ان میں سے ہر ایک کا نام فاطمہ تھا۔ یعنی (فاطمہ بنت محمد، فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنت حمزہ اور فاطمہ زوجہ عقیل

رضی اللہ عنھن)

حاصل کلام: نبی ﷺ کو یہ حلہ تحفہ کے طور پر وصول ہوا تھا۔ آپؐ نے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زیب تن فرمایا مگر آنحضرت ﷺ نے اس پر اظہار ناراضی فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "میں نے تمہیں پہننے کیلئے نہیں دیا تھا بلکہ اس لئے دیا تھا کہ گھر کی عورتیں پہن لیں۔" چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے خواتین میں تقسیم کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا مسنون ہے' خواہ اس کا استعمال مرد کیلئے جائز نہ ہو۔

(٤٢٠) وَعَنْ أَبِيْ مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أُحِلَّ الذَّهَبُ وَالحَرِيرُ لإِنَاثِ أُمَّتِي. وَحُرِّمَ عَلَى ذُكُورِهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کیلئے حلال کر دیا گیا ہے اور ان کے مردوں پر حرام۔" (اسے احمد' نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کیلئے سونا پہننا بصورت زیور و لباس جائز ہے مگر ترغیب نہیں' اسی طرح خواتین کو ریشم کے استعمال کی بھی اجازت ہے۔

(٤٢١) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ إِذَا أَنْعَمَ عَلَى عَبْدِهِ نِعْمَةً، أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَيْهِ». رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کو یہ پسند و محبوب ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندے پر انعام فرمائے تو اس نعمت کا اثر اس پر دیکھا جائے۔" (بیہقی)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا اظہار ہونا چاہئے۔ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کھانا پینا اور اچھا لباس پہننا تقویٰ کے خلاف نہیں۔ بہترین سواری بھی تکبر میں شمار نہیں بشرطیکہ آدمی دوسروں کو حقیر نہ سمجھے۔

(٤٢٢) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ لُبْسِ القَسِّيِّ وَالمُعَصْفَرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے قس (شہر کا نام) کے ساختہ کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ القسی ﴾ قاف پر فتحہ سین کے نیچے کسرہ اور اوپر تشدید اس کے بعد یائے نسبتی ہے۔ قس کی طرف منسوب ہے۔ بلاد مصر میں سے ایک جگہ کا نام جو ساحل سمندر پر تنیس کے قریب واقع ہے' یہ ایسا کپڑا تھا جس میں ریشم کی دھاریاں ہوتی تھیں اور مقام قس میں تیار کیا جاتا تھا اور ایک قول یہ

بھی ہے کہ یہ "قز" کی طرف منسوب ہے اور یہ ریشم کا بیکار' بچا کھچا مواد ہوتا ہے۔ "زا" اور سین کے قریب المخرج ہونے کی وجہ سے "زا" کو سین میں تبدیل کر دیا اور اس قز سے قس بن گیا۔ ﴿ والمعصفر ﴾ رباعی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ عصفر سے رنگا ہوا۔ عصفر ہندی زبان میں کسنبہ کو کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سرخی اور زردی کے بین بین ہوتا ہے۔ ہندو کاہن' سادھو اور جوگی لوگ پہنتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ کے کاہنوں کا بھی یہی لباس ہو۔ اسی بنا پر یہ رنگ پہننے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

(٤٢٣) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَأَى عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ ثَوْبَيْنِ مُعَصْفَرَيْنِ، فَقَالَ: «أُمُّكَ أَمَرَتْكَ بِهٰذَا؟». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے میرے جسم پر زرد رنگ کے دو کپڑے دیکھے تو فرمایا "کیا تیری والدہ نے یہ پہننے کا حکم دیا ہے؟" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ رای علی ﴾ علی حرف جر ہے "یاء" پر تشدید "یاء" متکلم مجرور۔ ﴿ امک امرتک؟ ﴾ امر سے صیغہ غائب ہے۔ آپ نے ایسا شدید ناپسندیگی کے اظہار کے طور پر فرمایا۔

حاصل کلام: تیری ماں نے تجھے پہنایا ہے کیا؟ یعنی یہ رنگ تو خواتین پہنتی ہیں اس لئے تیری ماں نے تجھے پہنا دیا۔ یہ غالباً حضور ﷺ نے بطور تنبیہہ اور زجر و توبیخ ارشاد فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں اسے دھو ڈالوں؟ تو فرمایا "نہیں جلا کر خاکستر کر دو۔"

(٤٢٤) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهَا أَخْرَجَتْ جُبَّةَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، مَكْفُوفَةَ الْجَيْبِ وَالْكُمَّيْنِ وَالْفَرْجَيْنِ بِالدِّيبَاجِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُه فِي مُسْلِمٍ، وَزَادَ: كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا حَتَّى قُبِضَتْ، فَقَبَضْتُهَا، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَلْبَسُهَا، فَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضَى، نَسْتَشْفِي بِهَا. وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِي الأَدَبِ الْمُفْرَدِ: وَكَانَ يَلْبَسُها لِلْوَفْدِ وَالْجُمُعَةِ.

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کا ایک چوغہ نکالا جس کی آستینوں' گریبان اور چاک پر دبیز ریشم کا حاشیہ تھا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے۔) مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ وہ جبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں تھا کہ وہ وفات پا گئیں تو میں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ نبی کریم ﷺ اسے زیب تن فرمایا کرتے تھے اور اسے دھو کر مریضوں کو پلاتے تھے اور شفاء طلب کرتے تھے اور بخاری نے الادب المفرد میں یہ اضافہ کیا ہے کہ حضور ﷺ اسے وفود کی آمد پر اور نماز جمعہ کیلئے پہنتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ مکفوفۃ ﴾ منصوب ہے اور حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿ مکفوف ﴾ کا مطلب ہے ایسا کپڑا جس کے اطراف و جوانب میں دوسرے کپڑے کا نشان ہوتا تھا۔ ﴿ الجیب ﴾ جیم پر فتحہ اور یا ساکن۔ قمیص وغیرہ کا وہ حصہ جو گردن کے گرد ہوتا ہے۔ ﴿ والکمین ﴾ کاف پر ضمہ اور میم پر تشدید کم کا تثنیہ ہے قمیص کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں سے ہاتھ داخل اور خارج ہوتا ہے۔ ﴿ والفرجین ﴾ فا پر فتحہ را ساکن فرج کا تثنیہ دراصل یہ کپڑے کا وہ حصہ ہے جو حلق سے شروع ہوتا ہے اور سینے تک جاتا ہے بسا اوقات وہ نیچے تک بھی چلا جاتا ہے۔ مگر پھر اس کا اطلاق سینے پر ملنے والے دونوں اطراف پر ہوتا ہے۔ ﴿ دیباج ﴾ دبیز و گاڑھا ریشم۔ فارسی کلمہ کو معرب بنایا گیا۔ ﴿ حتی قبضت ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی وفات پاگئیں۔ ﴿ فقبضتها ﴾ تو میں نے اس جبہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ﴿ نستشفی بها ﴾ صیغہ معروف متکلم ہے۔ اور ایک نسخہ میں یستشفی صیغۂ مجہول بھی ہے یعنی اس کی برکت سے شفا طلب کی جاتی تھی۔ ﴿ للوفد ﴾ واو پر فتحہ اور فا ساکن۔ معزز لوگوں کی جماعت جو امیر اور معزز آدمی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفود کی آمد پر ان کے استقبال اور مجمعوں کے مواقع پر زینت و زیبائش کیلئے اچھا اور مخصوص قسم کا لباس پہننا مندوب ہے۔ چار انگشت کے مساوی ریشم کی رخصت کا معنی یہ ہے کہ یہ ریشم کے کپڑے کے عرض میں لگا ہوا (طول میں نہیں) اور آستینوں' گریبانوں اور چاک پر ان کے طول کے حساب سے جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت' امیر اور صاحب منصب و مرتبہ خطیب و امام اور دیگر معزز لوگوں اور وفود کی آمد اور جمعہ و جماعت اور دیگر خاص مجمعوں کیلئے عام معمول سے ہٹ کر اچھا لباس رکھنا جائز ہے اور عمدہ اور اچھا صاف ستھرا لباس زیب تن کر کے باہر نکلنا چاہئے۔ بشرطیکہ حدود شرعیہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ فخر و ریا اور کبر و نخوت اور شان نمائی نہ ہو۔ ممنوع لباس سے پرہیز و اجتناب کیا گیا ہو۔

۳۔ كِتَابُ الْجَنَائِزِ

جنازے کے مسائل

(٤٢٥) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَادِمِ اللَّذَّاتِ: الْمَوْتِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لذتوں کو توڑ دینے' کاٹ دینے والی کا ذکر کثرت سے کیا کرو (یعنی موت کا)" (اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الجنائز﴾ جیم پر فتحہ۔ جنازہ کی جمع ہے۔ جنازہ کی جیم پر فتحہ اور کسرہ دونوں اعراب ہیں مگر کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ چارپائی پر رکھی ہوئی میت اور ایک قول کے مطابق جیم پر فتحہ ہے اس صورت میں اس کا معنی میت کے ہیں اور کسرہ کی صورت میں اس چارپائی کو کہیں گے جس پر میت پڑی ہو اور ایک قول اس کے برعکس بھی ہے یعنی فتحہ کی صورت میں میت والی چارپائی اور کسرہ کی صورت میں میت "کتاب الصلوٰۃ" کے مابعد کتاب الجنائز لانے سے مقصود یہ ہے کہ میت کی تجہیز و تکفین کے جملہ امور و افعال میں نماز جنازہ زیادہ اہم ہے۔ لہٰذا اس طرح دونوں میں قریبی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے کتاب الصلوٰۃ کے بعد کتاب الجنائز کو رکھا ہے۔ ایک قول کے مطابق جنازہ کی مشروعیت اہجری میں ہوئی۔

﴿اکثروا﴾ اکثار سے امر کا صیغہ ہے۔ زیادہ کرو ﴿ھاذم﴾ مضاف ہونے کی بنا پر مجرور ہے اور "لذات" کی طرف مضاف ہے۔ "ذال" کے ساتھ ہونے کی صورت میں اس کا معنی کاٹ ڈالنے والی' توڑ دینے والی۔ اس سے مراد موت ہے۔ جب موت کسی پر وارد ہوتی ہے تو دنیوی لذتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑتی' سب ختم ہو جاتی ہیں اور آدمی کو دنیا سے بے رغبت کر دیتی ہے اور ایک روایت میں ھادم بھی منقول ہے جو ﴿ھدم البناء والجدار﴾ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ موت کو اکثر یاد رکھو جو دنیوی لذتوں کی عمارت کو منہدم کر دینے والی ہے۔ موت جب وارد ہوتی ہے تو لذات دنیوی کی تعمیر شدہ عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے۔ ﴿الموت﴾ جر (کسرہ) کی صورت میں عطف

بیان ہوگا اور رفعی صورت میں مبتداء محذوف کی خبر جو "ھو" ہو سکتا ہے اور نصب کی صورت میں "اعنی" کو مقدر تسلیم کرنا ہوگا اس صورت میں وہ ھاذم کا بیان ہوگا۔

حاصل کلام: موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ابتدائے آفرینش سے روز ابد تک کوئی منکر نہیں۔ یہ انسانوں کی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے کہ روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہر ایک کے اعزاء و اقرباء' احباب و رفقاء میں سے کوئی نہ کوئی موت کا جام پیتا ہے' سب اس وقت بے بس ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر قدرتی طور پر دلوں میں نرمی' خوف' محاسبۂ اعمال' قیامت کے ہولناک مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جس سے طبیعت میں قیامت کی تیاری کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور انسان نیک اعمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے موت کو ہمیشہ یاد رکھنے کا حکم ہے۔

(٤٢٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ المَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهِ، فَإِنْ كَانَ لا بُدَّ مُتَمَنِّياً، فَلْيَقُلِ: اللَّهُمَّ أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الحَيَاةُ خَيْراً لِّي، وَتَوَفَّنِي مَا كَانَتِ الوَفَاةُ خَيْراً لِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کسی کو اس مصیبت و تکلیف کی وجہ سے جو اس پر نازل ہوئی ہو موت کی تمنا و خواہش ہرگز نہیں کرنی چاہئے اور اگر اس کی تمنا ضروری ہو تو پھر اس طرح کہنا چاہئے اے اللہ! جب تک جینا میرے لئے بہتر ہو اس وقت تک مجھے زندگی عطا فرما اور جب موت میرے لئے بہتر ہو تو مجھے وفات دے دے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لایتمنین ﴾ "تمنی" سے ماخوذ ہے۔ اس میں نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے اور نہی کا صیغہ ہے۔ "لضر" ضاد پر ضمہ اور کبھی فتحہ بھی آجاتا ہے۔ میرے جانی اور مالی نقصان اور ضرر کی وجہ سے ﴿ لابد ﴾ "با" پر ضمہ اور دال پر تشدید۔ ضروری اور لازمی طور پر۔ ﴿ احینی ﴾ ھمزہ اس میں قطعی ہے یعنی باب افعال کا ہے۔ معنی ہے مجھے زندگی عطا فرما ﴿ توفنی ﴾ مجھے وفات دے۔ یہ حدیث دنیوی مصائب و آلام اور رشتوں سے تنگ آکر موت کی تمنا و خواہش کرنے کو مکروہ قرار دیتی ہے کیونکہ یہ عدم رضا بالقضا کی خبر دیتی ہے اور شہادت فی سبیل اللہ کی خواہش اور دین کے بارے میں خوف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ و ناپسندیدہ نہیں ہے۔

حاصل کلام: ایک سچے پکے مومن کیلئے زندگی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ صالح آدمی زندگی کی صورت میں اپنے نیک اعمال اور صالح افعال میں اضافہ ہی کرے گا اور سابقہ گناہوں سے اسے تائب ہونے کا موقع نصیب ہوگا۔ اگر آدمی برا ہے' بدکردار' بداعمال ہے تو اسے موقع غنیمت ملے گا کہ توبہ کر لے اور راہ راست پر گامزن ہو کر اپنی اخروی زندگی سدھار لے۔ اس لئے دنیوی مصائب و آلام' مفلسی' غربت' بیماری وغیرہ سے تنگ آکر موت کی آرزو نہ کرے۔ البتہ رب کائنات سے

ملاقات کے شوق میں موت کی آرزو کمال ایمان کی نشانی اور علامت ہے۔ اگر دین کے بارے میں کسی فتنہ اور آزمائش کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی موت و آرزو کی تمنا کی جا سکتی ہے۔ دنیوی مشکلات و تکالیف تو مومن کو اونچا اڑانے کا باعث ہیں ؎
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔

(٤٢٧) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «المُؤْمِنُ يَمُوتُ بِعَرَقِ الجَبِينِ». رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا "مومن کی موت کے وقت اس کی پیشانی پر پسینہ رونما ہو جاتا ہے۔" (اس روایت کو تینوں (ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ بعرق الجبین ﴾ "عرق" پسینہ۔ اس پانی کو کہتے ہیں جو محنت و مشقت یا گرمی و حرارت کی وجہ سے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ ایک قول اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ وہ پانی ہوتا ہے جو مومن کے گناہوں کی تطہیر کیلئے موت کے وقت اس کی پیشانی پر رونما ہوتا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ طلب حلال' صوم و صلاۃ کی ادائیگی' احکام شرعیہ پر محافظت کے سلسلہ میں جو محنت و مشقت اور کد و کاوش کرنی پڑتی ہے تاآنکہ موت واقع ہو جاتی ہے۔

(٤٢٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَا: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالأَرْبَعَةُ.

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قریب المرگ آدمی کو "لا الہ الا اللہ" کی تلقین کرو۔" (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لقنوا ﴾ تلقین سے ماخوذ امر کا صیغہ ہے معنی ہیں یاددہانی کراؤ۔ ﴿ موتاکم ﴾ میت کی جمع ہے۔ جب مرنے والے کا وقت قریب ہو تو اس کو سناتے ہوئے اس کے پاس پڑھا جائے' تاکہ وہ اسے سنے اور سمجھے اور پھر خود بھی پڑھے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گو صرف لا الہ الا اللہ کی تلقین کا ذکر ہے مگر اس سے مراد پورا کلمہ ہے کہ یوں مرنے والا توحید و رسالت دونوں کا اقرار کر لیتا ہے۔ قریب المرگ آدمی کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی اسے پڑھیں اور جب مرنے والے کے حواس قدرے ٹھیک ہوں تو اسے بھی پڑھنے کی تلقین کرنی چاہئے۔ نہ تو اسے مرنے والے ہی کو تلقین کرنے پر منحصر کیا جانا چاہئے اور نہ اعزاء و اقرباء اور قریب بیٹھے ہوئے لوگوں پر۔ نبی ﷺ نے خود ایک قریب المرگ آدمی کو لا الہ الا اللہ پڑھنے کیلئے فرمایا تھا۔ (مسند احمد) جس سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کو بھی پڑھنے کیلئے کہا جا سکتا ہے۔

(٤٢٩) وَعَنْ مَعْقَلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «اقْرَءُوْا عَلَى مَوْتَاكُمْ يس». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنے مرنے والوں کے قریب سورۂ یٰس پڑھا کرو۔" (اسے ابوداؤد' نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اقرووا ﴾ امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی ہے پڑھو' پڑھا کرو ﴿ علی موتاکم ﴾ جس کی موت کا وقت حاضر ہو رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جس کی موت کا وقت قریب ہو اس کے پاس سورۂ یاسین پڑھنے سے میت سے جان کنی کی تکلیف میں تخفیف کر دی جاتی ہے مگر یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ تاہم امت کی اکثریت کا اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث: ﴿ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ﴾ معقل میں میم پر فتح' "عین" پر سکون اور "قاف" پر کرہ ہے۔ مزینہ قبیلہ کے صحابی تھے۔ حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ بیعت رضوان میں حاضر ہوئے۔ ان کی طرف بصرہ میں ایک نہر منسوب ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کھودی تھی اس لیے عربوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ "اذا جاء نهر الله بطل نهر معقل" جب اللہ نہر (بارش) جاری ہو جاتی ہے تو معقل کی نہر کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے۔ آپؓ امیر معاویہؓ کی خلافت کے آخر دور میں ۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ اور بعض کے نزدیک یزید کے دور میں فوت ہوئے۔

(٤٣٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى أَبِي سَلَمَةَ، وَقَدْ شُقَّ بَصَرُهُ، فَأَغْمَضَهُ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ اتَّبَعَهُ الْبَصَرُ»، فَضَجَّ نَاسٌ مِنْ أَهْلِهِ، فَقَالَ: «لَا تَدْعُوْا عَلَى أَنْفُسِكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تُؤَمِّنُ عَلَى مَا تَقُوْلُوْنَ»، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ، وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ، وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ، وَنَوِّرْ لَهُ فِيْهِ، وَاخْلُفْهُ فِي عَقِبِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی موت کے وقت تشریف لائے تو اس وقت ان کی آنکھ کھلی ہوئی تھی آپؐ نے اسے بند کر دیا اور پھر فرمایا کہ "جب روح بدن سے نکل جاتی ہے تو آنکھ اس کا پیچھا کرتی ہے" اتنے میں گھر کے لوگ آہ و بکا کرنے لگے' چیخنے لگے۔ تو آپؐ نے فرمایا "اپنے لئے اچھی اور بہتر دعا کرنا کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر فرشتے آمین کہتے ہیں" پھر آپؐ نے دعا فرمائی کہ "الٰہی! ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرما دے۔ ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ و مرتبہ بلند فرما اور اس کی قبر کشادہ و وسیع فرما دے اور اسے منور فرما دے اور اس کے پیچھے رہنے والوں میں نائب و قائم مقام ہو جا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ﴾ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر ﴿ شق ﴾ شین پر فتحہ صیغہ معلوم۔ ﴿ بصرہ ﴾ اس کی آنکھ۔ رفعی صورت میں یہ شق کا فاعل ہے۔ اس صورت میں کہ وہ لازم ہے اور نصبی حالت میں یہ مفعول ہے۔ اس صورت میں یہ متعدی فعل ہوگا اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے جو ابوسلمہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی ابوسلمہ کی آنکھ کھلی ہوئی تھی اور ﴿ شق بصرہ ﴾ کنایہ ہے موت سے کیونکہ میت کی نظر اس کی طرف لوٹی نہیں۔ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے ﴿ فاغمضہ ﴾ آپؐ نے اسے بند کر دیا یعنی آنکھ کے پپوٹوں کو آپس میں ملا دیا۔ ﴿ قبض ﴾ صیغہ مجہول ہے ﴿ فضج ﴾ اس میں فا تعقیب کیلئے ہے' یعنی معاً اہل خانہ نے رونا' چیخنا شروع کر دیا۔ شاید یہ لوگ دور جاہلیت کی طرح واویلاہ اور واثبورہ کہہ رہے تھے اس لئے حضور ﷺ نے ان کو تلقین فرمائی کہ اچھی اور خیر کی دعا کرو کہ فرشتے تمہارے لئے آمین کہتے ہیں۔ ﴿ تومن ﴾ تامین سے ہے یعنی آمین کہتے ہیں۔ ﴿ وافسح ﴾ وسیع و کشادہ فرما دے۔ ﴿ نور ﴾ تنویر سے امر کا صیغہ ہے یعنی اس کیلئے اس کی قبر میں نور پیدا فرما دے۔ ﴿ واخلفہ ﴾ باب نصر ینصر سے۔ یعنی اس کا نائب و قائم مقام ہو جا۔ ایسا قائم مقام جو اس کی تمام ضروریات پوری فرما دے۔ ﴿ فی عقبہ ﴾ عین پر فتحہ اور قاف پر کسرہ۔ اپنے پیچھے' یعنی اے اللہ! مرنے والے نے اپنے پیچھے دنیا میں اہل و عیال' مال و متاع جو کچھ چھوڑا ہے تو اس کا نائب و محافظ بن جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی جب روح جسد خاکی سے پرواز کر جائے تو اس کی آنکھیں عموماً کھلی رہ جاتی ہیں انہیں فوراً بند کر دینا چاہئے کیونکہ جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد آنکھ کا بند ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی رہیں تو مردے سے دہشت و وحشت آنے لگتی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کے اہل و عیال اور حتیٰ الامکان اعزہ و اقرباء کو اس کے پاس ہونا چاہئے تاکہ مرنے سے پہلے اگر وہ کوئی بات یا نصیحت کرے تو اس کے گواہ بن سکیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے والے کیلئے نماز جنازہ سے پہلے مغفرت و بخشش کی دعا کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کیلئے دعا فرمائی۔ مگر اس موقع پر ہاتھ اٹھانا اور اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی قرشی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پھوپھی زاد بھائی۔ آپؐ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دونوں کا رضاعی بھائی ہے۔ ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی نے انہیں اپنا دودھ پلایا۔ ہجرت اپنی اہلیہ کے ساتھ کی۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوہ احد میں زخمی ہوئے۔ زخم پہلے درست ہوگیا مگر پھر جاری ہوگیا۔ ۴ھ جمادی الاولیٰ میں وفات پائی۔ شوال میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حرم نبوی میں داخل فرمالیا۔

(٤٣١) وَعَنْ عائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْها، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حِينَ تُوُفِّيَ، سُجِّيَ بِبُرْدٍ حِبَرَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب فوت ہوئے تو آپؐ کو ایک دھاری دار چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ سجی ﴾ تسجیۃ یعنی باب تفعیل سے۔ صیغۂ مجہول ہے۔ ڈھانپنے کے معنی میں۔ ڈھانپ دیا گیا۔ ﴿ ببرد حبرۃ ﴾ اس میں مضاف اور مضاف الیہ کی شکل بھی بنتی ہے اور صفت موصوف کی بھی اور ﴿ برد ﴾ کے "با" پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ چادر یا دھاری دار کپڑا اور ﴿ حبرۃ ﴾ میں "حا" کے نیچے کسرہ بھی جائز ہے اور فتحہ بھی۔ بیل بوٹے والی چادر اور یہ ڈھانپنے کا عمل غسل سے پہلے تھا۔

حاصل کلام: میت کو غسل سے پہلے دھاری دار چادر سے ڈھانپ دینا بھی جائز ہے۔ دوسرا آپؐ پر بھی موت وارد ہوئی۔ اس سے حیات النبی کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو گیا کہ اگر آپؐ نے وفات نہیں پائی تو آپؐ کے ساتھ وہ عمل کیوں کیا ہے جو مرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (غسل اور تدفین و تجہیز وغیرہ)

(٤٣٢) وَعَنْهَا أَنَّ أَبَا بَكْرِ الصِّدِّيْقَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَبَّلَ النَّبِيَّ ﷺ بَعْدَ مَوْتِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ (کی پیشانی) کا بوسہ لیا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قبل ﴾ تقبیل یعنی باب تفعیل سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ میت کا تعظیم و تکریم کے نقطۂ نظر سے بوسہ لینا جائز ہے۔ کیونکہ کسی ایک صحابی کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اظہار ناپسندیدگی منقول نہیں گویا اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ (نیل الاوطار للشوکانی)

(٤٣٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ، حَتَّى يُقْضَىٰ عَنْهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مومن کی روح قرض کے ساتھ اس وقت تک معلق (لٹکی) رہتی ہے جب تک اسے ادا نہیں کر دیا جاتا۔" (احمد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ معلقۃ ﴾ تعلیق تعلیق یعنی باب تفعیل سے۔ جن نعمتوں اور انعامات کا وہ مستحق ہوتا ہے اس کیلئے بند کر دی جاتی ہیں۔ نہ اس کی نجات کا فرمان جاری کیا جاتا ہے اور نہ اس کی ہلاکت کا ﴿ بدینہ ﴾ دال پر فتحہ۔ قرض جس کا ادا کرنا مرنے والے کے ذمہ واجب ہو۔ ﴿ حتی یقضی عنہ ﴾ صیغۂ مجہول یعنی تاوقتیکہ وہ قرض اس کی جانب سے ادا نہ کر دیا جائے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد مرنے والے سے معاف نہیں ہوتے تاوقتیکہ جس کا حق تھا وہ حق دار اسے از خود معاف نہ کر دے یا کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہ کر دے۔ اسی طرح قرض کا بار میت کے ذمے ہوتا ہے جب تک اس کی طرف سے وہ قرض ادا نہیں کر دیا جاتا۔ خواہ کوئی رشتہ دار ادا کرے یا احباب و رفقاء میں سے کوئی یا ریاست اپنے شہری کی حیثیت سے اس کا قرض ادا کر دے۔ اس سے ذرا اندازہ لگائیں کہ یہ مال تو مرنے والے نے مالک کی رضامندی سے واپسی کی نیت سے قرض لیا تھا۔ جب تک اس کی ادائیگی نہیں ہوتی میت اسی قرض سے معلق رہتی ہے مگر جن لوگوں نے

دوسروں کی کوئی چیز یا مال فریب' دھوکہ یا ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہوگی' اس کا کیا حشر ہوگا۔

اگر مرنے والے نے اپنا مال اتنا پیچھے چھوڑا ہو کہ اس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہو تو وارث اس مال میں سے قرض کی ادائیگی کرنے کے پابند ہیں۔ اگر وہ مفلس و غریب تھا اتنا مال ہی ترکہ میں پیچھے نہیں چھوڑا تو پھر اسلامی ریاست اس کے قرض ادا کرنے کی پابند ہوگی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مرنے والا جو مال اپنے پیچھے چھوڑ کر مرے تو وہ وارثوں کا حق ہے اور جو قرض اس کے ذمہ تھا وہ میرے اور میرے والیان ریاست کے ذمہ ہے۔ ہم اسے ادا کریں گے۔" اس سے معلوم ہوا کہ قرض کی معافی نہیں کیونکہ یہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

(٤٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي الَّذِيْ سَقَطَ عَنْ رَاحِلَتِهِ، فَمَاتَ: اغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَكَفِّنُوْهُ فِي ثَوْبَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اس آدمی کے متعلق جو اپنی سواری سے گر کر جاں بحق ہو جائے فرمایا کہ "اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور اسی کے دو کپڑوں میں کفن دے دو۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ فی الذی سقط عن راحلته ﴾ یہ ایک صحابی رسول تھے۔ حج کا احرام باندھے مقام عرفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنے اونٹ سے گر گئے اور ان کی گردن ٹوٹ گئی اور وفات پا گئے۔ ﴿ بماء وسدر ﴾ بیری کے پتوں کا طریق استعمال تین طرح پر ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو پانی میں ڈال کر اسے اتنا زور سے ہلائیں کہ اس کا جھاگ باہر نکل آئے۔ اس پانی سے میت کے جسم کو مل کر غسل دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو پانی میں خوب ابالیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو جلا کر راکھ بنا لی جائے اور اسے میت کے جسم پر خوب ملا جائے پھر خالص پانی سے بدن میت کو اچھی طرح صاف کیا جائے۔ یہ غسل دینا ایک ہی مرتبہ ہوگا۔ ﴿ کفنوہ ﴾ تکفین سے امر کا صیغہ ہے۔ (باب تفعیل ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) عرفات میں سواری پر جانا جائز ہے۔ (۲) اونٹ کی سواری بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ (۳) حالت احرام میں جو آدمی گر کر فوت ہو جائے اسے بھی پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔ (۴) انہی احرام کے کپڑوں ہی میں اسے دفن کیا جائے۔ نیا کفن خریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سر ڈھانکا نہ جائے اور نہ خوشبو ہی لگائی جائے۔ سر ننگا رکھنے اور خوشبو نہ لگانے کی حکمت یہ ہے کہ قیامت کے روز یہ اسی حالت میں لبیک اللھم کا تلبیہ پڑھتا ہوا ننگے سر اٹھے گا۔ (بخاری) بیری کے پتوں میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو اس سے بدن صاف اور نرم بھی ہو جاتا ہے اور دوسرا اس پر خرچ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس دور میں یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔ صابن وغیرہ کا استعمال غالباً نہ ہونے کے برابر تھا۔

(٤٣٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا أَرَادُوا غُسْلَ النَّبِيِّ ﷺ، قَالُوا: وَاللهِ مَا نَدْرِيْ نُجَرِّدُ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا أَمْ لاَ؟ اَلْحَدِيْثَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا اللہ کی قسم! ہمیں علم نہیں کہ ہم نبی ﷺ کے کپڑے اتاریں جس طرح ہم اپنے مرنے والوں کے کپڑے اتارتے ہیں یا نہ اتاریں؟ پھر ساری حدیث بیان کی۔ (احمد اور ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ ما ندری ﴾ یعنی ہمیں معلوم نہیں۔ ﴿ نجرد ﴾ تجرید سے ماخوذ ہے (باب تفعیل) بدن سے کپڑے اتارنا۔ مصنف مرحوم رحمہ اللہ نے اس حدیث کا ابتدائی حصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مکمل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسی تذبذب میں صحابہ کرامؓ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں انہوں نے کہنے والے سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو۔ لہٰذا صحابہ کرامؓ نے آپؐ کو بغیر کپڑے اتارے غسل دیا۔ یہ صحابہؓ کا اپنا تردد و تذبذب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو چونکہ دیگر مخلوق پر شرف و بزرگی حاصل ہے۔ اس لئے آپؐ کے بارے میں انہیں تردد ہوا کہ آپؐ کے کپڑے اتاریں یا نہ اتاریں۔ ورنہ ان کے ہاں میت کے کپڑے اتار کر غسل دینا بغیر کسی شک و ریب کے مشروع تھا۔ البتہ قابل ستر اعضاء کی پردہ پوشی واجب ہے۔

(٤٣٦) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ وَنَحْنُ نُغَسِّلُ ابْنَتَه، فَقَالَ: **«اغْسِلْنَهَا ثَلاَثاً أَوْ خَمْساً أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ، إِنْ رَأَيْتُنَّ ذَلِكَ، بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَاجْعَلْنَ فِي الأَخِيْرَةِ كَافُوراً، أَوْ شَيْئاً مِنْ كَافُورٍ»**، فَلَمَّا فَرَغْنَا آذَنَّاهُ، فَأَلْقَى إِلَيْنَا حِقْوَهُ، فَقَالَ: **أَشْعِرْنَهَا إِيَّاهُ.** مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: **«ابْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا»**. وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَضَفَّرْنَا شَعْرَهَا ثَلاَثَةَ قُرُونٍ، فَأَلْقَيْنَاهَا خَلْفَهَا.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے پاس اس وقت تشریف لائے جب ہم آپؐ کی صاحبزادی کو غسل دے رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "اسے تین یا پانچ مرتبہ' یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دو۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو' غسل پانی اور بیری کے پتوں سے دو' آخر میں کافور یا فرمایا کچھ کافور ڈالو" جب ہم فارغ ہوئیں تو ہم نے آپؐ کو اطلاع بھجوا دی آپؐ نے اپنا تہ بند اتار کر ہماری طرف پھینک دیا اور فرمایا "اسے جسم کے ساتھ لگا دو۔" (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ غسل دائیں طرف سے اور وضو کے اعضاء سے شروع کرنا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اس کے سر کے بالوں کو

تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کو پشت پر ڈال دیا۔

لغوی تشریح: ﴿ ونحن نغسل ابنتہ ﴾ مشہور روایت کے مطابق یہ آپؐ کی صاحبزادی، ابوالعاص کی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کی وفات ۸ھ کے آغاز میں ہوئی۔ ایک قول کے مطابق یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا ان دونوں کی وفات کے موقع پر حاضر تھیں۔ یہ صاحبہ خواتین کی میت کو غسل دیا کرتی تھیں۔ ﴿ ان رایتن ذلک ﴾ اگر تم یہ سمجھو کہ تین یا پانچ مرتبہ غسل دینے سے زائد کی ضرورت ہے تو زیادہ مرتبہ غسل دے سکتی ہو۔ ﴿ بماء و سدر ﴾ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ کا تعلق ﴿ اغسلنھا ﴾ کے ساتھ ہے یعنی غسل پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ دو۔ ﴿ فی الاخیرۃ کافورا ﴾ راوی کو تردد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کافور" کہا ہے یا ﴿ شیئا من کافور ﴾ فرمایا۔ جمہور کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخری دفعہ پانی میں کافور یا کچھ کافور ملا لینا۔ امام اوزاعی اور بعض علمائے احناف کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ غسل کے بعد جسم پر کافور ڈال دینا۔ نسائی کی حدیث کے الفاظ "واجعلن فی آخر ذلک کافورا" بظاہر اسی کے مؤید ہیں۔ ﴿ آذناہ ﴾ ایذان سے ماخوذ ہے۔ صیغہ جمع متکلم ہے۔ یعنی ہم نے آپؐ کو خبر دی۔ ﴿ حقوہ ﴾ "حا" پر فتحہ اور کسرہ بھی جائز ہے یعنی حاء کے نیچے کسرہ اور قاف ساکن ہے۔ اس سے مراد تہہ بند ہے۔ دراصل تو یہ تہبند باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مگر مجازی طور پر ازار کیلئے بولا جاتا ہے۔ ﴿ اشعرنھا ایاہ ﴾ اشعار سے امر کا صیغہ ہے۔ آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس تہبند کو بطور شعار استعمال کرو۔ "شعار" اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ آپؐ کے اس ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کی صاحبزادی کو اس سے برکت حاصل ہو۔ ﴿ ابدان ﴾ آغاز کریں، ابتداء کریں ﴿ بمیا منھا ﴾ میمنہ کی جمع ہے یعنی اس کی دائیں جانب سے۔ ﴿ فضفرنا شعرھا ﴾ ﴿ الضفر ﴾ مینڈھی، بالوں کو اس طرح بٹ دے کر یا بن کر ایک دوسرے میں داخل کرنا کہ وہ رسی کی مانند ہو جائیں۔ ﴿ ثلاثۃ قرون ﴾ قرن کی جمع ہے۔ مینڈھیوں کو کہتے ہیں۔ یہ مینڈھیاں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تحت بنائی گئیں۔

حاصل کلام: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ میت کو کم از کم تین مرتبہ غسل ضرور دینا چاہئے۔ البتہ بوقت ضرورت اگر زیادہ مرتبہ غسل دینے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر پانچ یا سات مرتبہ یعنی طاق کا لحاظ رکھ کر غسل دینا چاہئے۔ غسل کا آغاز بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد حصول برکت کی غرض سے کسی بزرگ کا خاص کپڑا پہنانا بھی جائز ہے۔ خاتون میت کے سر کے بالوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پیچھے ڈال دیئے جائیں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کر کے سینے پر ڈالنے کا کوئی صحیح ثبوت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دینا چاہئے۔ اور آخر میں کافور پانی میں ملا کر جسم پر ڈال دینا

چاہئے یا جسم پر کافور مل دینا چاہئے۔ کافور کے علاوہ خوشبو کا استعمال بھی جائز ہے۔

(٤٣٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُفِّنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ ثَلاثَةِ أَثْوَابٍ بِيْضٍ سَحُوْلِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيْهَا قَمِيْصٌ وَلاَ عِمَامَةٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سحولیہ کے ساختہ سوتی سفید رنگ کے تین کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ جس میں قمیص اور پگڑی نہیں تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ کفن ﴾ تکفین سے ماخوذ ہے ﴿ ثلاثة اثواب ﴾ یعنی تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ ﴿ بیض ﴾ "با" کے نیچے کسرہ ہے' بیض کی جمع ہے۔ ﴿ سحولیة ﴾ "سین" اور "حا" دونوں پر ضمہ اور یہ بھی منقول ہے سین پر فتحہ اور "حا" پر ضمہ۔ سحول کی طرف منسوب ہے۔ یمن کا ایک قصبہ یا بستی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتحہ کی صورت میں یہ قصار (دھوبی) کی طرف منسوب ہوگا۔ کیونکہ دھوبی کپڑے کو دھو کر صاف کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سحولیہ کا معنی تقیہ (صفائی و طہارت اور پاکیزگی و نظامت) کے ہوں گے۔ ﴿ کرسف ﴾ کاف پر ضمہ "را" ساکن اور سین پر ضمہ یعنی کپاس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت مرد ہو تو اسے تین کپڑوں میں کفن دینا چاہئے۔ ان کپڑوں میں نہ تو قمیص ہو اور نہ ہی پگڑی اور کفن میں سوتی کپڑا بہتر ہے۔ تین کپڑوں سے مراد جمہور کے نزدیک تین بڑی چادریں ہیں اور بعض کے ہاں اس سے مراد کفنی' تہہ بند اور بڑی چادر ہے۔

(٤٣٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا تُوُفِّيَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ جَاءَ ابْنُهُ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: أَعْطِنِيْ قَمِيْصَكَ أُكَفِّنْهُ فِيْهِ، فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ عبداللہ بن ابی جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا آپؐ اپنی قمیص عنایت فرما دیں کہ میں اس میں اسے کفن دے دوں۔ آپؐ نے اپنی قمیص اتار کر عنایت فرما دی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فاعطاه ﴾ اپنی قمیص عطا فرما دی۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تدفین سے پہلے ہوا ہے۔ لیکن بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اسے قبر میں داخل کر دیا گیا تھا۔ آپؐ نے اسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ اسے باہر نکالا گیا۔ پھر اسے اپنی قمیص پہنائی۔ ممکن ہے آپؐ نے پہلے قمیص دینے کا وعدہ فرمایا ہو' دفن کے بعد یہ وعدہ جب یاد دلایا گیا تو آپؐ نے قمیص عنایت فرما دی۔ آپؐ نے اپنی قمیص اس لئے عنایت فرمائی تھی کہ غزوۂ بدر کے اسیران کو آپؐ نے لباس دیئے تھے اور ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدی ہو کر آئے تھے ان کا قد لمبا تھا کسی کی قمیص انہیں پوری نہیں آتی تھی۔ عبداللہ بن ابی نے اپنی قمیص دی تو انہیں پوری آگئی۔ حضور ﷺ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے اس لئے یہ قمیص اس کو پہنائی۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو ضرورت کے وقت قبر میں داخل کرنے کے بعد باہر نکالنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کو انسانوں سے محبت و شفقت کتنی تھی' اس واقعہ سے اندازہ لگا لیں۔ اپنے احباب و اصحاب کی خواہش کا کتنا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ (بلکہ منافق کی خواہش کا بھی احترام کیا) راہنمایان و لیڈر حضرات کو بھی اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

راوی حدیث : ﴿ عبدالله بن ابی ﴾ جاہلیت میں خزرج کا سردار تھا اور بظاہر اسلام میں داخل ہونے کے بعد منافقین کا لیڈر بنا اور رئیس المنافقین کے لقب سے مشہور تھا۔ غزوۂ احد کے موقع پر لشکر اسلام کا تہائی حصہ لے کر واپس ہوگیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں مرکزی کردار اسی کا تھا۔ سورۂ منافقین میں آیت (لئن رجعنا الی المدینة ليخرجن الاعز منها الاذل) اسی کا قول ہے۔ ۹ھ میں ذی قعدہ میں فوت ہوا۔ "ابی" ہمزہ پر ضمہ اور یا پر تشدید۔ سلول اس کی ماں کا نام تھا۔

﴿ ابنه ﴾ اس سے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول مراد ہیں۔ عظیم صحابہؓ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام غزوات میں شریک رہے اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ ان کا رویہ اپنے باپ کے بارے میں بہت سخت تھا۔ جب عبداللہ بن ابی نے لئن رجعنا .... الخ کہا تھا تو انہوں نے اپنے باپ کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کی تھی۔ جاہلیت کے دور میں ان کا نام حباب تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔

(٤٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «البسُوا مِنْ ثِيَابِكُمُ البيضَ فَإِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ، وَكَفِّنُوا فِيهَا مَوْتَاكُمْ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرمِذِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "سفید لباس زیب تن کیا کرو یہ تمہارے ملبوسات میں بہترین اور عمدہ لباس ہے اور اپنے مرنے والوں کو بھی اس میں کفن دیا کرو۔" (نسائی کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید لباس آنحضور ﷺ کا پسندیدہ و محبوب لباس تھا۔ گو آپؐ نے کبھی کبھی رنگ دار لباس بھی زیب تن فرمایا ہے۔ مرنے والوں کو بھی سفید کفن ہی دینا چاہئے۔ بامر مجبوری دوسرے رنگ کا کپڑا بھی کفن میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(٤٤٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَفَّنَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے اچھا کفن دینا چاہئے۔" (مسلم)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اچھا و عمدہ کفن

دینے کا مطلب یہ ہے کہ کفن کا کپڑا صاف ستھرا اور عمدہ ہونا چاہئے اور وہ اس قدر ہو کہ میت کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لے۔ اچھے کفن سے مراد یہ نہیں کہ وہ قیمتی ہو۔ قیمتی کفن کی ممانعت آئندہ آرہی ہے۔

(٤٤١) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلَى أُحُدٍ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ: «أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذاً لِلْقُرْآنِ»؟ فَيُقَدِّمُهُ فِي اللَّحْدِ، وَلَمْ يُغَسَّلُوا، وَلَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِمْ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اور انہی (حضرت جابر رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ نبی ﷺ شہداء احد کے دو دو آدمیوں کو ایک لباس میں جمع کرتے تھے پھر فرمایا "ان میں سے قرآن کس کو زیادہ یاد تھا۔ جسے زیادہ یاد ہوتا' اسے لحد میں پہلے اتارتے۔ نہ تو ان شہداء کو غسل دیا گیا اور نہ ہی ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قتلی ﴾ قتیل کی جمع ہے۔ معنی مقتول کے ہی ہیں۔ ﴿ احد ﴾ "ہمزہ" اور "حا" دونوں پر ضمہ ہے۔ اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ مدینہ کے شمال میں مشہور و معروف پہاڑ کا نام ہے۔ غزوۂ احد اسی پہاڑ کے پاس لڑا گیا۔ جو تاریخ اسلام میں معروف ہے۔ یہ غزوۂ ۳ھ میں شوال کے مہینہ میں ہوا تھا جس میں ستر صحابہ کرامؓ نے جام شہادت نوش کیا اور نبی کریم ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ ﴿ ایھم اکثر اخذا للقران ﴾ جسے قرآن زیادہ ازبر ہو۔ ﴿ فیقدمه ﴾ تقدیم سے ماخوذ ہے یعنی اسے آگے رکھا جائے۔ ﴿ اللحد ﴾ میت کو قبر میں رکھنے کیلئے قبر کے پہلو میں جو شگاف رکھا جاتا ہے اسے لحد کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) ضرورت کے وقت ایک کفن میں دو آدمیوں کو کفنانا درست ہے۔ (۲) دو یا اس سے زیادہ میتوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنا بھی جائز ہے البتہ ان میں صاحب قرآن کو پہلے داخل کیا جانا چاہیے۔ (۳) شہداء فی سبیل اللہ کو غسل نہیں دیا جاتا۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے شہداء احد کے بارے میں فرمایا کہ "ان کو غسل مت دو۔ ان کا ہر ایک زخم قیامت کے روز مشک کی سی خوشبو دے رہا ہوگا۔" (۴) شہداء کا جنازہ بھی ضروری نہیں۔ جن روایات میں شہداء احد کی نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر تکبیریں کہنے کا ذکر ہے' امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ روایات صحیح نہیں۔ صحیح بخاری میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے آٹھ سال بعد شہدائے احد کا جنازہ پڑھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان کیلئے دعائے مغفرت ہے۔ ورنہ شہید کی نماز جنازہ کے قائلین مدت دراز کے بعد قبر پر جنازہ پڑھنے کے قائل کیوں نہیں؟

(٤٤٢) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «لَا تَغَالُوا فِي الْكَفَنِ، فَإِنَّهُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ سے فرماتے سنا کہ (بہت) قیمتی کفن نہ دیا کرو۔ وہ تو بہت جلد بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

يُسْلَبُ سَرِيعاً». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: ﴿ لا تغالوا ﴾ مغالاة سے ماخوذ ہے یا تغالی سے۔ اس صورت میں ایک "تا" محذوف ہوگا۔ اس کے معنی ہیں "بہت قیمتی" ﴿ یسلب ﴾ صیغۂ مجہول۔ بوسیدہ ہونے سے کنایہ ہے۔

حاصل کلام: بہت قیمتی کفن کی میت کو ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ دیر یا سویر بوسیدہ ہو جانا ہے۔ یہ روایت سنداً کمزور ہے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وفات کے وقت فرمان اس کا مؤید ہے کہ میری چادروں کو دھو کر مجھے انہی میں کفن دینا۔ زندہ آدمی نئے لباس کا میت سے زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ (بخاری)

(٤٤٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «لَوْ مُتِّ قَبْلِي لَغَسَّلْتُكِ»، اَلْحَدِيثُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں فرمایا کہ "اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہو جائے تو میں تمہیں غسل دوں گا۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شوہر اپنی اہلیہ کو غسل دے سکتا ہے۔ جمہور علماء اس کے قائل ہیں کہ خاوند اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کی تردید کرتا ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ (رسول اللہ ﷺ کی لخت جگر) کو خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خود غسل دیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں اور یہی بات راجح ہے۔

(٤٤٤) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَوْصَتْ أَنْ يُغَسِّلَهَا عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود یہ وصیت کی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود ان کو غسل دیں۔ (سنن دارقطنی)

حاصل کلام: وصیت کا پورا کرنا اسلام میں نہایت ضروری ہے۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔ وصیت بھی پوری ہوگئی اور خاوند کا اپنی بیوی کو غسل دینا بھی ثابت ہوگیا۔

راوی حدیث: ﴿ فاطمه بنت النبی رضی اللہ عنہا ﴾ نبی ﷺ کی سب سے چھوٹی لخت جگر تھیں۔ اس امت کی خواتین کی سردار۔ ۲ھ رمضان المبارک میں حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر پندرہ سال پانچ ماہ تھی۔ ۱۱ھ رمضان المبارک میں نبی ﷺ

کے چھ ماہ بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

(٤٤٥) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِيْ قِصَّةِ الغَامِدِيَّةِ، الَّتِيْ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجْمِهَا فِي الزِّنَا - قَالَ: ثُمَّ أَمَرَ بِهَا، فَصُلِّي عَلَيْهَا وَدُفِنَتْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے غامدیہ کے قصہ میں مروی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ارتکاب زنا کی پاداش میں رجم و سنگساری کا حکم دیا تھا کہ آپؐ نے اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا پھر خود اس کی جنازہ پڑھی اور اسے دفن کیا گیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ في قصة الغامدية ﴾ غامدیہ غامد کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے غامدیہ کہلائی۔ جہینہ کی ایک شاخ تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ اس خاتون نے نبی ﷺ کے روبرو خود اس کا اعتراف کیا کہ وہ زنا سے حاملہ ہے۔ لہٰذا نبی ﷺ نے بچہ کا دودھ پلائی کا زمانہ گزار کر دودھ چھڑانے کے بعد رجم کا فیصلہ فرمایا اور حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ رجم کہتے ہیں مجرم کو پتھروں سے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے شرعی حد لگی ہو اور وہ جاں بحق ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

حاصل کلام: صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ آنجناب ﷺ نے بذات خود غامدیہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی تھی۔ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے مثلاً خود کشی کرنے والا زنا کرنے والد وغیرہ کے بارے میں قاضی عیاض نے کہا ہے کہ علماء کے نزدیک ان کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام اور مفتی کو فاسق کا جنازہ پڑھانے سے گریز کرنا چاہئے' تاکہ فساق کو اس سے عبرت حاصل ہو۔

(٤٤٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَتَلَ نَفْسَهُ بِمَشَاقِصَ، فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی لایا گیا جس نے تیر سے خودکشی کی تھی۔ آپؐ نے اس کی نماز نہ پڑھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اتی ﴾ صیغۂ مجہول لایا گیا ﴿ بمشا قص ﴾ مشقص کی جمع۔ مشقص کے میم کے نیچے کسرہ ہے۔ چوڑا نیزہ' ﴿ فلم یصل علیہ ﴾ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔ یعنی بطور عبرت اور اس جیسا فعل کرنے والوں کو خوف زدہ کرنے اور ڈرانے' دھمکانے کیلئے آپؐ نے نماز جنازہ نہ پڑھی۔

حاصل کلام: خود کشی کرنے والے کی نمازہ جنازہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ قوم کے معزز و فضلاء تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے۔ البتہ عام لوگ پڑھیں گے کیونکہ نسائی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔" یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے نماز جنازہ پڑھی تھی۔ جیسے ابتداء میں آپؐ مقروض کا جنازہ

نہیں پڑھتے تھے البتہ صحابہ ؓ کو فرما دیتے تھے کہ تم جنازہ پڑھو۔

(٤٤٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تُعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ المَرأَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ - قَالَ: فَسأَلَ عَنْهَا النَّبِيُّ ﷺ، فَقَالُوا: مَاتَتْ، فَقَالَ: «أَفَلاَ كُنْتُمْ آذَنْتُمُونِيْ»؟ - فَكَأَنَّهُمْ صَغَّرُوا أَمْرَهَا - فَقَالَ: «دُلُّوْنِيْ عَلَى قَبْرِهَا»، فَدَلُّوْهُ، فَصَلَّى عَلَيْهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس عورت کے بارے میں جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی' روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس کے متعلق صحابہ کرام ؓ سے دریافت فرمایا تو صحابہ کرام ؓ نے جواب دیا کہ وہ فوت ہو چکی ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا "تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ گویا انہوں نے اس کے معاملہ' وفات کو معمولی خیال کیا۔ آپ ؐ نے فرمایا مجھے اس کی قبر کا راستہ بتاؤ۔" انہوں نے آپ کو اس کی قبر کر راستہ بتا دیا۔ آپ ؐ نے وہاں جا کر قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

وَزَادَ مُسْلِمٌ: ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ هَذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلَى أَهْلِهَا، وَإِنَّ اللَّهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلاَتِيْ عَلَيْهِمْ».

اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے پھر آپ ؐ نے فرمایا "یہ قبریں اہل قبور کیلئے اندھیروں سے بھری ہوئی ہیں اور میری نماز سے ان کی قبروں میں روشنی ہو جاتی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ تقم ﴾ قاف پر ضمہ اور میم پر تشدید یعنی جھاڑو دیا کرتی تھی۔ لکڑیوں' کپڑے کے چیتھڑوں کے ذریعہ کوڑا کرکٹ اور غبار اور بھوسا وغیرہ نکال باہر کرتی تھی۔ یہ خاتون سیاہ فام تھی اور اس کا نام ام محجنؓ تھا۔ ﴿ آذنتمونی ﴾ اس کی وفات کی مجھے اطلاع دیتے کہ میں بھی اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ ﴿ صغروا ﴾ نبی ﷺ کی عظمت کے پہلو کے اعتبار سے انہوں نے اس کی وفات کو معمولی اور حقیر سمجھا۔ ﴿ دلونی ﴾ دال پر ضمہ۔ دلالت سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿ فدلوہ ﴾ دال پر فتحہ اور لام پر ضمہ دلالت سے ماضی کا صیغہ ہے۔ ﴿ ظلمۃ ﴾ منصوب ہے تمییز واقع ہونے کی بنا پر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر بھی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ گو تدفین سے پہلے بھی اس پر نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہو۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ بھی آپ ؐ نے ایک ماہ بعد ان کی قبر پر پڑھی تھی کیونکہ ان کی وفات کے وقت آپ ؐ مکہ مکرمہ میں تھے۔ (۲) مرنے والے کی قبر وہی ہے جہاں اسے دفن کیا ہو۔ انہی قبروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان میں تاریکی ہی تاریکی ہے روشنی نام کی کوئی چیز نہیں۔۔ (۳) مسجد کی صفائی کرنے والے کا مرتبہ اور مقام بہت بلند ہے۔ (۴) مسجد کی صفائی مسلمان خاتون بھی کر سکتی ہے۔ (۵) مسجد کو صاف ستھرا اور پاک رکھنا

ضروری ہے۔ صفائی' جھاڑو سے بھی کی جا سکتی ہے اور کپڑے سے بھی۔ (٦) نبی ﷺ کی غریبوں سے محبت کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ آپ ؐ کو اپنے کارکن مرد و عورت دونوں سے کس قدر تعلق اور لگاؤ تھا۔

(٤٤٨) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْهَى عَنِ النَّعْيِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ موت کے لئے کھلے عام منادی سے منع فرمایا کرتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ النعی ﴾ موت کی اطلاع دینا۔ مجرد اطلاع دینا۔ مجرد اطلاع تو ممنوع نہیں ہے بلکہ جاہلیت کے دور کے طریقے سے منادی کرنا ممنوع ہے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ اس منادی میں نوحہ ہوتا اور مرنے والے کے افعال حمیدہ بیان کئے جاتے تھے۔

(٤٤٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَعَى النَّجَاشِيَّ فِي الْيَوْمِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ، وَخَرَجَ بِهِمْ إِلَى الْمُصَلَّى، فَصَفَّ بِهِمْ، وَكَبَّرَ عَلَيْهِ أَرْبَعاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نجاشی کی خبر وفات اسی روز دی جس روز وہ فوت ہوا تھا۔ آپ ؐ صحابہ کرام ؓ کو لے کر جنازگاہ کی طرف تشریف لے گئے۔ صف بندی کروائی اور اس پر چار تکبیریں کہیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کی موت کی اطلاع دینا ثابت ہو رہا ہے اور نماز غائبانہ بھی ثابت ہو رہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں۔ مگر احناف اور مالکی علماء اسے آپ ؐ کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ خطابی رحمہ اللہ وغیرہ کا خیال ہے کہ اگر کسی نے جنازہ نہ پڑھی ہو تو غائبانہ اس کی نماز جنازہ پڑھنی چاہیئے۔ یہ بات گو وزنی ہے مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ نجاشی پر حبشہ میں نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔

راوی حدیث: ﴿ نجاشی رضی اللہ عنہ ﴾ نون پر فتحہ۔ حبشہ کے بادشاہ کا لقب۔ جیسا کہ روم کے بادشاہ کو قیصر اور ایران کے بادشاہ کو کسریٰ کہتے تھے۔ نجاشی کا اصل نام اصحمہ بن ابجر رضی اللہ عنہ تھا۔ کفار مکہ کے فتنہ سے اپنے دین کو بچانے کیلئے مسلمانوں نے اسی بادشاہ کے دور میں حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ نبی ﷺ نے ٦ھ کے آخر میں یا محرم ٧ھ میں عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس نے آپ ؐ کے مکتوب گرامی کو بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں سے بھی لگایا اور اپنے تخت شاہی سے نیچے اتر آیا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور نبی ﷺ کو یہ ساری صورتحال تحریر کر کے بھجوا دی۔ غزوۂ تبوک ٩ھ کے بعد ماہ رجب میں وفات پائی۔ پھر نبی ﷺ نے اس کے نائب کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

(٤٥٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوتُ، فَيَقُومُ عَلَى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُونَ رَجُلاً، لاَ يُشْرِكُونَ بِاللهِ شَيْئاً، إِلاَّ شَفَّعَهُمُ اللَّهُ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ "کوئی مسلمان نہیں مرتا کہ اس کے جنازے میں ایسے چالیس آدمی شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس مرنے والے کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرما لیتا ہے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کثرت جنازہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں چالیس موحد لوگوں کی شفاعت کا ذکر ہے کہ بعض دوسری احادیث میں سو کی تعداد بھی ہے اور بعض میں تین صفوں کا ذکر بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائلین کے جواب میں موقع محل کے اعتبار سے آپؐ نے تعداد کا ذکر فرمایا دیا۔

(٤٥١) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى امْرَأَةٍ مَاتَتْ فِي نِفَاسِهَا، فَقَامَ وَسْطَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے پیچھے ایک ایسی عورت کی نماز جنازہ پڑھی جو حالت نفاس میں فوت ہوئی تھی۔ آپؐ اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی نفاسھا ﴾ بچے کی پیدائش کے ایام میں۔ یہ خاتون ام کعب انصاریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت اگر عورت ہو تو امام میت کے درمیان میں کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھائے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مسند امام احمد' ابوداؤد' ترمذی وغیرہ میں ہے کہ میت اگر مرد ہو تو امام کو اس کے سر کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھانی چاہئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اس کے برعکس علمائے احناف عموماً مرد و عورت کے دل کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھاتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں بلکہ نص صریح کے مقابلہ میں محض قیاس پر عمل کرتے ہیں کہ دل منبع ایمان ہے اس لئے دل کے برابر کھڑا ہونا چاہئے۔ مگر یہ حقیقتاً حدیث کے خلاف ہے۔

(٤٥٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: وَاللهِ لَقَدْ صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى ابْنَيْ بَيْضَاءَ فِي المَسْجِدِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا فرمائی۔ (مسلم)

حاصل کلام: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا نبی ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ دونوں مسجد میں نماز جنازہ کو مکروہ سمجھتے ہیں حالانکہ کوئی شرعی و نقلی دلیل ان کے پاس نہیں۔ بلکہ ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا۔ نیز مسند سعید منصور میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد دوم کا جنازہ بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا۔ اگر ایسا کرنا ناجائز و مکروہ ہوتا تو خلفاء راشدین اس پر عمل نہ کرتے۔ نبی ﷺ کے اپنے عمل سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے بغیر کسی قسم کی کراہت کے مسجد میں جنازہ پڑھا جا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بیضاء﴾ سھل اور سھیل کی والدہ کا لقب ہے۔ ان کا نام دعد بنت جحدم فھریہ ہے اور ان کے خاوند کا نام وھب بن ربیعہ قرشی ہے۔ سھل تو ان لوگوں میں سے تھا جس نے قریش کے اس صحیفہ کو پاش پاش کیا تھا جس میں قریش نے بنو ہاشم اور مسلمانوں سے مقاطعہ کی قرارداد کی تھی۔ ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام کے قبول کا اظہار مکہ ہی میں کر دیا تھا اور ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام لانے کو چھپائے رکھا۔ اسی حالت میں بدر میں حاضر ہوئے۔ مسلمانوں نے اسے بھی قیدی بنا لیا مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے شہادت دی کہ میں نے ان کو مکہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے تو ان کی شہادت پر آزادی دے دی گئی۔ انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔ رہے سھیل تو وہ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی ہجرت اور ہجرت مدینہ دونوں میں شریک رہے ہیں۔ بدر اور باقی تمام غزوات میں شامل رہے ہیں۔ غزوۂ تبوک ۹ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔ بیضاء کے تین بیٹے مشہور تھے۔ دو تو یہ تھے اور تیسرا صفوان تھا۔ غزوۂ بدر میں قتل ہو کر جام شہادت نوش کیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کے کافی عرصہ بعد وفات پائی ہے۔

(٤٥٣) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى قَالَ: كَانَ زَيْدُ بْنُ أَرْقَمَ يُكَبِّرُ عَلَى جَنَائِزِنَا أَرْبَعاً، وَأَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى جَنَازَةٍ خَمْساً، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُكَبِّرُهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَالأَرْبَعَةُ.

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہتے تھے مگر (خلاف معمول) ایک مرتبہ انہوں نے پانچ تکبیریں کہیں تو میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ بھی پانچ تکبیریں کہتے تھے۔ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں چار سے زیادہ تکبیریں بھی جائز ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پانچ' چھ' سات اور آٹھ تکبیریں بھی منقول ہیں۔ مگر اکثر روایات میں چار

تکبیروں کا ذکر ہے۔ بیہقی وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے چار تکبیریں کہنے کا حکم فرمایا۔ بعض نے اسے اجماع قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے چار سے زائد تکبیریں بھی ثابت ہیں۔ چوتھی تکبیر کے بعد کی تکبیرات میں میت کیلئے دعا ہوتی ہے۔ تکبیرات جنازہ میں رفع الیدین صحابہ سے ثابت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں بلکہ بعض علمائے احناف کا بھی اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابن ابی لیلی ﴾ انصاری مدنی ہیں۔ پھر کوفہ میں منتقل ہونے کی وجہ سے کوفی کہلائے۔ کبار تابعین میں سے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے سماع ثابت ہے۔ ان کی کنیت ابوعیسیٰ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اختتام میں ابھی چھ سال باقی تھے۔ جب ان کی پیدائش ہوئی۔ ۸۶ھ میں معرکہ جماجم میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ نہر بصرہ میں ڈوب کر جاں بحق ہوئے۔

(٤٥٤) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ سِتّاً، وَقَالَ: إِنَّهُ بَدْرِيٌّ. رَوَاهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ. وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ میں چھ تکبیریں کہیں اور فرمایا کہ وہ بدری تھے۔ (اسے سعید بن منصور نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ بدری ﴾ بدری ہیں سے مراد ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ بدری ہونے کا شرف و بزرگی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے چھ تکبیریں کہیں کہ اس طرح اس کیلئے زیادہ دعا مانگی جا سکے۔

حاصل کلام: اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ چار سے زائد تکبیریں کسی کی بزرگی اور شرف کا لحاظ رکھتے ہوئے کہی جا سکتی ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ ﴾ حنیف تصغیر ہے حنیف کی۔ انصاری اوسی مدنی۔ بدر اور باقی غزوات و مشاہد میں حاضر تھے۔ غزوۂ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بصرہ پر عامل مقرر کیا اور صفین میں بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہجرت مدینہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے مابین مؤاخاۃ ہوئی۔ ۳۸ھ میں وفات پائی۔

(٤٥٥) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُكَبِّرُ عَلَى جَنَائِزِنَا أَرْبَعاً، وَيَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِي التَّكْبِيرَةِ الأُولَى. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہا کرتے تھے اور پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ (بھی) پڑھتے تھے۔ (اسے شافعی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس سے اور آئندہ آنے والی روایت دونوں سے ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کی پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ پڑھنا مسنون ہے۔ اب یہ کہنا کہ قراءت کی نیت سے نہ پڑھے بلکہ صرف دعا کی نیت سے

پڑھے۔ محض ایسی تاویل ہے جس کی پشت پر کوئی شرعی دلیل نہیں۔ نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ عصر کا پڑھنا بھی منقول ہے۔ اس سورۂ میں تو دعا کا کوئی اشارہ اور لفظ تک نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو سورۂ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا واجب ہے۔ اور بعض حضرات اس کی مشروعیت کے قائل نہیں۔ مگر اس کی عدم مشروعیت پر کوئی صحیح دلیل نہیں۔

(٤٥٦) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عَوْفٍ، قَالَ: صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلَى جَنَازَةٍ، فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الكِتَابِ، فَقَالَ لِتَعْلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ انہوں نے اس میں سورۂ فاتحہ پڑھی اور فرمایا (میں نے اس لئے سورۂ فاتحہ پڑھی ہے) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ لتعلموا انها سنة ﴾ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ یہ طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہے۔ یہاں سنت سے وہ سنت مراد نہیں جو فرض کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ یہ فقہاء کرام کی جدید اصطلاح ہے۔ لہٰذا یہ اس کے وجوب کے منافی نہیں۔

حاصل کلام: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۂ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی اور وجہ بھی بیان کر دی کہ تمہیں بتانے کیلئے کہ یہ مسنون ہے۔ گویا نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ اونچی آواز سے پڑھنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ طلحه بن عبدالله بن عوف ﴾ عبدالرحمٰن بن عوف مشہور و معروف صحابی کے بھائی کے بیٹے تھے۔ طلحہ ندی کے لقب سے مشہور تھے۔ ثقہ اور بڑے پایہ کے فقیہہ تھے۔ اوساط تابعین میں شمار کئے گئے ہیں۔ ۹۷ھ میں ۷۲ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔

(٤٥٧) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى جَنَازَةٍ، فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهِ «اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ، وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ، وَالثَّلْجِ، وَالبَرَدِ. وَنَقِّهِ مِنَ الخَطَايَا، كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِّنْ دَارِهِ، وَأَهْلاً خَيْراً مِنْ أَهْلِهِ، وَأَدْخِلْهُ

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی۔ میں نے آپؐ کی دعا میں سے اتنا حصہ یاد کر لیا۔ "اے اللہ! اس کی مغفرت فرما دے' اس پر رحم فرما' اسے عافیت و آرام سے رکھ۔ اس سے درگزر فرما۔ اس کی مہمان نوازی اچھی فرما۔ اس کی قبر کشادہ و فراخ کر دے' اسے پانی' برف اور ژالوں سے دھو دے (بالکل صاف کر دے) اسے گناہوں سے ایسا صاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے اور اسے اس دنیاوی گھر سے بہتر اور عمدہ گھر اور

الْجَنَّةَ، وَقِهِ فِتْنَةَ الْقَبْرِ، وَعَذَابَ النَّارِ» . رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اہل و عیال سے بہتر اہل و عیال عطا فرما' اسے جنت میں داخل فرما' اسے قبر کے فتنہ و آزمائش اور عذاب دوزخ سے محفوظ رکھ۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نزلہ ﴾ "نون" اور "زا" دونوں پر ضمہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "زاء" ساکن ہو۔ خورد و نوش کی مہمان کے سامنے پیش کی جانے والی کوئی چیز اور یہاں اجر و ثواب مراد ہے۔ ﴿ وسع ﴾ توسیع باب تفعیل سے۔ کشادہ و وسیع کر۔ ﴿ مدخلہ ﴾ میم پر ضمہ' جائے داخلہ۔ مراد یہاں قبر ہے۔ ﴿ البرد ﴾ "با" اور "را" دونوں پر فتحہ اولے مراد ہیں۔ ﴿ نقہ ﴾ "قاف" پر تشدید۔ تنقیۃ سے ماخوذ ہے' دعا ہے کہ پاک کر دے صاف ستھرا کر دے۔ ﴿ الدنس ﴾ دال اور نون دونوں پر فتحہ میل کچیل۔ ﴿ ابدلہ ﴾ ابدال سے ماخوذ ہے (باب افعال) بدل دے۔ اس کے عوض دے ﴿ وقہ ﴾ اس میں واؤ عطف کی ہے۔ "قاف" کے نیچے کسرہ ہے۔ وقایۃ سے ماخوذ ہے۔ دعا ہے اور "ھاء" ضمیر میت کی طرف راجع ہے۔ بچا اسے' حفاظت فرما اس کی' محفوظ رکھ اسے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ نے یہ دعا بھی بلند آواز سے پڑھی تھی۔ تبھی تو حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے اسے یاد کر لیا تھا۔ ابوداؤد وغیرہ میں تو "سمعت" کا لفظ صراحتاً منقول ہے کہ میں نے یہ دعا آپ ؐ سے سنی اور یہ بھی امکان ہے کہ راوی نے آپ ؐ سے بعد میں پوچھ کر یاد کر لیا ہو۔ اکثر فقہاء کی رائے یہی ہے کہ دعا آہستہ مانگی جائے اور بعض بآواز بلند کے بھی قائل ہیں۔ بعض نے یہ بھی رائے دی ہے کہ رات کے اوقات میں بآواز بلند اور دن میں آہستہ آواز سے مانگی چاہئے۔ دعا میں چونکہ افضل یہ ہے کہ آہستہ مانگی جائے اس لئے اکثر فقہاء نے آہستہ پڑھنے کو راجح قرار دیا ہے اور اکثر احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرح بطور تعلیم اونچی آواز سے پڑھا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ ﴾ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ قبیلہ اشجع سے تعلق کی وجہ سے اشجعی کہلائے۔ غزوۂ خیبر میں پہلی مرتبہ شریک جہاد ہوئے۔ فتح مکہ کے روز قبیلہ اشجع کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ ۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

(٤٥٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ، يَقُولُ: «اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا، وَمَيِّتِنَا، وَشَاهِدِنَا، وَغَائِبِنَا، وَصَغِيرِنَا، وَكَبِيرِنَا، وَذَكَرِنَا، وَأُنْثَانَا، اللّٰهُمَّ مَنْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کی نماز جنازہ پڑھتے تو یہ دعا مانگتے۔ "الٰہی! ہمارے زندوں اور مردوں' ہمارے حاضر و غائب' ہمارے چھوٹوں اور بڑوں' ہمارے مردوں اور عورتوں کی مغفرت و بخشش فرما دے۔ الٰہی! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور

أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الإِسْلاَمِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الإِيمَانِ، اللَّهُمَّ لاَ تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ، وَلاَ تَفْتِنَّا بَعْدَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالأَرْبَعَةُ.

جسے تو موت دے اسے ایمان کی موت سے سرفراز فرما۔ الٰہی! ہمیں اس کے اجر و ثواب سے محروم نہ رکھیو اور نہ ہمیں اس کے بعد گمراہ کرنا۔ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شاهدنا ﴾ جو حاضر ہیں۔ ﴿ صغیرنا ﴾ کم عمر اور چھوٹے عمر والوں کے حق میں بلندی درجات کی دعا یا اس کی دعا کہ اللہ تعالیٰ تکلیف و مصیبت کے وقت افعال صالحہ پر ثابت قدم رکھے۔ ﴿ فاحیه ﴾ احیاء سے ماخوذ ہے۔ زندگی کی دعا۔ ﴿ لا تحرمنا ﴾ "تا" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ حرمان سے ماخوذ و مشتق ہے۔ نہ محروم رکھ ہمیں۔ ﴿ اجره ﴾ اس کی موت کی وجہ سے ہمیں جو صدمہ پہنچا ہے اس پر صبر کے اجر سے۔ ﴿ لاتفتنا ﴾ دوسرے "تا" کے نیچے کسرہ اور نون جمع پر تشدید۔ باب ضرب یضرب سے اور فعل کے نون کو نون متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ یعنی ہمیں اس کی موت کے بعد فتنہ و آزمائش میں مبتلا نہ کرنا بلکہ اس کی موت کو ہمارے لئے مقام عبرت بنا دے۔ یہ حدیث مسلم میں نہیں ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ کسی کاتب کی کرم فرمائی ہے' مصنف کی نہیں۔

(٤٥٩) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى المَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو خوب خلوص دل سے اس کیلئے دعا کرو۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: نماز جنازہ پڑھنے والے کیلئے مرنے والے دراصل رب کائنات کے حضور اس کی بخشش کی سفارش کرتے ہیں۔ ہر سفارشی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی سفارش قبول ہو اس لئے سفارش کرنے والا بڑی آہ و زاری اور درد دل سے سفارش کرتا ہے۔ یہ میت کا آخری وقت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کیلئے جتنے خلوص قلب سے دعا کی جا سکتی ہو کرنی چاہئے۔ لیکن بعض لوگ تو صرف رسم ہی پوری کرتے ہیں۔ خلوص نام کی چیز بہت ہی کم نظر آتی ہے اور دو تین منٹ میں جنازے کا جھٹکا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

(٤٦٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «أَسْرِعُوا بِالجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً، فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوَى ذَٰلِكَ، فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جنازہ لے جانے میں جلدی کیا کرو۔ اس لئے کہ اگر مرنے والا صالح اور نیک آدمی تھا تو اس کیلئے بہتر ہو گا کہ اسے بہتر جگہ کی طرف جلدی لے جاؤ اور اگر دوسرا ہے (برا آدمی ہے) تو اپنی گردن

رِقَابِكُمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سے اتار کر رکھ دو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اسرعوا ﴾ موت کے وقوع کے یقینی ہونے کے بعد میت کو جلدی لے جاؤ اور تجہیز و تکفین میں جلدی کرو ﴿ تضعونه ﴾ وضع سے ماخوذ ہے جس کے معنی اتار کر رکھ دینے کے ہیں۔ یہ حمل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جس کے معنی اٹھانا ہوتا ہے اور یہ کنایۃً "اپنے سے دور کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کے دفن کرنے میں بلا ضرورت تاخیر کرنا خلاف سنت ہے۔ میت کو جلدی دفن کرنے کی تاکید حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمائی تھی۔ نیز طبرانی میں سند حسن سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو موت آجائے تو اسے روک نہ رکھو بلکہ اسے قبر کی طرف جلدی سے لے جاؤ۔"

(٤٦١) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ الجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتَّى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيرَاطَانِ»، قِيلَ: وَمَا القِيرَاطَانِ؟ قَالَ: «مِثْلُ الجَبَلَيْنِ العَظِيمَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «حَتَّى تُوضَعَ فِي اللَّحْدِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے اسے ایک قیراط کے برابر ثواب ملے گا اور جو شخص دفن ہونے تک حاضر رہے اسے دو قیراط اجر ملے گا۔" دریافت کیا گیا کہ دو قیراط سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "دو قیراط دو بڑے پہاڑوں کے برابر۔" (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے "میت کو قبر میں اتارے جانے تک حاضر رہے۔"

وَلِلْبُخَارِيِّ: «مَنْ تَبِعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً، وَكَانَ مَعَهَا حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهَا وَيُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيرَاطَيْنِ، كُلُّ قِيرَاطٍ مِثْلُ جَبَلِ أُحُدٍ».

اور بخاری کی روایت میں ہے "جس نے کسی مسلمان کے جنازہ میں ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے شرکت کی اور نماز جنازہ کے اختتام تک اس کے ساتھ بھی رہا اور تدفین سے فراغت کے بعد واپس لوٹا تو وہ دو قیراط لے کر واپس لوٹا۔ ہر قیراط احد پہاڑ کی مقدار کے برابر ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ قیراط ﴾ "قاف" کے نیچے کسرہ۔ نصف دانق اور دانق درہم کا چھٹا حصہ۔ قیراط سمجھ میں جلدی آجانے والا پیمانہ وزن تھا اس لئے قیراط بولا گیا ہے۔ اس زمانہ میں کام کی اجرت قیراط کی صورت میں دی جاتی تھی۔ مذکور قیراط وزن کے اعتبار سے تو بالکل معمولی اور حقیر ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیراط بڑا عظیم ہے اور یہی بتانا مطلوب و مقصود تھا کہ اس کو دنیاوی قیراط نہ سمجھنا بلکہ وہ پہاڑوں جتنا عظیم ہے۔ ﴿ ایمانا و

احتسابا ﴾ دونوں منصوب ہیں علت کی بنا پر یا پھر حال واقع ہو رہے ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جنازہ میں شرکت کے ساتھ طلب اجر و ثواب کی غرض ہو۔ دکھلاوا اور اہل میت کے ہاں حاضری لگوانے کی نیت نہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ ادا کرنے کے ثواب کو تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مومن کی نماز جنازہ پڑھنے کا بہت بڑا ثواب ہے۔ اہل ایمان کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ جنازہ میں شرکت کا اہتمام کریں۔ اس روایت میں لفظ "قیل" سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ ابو عوانہ میں ہے کہ انہوں نے یہ سوال آپ ؐ سے کیا تھا کہ قیراط کیا ہے؟

(٤٦٢) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ، يَمْشُونَ أَمَامَ الجَنَازَةِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ النَّسَائِيُّ وَطَائِفَةٌ بِالإِرْسَالِ.

حضرت سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو جنازے کے آگے چلتے دیکھا ہے۔ (اس کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی اور ایک گروہ نے اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول کہا ہے)

حاصل کلام: جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانے کی صورت میں آگے چلنا چاہئے یا پیچھے۔ مختلف روایات سے آپ ؐ کا عمل دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرح ثابت ہے مگر بہتر کونسا ہے؟ اس میں ائمہ کرام کی آراء مختلف ہیں۔ جمہور علماء امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ تینوں ائمہ آگے آگے چلنے کو بہتر خیال کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اوزاعی رحمہ اللہ پیچھے چلنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آگے پیچھے ہر سمت چلنا جائز ہے۔ کسی پر فوقیت و برتری اور ترجیح نہیں۔ چلنے والے جس طرح سہولت پائیں، اس پر عمل کریں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ پیدل چلنے والے آگے چلیں اور سوار جنازے کے پیچھے پیچھے۔ یہ رائے سفیان ثوری اور کچھ دیگر علماء کی ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر جنازے کے ساتھ خواتین بھی ہوں تو اس صورت میں مردوں کو جنازے کے آگے چلنا بہتر ہے ورنہ پیچھے چلیں گے۔ بہرحال جس طرح کی صورت درپیش ہو چلنے والے اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسی کو اختیار کر سکتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ سالم ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ یا ابو عمر ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے۔ سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب۔ سادات تابعین میں سے تھے اور مدینہ طیبہ کے فقہاءِ سبعہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم و فضل میں اپنے والد سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ ۱۰۶ھ میں ذی القعدہ یا ذی الحجہ کے مہینے میں فوت ہوئے۔

(٤٦٣) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الجَنَائِزِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں جنازوں میں شرکت سے منع کر دیا گیا مگر یہ ممانعت ہم پر لازمی قرار نہیں دی گئی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نھینا ﴾ صیغہ مجہول ہے مگر یہ مرفوع کے حکم میں ہے بلکہ بخاری میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا۔ ﴿ لم یعزم ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی یہ ممانعت ہمارے لئے لازمی قرار نہیں دی گئی بلکہ یہ نفی کراہت و ناپسندیدگی کیلئے تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے خواتین کی جنازوں میں شرکت ممنوع معلوم ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ پہلے خواتین کو جنازوں میں شریک ہونے اور قبرستان میں جانے سے منع فرما دیا گیا ہو مگر جب ان میں اسلامی شعور کافی حد تک بیدار ہوگیا تو جس طرح آپؐ نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی اسی طرح جنازہ میں شرکت کی بھی اجازت دے دی ہو۔ چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے نسائی' ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ ایک جنازہ میں عورتیں شریک ہوئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکنا چاہا مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انہیں جانے دو۔"

(٤٦٤) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمُ الجَنَازَةَ فَقُومُوا، فَمَنْ تَبِعَهَا فَلاَ يَجْلِسْ حَتَّى تُوضَعَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی جنازے کو آتے دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ۔ نیز جو شخص جنازے کے ساتھ ہو وہ جنازے کے زمین پر رکھے جانے سے پہلے نہ بیٹھے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فقوموا ﴾ امر کا صیغہ ہے مگر یہاں امر استحباب کے معنی میں ہے یا یہ حکم اب منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے آخری دو ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے قیام چھوڑ دیا تھا (حتی توضع) آدمیوں کے کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھنے تک اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قبر میں اتارنے تک۔ دونوں کا احتمال ہے مگر پہلا قول راجح ہے۔ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنے کی ممانعت بھی استحباب پر محمول ہے وجوب پر نہیں۔

حاصل کلام: موت کا عمل انسان کیلئے اضطراب اور بے چینی و بے قراری کا باعث ہوتا ہے۔ نیز میت کے ہمراہ فرشتے بھی ہوتے ہیں اس لئے ان کے احترام میں کھڑے ہونا لائق اعتبار ہے۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؐ کو علم ہوا کہ جنازہ کیلئے کھڑا ہونا یہودیوں کا طریقہ ہے تو آپؐ نے بیٹھنے اور یہودیوں کی مخالفت کا حکم فرمایا۔ اس بنا پر بعض نے کھڑے ہونے کے حکم کو منسوخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس حکم کو محض استحباب پر محمول کیا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنا نہیں چاہئے۔ نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ نبی ﷺ کسی جنازے پر حاضر ہوئے ہوں اور جنازے کے زمین پر رکھے جانے سے پہلے ہی زمین پر بیٹھ گئے ہوں۔

(٤٦٥) وَعَنْ أَبِيْ إِسْحَاقَ، أَنَّ

حضرت ابو اسحٰق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن

عَبْدَ اللهِ بْنَ يَزِيْدَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَدْخَلَ الْمَيِّتَ مِنْ قِبَلِ رِجْلَيِ الْقَبْرِ، وَقَالَ: هٰذَا مِنَ السُّنَّةِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

یزید رضی اللہ عنہ نے میت کو اس کے پاؤں کی طرف سے قبر میں اتارا اور کہا کہ سنت طریقہ یہی ہے۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ من رجل القبر ﴾ یعنی اس جانب سے جس جانب سے میت کے پاؤں ہوتے ہیں یہ حال کا اطلاق محل پر ہے۔ یعنی حال بول کر محل مراد لیا ہے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں پاؤں کی جانب سے اتارنا چاہئے۔ اہل حجاز میں اسی پر عمل تھا اور اسی کو امام شافعیؒ و احمدؒ نے اختیار کیا ہے اور یہی افضل ہے کیونکہ کوئی صحیح روایت اس کے برعکس ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابواسحاق ﴾ عمرو بن عبداللہ سبیعی ہمدانی کوفی۔ مشہور تابعی کثیرالروایہ۔ مگر تدلیس کرتے تھے۔ آخر عمر میں ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابھی دو سال باقی تھے کہ ان کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

﴿ عبداللہ ابن یزید رضی اللہ عنہ ﴾ خطمی انصاری۔ قبیلہ اوس سے تھے۔ جس وقت صلح حدیبیہ میں حاضر ہوئے اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ کوفہ میں آئے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے عہد میں کوفہ کے والی تھے۔ اسی دور میں کوفہ میں فوت ہوئے۔

(٤٦٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِذَا وَضَعْتُمْ مَوْتَاكُمْ فِي الْقُبُوْرِ، فَقُوْلُوْا: بِسْمِ اللهِ، وَعَلَى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِالْوَقْفِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جب اپنے مرنے والوں کو قبروں میں اتارو تو "بسم اللہ' وعلی ملہ رسول اللہ" کہو۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے نکالا ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے اسے معلول قرار دیتے ہوئے اسے وقوف کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرتے ہوئے یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی طرح نسائی نے اس روایت کو گو موقوف ہی قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کی تائید مستدرک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کی سند حسن ہے۔

(٤٦٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی مردے کی ہڈی توڑنے (کا گناہ) زندہ انسان کی ہڈی توڑنے کے گناہ کی طرح ہے۔"

حَيًّا» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، وَزَادَ ابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ: «فِي الإِثْمِ».

(اسے ابوداؤد نے مسلم کی شرط کی سند سے روایت کیا ہے) اور ابن ماجہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (گناہ میں)۔"

لغوی تشریح: ﴿ فی الاثم ﴾ گناہ میں۔ یعنی کہ مردہ کی ہڈی توڑنا گناہ کے اعتبار سے ایسا ہے جیسے کسی زندہ کی ہڈی توڑنے کا ہے۔ یہ درد اور الم و تکلیف کے پہلو سے نہیں کیونکہ زندہ کو اس سے تکلیف ہوگی جبکہ مردے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مسلمان خواہ وہ مردہ ہی ہو اس کی عزت و احترام کا سبق ملتا ہے۔ احترام میں زندہ اور مردہ میں کوئی خاص امتیاز نہیں رکھا۔ مگر اس دور میں سرجری نے اتنی ترقی کرلی ہے جس کا صدیوں پہلے خواب و خیال بھی نہ تھا۔ علماء کرام نے جرم کی تحقیق و تفتیش کیلئے پوسٹ مارٹم اور علاج معالجہ کیلئے چیرپھاڑ کی اجازت دی ہے۔

(٤٦٨) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَلْحِدُوا لِيْ لَحْداً وَانْصِبُوا عَلَيَّ اللَّبِنَ نَصْباً، كَمَا صُنِعَ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے لئے بغلی لحد والی قبر بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں چننا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا گیا۔ (مسلم)

وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ، وَزَادَ: وَرُفِعَ قَبْرُهُ عَنِ الأَرْضِ قَدْرَ شِبْرٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اور بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپ کی قبر زمین سے صرف ایک بالشت برابر اونچی بنائی گئی۔ (ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْهُ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ، أَنْ يُجَصَّصَ القَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ.

اور مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ "قبر کو پختہ کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر عمارت تعمیر کی جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿ الحدوا ﴾ فتح یفتح سے امر کا صیغہ۔ لحد۔ قبر کے قبلہ رخ گڑھے کو کہتے ہیں جہاں سے میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے ﴿ وانصبوا ﴾ ضرب یضرب سے صیغہ امر ہے۔ اقیموا کے معنی میں یعنی نصب کرو' قائم کرو ﴿ اللبن ﴾ لام پر فتحہ اور "با" کے نیچے کسرہ' اینٹ جو گارے سے بنائی جاتی ہے جب اسے آگ میں پکایا جائے تو "آجر" کہتے ہیں یہ جیم پر ضمہ اور "را" پر تشدید ﴿ قدر شبر ﴾ شین پر کسرہ اور "با" ساکن۔ یہ فاصلہ ہے جو انگوٹھے کے سر سے لے کر چھنگلی کے سر تک۔ یعنی بالشت۔ ﴿ ان

یجصص القبر ﴾ تجصیص سے ماخوذ ہے اور صیغۂ مجہول ہے یعنی چونا گچ اور پختہ عمارت۔ ﴿ وان یبنی علیہ ﴾ صیغۂ مجہول۔ یعنی قبر کو بلند اور نمایاں کرنے کی غرض سے اس پر عمارت تعمیر نہ کی جائے یا قبر پر گنبد وغیرہ جیسی عمارت نہ بنائی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ (۱) قبر ایک بالشت سے زیادہ اونچی نہیں ہونی چاہئے۔ (۲) قبر کو بغلی بنانا آپؐ کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ (۳) کچی اینٹیں اندر لگانی چاہئیں۔ (۴) قبر پر کسی قسم کی عمارت تعمیر کرنا اور قبر کو پختہ بنانا شرعاً منع ہے اور یہ ممانعت تحریمی ہے۔ (۵) نیز قبر کو کوئی مخصوص شکل دینا بھی درست نہیں۔ نبی ﷺ کی ابدی آرام گاہ کوہان نما تھی اور ایک بالشت سے بلند نہیں تھی اور یہی کیفیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی قبروں کی تھی۔

(٤٦٩) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى عَلَى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُونٍ، وَأَتَى الْقَبْرَ، فَحَثَى عَلَيْهِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ، وَهُوَ قَائِمٌ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کی قبر پر تشریف لائے اور کھڑے کھڑے تین لپ مٹی ڈالی۔ (سنن دار قطنی)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرنے کے بعد وہاں موجود آدمیوں کو تین تین مٹھیاں بھر کر مٹی کھڑے کھڑے ڈالنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ عثمان بن مظعون جمحی قرشی رضی اللہ عنہ ﴾ آپ اکابر صحابہؓ میں سے تھے۔ بڑے عابد و زاہد صحابیؓ تھے۔ جاہلیت ہی کے زمانہ میں انہوں نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دے لیا تھا۔ ۱۳ آدمیوں کے بعد اسلام قبول کیا۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ غزوۂ بدر میں حاضر ہوئے۔ مدینہ طیبہ میں ہجرت کے تیسویں ماہ' شعبان میں وفات پائی۔ مہاجرین میں سب سے پہلے یہی فوت ہوئے اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد نبی ﷺ نے ان کو بوسہ دیا۔ جب تدفین سے فارغ ہوئے تو فرمایا وہ ہمارے بہترین پیشرو ہیں۔"

(٤٧٠) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ، وَقَالَ: اسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ، وَسَلُوا لَهُ التَّثْبِيتَ، فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو قبر پر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے کہ "اپنے بھائی کیلئے بخشش مانگو اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اب اس سے باز پرس کی جائے گی۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت سے قبر میں باز پرس ہوتی ہے۔ تدفین کے بعد دعا کرنا

میت کیلئے ثابت ہے۔ مگر اس دور میں لوگوں نے سنت کو پس پشت ڈال کر نئی نئی رسمیں ایجاد کر لی ہیں اور اذانیں شروع کر دی ہیں جس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔

(٤٧١) وَعَنْ ضَمْرَةَ بْنِ حَبِيْبٍ - أَحَدِ التَّابِعِيْنَ - قَالَ: كَانُوا يَسْتَحِبُّونَ إِذَا سُوِّيَ عَلَى الْمَيِّتِ قَبْرُهُ وَٱنْصَرَفَ النَّاسُ عَنْهُ، أَنْ يُقَالَ عِنْدَ قَبْرِهِ: يَا فُلَانُ! قُلْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، يَا فُلاَنُ! قُلْ: رَبِّيَ اللَّهُ، وَدِيْنِي الإِسْلاَمُ، وَنَبِيِّ مُحَمَّدٌ ﷺ. رَوَاهُ سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُورٍ مَوْقُوفاً، وَلِلطَّبَرَانِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي أُمَامَةَ مَرْفُوعاً مُطَوَّلاً.

حضرت ضمرہ بن حبیب رحمۃ اللہ علیہ جو ایک تابعی ہیں سے مروی ہے کہ لوگ مستحب سمجھتے تھے کہ جب میت کی قبر برابر و ہموار کر دی جاتی اور لوگ جانے لگتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر میت کو مخاطب ہو کر یوں کہا جائے اے فلاں (لا الہ الا اللہ) کہو۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں)۔ اس کو تین مرتبہ کہتے۔ اے فلاں! "ربی اللہ و دینی الاسلام و نبی محمد" کہو۔ (میرا رب اللہ ہے' میرا دین اسلام ہے اور محمدؐ میرے نبی ہیں)
(سعید بن منصور نے اسے موقوف بیان کیا ہے اور طبرانی نے اسی طرح کی ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی لمبی مرفوع حدیث بیان کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿كانوا يستحبون﴾ پسند کرنے والوں سے یہاں صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔ ﴿سوى﴾ تسویہ سے ماخوذ ہے' علامہ ابن قیم نے المنار میں کہا ہے کہ تلقین کی یہ مرفوع حدیث فن حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک موضوع ہونے میں ذرا بھر شک نہیں۔ اسی طرح انہوں نے "الھدیٰ" میں بھی پورے جزم اور اعتماد سے کہا ہے کہ یہ موضوع اور من گھڑت روایت ہے اور کتاب الروح میں اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ یمانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور اس پر اکثر لوگوں کے عمل سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔

حاصل کلام: میت کو دفن کرنے کے بعد میت کو مخاطب کر کے تلقین کرنا کسی بھی صحیح یا حسن روایت سے ثابت نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا اہل شام کے علاوہ میں نے یہ عمل کسی اور کو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

راوی حدیث: ﴿ضمره بن حبيب﴾ ان کی کنیت ابوعتبہ ہے۔ ضمرہ میں ضاد پر فتحہ اور میم ساکن۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ ضمرہ بن حبیب بن صہیب زبیدی۔ زبیدی کی "زا" پر ضمہ ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے اس لئے حمصی کہلائے۔ ثقہ تابعی ہیں اور چوتھے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔

(٤٧٢) وَعَنْ بُرَيْدَةَ بْنِ الْحُصَيْبِ

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. زَادَ التِّرْمِذِيُّ: «فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الآخِرَةَ». زَادَ ابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ: «وَتُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا».

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب ان کی زیارت کرو۔" (مسلم) ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ "قبروں کی زیارت آخرت کی یاد دلاتی ہے۔" اور ابن ماجہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ "یہ زیارت دنیا سے بے رغبت بنا دیتی ہے۔"

لغوی تشریح: فزوروها زیارت سے امر کا صیغہ ہے۔ ممانعت کے بعد اجازت کے معنی میں ہے۔ ﴿ تذکر ﴾ تذکیر سے ماخوذ ہے یعنی یاددہانی کراتی ہے۔ ﴿ تزهد ﴾ تزهید سے ماخوذ ہے۔ یعنی دنیا سے بے رغبت و زاہد بنا دیتی ہے۔ زیارت قبور سے بس یہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبروں کی زیارت جائز ہے۔ ابتداء میں آپؐ نے اس سے منع فرمایا تھا مگر پھر اس کی اجازت دے دی اور اس سے مقصد آخرت کی یاد اور میت کیلئے بخشش و مغفرت کی دعا کرنا ہے۔ قبروں پر نذر و نیاز اور عرس کا شریعت مطہرہ میں کوئی جواز نہیں۔

(٤٧٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَعَنَ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کیلئے جانے والی خواتین پر لعنت فرمائی ہے۔ (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث خواتین کا قبور کی زیارت کیلئے جانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ لعنت کسی حرام کام پر کی جاتی ہے حالانکہ بہت سی احادیث سے خواتین کا قبروں کی زیارت کیلئے جانا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ ممانعت زیارت قبور کی اجازت و رخصت سے پہلے کی ہے مگر جب اجازت و رخصت دی گئی تو اس میں مرد و عورت شامل ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تاحال زیارت قبور کی حرمت خواتین کیلئے برقرار ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں میں صبر کی کمی ہوتی ہے اور جزع و فزع' آہ و بکا کثرت سے کرتی ہیں اور بعض علماء کا قول ہے کہ خواتین کو زیارت قبور سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ عموماً حرام کام کا ارتکاب کرتی ہیں۔ مثلاً جاہلیت کے طور طریقے اختیار کرتی ہیں' روتی پیٹتی اور بین کرتی ہیں' جزع و فزع کرتی ہیں اور چیختی چلاتی ہیں' یہ امور اسلام کی تعلیم کے منافی ہیں اس لئے ان سے منع کیا گیا ہے۔ اگر زیارت قبور عبرت حاصل کرنے' اخروی یاددہانی و تذکیر کیلئے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ و حرج نہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح حدیث میں "زوارات" کا لفظ ہے کہ عورتوں کے باکثرت قبرستان جانے پر آپؐ نے لعنت فرمائی۔ عبرت کیلئے گاہے بگاہے جانا جائز ہے۔

علامہ البانی نے بھی اسی بات کو صحیح کہا ہے اور فرمایا ہے "زائرات القبور" کے الفاظ ضعیف ہیں اور صحیح "زوارات القبور" کے الفاظ ہیں جن میں عورتوں کیلئے کثرت سے قبرستان جانے کی ممانعت ہے۔ (احکام الجنائز)

(٤٧٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ النَّائِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نوحہ کرنے اور سننے والی پر لعنت فرمائی ہے۔ (ابوداؤد)

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: نائحۃ نیاحۃ سے ماخوذ ہے۔ مرنے والے کے اوصاف و شمائل کو گن گن کر بلند آواز سے بیان کرنا اور رونا اور اچھے اور عمدہ کارناموں کو بیان کر کے چیخ و پکار کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نوحہ کرنے اور سننے کی حرمت ثابت ہوتی ہے بلکہ نبی کریم ﷺ عورتوں سے نوحہ نہ کرنے کا باقاعدہ عہد لیتے تھے۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔

(٤٧٥) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ لَا نَنُوحَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیعت کے موقع پر یہ عہد لیا تھا کہ ہم میت پر نوحہ نہ کریں گی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ مرنے والوں پر نوحہ اور بین کرنا، چیخنا چلانا، واویلا کرنا، گریباں چاک کرنا، منہ نوچنا حرام افعال ہیں۔ غمی سے آنکھوں کا اشک بار ہونا، آنسوؤں کا بے اختیار بہہ نکلنا حرام نہیں۔ گویا آنکھوں کا فعل حرام نہیں بلکہ زبان کا فعل حرام ہے۔

(٤٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْمَيِّتُ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهِ بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَهُمَا نَحْوُهُ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مرنے والے کو اس پر نوحہ کرنے والوں کے سبب سے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم نیز ان دونوں نے مغیرہ بن شعبہ کے واسطہ سے اسی طرح روایت بیان کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿المیت یعذب﴾ اس حدیث میں ایک اشکال ہے کیونکہ اس کی رو سے دوسرے کسی کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ثابت ہو رہا ہے حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ولا تزر وازرۃ وزر اخری (۱۵/۱۷) کہ "کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" اس لئے علماء کرام نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں ان میں سے ایک قول ہے کہ اگر نوحہ مرنے والے کا اپنا طریقہ ہو اور زندگی میں اس نے اسے برقرار رکھا ہو پھر تو اسے عذاب ہوگا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مرنے والے کو عذاب اس صورت میں ہوگا کہ وہ خود اس کی وصیت کر گیا ہو۔ بصورت دیگر اسے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

(٤٧٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ بِنْتاً لِلنَّبِيِّ ﷺ تُدْفَنُ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ جَالِسٌ عِنْدَ القَبْرِ، فَرَأَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی ﷺ کی ایک صاحبزادی کی تدفین کے موقع پر حاضر تھا۔ رسول اللہ ﷺ قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ میں نے دیکھا آپؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿شهدت بنتا﴾ یہ آپؐ کی صاحبزادی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ جنہوں نے ۹ھ میں وفات پائی۔ ﴿تدفن﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی اس کی تدفین کے موقع پر۔ ﴿تدمعان﴾ "تا" اور میم دونوں پر فتحہ یعنی اشک رواں تھے۔ آنسو بہہ رہے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت پر رونا جائز ہے۔ نبی ﷺ کے اپنے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر آنسو بہہ نکلے تھے تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا یارسول اللہ (ﷺ)! کیا آپؐ بھی گریہ و زاری کرتے ہیں؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا "یہ بے صبری کی وجہ سے نہیں بلکہ شفقت پدری کی بنا پر ہے۔" گویا غم کی وجہ سے شفقت پدری جوش مارے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو قابل مذمت و ملامت نہیں البتہ زبان سے چیخ و پکار اور نوحہ کرنا منع ہے۔

(٤٧٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ تَدْفِنُوا مَوْتَاكُمْ بِاللَّيْلِ إِلاَّ أَنْ تُضْطَرُّوا إِلَيْهِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ، لَكِنْ قَالَ: زَجَرَ أَنْ يُقْبَرَ الرَّجُلُ فِي اللَّيْلِ حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "اپنے مرنے والوں کو رات کے اوقات میں دفن نہ کرو الا یہ کہ تم اس کیلئے مجبور ہو جاؤ۔" (ابن ماجہ) اس کی اصل مسلم میں ہے لیکن اسی میں ہے کہ آپؐ نے رات کو دفن کرنے پر ڈانٹا الا یہ کہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔

لغوی تشریح: ﴿لا تدفنوا﴾ باب ضرب یضرب سے ہے۔ دفن نہ کرو۔ ﴿زجر﴾ زجر سے ماخوذ ہے۔ سختی سے ڈانٹ پلانا اور روک دینا۔ مسلم کی حدیث میں رات کے اوقات میں میت کو دفن کرنے کی ممانعت صرف اس گمان کے تحت ہے کہ رات کے وقت نماز جنازہ میں لوگ کم تعداد میں شریک ہوں گے۔

حاصل کلام: یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ رات کے وقت کفن اچھی طرح نہ دیا جاسکے گا۔ اگر نماز جنازہ دن کے وقت پڑھ لی جائے اور کسی عذر سے دفن کی نوبت رات کو آئے تو یہ منع نہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ کو رات ہی میں دفن کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تدفین بھی رات ہی کو ہوئی تھی بلکہ خود رسالت مآب ﷺ نے ایک صحابی کو رات کو دفن کیا تھا۔ (ترمذی' ابن ماجہ) یہ اور اسی موضوع کی دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رات کو کسی خاص وجہ کے بغیر بھی دفن کرنا جائز ہے۔ جمہور اسی

کے قائل ہیں۔ مگر امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین میں ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ رات کو بلاضرورت دفن کرنا مکروہ ہے۔

(٤٧٩) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ جَعْفَرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ، حِينَ قُتِلَ، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، «اصْنَعُوا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَاماً، فَقَدْ أَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ». أَخرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کرو۔ ان کو ایسی تکلیف دہ اطلاع ملی ہے جو ان کو کھانا پکانے سے مشغول رکھے گی۔" (نسائی کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کا کوئی عزیز وفات پا جائے تو ان کو کھانا کھلانا مسنون ہے۔ ہمسایہ کا حق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہے۔ کھانا صرف میت کے گھر والوں اور ان کے دور سے آئے ہوئے اعزاء و اقرباء کیلئے سنت ہے باقی محلے دار اور تدفین میں شریک لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ اہل خانہ کا کھانا پکانا اور ان کے ہاں جمع ہونا درست نہیں۔ حدیث میں اس کی ممانعت ثابت ہے۔

راوی حدیث : ﴿ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ﴾ حضرت جعفر، ابو طالب کے بیٹے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے اور ان سے دس برس بڑے تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہیں قیام پذیر ہوئے۔ نجاشی نے انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ پھر انہوں نے مدینہ کی طرف بھی ہجرت فرمائی اور خیبر میں اس وقت پہنچے جب یہ فتح ہو چکا۔ نبی ﷺ نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا "مجھے معلوم نہیں کہ جعفر کی آمد پر مجھے اتنی مسرت ہے یا خیبر کے فتح ہونے پر۔" انتہائی سخی انسان تھے۔ ۸ھ میں موتہ کے معرکہ میں جام شہادت نوش کیا اور جنت بریں کو سدھار گئے۔ اس معرکہ میں لشکر اسلام کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں بازو جنگ میں بدن سے کٹ کر جدا ہو گئے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ان کے دونوں ہاتھ کے بدلہ ان کے دو پر لگا دیئے ہیں۔ جن سے وہ جنت میں جہاں چاہیں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔" اسی وجہ سے ان کو جعفر طیار کہا جاتا ہے اور جعفر ذوالجناحین بھی انہی کا لقب ہے۔

(٤٨٠) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى المَقَابِرِ، أَنْ يَقُولُوا: السَّلاَمُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ المُؤْمِنِينَ وَالمُسْلِمِينَ، وَإِنَّا إِنْ

حضرت سلیمان بن بریدہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب قبرستان جاتے تو رسول اللہ ﷺ ان کو سکھلاتے کہ یوں کہو۔ سلام ہو تم پر اے گھر والو! مومنوں اور مسلمانوں میں سے اور ہم بھی انشاء اللہ تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں

شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ . رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اور ہم اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اهل الديار﴾ ان سے مراد قبروں میں پڑے ہوئے لوگ ہیں۔ دیار' دار کی جمع ہے۔ گھر کو قبر سے تشبیہہ دی گئی ہے اس لئے کہ قبر میت کیلئے گھر کی مانند ہے کہ وہ اس میں رہائش پذیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے قبرستان میں جانا اور پھر ان کیلئے اور اپنے لئے مغفرت و بخشش کی دعا کرنا ثابت ہوتا ہے۔ "من المومنين والمسلمين" سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک' کافر اور ملحد کے لئے دعا و بخشش جائز نہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اہل قبور کو فریاد رس' مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یہ سب کام خلاف شرع ہیں اور شرکیہ افعال ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے ہر ممکن طریقہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سليمان بن بريده بن حصيب اسلمی مروزی رحمۃ اللہ علیہ﴾ مشہور تابعی ہیں۔ ابن معین اور ابوحاتم نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ ان کا اپنے والد سے سماع کہیں مذکور نہیں مگر خزرجی نے کہا کہ ان کی اپنے والد سے متعدد احادیث مسلم میں منقول ہیں۔

(٤٨١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: مَرَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقُبُورِ الْمَدِيْنَةِ فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: «**السَّلَامُ عَلَيْكُمْ، يَا أَهْلَ الْقُبُورِ! يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالأَثَرِ**». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر مدینہ کے قبرستان پر ہوا۔ آپؐ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے اہل قبور! تم پر سلام ہو۔ اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔ تم ہمارے پیشرو ہو اور ہم تمہارے پیچھے چلے آرہے ہیں۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿انتم سلفنا﴾ سلفنا میں سین اور لام دونوں پر فتحہ ہے۔ یعنی پہلے فوت ہونے والے۔ ﴿ونحن بالاثر﴾ اثر میں همزہ اور "ثا" پر فتحہ' ہم تمہارے پیچھے پیچھے آرہے ہیں اور تمہیں ملنے والے ہیں۔

(٤٨٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لَا تَسُبُّوا الأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مردوں کو گالی مت دو اس لئے کہ انہوں نے جو بھیجا ہے اسے حاصل کر لیا ہے۔" (بخاری) ترمذی نے مغیرہ کے حوالہ سے اسی طرح

وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْمُغِيْرَةِ نَحْوَهُ، لَكِنْ قَالَ: «فَتُؤْذُوا الأَحْيَاءَ». روایت کیا ہے لیکن اس میں فتوذوا الاحیاء ہے یعنی گالی سے تم زندہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو۔

لغوی تشریح: ﴿ لاتسبوا ﴾ سب سے ماخوذ ہے۔ باب نصر ینصر گالی گلوچ' سب و شتم' برے اور قبیح وصف سے پکارنا۔ ﴿ افضو ﴾ افضاء سے ماخوذ ہے۔ پہنچ گئے ہیں۔ پا چکے ہیں ﴿ الی ماقدموا ﴾ جو اعمال و افعال وہ آگے بھیج چکے ہیں یہ تقدیم سے ماخوذ ہے۔ ﴿ فتوذوا الاحیاء ﴾ ایذاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی تمہارا مردوں کو برا بھلا کہنا' سب و شتم کرنا' زندوں کیلئے باعث اذیت ہے کیونکہ مرنے والوں کا ان سے قرابت داری کا تعلق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مرنے والوں کو سب و شتم نہیں کرنا چاہئے۔ ابولہب کی بیٹی درۃ مسلمان ہوئی تو بعض نے کہا اللہ کے دشمن کی بیٹی مسلمان ہوئی ہے۔ اس نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی تو آپؐ نے فرمایا "مرنے والوں کو برا مت کہو۔ اس سے ان کی مسلمان ہونے والی اولاد کو تکلیف پہنچتی ہے۔" (مسند احمد) غور فرمائیں جب کفار کو ان کی مسلمان اولاد کے سامنے گالی دینا جائز نہیں تو مسلمانوں کے اکابرین کو گالی دینا اسلام کی کونسی خدمت ہے؟

٤ ـ كِتَابُ الزَّكَاةِ

زکوٰۃ کے مسائل

(٤٨٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ مُعَاذاً رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ، وَفِيْهِ: «إِنَّ اللَّهَ قَدِ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، فَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ فرمایا' پھر ساری حدیث بیان کی جس میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے اموال پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ جو ان کے اغنیاء سے وصول کی جائے اور انہی کے محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الزکاۃ﴾ لغت میں زکوٰۃ نمو یعنی زیادہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اور پاکیزہ ہونا۔ زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ مال کو پاک کر دیتی ہے اور صاحب مال کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے کے مال کو اور بڑھا دیتی ہے اور اس کے وقت فرضیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ ۲ھ میں فرض ہوئی' رمضان کی فرضیت سے پہلے اور تحقیق کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ فرض تو مکہ میں ہی ہو گئی مگر اس کے تفصیلی احکام مدینہ میں ۲ھ کو نازل ہوئے ہیں۔ ﴿بعث معاذا الی الیمن﴾ آپؐ نے ۱۰ھ میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی یا عامل بنا کر اہل یمن کی طرف روانہ فرمایا اور ایک قول کے مطابق ۹ھ میں اور ایک تیسرے قول کے مطابق ۸ھ میں بھیجا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک یمن ہی میں رہے۔ پھر شام کا رخ کیا اور طاعون عمواس کے زمانہ میں وفات پائی۔ ﴿فذکر الحدیث﴾ اس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کیلئے وصیت تھی کہ انہیں اہل یمن کے ساتھ کیا سلوک انجام دینا ہے ﴿افترض﴾ فرض قرار دی گئی۔ ﴿فترد﴾ اس میں "فا" تعقیب کیلئے ہے یعنی وصول کرنے کے بعد غرباء میں تقسیم کر دی جائے گی۔ ﴿ترد﴾ رد سے ماخوذ ہے

اور صیغہ مجہول ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ کے عہد باسعادت سے زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے مصارف کا سرکاری سطح پر انتظام ہوگیا تھا۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں سے زکوٰۃ حاصل کی جائے گی وہیں کے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ مقامی فقراء سے اگر زکوٰۃ بچ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں زکوٰۃ منتقل کی جا سکتی ہے۔ یہ غرباء کا حق ہے ان پر کوئی احسان نہیں۔

(٤٨٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أن أبا بكر رضي الله عنه كَتَبَ لَهُ: هٰذِهِ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ، الَّتِيْ فَرَضَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ، وَالَّتِيْ أَمَرَ اللَّهُ بِهَا رَسُولَهُ: «فِيْ كُلِّ أَرْبَعٍ وَعِشْرِيْنَ مِنَ الإِبِلِ فَمَا دُوْنَهَا الغَنَمُ: فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ، فَإِذَا بَلَغَتْ خَمْساً وَعِشْرِيْنَ إِلَى خَمْسٍ وَثَلاثِيْنَ، فَفِيْهَا بِنْتُ مَخَاضٍ أُنْثَى، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ فَابْنُ لَبُونٍ ذَكَرٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَثَلاثِيْنَ، إِلَى خَمْسٍ وَأَرْبَعِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتُ لَبُونٍ أُنْثَى. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَأَرْبَعِيْنَ، إِلَى سِتِّيْنَ، فَفِيْهَا حِقَّةٌ طَرُوقَةُ الجَمَلِ. فَإِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً وَسِتِّيْنَ، إِلَى خَمْسٍ وَسَبْعِيْنَ، فَفِيْهَا جَذَعَةٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَسَبْعِيْنَ، إِلَى تِسْعِيْنَ، فَفِيْهَا بِنْتَا لَبُونٍ. فَإِذَا بَلَغَتْ إِحْدَى وَتِسْعِيْنَ، إِلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ، فَفِيْهَا حِقَّتَانِ طَرُوْقَتَا الجَمَلِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِيْنَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فریضہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ تحریر لکھ کر دی تھی۔ جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر مقرر فرمایا تھا اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو دیا تھا کہ اونٹوں کی چوبیس یا اس سے کم تعداد پر بکریاں ہیں ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری جب تعداد پچیس سے بڑھ کر پینتیس ہو جائے تو اس تعداد پر ایک سالہ اونٹنی اگر میسر نہ ہو تو پھر دو سالہ نر بچہ اور جب چھتیس سے تعداد بڑھ کر پینتالیس تک پہنچ جائے تو ان میں دو سالہ اونٹنی اور جب چھیالیس سے بڑھ کر ساٹھ تک تعداد پہنچ جائے تو ان میں تین سالہ جوان اونٹ کی جفتی کے قابل اونٹنی اور جب اکسٹھ سے بڑھ کر پچھتر تک پہنچ جائے تو ان میں چار سالہ اونٹ اور جب چھہتر سے تعداد بڑھ کر نوے ہو جائے تو ان میں دو' دو سالہ دو اونٹنیاں اور پھر اکانوے سے بڑھ کر تعداد ایک سو بیس تک پہنچ جائے تو ان میں تین' تین سالہ دو جوان اونٹنیاں۔ جو اونٹ کی جفتی کے قابل ہوں۔ اور جب تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو پھر ہر چالیس اونٹوں پر ایک دو سالہ اونٹنی اور ہر پچاس پر تین سالہ اور جس کے پاس صرف چار ہی اونٹ ہوں تو اس تعداد

وَمِائَةٍ، فَفِي كُلِّ أَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُونٍ، وَفِيْ كُلِّ خَمْسِيْنَ حِقَّةٌ. وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ مَّعَهُ إِلاَّ أَرْبَعٌ مِنَ الإِبِلِ، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا. وَفِيْ صَدَقَةِ الغَنَمِ، فِيْ سَائِمَتِهَا: إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِيْنَ، إِلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ شَاةٍ، شَاةٌ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ إِلَى مِائَتَيْنِ، فَفِيْهَا شَاتَانِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى مِائَتَيْنِ، إِلَى ثَلاَثِمَائَةٍ، فَفِيْهَا ثَلاَثُ شِيَاهٍ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى ثَلاَثِمَائَةٍ، فَفِيْ كُلِّ مِائَةٍ، شَاةٌ. فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً عن أَرْبَعِيْنَ شَاةً، شَاةً، وَاحِدَةً، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا، وَلاَ يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ، وَلاَ يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ، خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ. وَمَا كَانَ مِنَ خَلِيْطَيْنِ، فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ. وَلاَ يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ، وَلاَ ذَاتُ عَوَارٍ، وَلا تَيْسٌ، إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ المُصدِّقُ. وَفِي الرِّقَةِ: فِي مِائَتَي دِرْهِمٍ، رُبْعُ العُشْرِ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ إِلاَّ تِسْعِيْنَ وَمِائَةً، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَن يَشَاءَ رَبُّهَا. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ مِنَ الإِبِلِ صَدَقَةُ الجَذَعَةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ جَذَعَةٌ، وَعِنْدَهُ حِقَّةٌ، فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الحِقَّةُ،

پر کوئی زکوٰۃ نہیں الاّ یہ کہ ان کا مالک چاہے اور بکریوں کی زکوٰۃ کہ جو باہر چرنے جاتی ہوں' چالیس سے لے کر ایک سو بیس کی تعداد پر صرف ایک بکری زکوٰۃ میں وصول کی جائے گی۔ جب یہ تعداد ایک سو بیس سے بڑھ کر دو سو تک پہنچ جائے گی تو دو بکریاں زکوٰۃ میں وصول کی جائیں گی۔ پھر جب دو سو سے بڑھ کر تین سو تک پہنچ جائے گی تو تین بکریاں وصول کی جائیں گی۔ جب تعداد تین سو سے بڑھ جائے گی تو ہر سو پر ایک بکری زکوٰۃ وصول ہوگی' اگر کسی کی باہر جنگل میں چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک بھی کم تعداد میں ہوں تو مالک پر کوئی زکوٰۃ نہیں الاّ یہ کہ مالک چاہے۔ زکوٰۃ کے ڈر سے نہ تو الگ الگ چرنے والیوں کو اکٹھا کیا جائے اور نہ ہی اکٹھی چرنے والیوں کو الگ الگ۔ اور جو جانور دو آدمیوں کے درمیان مشترکہ ہوں وہ مساوی طور پر زکوٰۃ کا حصہ نکالیں۔ زکوٰۃ کی مد میں بوڑھا اور نہ یک چشم جانور اور نہ سانڈ لیا جائے الاّ یہ کہ زکوٰۃ دینے والا آپ چاہے اور چاندی کے سکوں کا نصاب دو سو درہم ہے اس میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔ اگر کسی کے پاس دو سو درہم سے ایک درہم بھی کم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں الاّ یہ کہ اس کا مالک خود دینا چاہے۔ اور جس کے اونٹوں کی زکوٰۃ میں چار سالہ اونٹ واجب الوصول ہو اور اس کے پاس اس عمر کا اونٹ نہ ہو اور یہ اس کے پاس تین سالہ ہو جوان اونٹنی تو اس سے دو بکریاں اور تین سالہ جفتی کے لائق جوان اونٹنی وصول کیا جائے بشرطیکہ بکریاں بآسانی دستیاب

وَيَجْعَلُ مَعَهَا شَاتَيْنِ إِنِ اسْتَيْسَرَتَا لَهُ، أَوْ عِشْرِيْنَ دِرْهَماً. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ صَدَقَةُ الحِقَّةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ الحِقَّةُ، وَعِنْدَهُ الجَذَعَةُ. فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الجَذَعَةُ، وَيُعْطِيْهِ الْمُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَماً أَوْ شَاتَيْنِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

ہو سکیں یا بیس درہم دینا ہوں گے اور جس کی زکوٰۃ میں تین سالہ جوان اونٹنی آتی ہو ہو اور اس کے پاس چار سالہ اونٹ ہو تو اس سے وہی چار سالہ اونٹ ہی وصول کر لیا جائے گا مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے بیس درہم یا دو بکریاں واپس دے گا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ کتب لہ ﴾ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو تحریر کر کے دیا جب ان کو بحرین کی طرف زکوٰۃ کی وصولی پر عامل بنا کر بھیجا۔ ﴿ ھذہ فریضۃ الصدقۃ ﴾ یہ فرضیت زکوٰۃ کا نوشتہ ہے۔ اس تحریری مکتوب کا آغاز اس سے ہوتا ہے۔ بخاری میں مکتوب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے ﴿ فما دونھا ﴾ اس تعداد سے کم کا مطلب ہے جو بیس سے کم۔ الغنم بکری اور بھیڑ دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں الغنم مبتداء مؤخر ہے اور اس کی خبر ﴿ فی کل اربع و عشرین فما دونھا ﴾ ہے جس کا مطلب ہے کہ اس تعداد و مقدار میں بکری یا بھیڑ زکوٰۃ میں نکالنا ہے۔ ﴿ فی کل خمس ﴾ ہر پانچ کی تعداد میں سے مراد اونٹ ہیں۔ جب پانچ اونٹ ہوں گے تو زکوٰۃ کا نصاب شروع ہو گا اور اس تعداد پر ﴿ شاۃ ﴾ ایک بکری یا بھیڑ دینا ہو گی ﴿ بنت مخاض ﴾ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک سال پورا کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ "مخاض" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اس عمر کو پہنچ چکی ہو کہ وہ حاملہ ہونے کی صلاحیت تو رکھتی ہو مگر ہنوز حاملہ نہ ہوئی ہو۔ اسے مخاض اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں کا شمار ان میں ہے جو حاملہ ہوتی ہیں اور مؤنث کی قید تاکید کیلئے ہے اور اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ نر اونٹ وہ کام نہیں دے سکتا جو مادہ دے سکتی ہے۔ ﴿ ابن لبون ﴾ لبون کے لام پر فتحہ ہے۔ وہ اونٹ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ ﴿ بنت لبون ﴾ وہ اونٹ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ ﴿ حقہ ﴾ "حا" کے نیچے کسرہ اور قاف پر تشدید۔ مادہ (اونٹنی) جو تین سال کی عمر پوری کر کے چوتھے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ اس کی جمع حقاق آتی ہے اور مذکر اس کا ﴿ حق ﴾ "حاء" کا کسرہ ہے۔ "حقہ" اسے اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور بار برداری کے قابل ہو جاتی ہے اور نر کی جفتی کے بھی قابل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ﴿ طروقۃ الجمل ﴾ کہا گیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ نر اگر اس پر جفتی کے ذریعہ وطی کرے تو کر سکتا ہے خواہ اس سے وطی نہ کی ہو۔ ﴿ جذعۃ ﴾ جیم اور ذال دونوں پر فتحہ جو پورے چار کو پہنچ چکی ہو اور پانچویں میں قدم رکھ چکی ہو۔ ﴿ فاذا زادت ﴾ جب تعداد اس سے زیادہ ہو جائے ﴿ علی عشرین

ومائۃ ﴾ ایک سو بیس سے خواہ ایک ہی کا اضافہ ہو۔ ﴿ ففی کل اربعین ﴾ تو ان کو چالیس اور پچاس کے دو زمروں میں تقسیم کر لیں گے۔ مثلاً جب مذکورہ تعداد میں ایک کا اضافہ ہو جانے کی صورت میں اس تعداد کو تین مرتبہ چالیس شمار کیا جائے گا اور ایک کے زائد عدد کا کوئی وزن نہیں۔ تین دفعہ چالیس کی صورت میں تین بنت لبون وصول کی جائیں گی۔ یہ ایک سو تیس تک کی زکوٰۃ ہوگی اور ایک سو تیس کی صورت میں پچاس پر حقہ اور چالیس پر دو بنت لبون' بس اسی طرح دس کے اضافہ کی صورت میں تبدیلی اور تغیر واقع ہوگا۔ حضرت عمرؓ کا مکتوب گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو اکیس ہو جائے تو ان میں تین بنت لبون زکوٰۃ ہوگی تاوقتیکہ یہ تعداد ایک سو انتیس تک پہنچ جائے۔ مدعا و مقتضاء کلام یہ ہے کسروں کو شمار میں نہیں رکھا جاتا اور تمام دہائیوں میں زکوٰۃ ہے (مثلاً دس' بیس' تیس علی ھذا القیاس)۔ (عون المعبود اور سبل الاسلام) الا ان یشاء ربھا الآیہ کہ اونٹوں کا مالک رضاکارانہ طور پر اپنی طرف سے نفلی طور پر زکوٰۃ کو نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے۔ اس پر واجب نہیں ہے۔ ﴿ فی سائمتھا ﴾ سے مراد زکوٰۃ میں وصول کی جانے والی بکریاں "سائمہ" وہ بکری جس کی زندگی کا انحصار جنگلوں میں چرنا ہو اور گھر پر چارہ بہت کم کھاتی ہو۔ جمہور کے نزدیک جنگل میں چرنے کی قید لازمی ہے۔
﴿ الی عشرین ومائۃ شاۃ شاۃ ﴾ ایک سو بیس تک کی تعداد میں صرف ایک بکری ہے پہلا "شاۃ" کا لفظ مائۃ کی تمیز ہے اور دوسرا شاۃ مرفوع ہے اور یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر پہلا جملہ ﴿ فی صدقۃ الغنم ﴾ ہے اور شاۃ کے لفظ میں نر و مادہ' بھیڑ اور بکری دونوں شامل ہیں اور غنم کا لفظ شاہ کا مترادف ہے یعنی شاۃ اور غنم دونوں ہم معنی ہیں اور ﴿ فاذا زادت علی عشرین ومائۃ ﴾ جب ایک سو بیس پر اضافہ ہو جائے خواہ ایک ہی عدد کا کیوں نہ ہو اس میں دو بکریاں ہیں اور جب دو سو سے زیادہ ہو کر تین سو ہو جائیں تو تین بکریاں ﴿ فاذازادت علی ثلث مائۃ ففی کل مائۃ شاۃ ﴾ اور جب تین سو سے تعداد میں اضافہ ہو جائے تو ہر سو میں ایک بکری کی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ بظاہر تو اس سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ چوتھی بکری اس وقت دینا ضروری ہوتا ہے جبکہ تعداد چار سو تک پہنچ جائے۔ جمہور کا یہی قول ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تین سو پر ایک کا بھی اضافہ ہو جائے گا تو اس تعداد میں چار بکریاں دینا ہوں گی۔ پہلی بات قابل ترجیح ہے اور اس کی تائید وہ روایت بھی کر رہی ہے جسے ترمذی نے ابن عمرؓ کے حوالہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے "کہ جب تین سو بکریوں میں ایک کا مزید اضافہ ہو جائے تو پھر ہر ایک سو بکریوں پر ایک بکری ہے' جب تک تعداد میں پورے سو کا اضافہ نہیں ہو جاتا اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔" ﴿ فاذا کانت سائمۃ الرجل ﴾ جب آدمی کے جانور جنگل میں چرنے چگنے والے چالیس سے تعداد میں کم ہوں تو ان پر ایک بکری بھی زکوٰۃ دینا نہیں بنتی۔ ﴿ ناقصۃ ﴾ منصوب ہے۔ کانت کی خبر واقع ہو رہی ہے۔ ﴿ من اربعین شاۃ شاۃ واحدۃ ﴾ دونوں شاۃ پر فتحہ ہے اس لئے منصوب ہے پہلی صورت میں عدد سے تمیز واقع ہو رہی ہے اور دوسری صورت میں حرف جر محذوف ہے جسے نزع الخافض کہتے ہیں یعنی بشاۃ واحدۃ یا پھر یہ ناقصہ مفعول ہے۔ مطلب ساری گفتگو کا یہ ہوا کہ جب کسی آدمی کے

پاس باہر چرنے چگنے والے جانوروں کی تعداد چالیس سے ایک بھی کم ہو تو ان میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور جب تعداد ایک سے بھی زیادہ کم ہو پھر تو کسی صورت بھی زکوٰۃ نہیں۔ ﴿ ولا یجمع ﴾ صیغہ مجہول (نہ جمع کیا جائے گا نہ اکٹھا کیا جائے گا) "ولا یفرق" "را" پر تشدید (صیغہ مجہول) ﴿ خشیۃ الصدقۃ ﴾ منصوب، مفعول لہ واقع ہو رہا ہے یعنی زکوٰۃ زیادہ یا کم دینے کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر، زیادہ کا اندیشہ ہو تو مالک کو ہوگا اور کم کا خوف زکوٰۃ وصول کرنے والے کیلئے۔ دونوں فریقین کیلئے یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ الگ الگ کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تین آدمی ہیں ہر ایک کی چالیس چالیس بکریاں ہیں۔ الگ الگ کی صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا واجب آتی ہے اس طرح مجموعی طور پر تین بکریاں دینا پڑتی ہیں مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچتا ہے تو انہوں نے بکریاں جمع کرلیں اور تعداد ایک سو بیس بن گئی۔ اس طرح ان کو صرف ایک بکری دینا پڑتی ہے اور جمع شدہ بکریوں کو الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو آدمی اکٹھے ہیں دو سو اور ایک بکریاں ان کی ملکیت میں ہیں۔ اس طرح دونوں پر تین بکریاں زکوٰۃ دینا لازمی ہے مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچا تو دونوں نے اپنی اپنی بکریاں الگ کرلیں کہ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے ذمہ ایک ایک بکری ہی آئے گی۔ ایسے مال کے مالکوں کو اس طرح حیلہ سازی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے کو منع کرنے کی یہ صورت ہے کہ دو آدمی ہیں جو باہم نہ شریک ہیں اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا مال ملایا ہوا ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک سو بیس یا کم و بیش بکریاں ہیں تو اس صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے۔ مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا ان دونوں کی بکریاں ازخود جمع کرتا ہے اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زائد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ تین بکریاں وصول کرلیتا ہے اور جدا اور الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک سو بیس بکریاں تین آدمیوں کی ملک میں ہیں۔ اس صورت میں صرف ایک ہی بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس طرح تین بکریاں وصول کرلیتا ہے۔ بایں طور کہ ہر چالیس پر ایک بکری کے حساب سے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ﴿ خشیۃ الصدقۃ ﴾ کا معنی یہ ہوا کہ کثرت کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر یا تعداد کی قلت کے نقطہ نظر سے دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔ دونوں معنی اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں۔ ﴿ وما کان من خلیطین ﴾ خلیطین کا معنی شریک ہیں اور اس میں "من" موصول کے بیان کیلئے ہے "والخلطۃ" اور شرکت یہ ہے کہ چرواہا، چراگاہ، نر اور پانی پلانا ایک طرح کا ہے۔ فانھما یترا جعان بینھما بالسویۃ سویۃ میں "یا" پر تشدید ہے معنی مساوات برابری کی سطح پر اور "تراجع" کا معنی یہ ہے کہ جب زکوٰۃ وصول کرنے والا دونوں کے مجموعہ پر واجب زکوٰۃ ایک بکری کی صورت میں وصول کرلیتا ہے حالانکہ اس کے ذمہ تو آدھی بکری آتی ہے اور باقی نصف اس کے دوسرے ساتھی پر۔ تو اب زکوٰۃ وصول کرنے والا دوسرے ساتھی سے نصف بکری کی قیمت اس سے لے کر دوسرے کے حوالہ کر دے گا۔ اس طرح دونوں کی طرف سے ان پر واجب الادا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کمی و بیشی کا شکوہ کسی کو نہیں رہے گا۔ بالسویۃ یہی سے۔ ہی برابری مراد ہے۔ ﴿ لا یخرج ﴾ صیغہ مجہول نہیں نکالا جائے گا۔ ﴿ ھرمۃ ﴾ فتحہ اور کسرہ۔ "ھا" پر فتحہ "را" کے نیچے کسرہ۔ بوڑھی اور اتنی عمر رسیدہ جس کے دانت گر چکے ہوں۔ ﴿ ولا ذات عوار ﴾ عوار کے عین پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں۔ عیب کے معنی میں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ عوار کے عین پر فتحہ کی صورت میں اس کا معنی عیب ہو گا اور ضمہ کی صورت میں کانا ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ اسے فتحہ سے ہی پڑھا جائے تاکہ تمام عیوب و نقائص اس میں شامل ہو جائیں۔ ﴿ ولا تیس ﴾ "تا" پر فتحہ "یا" ساکن۔ سانڈ بکرا جو بکریوں پر جفتی کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ ﴿ الا ان یشاء المصد ﴾ مصدق کے صاد پر تشدید اور تخفیف دونوں طرح ہے۔ پہلے کا اصل متصدق یعنی زکوٰۃ و صدقہ دینے والا۔ یعنی مال کا مالک۔ اس میں استثناء فقط لفظ تیس کی طرف راجع ہے۔ یعنی سانڈ بکرا کا لینا مالک کی مرضی پر منحصر ہے۔ کیونکہ اس کی ضرورت اسے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی رضامندی اور خوشی کے بغیر بکرے کا وصول کرنا مالک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ دوسری صورت میں مصدق کا صاد مخفف ہے۔ جس کا معنی صدقہ لینے والا' اس پر دوڑ دھوپ اور سعی کرنے والا اور استثناء تینوں کی طرف راجع ہے یعنی بوڑھی گھونسٹ۔ عیب والی اور سانڈ بکرے (بوک) کی طرف الآ یہ کہ زکوٰۃ لینے والا اس کے لینے میں مصلحت سے زیادہ موافقت محسوس کرے اور مساکین کیلئے زیادہ اچھا سمجھے۔ ﴿ وفی الرقۃ ﴾ اور چاندی میں زکوٰۃ کی نوعیت یہ ہے۔ رقۃ کے "را" کے نیچے کسرہ۔ دراصل یہ ورق سے ہے۔ ورق "واؤ" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ چاندی کو کہتے ہیں ﴿ ربع العشر ﴾ ربع کے راء اور عشر کے عین پر ضمہ ہے اور "با" اور شین ساکن ہیں یا دونوں پر ضمہ "ربع" کسی چیز کا چوتھا حصہ اور "عشر" دسواں حصہ اور ربع العشر چالیسواں حصہ ہوا اور دو سو درہم باون تولہ اور چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوتے ہیں یعنی سات سو پینتیس گرام اور درہم تین ماشے ایک رتی کا اور پانچ رتی بڑے رائی کے دانوں کے برابر۔ ﴿ فان لم تکن ﴾ اور اگر چاندی ﴿ الا تسعین ومائۃ ﴾ ایک سو نوے درہم ہو یعنی جب دو سو درہم پورے نہ ہوں اس پر زکوٰۃ نہیں۔ نوے کا ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ سو پورا ہونے سے پہلے آخری گنتی نوے ہی ہے اور حساب کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب احاد سے اکائی تجاوز کر جائیں تو دہائیوں سے گنتی کی جاتی ہے۔ جیسے دہائیوں سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ (فانھا تقبل منہ الحقۃ) جذعہ کی جگہ حقہ قبول کر لیا جائے گا۔ ﴿ ویجعل ﴾ مالک ساتھ شامل کرے گا۔ ﴿ معھا شاتین ﴾ دو بکریاں نقصان و کمی کی تلافی کرنے کیلئے کیونکہ حقہ جذعہ سے چھوٹا ہوتا ہے ﴿ ان استیسرتالہ ﴾ بایں صورت کہ دو بکریاں اس کے مویشیوں میں موجود ہوں ﴿ او عشرین درھما ﴾ او یہاں تخییر کیلئے ہے یعنی اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہے تو یہ دے دے' چاہے وہ دے دے۔ ﴿ ویعطیہ المصدق ﴾ دال پر تشدید۔ زکوٰۃ و صدقہ وصول کرنے والا سرکاری کارندہ اور نمائندہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مال و مویشی کی زکوٰۃ کا نصاب مذکور ہے نیز اس میں زکوٰۃ وصول کرنے کا طریق کار۔ زکوٰۃ میں وصول کئے جانے والے جانوروں کی عمروں کا بیان ہے اور زکوٰۃ کی وصولی کا اہتمام

مذکور ہے۔ نہ تو مالک کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے اور نہ ہی سرکاری اہل کار کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ہر قسم کے مویشیوں پر زکوٰۃ نہیں بلکہ جنگل میں چرنے چگنے والوں پر ہے۔

(٤٨٥) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَهُ إِلَى الْيَمَنِ ، فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِيْنَ بَقَرَةً تَبِيْعاً أَوْ تَبِيْعَةً، وَمِنْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةً، وَمِنْ كُلِّ حَالِمٍ دِيْنَاراً، أَوْ عَدْلَه مَعَافِرِيّاً. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَاللَّفْظُ لِأَحْمَدَ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَأَشَارَ إِلَى اخْتِلَافٍ فِيْ وَصْلِهِ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو یمن کی طرف (عامل مقرر کر کے) بھیجا۔ ان کو حکم دیا کہ وہ تیس گائیوں پر ایک سالہ مادہ گائے یا نر بچھڑا وصول کرے اور ہر چالیس کی تعداد پر ایک دو سالہ بچھڑا لیا جائے اور ہر نوجوان سے ایک دینار یا معافری کپڑا لیا جائے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ احمد کے ہیں اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور اس کے موصول ہونے کے بارے میں اختلاف کا اشارہ کیا ہے ابن حبان اور حاکم دونوں نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿من کل ثلاثین بقرۃ﴾ یہ نصاب متفق علیہ ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ تیس سے کم پر کوئی چیز واجب نہیں مگر امام زھری کی رائے ہے کہ ہر پانچ گائے کی تعداد پر ایک بکری ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اونٹوں کے نصاب پر قیاس کر کے کہا ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ نصاب کا تعین قیاس سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور "بقرۃ" اسم جنس ہے اور "تا" اس میں "وحدۃ" کی علامت ہے' تانیث کی نہیں۔ یہ مذکر و مونث دونوں پر یکساں بولا جاتا ہے۔ تبیعا او تبیعۃ تبیعا اس کو کہتے ہیں جو ایک سال کی عمر مکمل کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو اور "او" اس میں تخییر کیلئے ہے یعنی سرکاری وصول کنندہ کو اختیار ہے چاہے مادہ حاصل کرے اور چاہے نر وصول کرے۔ مسنۃ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دو دانت نکل آئے ہوں یعنی جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ تحفۃ الاحوذی (ج ۲' ص ۴) میں ہے کہ طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر چالیس کی تعداد پر مسنہ یا مسن ہے ﴿ومن کل حالم﴾ ہر بالغ سے۔ خواہ احتلام سے دوچار ہوا ہو یا ہنوز نہ ہوا ہو پر "دینارا" ایک دینار بطور جزیہ وصول کیا جائے گا۔ ﴿اوعدلہ﴾ عین پر فتحہ۔ دال ساکن ہے مراد ہے اتنی قیمت۔ اس کے برابر مساوی قیمت اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتحہ اور کسرہ دونوں برابر ہیں۔ ﴿معافریا﴾ وہ چادریں جو یمن کی بنی ہوئی ہیں۔ "معافر" بروزن مساجد ہے یہ ھمدان کا ایک قبیلہ ہے۔ انہی کی طرف معافری کپڑے منسوب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گائے کے نصاب کی تفصیل کے ساتھ ساتھ غیر مسلم سے جزیہ وصول کرنے کا بھی حکم ہے۔ بالاتفاق علماء نے بھینس کو گائے پر قیاس کیا اس کی حلت اور زکوٰۃ کا وہی حکم ہے جو گائے کا

ہے۔

(٤٨٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تُؤْخَذُ صَدَقَاتُ الْمُسْلِمِينَ عَلَى مِيَاهِهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: «وَلاَ تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ إِلاَّ فِي دُورِهِمْ».

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "مسلمانوں سے زکوٰۃ ان کے پانی پلانے کی جگھوں پر وصول کی جائے گی۔" (احمد) اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ مسلمانوں کے صدقات ان کے گھروں ہی پر حاصل کئے جائیں گے۔

لغوی تشریح: ﴿علی میاھھم﴾ میاہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چشمے ہیں جہاں لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کیلئے لے جاتے ہیں۔ ﴿الا فی دورھم﴾ دور' دار کی جمع ہے۔ ان کی اپنی رہائش گاہیں' جائے رہائش' مکانات' پانی کے گھاٹ' ان کے قبائل اور مویشیوں کی قیام گاہیں مراد ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ سرکاری زکوٰۃ وصول کنندہ خود لوگوں کے پاس پہنچ کر زکوٰۃ کی وصولی کرے۔ ایسا نہیں کہ خود دور دراز جگہ میں ڈیرہ جما کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو اپنے ہاں آکر زکوٰۃ جمع کرانے کا حکم دے۔ اس طرح لوگوں کا مشقت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں عامل زکوٰۃ کو زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے لوگوں کے پاس ان کے گھروں' مویشیوں کی قیام گاہوں میں جانے کا حکم ہے۔ تاکہ کسی قسم کے دھوکہ میں مبتلا نہ کیا جاسکے اور وہ اپنی حاکمیت کی دھونس بھی نہ جما سکے۔ بلکہ ایک خادم دین کی حیثیت سے گھر گھر جاکر زکوٰۃ وصول کرے۔ جابر بن عتیک کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری نمائندے آئیں گے جب وہ تمہارے پاس پہنچیں تو ان کو خوش آمدید کہو اور جس چیز کا وہ مطالبہ کریں' وہ ان کے سپرد کر دو۔ اگر انہوں نے انصاف سے کام لیا تو انہیں ثواب ملے گا اور اگر ظلم کریں گے تو اس کا وبال انہی پر پڑے گا۔" اگر یہ زکوٰۃ مقدار وجوب سے زیادہ طلب کریں تو صحیح بخاری میں ہے کہ انہیں زیادہ ہرگز نہ دی جائے۔

(٤٨٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلاَ فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلِمُسْلِمٍ: لَيْسَ فِي الْعَبْدِ صَدَقَةٌ، إِلاَّ صَدَقَةَ الْفِطْرِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمانوں پر نہ اس کے غلام میں زکوٰۃ ہے اور نہ اس کے گھوڑے میں۔" (بخاری) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "غلام میں زکوٰۃ نہیں مگر صدقہ فطر سے۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں۔ یعنی جو غلام اپنی خدمت کیلئے اور جو گھوڑا اپنی سواری کے لئے مخصوص ہو ان پر کسی قسم کی زکوٰۃ نہیں۔ البتہ اگر برائے تجارت

ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہوگی۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے مگر علامہ ابن حزم اور دیگر ظاہریہ کے نزدیک گھوڑے تجارت کیلئے ہوں تو ان کی بھی زکوٰۃ نہیں۔

(٤٨٨) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «فِي كُلِّ سَائِمَةِ إِبِلٍ: فِي أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ، لاَ تُفَرَّقُ إِبِلٌ عَنْ حِسَابِهَا، مَنْ أَعْطَاهَا، مُؤْتَجِراً بِهَا، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَمَنْ مَنَعَهَا، فَإِنَّا آخِذُوهَا وَشَطْرَ مَالِهِ، عَزْمَةً مِنْ عَزَمَاتِ رَبِّنَا، لاَ يَحِلُّ لآلِ مُحَمَّدٍ مِنْهَا شَيْءٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَعَلَّقَ الشَّافِعِيُّ القَوْلَ بِهِ عَلَى ثُبُوتِهِ.

حضرت بھز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "چرنے والے تمام اونٹوں میں چالیس پر ایک دو سالہ اونٹنی ہے اور اونٹوں کو ان کے حساب سے جدا نہ کیا جائے گا اور جو شخص حصول ثواب کی نیت سے زکوٰۃ ادا کرے گا اس کو اس کا ثواب بھی ملے گا اور جس نے زکوٰۃ روک لی تو ہم زکوٰۃ زبردستی وصول کریں گے اور اس کا کچھ مال بھی' ہمارے پروردگار کے فرائض میں سے ایک لازمی حصہ ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی آل محمد کیلئے حلال نہیں ہے۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور شافعی نے اس کے ثابت ہونے پر اپنے قول کو معلق رکھا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ سائمة ابل ﴾ سائمة ' ابل کی طرف مضاف ہے۔ ﴿ فی اربعین بنت لبون ﴾ یعنی فی الجملہ چالیس میں "بنت لبون" دو سالہ اونٹنی ہے۔ حضرت انس کی روایت میں جو پہلے گزر چکی ہے ۳۶ سے زیادہ ۴۵ تک میں ایک بنت لبون کا ذکر ہے اور اس حدیث میں چالیس کی تعداد' اس وقت مراد ہے جب ایک سو بیس سے اونٹ زیادہ ہوں تو پھر چالیس پر بنت لبون ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تفصیل موجود ہے یا یہ کہ ۴۰ کی تعداد بھی ۳۶ سے ۴۵ کے مابین ہے۔ ان دونوں کے مابین جتنے اونٹ ہوں ۴۰ ہوں یا اس سے کم و بیش ان پر زکوٰۃ ہے' یہ مفہوم ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں منطوق راوی ہے اس لئے اعتبار اسی روایت کا ہے۔ ﴿ لا یفرق ﴾ تفریق سے ماخوذ ہے۔ مبنی للمفعول ہے یعنی الگ الگ اور جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔ "ابل عن حسابها" اس کا معنی ہے کہ مالک اپنی ملکیت کی چیزوں کو دوسرے کی ملکیت سے الگ نہ کرے جبکہ دونوں کے مویشی اکٹھے ہوں۔ جیسا کہ اس سے پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ یا یہ معنی ہوں گے کہ تمام اونٹوں کو فی چالیس کے حساب سے شمار کیا جائے' اس صورت میں نہ مریل و کمزور کو چھوڑا جائے گا نہ کسی فربہ کو' نہ چھوٹے کو اور نہ بڑے کو ﴿ موتجرابها ﴾ اجر و ثواب کے حصول کے ارادے سے ان کو زکوٰۃ میں دینا ﴿ ومن منعها ﴾ جس نے

نہ دیا ﴿ فانا اخذوھا ﴾ تو ہم اسے بزور و زبردستی وصول کریں گے۔ ﴿ وشطر مالہ ﴾ کچھ مال یا آدھا مال۔ نہ زکوٰۃ نہ دینے کی سزا کے طور پر ﴿ اخذوھا ﴾ میں جو ضمیر مجرور ہے' اس پر اس کا عطف ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ تشطیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوگا کہ اس کے مال کو عامل دو نصف حصوں میں تقسیم کردے اور بہترین و افضل حصہ خود وصول کرلے۔ ﴿ عزمۃ ﴾ رفعی حالت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی اور نصب کی صورت میں مصدر۔ مطلب ہے کہ یہ فریضہ ہے اور واجب حق ہے ﴿ من عزمات ربنا ﴾ اللہ تعالیٰ کے حقوق و واجبات میں سے ﴿ لایحل لال محمد ﴾ الخ آل محمد کیلئے یہ حلال نہیں۔ آل محمد سے کیا مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے بنو ہاشم' بنو عبدالمطلب بن عبد مناف مراد ہیں اور ایک قول یہ ہے اس سے مراد بالخصوص آل علی' آل عباس اور آل عقیل اور آل حارث بن عبدالمطلب ہیں۔ ﴿ اوعلق الشافعی ﴾ علق تعلیق سے ماخوذ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ثبوت پر اپنا قول معلق رکھا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو میرا قول اس کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس کا دارومدار بھز بن حکیم پر ہے اور اس پر کلام ہے اور کسی دوسری صحیح حدیث میں زکوٰۃ نہ دینے والے سے مقدار زکوٰۃ سے زائد مال بطور جرمانہ وصول کرنے کا ذکر نہیں۔

حاصل کلام: زکوٰۃ کے ایک مسئلے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ بنو ہاشم' بنو عبدالمطلب زکوٰۃ نہیں لے سکتے۔ بنو ھاشم میں اولاد علی' اولاد عباس' اولاد عقیل اور اولاد حارث بن عبدالمطلب شامل ہیں۔ یہ بھی زکوٰۃ کا استحقاق نہیں رکھتے۔ امام یوسف کے بقول سید' سید کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ بھز بن حکیم ﴾ ابو عبدالملک ان کی کنیت ہے۔ بھز کی "با" پر فتحہ اور ھا ساکن۔ بھز بن حکیم بن معاویہ بن حیدہ۔ حیدہ کی "حا" پر فتحہ "یا" ساکن اور "دال" پر فتحہ' تصغیر ہے۔ بصری ہے۔ طبقۂ سادسہ کے تابعی ہیں۔ اس حدیث سے حجت پکڑنے میں اختلاف ہے۔ ابوداؤد کا خیال ہے کہ اس کی احادیث صحیح ہیں۔ ابن معین' ابن مدینی اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے لیکن ابوحاتم نے کہا ہے' اس سے احتجاج نہیں کیا جاتا اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ غلطیاں بہت کرتے ہیں۔ ۱۴۰ھ کے بعد وفات پائی اور ایک روایت کے مطابق ۱۶۰ھ کے بعد۔

﴿ عن ابیہ ﴾ یعنی حکیم بن معاویہ' یہ بھی تابعی ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

﴿ عن جدہ ﴾ معاویہ بن حیدہ بن معاویہ بن قشیر بن کعب قشیری صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ ان سے بھی بہت سی احادیث منقول ہیں۔

(٤٨٩) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا كَانَتْ لَكَ مِائَتَا دِرْهَمٍ، وَحَالَ عَلَيْهَا الحَوْلُ، فَفِيهَا خَمْسَةُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تیرے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر پورا سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم زکوٰۃ ہے۔ جب تک تیرے پاس بیس دینار نہ ہوں اور ان

دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ، حَتَّى يَكُونَ لَكَ عِشْرُونَ دِينَاراً، وَحَالَ عَلَيْهَا الحَوْلُ، فَفِيهَا نِصْفُ دِينَارٍ، فَمَا زَادَ، فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ، وَلَيْسَ فِي مَالٍ زَكَاةٌ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الحَوْلُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَهُوَ حَسَنٌ، وَقَدِ اخْتَلَفُوا فِي رَفْعِهِ.

پر پورا سال نہ گزر جائے۔ اس وقت تک تجھ پر کوئی چیز نہیں جب بیس دینار ہوں تو ان میں نصف دینار زکوٰۃ ہے۔ جو اس سے زیادہ ہو گا تو اسی حساب سے زکوٰۃ ہو گی۔ کسی بھی مال پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک کہ اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور یہ حسن ہے۔ اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف ہے)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ: مَنِ اسْتَفَادَ مَالاً، فَلاَ زَكَاةَ عَلَيْهِ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الحَوْلُ. وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جو مالی سال کے دوران حاصل ہو اس پر بھی سال گزرنے سے پہلے کوئی زکوٰۃ نہیں اور راجح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿حال عليها الحول﴾ یعنی اس مال پر پورا سال گزر جائے۔ ﴿عشرون دينارا﴾ بیس دینار موجود وزن کے مطابق ساڑھے سات تولہ یعنی ۱۰۵ گرام بنتا ہے۔ ﴿فما زاد فبحساب ذلك﴾ اس سے زائد ہو تو اسی حساب سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ نصاب سے زائد ہو گا خواہ وہ قلیل ہے یا کثیر' اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ﴿من استفاد مالا﴾ جو حاصل ہوا ہو۔ ﴿والراجح وقفه﴾ راجح بات کے مطابق یہ حدیث موقوف ہے مگر مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کیلئے کوئی راستہ اور گنجائش نہیں ہے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث میں سونے اور چاندی کی مقدار زکوٰۃ کا بیان ہے۔ چاندی اگر دو سو درہم سے کم ہو تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ یاد رہے کہ درہم کا وزن سوا تین ماشہ ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساڑھے باون تولہ نصاب زکوٰۃ مقرر کیا گیا ہے اور سونے کے بیس دینار پر زکوٰۃ ہے۔ ایک دینار برابر ہے بیس مثقال کے یا نوے ماشہ کے جو ساڑھے سات تولہ بنتا ہے اور ایک حساب اس طرح بھی لگایا گیا ہے کہ درہم سوا تین ماشہ کا ہوتا ہے' اس لحاظ سے محتاط اندازے کے مطابق پچاس تولے مقرر کیا گیا ہے اور زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے اور سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور ایک مثقال بیس قیراط کا وزن تین ماشہ ایک رتی بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے تو بیس مثقال سونے کے ساڑھے باسٹھ ماشہ بنتے ہیں (یعنی پانچ تولہ اڑھائی ماشہ) اور اس کی زکوٰۃ بھی چالیسواں حصہ ہے۔ کاغذی نوٹ جو روپیہ کا بدل ہے اس میں بھی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث دو طریق سے منقول ہے۔ ایک عاصم بن ضمرہ عن علی اور دوسرا حارث الاعور عن علی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ دونوں طریق صحیح ہیں۔

(٤٩٠) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ فِي الْبَقَرِ الْعَوَامِلِ صَدَقَةٌ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ أَيْضاً.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کام کرنے والے بیلوں پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ (اسے ابوداؤد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ راجح یہی ہے کہ یہ بھی موقوف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ البقرا لعوامل ﴾ عوامل عاملة کی جمع ہے۔ عاملہ وہ جانور جو کھیتی باڑی کیلئے جوتتے ہیں' گاہنے کا کام لیتے ہیں' کنوئیں سے پانی نکالنے کا کام لیتے ہیں اور وزنی چیزوں کو کھینچ کر لے جانے کا کام لیتے ہیں اور ایسی دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن جانوروں سے پیداوار حاصل کرنے کیلئے کام لیا جائے یعنی آلات و ذرائع کے طور پر استعمال ہوں ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح وہ کارخانے جن سے پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کی مشینری پر بھی زکوٰۃ نہیں کیونکہ وہ بھی آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار ہیں۔

(٤٩١) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَلِيَ يَتِيماً لَهُ مَالٌ، فَلْيَتَّجِرْ لَهُ، وَلاَ يَتْرُكْهُ حَتَّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ، وَلَهُ شَاهِدٌ مُرْسَلٌ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی یتیم کا متولی بنے اسے چاہئے کہ مال یتیم کو تجارت میں لگائے۔ اسے یوں ہی بے کار پڑا نہ رہنے دے کہ زکوٰۃ ہی اسے کھا جائے۔" (اسے ترمذی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے' البتہ امام شافعی کے پاس ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ من ولی ﴾ علم' یعلم کے باب سے معروف کا صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ جو شخص متولی ہے اور لام پر تشدید کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے۔ ﴿ فلیتجر ﴾ باب افتعال ہے۔ تجارت سے ماخوذ ہے۔ "ولا یترکه" نہی کا صیغہ ہے یعنی مال یتیم کو یوں بے کار پڑا نہ رہنے دے۔ ﴿ حتی تاکله الصدقة ﴾ کہ زکوٰۃ اسے کھا جائے۔ یعنی سال بہ سال اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی رہے اور آہستہ آہستہ ساری جائیداد اسی کی مد میں ادا ہو جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یتیم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر واجب نہ ہوتی تو مال یتیم کے ختم ہونے کا اندیشہ کیسے پیدا ہوتا۔ جمہور کی یہی رائے ہے اور یہی مسلک حق ہے۔

(٤٩٢) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جب لوگ زکوٰۃ لے

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَتَاهُ قَوْمٌ بِصَدَقَتِهِمْ قَالَ: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

کر حاضر ہوتے تو آپؐ ان کیلئے یوں دعا فرماتے۔ "یااللہ! ان پر رحم و کرم فرما۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نسائی میں ہے کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ لے کر خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کیلئے ان الفاظ میں دعا دی۔ اللھم بارك فيه وفي اهله۔ الٰہی! اس شخص اور اس کے اھل میں برکت نازل فرما۔" اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ خود حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کرتے اور رسول اللہ ﷺ ان کیلئے خیر و برکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا کرتے۔

(٤٩٣) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ العَبَّاسَ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ فِي تَعْجِيلِ صَدَقَتِهِ قَبْلَ أَنْ تَحِلَّ، فَرَخَّصَ لَهُ فِي ذٰلِكَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ آیا زکوٰۃ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ادا ہو سکتی ہے؟ تو آپؐ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ (ترمذی اور مستدرک حاکم)

لغوی تشریح: ﴿قبل ان تحل﴾ مقررہ وقت آنے سے پہلے۔ یحل' حلول سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب یضرب ہے۔ یعنی سائل نے پوچھا کہ کیا زکوٰۃ سال گزرنے اور وقت مقررہ سے پہلے ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

حاصل کلام: زکوٰۃ فرض تو سال گزرنے کے بعد ہوتی ہے مگر نبی ﷺ نے پیشگی ادائیگی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس طرح نماز' روزہ اور حج ایسی عبادات اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی عبادت ہے یہ بھی اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتی۔ سفیان ثوری کی یہی رائے ہے حالانکہ یہ استدلال و قیاس کچھ زیادہ وزنی نہیں اس لئے کہ زکوٰۃ کا دیگر عبادات کی طرح ٹائم ٹیبل متعین نہیں۔ اسے اگر قدرے تاخیر سے دیا جا سکتا ہے تو پیشگی بھی ادا ہو سکتی جس کی دلیل یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ جمہور اہل عالم کی بھی یہی رائے ہے۔

(٤٩٤) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، قَالَ: «لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ مِنَ الوَرِقِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الإِبِلِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح اونٹوں کی تعداد پانچ سے کم ہو تو ان پر بھی زکوٰۃ نہیں اور پانچ وسق سے کم کھجوروں پر بھی زکوٰۃ نہیں۔" (مسلم)

اور مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

خَمْسَةِ أَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ». پانچ وسق سے کم کھجوروں یا غلہ میں زکوٰۃ نہیں۔

رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ؛ لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسَاقٍ مِنْ تَمْرٍ وَلَا حَبٍّ صَدَقَةٌ. وَأَصْلُ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کی اصل بخاری و مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اواق ﴾ اس پر تنوین ہے اور قاف کے بعد "یاء" مشددہ اور مخففہ کی صورت بھی جائز ہے۔ اوقیہ کی جمع ہے۔ اوقیہ کے ہمزہ پر ضمہ اور "یا" پر تشدید۔ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یوں پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہیں۔ جدید وزنی پیمانہ کی اصطلاح کے مطابق یہ سات سو پینتیس گرام بنتا ہے۔ ﴿ الورق ﴾ "واؤ" پر فتحہ اور "را" پر کسرہ اور "را" ساکن بھی پڑھی گئی ہے۔ معنی اس کے چاندی "ذود" ذال پر فتحہ اور "واؤ" ساکن۔ اونٹ کے معنی میں۔ یہ اسم جمع ہے اس میں مذکر و مؤنث سبھی شامل ہیں۔ اسی لئے خمس کی اضافت اس کی طرف جائز ہے۔ ﴿ اوسق ﴾ ھمزہ پر فتحہ "واؤ" ساکن اور سین پر ضمہ' وسق کی جمع۔ وسق کی "واؤ" پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور پانچ وسق تین سو صاع ہوئے اور ایک صاع میں چار مد آتے ہیں اور ایک مد ایک رطل اور تہائی رطل کے برابر ہوتا ہے۔ پس صاع جدید پیمانہ کی زبان میں اڑھائی کلوگرام کے قریب ہوتا ہے ﴿ اوساق ﴾ وسق کی جمع ہے' اوسق کی طرح ہے۔ ﴿ حب ﴾ "حا" پر فتحہ اور "با" پر تشدید۔ بیج' تخم مثلاً گندم کا بیج' جو' مسور وغیرہ اور لفظ ﴿ دون ﴾ چاروں جگہ ﴿ اقل ﴾ کے معنی میں ہے یعنی کم از کم مراد یہ ہے کہ مذکورہ اشیاء کی اس مقدار سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ بیان ہوا ہے جبکہ اس سے پہلی حدیث میں دو سو درہم ہے۔ ان دونوں احادیث میں کوئی تفاوت و اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہوگئے کوئی تفاوت نہ رہا۔ تین سو صاع حجازی ہمارے ملک میں مروج انگریزی وزن کے اعتبار سے بیس من ہوتے ہیں۔ ایک وسق میں ساٹھ صاع ہوتے ہیں جو چار من کے برابر ہے۔ گویا ہمارے ملکی حساب سے بیس من غلہ سے کم پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ مگر احناف نے کتاب اللہ اور حدیث کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ غلہ اور کھجور خواہ ایک من یا اس سے بھی کم ہی کیوں نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ ہے مگر پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خود وزن مقرر فرمایا ہے تو پھر ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ اپنی جانب سے کم و بیش کرنے کا مجاز نہیں۔ ہر اس جنس میں جو سال بھر ذخیرہ ہو سکتی ہے۔ اس پر زکوٰۃ ہے۔ مثلاً گندم' چاول' جو' باجرہ' مکئی' ماش' مونگ' چنے وغیرہ۔

(٤٩٥) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، حضرت سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت

عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: **فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالعُيُونُ، أَوْ كَانَ عَثَرِيّاً، اَلْعُشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ العُشْرِ.** رَوَاهُ البُخَارِيُّ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: أَوْ كَانَ بَعْلاً اَلْعُشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالسَّوَانِي أَوِ النَّضْحِ نِصْفُ العُشْرِ.

کرتے ہیں' انہوں نے نبی ﷺ سے بیان کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو زمین آسمانی بارش اور چشموں سے سیراب ہوتی ہو یا رطوبت والی ہو اس میں دسواں حصہ زکوٰۃ ہے (عشر ہے) اور جو زمین پانی کھینچ کر سیراب کی جاتی ہو۔ اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔" (بخاری) ابوداؤد کی روایت میں "بعلا العشر" کا لفظ ہے "العشر" کی جگہ اور اگر جانوروں کے ذریعہ یا ڈول سے پانی نکال کر سیراب کی جاتی ہو اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ فیما سقت السماء ﴾ اس سے مراد بارش' اولے' برف' شبنم وغیرہ ہے اور یہ خبر مقدم ہے۔ ﴿ والعیون ﴾ عین کی جمع ہے۔ چشمے کو کہتے ہیں جو زمین کا پیٹ چاک کر کے نکل آتا ہے اور بلا کسی مشقت و محنت کے اس کا پانی حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿ او کان عثریا ﴾ "عین" اور "ثا" دونوں پر فتحہ ہے اور "را" کے نیچے کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ زمین میں جو رطوبت ہوتی ہے' اس میں سے خوراک حاصل کر کے پروان چڑھتی ہے کیونکہ پانی سطح زمین کے قریب ہوتا ہے اس لئے وہ زمین بغیر سیراب کئے اور پانی چھوڑے پانی حاصل کر لیتی ہے "العشر" مبتداء مؤخر ہے۔ عین پر ضمہ ہے اور شین ساکن ہے۔ ایک چیز کے دس حصے کر لئے جائیں تو اس کا ایک جزء عشر کہلائے گا۔ ﴿ وفیما سقی ﴾ صیغۂ مجہول۔ اس زمین میں جسے سیراب کیا جائے ﴿ بالنضح ﴾ نضح کے نون پر فتحہ اور "ضاد" ساکن ہے۔ اصل میں پانی کا چھڑکاؤ کرنا بلکہ خوب پانی بہا دینا۔ یہاں وہ اونٹ مراد ہیں جن کے ذریعہ پانی لا کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ اونٹ کی طرح بیل اور گدھے جن سے پانی حاصل کرنے کی خدمت لی جاتی ہے۔ ﴿ بعلا ﴾ یعنی ﴿ عثریا ﴾ کے بدلے بعلا کا لفظ روایت کیا ہے۔ بعل کی "با" پر فتحہ اور عین ساکن۔ وہ زمین جو سیراب کئے بغیر زمین کی نمی و رطوبت یا آسمانی بارش کے ذریعہ سیراب ہوتی ہو۔ اس کا معنی بھی قریب قریب وہی ہے جو عثری (نمی والی زمین) کا ہے یا پھر دونوں مترادف المعنی ہیں۔ ﴿ بالسوانی او النضح ﴾ سوانی سانیۃ کی جمع ہے۔ عطف اس کا تقاضہ کرتا ہے کہ سانیہ اور نضح کے معنی الگ الگ ہوں مگر عموماً علماء نے انہیں مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ قابل اعتماد بات یہ ہے کہ سانیہ جانوروں کے ذریعہ پانی لا کر زمین کو سیراب کرنے کا نام ہے اور "نضح" عام ہے اس میں سیراب کرنے کے تمام ذرائع و آلات شامل ہیں۔ اس طرح عام کا عطف خاص پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمین کو مختلف ذرائع و وسائل سے سیراب کرنے کی صورت میں زکوٰۃ (عشر) کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ مثلاً جو زمین مشقت طلب ذریعہ سے سیراب ہو جیسے اونٹ' بیل

یا آدمی پانی نکال کر یا لا کر سیراب کرتے ہوں تو اس زمین کی پیداوار پر نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے۔ اسی طرح اگر زمین کنوئیں کے پانی' ٹیوب ویل کے پانی سے یا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہو جیسے نہر کا پانی' ٹیوب ویل کا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں بھی نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے آج کل آبیانہ دے کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ یہ آبیانہ مشقت و محنت کے قائم مقام ہے لہٰذا موجودہ نظام کے تحت نہری پانی سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار میں بھی بیسواں حصہ ہے۔

(٤٩٦) وَعَنْ أَبِيْ مُوسَى الأَشْعَرِيِّ وَمُعَاذٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُمَا: **لاَ تَأْخُذَا فِي الصَّدَقَةِ إِلاَّ مِنْ هٰذِهِ الأَصْنَافِ الأَرْبَعَةِ: الشَّعِيْرِ، وَالحِنْطَةِ، وَالزَّبِيْبِ، وَالتَّمْرِ.** رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ وَالحَاكِمُ.

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ: فَأَمَّا القِثَّاءُ وَالبِطِّيْخُ وَالرُّمَّانُ وَالقَصَبُ، فَقَدْ عَفَا عَنْهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ. وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دونوں سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "جو' گندم' منقیٰ (کشمش) اور کھجور ان چار اصناف کے علاوہ کسی غلہ پر زکوٰۃ وصول نہ کی جائے۔ (اسے طبرانی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دارقطنی نے معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کھیرا ککڑی' تربوز' انار اور گنے میں البتہ رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ معاف فرمائی ہے۔ مگر اس روایت کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿الزبیب﴾ خشک انگور (کشمش) ﴿القثاء﴾ "قاف" کے نیچے کسرہ اور "ثا" پر تشدید۔ کھیرا ﴿البطیخ﴾ "با" کے نیچے کسرہ "طاء" پر تشدید۔ تربوز ﴿الرمان﴾ "را" پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ انار۔ ﴿القصب﴾ قاف اور صاد دونوں پر فتحہ۔ گنا۔ یہ حدیث زکوٰۃ کی فرضیت کو غلہ اور پھلوں میں انہی چار اصناف پر انحصار کرتی ہے۔ یہ رائے ایک گروہ کی ہے اور دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہروہ چیز جو ان چار اصناف کے قائم مقام ہو اور جو ذخیرہ ہو سکتی ہو اور محفوظ رہ سکتی ہو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اس حدیث میں جو حصر ہے وہ حصر حقیقی نہیں ہے بلکہ وہ حصر اضافی ہے اس مناسبت سے کہ جو اجناس اس دور میں یمن میں دستیاب تھیں اور ان سبزیوں کی مناسبت سے جن پر زکوٰۃ فرض ہی نہیں۔ پس چاول اور مکئی وغیرہ غلہ قسم کی اجناس جنہیں شہروں میں بالعموم لوگ ذخیرہ کر لیتے ہیں' میں زکوٰۃ واجب ہے۔ محققین کے نزدیک یہ رائے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

حاصل کلام: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت جو دارقطنی کے حوالہ سے ہے اس میں ضعف اس لئے ہے کہ اس میں ایک راوی ضعیف ہے اور سند بھی منقطع ہے جیسا کہ مصنف نے التلخیص میں وضاحت بیان کی ہے۔

(٤٩٧) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِيْ حَثْمَةَ حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوا، وَدَعُوا الثُّلُثَ فَإِنْ لَمْ تَدَعُوا الثُّلُثَ، فَدَعُوا الرُّبُعَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ ابْنَ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا "جب تم غلہ کا تخمینہ اور اندازہ لگاؤ تو ایک تہائی چھوڑ دیا کرو اگر تہائی نہیں چھوڑ سکتے تو چوتھائی چھوڑ دیا کرو۔" (ابن ماجہ کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا خرصتم ﴾ یہ خطاب زکوٰۃ وصول کرنے والے عمال کو ہے اور ان کیلئے جو وصولی زکوٰۃ کیلئے دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرتے ہیں اور "خرص" اندازہ لگانے' تخمینہ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں خرص سے مراد انگور اور تر کھجور کا درختوں پر اندازہ ہے۔ ان دونوں کا اندازہ کس طرح لگایا جائے۔ اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اندازہ لگانے والا مرد درخت کے گرد چکر لگائے۔ جب انگور اور کھجور میں مٹھاس پیدا ہو جائے تو سارے پھل پر سرسری طور پر نظر دوڑائے پھر اندازہ لگائے کہ جب یہ انگور خشک ہو کر کشمش کی صورت اختیار کر لیں گے تو اس وقت ان کی مقدار اور وزن اتنا رہ جائے گا اور یہ کھجور جب خشک ہوگی تو اتنی مقدار میں باقی رہ جائے گی۔ اس تخمینہ اور اندازہ لگانے کیلئے ایک ہی آدمی کافی ہے بشرطیکہ وہ منصف مزاج اور عادل ہو ﴿ فخذوا ﴾ پس تخمینہ کے مطابق تم زکوٰۃ وصول کر لو۔ "خذوا" امر کا صیغہ ہے اور اخذ سے ماخوذ ہے۔ ﴿ ودعوا الثلث الخ ﴾ مال کے مالکوں کیلئے تخمینہ لگائی گئی مقدار میں سے ۳/۱ حصہ چھوڑ دو ایک قول یہ ہے کہ یہ ۳/۱ یا ۴/۱ حصہ جو مال کے مالکوں کیلئے چھوڑا جاتا ہے وہ اس لئے چھوڑا جاتا ہے کہ مالک خود اپنے اعزاء و اقرباء اور اپنے ہمسایوں کو اور اندازہ لگانے کے وقت پاس سے گزرنے والوں پر صدقہ و خیرات کر سکے اور مالک سے اس کا تقاضا و مطالبہ اسے کسی تنگی اور حرج میں مبتلا کئے بغیر کچھ محتاجوں اور مساکین کیلئے کیا جائے گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۳/۱ یا ۴/۱ عشر نکالنے سے پہلے ہی اصل مال سے الگ رکھا جائے گا فراخ دلی کے خیال سے کہ پھلوں کا مالک خود اور اپنے اہل و عیال کو کھلا سکے اور ان کی فروخت اس وقت ہوگی جبکہ کھجور رنگ پکڑ کر سرخی مائل ہو جائے۔ اہل و عیال' ہمسائے اور مہمانوں کو فوقیت اور ترجیح دینے کیلئے۔ یہ مقدار جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے' ان سبزیوں کے قائم مقام ہے جن پر زکوٰۃ نہیں۔ یہ حدیث شریعت اسلامیہ کی خوبیوں اور محاسن میں سے ہے۔ صاحب سبل السلام نے بتایا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ تو معمول کی بات ہے کہ جب پھل پک جائے تو مال کے مالک کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ خود اور اس کے اہل و عیال وہ پھل کھائیں اور لوگوں کو اس قدر کھلائیں کہ وہ ذخیرہ کر کے نہ رکھے جا سکیں۔ عرف عام میں خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کو ان سبزیوں کی جگہ تصور کیا جاتا ہے جو ذخیرہ کر کے رکھی نہیں جا سکتیں۔

راوی حدیث: ﴿ سھل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ ﴾ سھل کے سین پر فتحہ اور "ھاء" ساکن ہے۔ ان کا نام عبداللہ یا عامر بن ساعدہ بن عامر انصاری خزرجی مدنی ہے۔ صغار صحابہؓ میں شمار ہوتا ہے۔ ۳ھ میں پیدا

ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے اور مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدینہ ہی میں وفات پائی۔

(٤٩٨) وَعَنْ عَتَّابِ بْنِ أَسِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُخْرَصَ العِنَبُ، كَمَا يُخْرَصُ النَّخْلُ، وَتُؤْخَذُ زَكَاتُه زَبِيْباً. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ.

حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ "ہم انگوروں کا اندازہ بھی اس طرح لگائیں جس طرح کھجوروں کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ میں کشمش وصول کی جائے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے مگر اس میں انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں انقطاع ہے اس لئے کہ اسے سعید بن مسیب' عتاب بن اسید سے روایت کرتے ہیں اور ابوداؤد کہتے ہیں کہ سعید بن مسیب کا عتاب سے سماع ہی ثابت نہیں۔ مگر امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گو یہ حدیث مرسل ہے لیکن ائمہ کا فتویٰ اس کا مؤید ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ ﴾ عتاب میں عین پر فتحہ اور "تا" پر تشدید۔ بن اسید۔ اسید کے ہمزہ پر فتحہ اور سین کے نیچے کسرہ۔ بن ابی العیص بن امیہ بن عبد شمس اموی مکی۔ مشہور صحابی ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے لگے تو ان کو مکہ پر اپنا عامل مقرر فرمایا۔ اس منصب پر عہد رسالت اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مامور رہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی وفات اسی روز ہوئی جس روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام تک زندہ رہے۔

(٤٩٩) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ امرَأَةً أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ وَمَعَها ابْنَةٌ لَّها، وَفِي يَدِ ابْنَتِهَا مَسْكَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ لَهَا: «أَتُعْطِيْنَ زَكَاةَ هٰذَا»؟ قَالَتْ: لاَ، قَالَ: «أَيَسُرُّكِ أَنْ يُسَوِّرَكِ اللَّهُ بِهِمَا يَوْمَ القِيَامَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ»؟ فَأَلْقَتْهُمَا. رَوَاهُ الثَّلاثَةُ، وَإِسْنَادُهُ قَوِيٌّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ.

حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ہمراہ اس کی بیٹی بھی تھی۔ جس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے۔ آپ ؐ نے اس سے فرمایا "کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے؟" اس نے عرض کیا نہیں! آپ ؐ نے فرمایا "کیا تجھے یہ پسند ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کے بدلے تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے؟" یہ سن کر اس خاتون نے دونوں کنگن پھینک دیئے۔ (اسے تینوں نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند قوی ہے۔ حاکم نے اسے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا اور اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ان امراہ﴾ اس خاتون کا نام اسماء بنت یزید بن سکن ہے۔ ﴿مسکتان﴾ کے میم' سین اور کاف تینوں پر فتحہ ہے اور یہ مسکۃ کا تثنیہ ہے یعنی کنگن جو ہاتھوں میں پہنا جاتا ہے۔ فارسی میں کہا جاتا ہے دست برنجن اور کنگن بھی کہا جاتا ہے۔ مسکۃ پازیب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پازیب وہ زیور ہے جو پاؤں میں اس طرح پہنا جاتا ہے جس طرح کنگن ہاتھوں میں پہنے جاتے ہیں۔ "ایسرک" اس میں ھمزہ استفہامیہ ہے اور فعل مضارع ہے' سرور سے ماخوذ ہے اور کاف مؤنث کے خطاب کیلئے ہے۔ معنی ہے کیا تجھے یہ پسند ہے' خوش لگتا ہے' باعث سرور و مسرت ہے۔ ﴿ان یسورک﴾ تسویر سے ماخوذ ہے' کنگن پہننے کو کہتے ہیں۔ ﴿بھما﴾ ان دونوں کی جگہ ان دونوں کے بدلہ میں یا یہ معنی ہے کہ ان دونوں کے سبب تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے جائیں۔ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی صورت میں۔ ﴿فالقتھما﴾ اس نے وہ دونوں کنگن پھینک مارے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ ہے۔ لیکن اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ زیور میں زکوٰۃ واجب ہے۔ دوسرا یہ کہ زیور میں زکوٰۃ فرض نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ' احمد رحمہ اللہ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ زیور کی زکوٰۃ اسے عاریتاً دینا ہے' الگ زکوٰۃ نہیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ زیورات میں صرف ایک ہی بار زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ فرض ہے اور یہ صحیح حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض آثار کی بنا پر جو کہا گیا ہے کہ زیورات میں زکوٰۃ نہیں وہ قابل التفات نہیں۔ (سبل)

(٥٠٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّهَا كَانَتْ تَلْبَسُ أَوْضَاحاً مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَكَنْزٌ هُوَ؟ فَقَالَ: «إِذَا أَدَّيْتِ زَكَاتَهُ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے سونے کا زیور پہن رکھا تھا۔ انہوں نے دریافت کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا وہ کنز ہے؟ فرمایا "جب تو نے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی تو پھر یہ کنز نہیں۔" (اسے ابوداؤد اور دارقطنی دونوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اوضاحا﴾ "ضاد" اور "حا" کے ساتھ "وضح" کی جمع ہے "وضح" کے معنی ہیں پازیب یعنی پاؤں کا زیور ﴿اکنزھو﴾ اس میں ھمزہ استفہامیہ ہے۔ یعنی دریافت کیا کہ آیا یہ کنز کی تعریف میں آتا ہے جس کے بارے میں قرآن حمید میں سخت وعید وارد ہے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھم وجنوبھم وظھورھم' ھذا ماکنزتم لانفکم' فذوقوا ماکنتم تکنزون (9

: ۳۴-۳۵) "یعنی جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اس میں سے خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے......" ﴿ اذا ادیت زکاتہ ﴾ اس سے زیور میں زکوٰۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور سنن ابی داوٗد میں ہے کہ جب مال نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر وہ کنز نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیور میں نصاب معتبر ہے۔ جب نصاب زکوٰۃ سے کم مالیت کا زیور ہوگا تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اوضاح جیسا کہ اوپر بیان ہوا وضح کی جمع ہے' وضح کہتے ہیں روشن اور چمک دمک کو۔ دراصل تو یہ زیور چاندی سے تیار ہوتا تھا۔ اس ظاہری چمک دمک اور سفیدی کی وجہ سے اسے اوضاح کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں یہ زیور سونے کا بھی تیار کیا جانے لگا۔ اس حدیث سے بھی سونے چاندی سے ساختہ زیورات پر زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ چاندی کے زیور پر بھی زکوٰۃ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ میں چاندی کے چھلے دیکھے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ "اے عائشہ! تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا "اچھا تو پھر جہنم کی آگ میں سے تمہارے لئے یہی کافی ہیں۔" حاکم نے اس کی سند کو شیخین کی شرط کے مطابق کہا ہے۔

(٥٠١) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نَعُدُّهُ لِلْبَيْعِ. رَوَاهُ أبو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ لَيِّنٌ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سامان تجارت سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ (اسے ابوداوٗد نے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ نعدہ ﴾ ہم اسے تیار کرتے تھے اور فروخت کیلئے حاضر کرتے تھے۔ ﴿ نعدہ ﴾ میں نون پر ضمہ اور عین کے نیچے کسرہ۔ اعداد سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے۔ یہ حدیث اموال تجارت پر زکوٰۃ کے وجوب کی دلیل ہے۔ ﴿ واسنادہ لین ﴾ ابوداوٗد نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ پھر منذری رحمہ اللہ نے بھی سکوت کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (عون المعبود' ج ۲ ص: ۳)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اموال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ مجاہد نے اس کی فرضیت پر قرآن مجید کی آیت ﴿ انفقوا من طیبات ما کسبتم ﴾ سے استدلال کیا ہے اور ابن منذر نے اس کی فرضیت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ فقہاء سبعہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ مال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ البتہ ظاہریہ اس کی فرضیت کے قائل نہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور اس روایت کا ایک راوی سلیمان بن سمرہ مجہول ہے۔ لیکن متقدمین کا اتفاق اور صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ اس کے مؤید ہیں۔

(۵۰۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "معدنیات میں خمس یعنی پانچواں حصہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وفی الرکاز ﴾ اس میں "واؤ" پہلے جملہ پر عطف کیلئے ہے اور وہ جملہ ہے ﴿ العجماء جبار' والبئر جبار' والمعدن جبار ﴾ مصنف نے اختصار کے پیش نظر اتنا حصہ چھوڑ دیا ہے۔ ﴿ والرکاز ﴾ "را" کے نیچے کسرہ۔ جاہلیت کے زمانہ کا زمین میں مدفون خزانہ جو بغیر کسی کثیر عمل و مشقت کے حاصل ہوا ہو۔ ﴿ الخمس ﴾ خا اور میم دونوں پر ضمہ۔ کسی چیز کے پانچ برابر حصے کئے جائیں تو ان میں سے ایک حصہ پانچواں حصہ کہلاتا ہے اور یہ مبتداء مؤخر ہے اور خبر اس کی پہلا جملہ ﴿ فی الرکاز ﴾ ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رکاز کے مال میں زکوٰۃ نہیں بلکہ خمس ہے۔ اس کی حیثیت اموال غنیمت کی سی ہے۔ اس میں خمس واجب ہے جو بیت المال میں جمع کیا جائے گا اور باقی تمام کا مالک وہ شخص ہوگا جسے یہ خزانہ ملا۔

(۵۰۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ فِي كَنْزٍ وَجَدَهُ رَجُلٌ فِيْ خَرِبَةٍ: «إِنْ وَجَدْتَهُ فِي قَرْيَةٍ مَسْكُونَةٍ فَعَرِّفْهُ، وَإِنْ وَجَدْتَهُ فِي قَرْيَةٍ غَيْرِ مَسْكُونَةٍ فَفِيهِ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خزانے کے بارے میں جو کسی آدمی کو ویرانے سے حاصل ہوا ہو (ملا ہو) فرمایا "اگر تو نے یہ خزانہ کسی آباد جگہ سے پایا ہے تو اس کی تحقیق کیلئے اعلان کرو اور اگر تو نے کسی غیر آباد جگہ سے پایا ہے تو اس میں اور معدنیات میں (پانچواں حصہ) ہے۔"

(اسے ابن ماجہ نے حسن سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی خربۃ ﴾ "خا" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ شکستہ' بے آباد مقام جہاں کوئی رہتا نہ ہو۔ ﴿ فی قریۃ مسکونۃ ﴾ جہاں لوگ آباد ہوں۔ یعنی یہ ویران اور بے آباد جگہ آبادی میں ہو ﴿ فعرفہ ﴾ تعریف سے امر کا صیغہ ہے تو لوگوں میں اس کا اس وقت تک اعلان کرو اور اس کی کیفیت بیان کرو کہ یا تو اس کا مالک آجائے اور یا پھر سال بھر اس پر گزر جائے تو ایسی صورت میں تمہارے لئے اس کا کھانا صحیح اور درست ہے تو گویا اس خزانے کی نوعیت گری پڑی چیز کی سی ہوگی۔ ﴿ وان وجدتہ ﴾ اور اگر تو اسے غیر آباد جگہ میں پائے تو اس کا حکم' رکاز کا حکم ہوگا اور دونوں کے حکم کی نوعیت اموال غنیمت کے حکم کی ہوگی۔ ﴿ وفی الرکاز ﴾ واؤ عطف اس بات کا متقاضی ہے کہ جب خزانہ زمین کے پیٹ سے نہ نکالا جائے تو اسے رکاز نہیں کہتے ہیں۔

(۵۰۴) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَخَذَ مِنَ الْمَعَادِنِ الْقَبَلِيَّةِ الصَّدَقَةَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

رسول اللہ ﷺ نے قبل جگہ میں واقع کانوں سے زکوٰۃ وصول کی۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ معادن ﴾ "معدن" کی جمع ہے۔ "معدن" میں دال کے نیچے کسرہ ہے۔ کان' زیر زمین اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سونا' چاندی اور جواہرات وغیرہ اللہ تعالیٰ نے بکثرت پیدا فرمائے ہوں۔ ﴿ القبلیۃ ﴾ "قاف" پر فتحہ اور "با" پر بھی "قبل" کی طرف نسبت ہے۔ "فرع" کے نواح میں ایک جگہ کا نام ہے اور "فرع" میں "فا" پر ضمہ ہے اور "را" ساکن ہے اور ایک قراءت کے مطابق دونوں پر ضمہ بھی ہے۔ مدینہ کے بالائی حصہ میں ساحل سمندر پر واقع زمین جو مکہ و مدینہ کے درمیان مدینہ سے آٹھ برد (تقریباً ۹۶ میل) کے فاصلہ پر ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جگہ چار دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اس میں بہت سی مساجد اور بستیاں ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کانوں پر زکوٰۃ واجب ہے ان میں خمس نہیں۔ معدن اور رکاز (کان اور دفینہ) دونوں ایک نہیں ہیں۔ لغوی اعتبار سے' حکماً نہ شرعاً۔

راوی حدیث: ﴿ بلال بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ بلال بن حارث مزنیہ قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے مزنی کہلائے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ۵ھ میں نمائندہ کی حیثیت سے آئے تھے۔ مدینہ میں سکونت اختیار کی۔ پھر بصرہ منتقل ہوگئے تھے۔ فتح مکہ کے روز انہوں نے مزنیہ قبیلہ کا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا۔ ۸۰ برس کی عمر میں ۶۰ھ میں وفات پائی۔

١ - بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ

صدقہ فطر کا بیان

(۵۰۵) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعاً مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ شَعِيرٍ، عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثٰى وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ، مِنَ الْمُسْلِمِينَ، وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے غلام' آزاد' مرد' عورت' بچے' بوڑھے سب پر صدقہ فطر واجب کیا ہے۔ ایک صاع (ٹوپا) کھجوروں سے یا ایک صاع جو سے اور اس کے متعلق حکم دیا ہے کہ یہ فطرانہ نماز کیلئے نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔ (بخاری و مسلم)

وَلِابْنِ عَدِيٍّ وَالدَّارَقُطْنِيِّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ: أَغْنُوهُمْ عَنِ الطَّوَافِ فِي هٰذَا الْيَوْمِ.

ابن عدی اور دار قطنی میں ضعیف سند سے ہے کہ اس روز غرباء کو دربدر پھرنے سے بے نیاز کر دو۔

لغوی تشریح: ﴿باب صدقة الفطر﴾ رمضان کے اختتام پر فطرانہ دینا۔ قسطلانی کے بقول فطرانہ کی فرضیت رمضان المبارک کے آغاز سے صرف دو روز پہلے ۲ھ میں ہوئی۔ ﴿فرض﴾ بمعنی واجب اور لازم۔ یعنی اسے واجب اور لازم قرار دیا گیا۔ یہ صدقۂ فطر (فطرانہ) کے وجوب کی واضح دلیل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فرض قدر کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن یہ ظاہر کے سراسر خلاف ہے۔ ﴿من المسلمین﴾ کافروں میں سے نہ ہو۔ اس لئے کافر غلام کا صدقۂ فطر نہیں نکالا جاتا۔ ﴿اغنوھم﴾ اغناء سے امر کا صیغہ ہے۔ ضمیر منصوب فقراء کی طرف راجع ہے یعنی "ھم" ضمیر سے مراد محتاج و ضرورت مند لوگ ہیں۔ ﴿عن الطواف﴾ دست سوال دراز کرنے کیلئے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے پھرنے سے بے نیاز کر دیں اور لوگوں سے اپنی معاشی ضروریات طلب کرنے سے روک دیں۔ یہ بے نیازی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ فطرانہ دن کے پہلے حصہ میں ادا کر دیا جائے تاکہ ضرورت مند لوگ اپنی ضروریات کا سامان خرید سکیں اور بے فکر ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فطرانہ مسلمانوں کے سب افراد پر واجب ہے اور اس کی ادائیگی کا حکم بھی نماز عید سے پہلے پہلے ہے تاکہ معاشرہ کے ضرورت مند حضرات اس روز مانگنے سے بے نیاز ہو کر عام مسلمانوں کے ساتھ خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہو سکیں۔ اس فطرانہ کی مقدار ایک صاع مقرر فرمائی ہے۔ غیر مسلم غلام کا فطرانہ نہیں۔ البتہ جن افراد کی کفالت کسی کے ذمہ ہو ان سب کا فطرانہ وہ خود ادا کرے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقۂ فطر کیلئے نصاب کا مالک ہونا بھی ضروری نہیں۔ فرض کا لفظ بتا رہا ہے کہ فطرانہ ادا کرنا نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ امام اسحٰق بن راھویہ رحمہ اللہ نے تو فطرانہ کے وجوب پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

(٥٠٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُعْطِيْهَا فِي زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ صَاعاً مِنْ طَعَامٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ شَعِيْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ زَبِيْبٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: «أَوْ صَاعاً مِنْ أَقِطٍ». قَالَ أَبُو سَعِيْدٍ: أَمَّا أَنَا فَلاَ أَزَالُ أُخْرِجُهُ، كَمَا كُنْتُ أُخْرِجُهُ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللهِ ﷺ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ: «لاَ أُخْرِجُ أَبَداً إِلاَّ صَاعاً».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے زمانہ میں گندم سے ایک صاع اور کھجور سے ایک صاع اور جو سے ایک صاع اور کشمش (منقیٰ) سے ایک صاع (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ پنیر میں سے ایک صاع نکالا کرتے تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو ہمیشہ وہی مقدار نکالتا رہوں گا جو میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نکالا کرتا تھا اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ میں تو ہمیشہ ایک صاع ہی نکالوں گا۔

لغوی تشریح: ﴿ کنا نعطیھا ﴾ ہم دیا کرتے تھے سے مراد ہم صدقہ فطر (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ ﴿ صاعا من طعام ﴾ طعام کا لفظ مابعد مذکور چیزوں کے مابین میں بولا گیا تاکہ طعام اور دوسری اجناس کے مابین فرق و تغائر واضح ہو جائے اور اس سے مراد گندم ہے۔ طعام بول کر اہل عرب عموماً اس سے مراد گندم لیتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ "طعام" میں اجمال ہے اور مابعد اس کی تفصیل ہے اور بعض روایات میں اس کی صراحت بھی ہے اس لئے یہی قول راجح ہے۔ ﴿ اقط ﴾ ھمزہ پر فتحہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ پنیر کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل دودھ ہوتا ہے جو خشک کر کے جمایا ہوتا ہے اور پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ ﴿ فلا ازال اخرجه ﴾ اور میں ہمیشہ ایک صاع کی مقدار ہی فطرانہ نکالتا رہوں گا خواہ کوئی جنس ہو' گندم ہو یا دوسری اجناس اور ایک صاع میں پانچ رطل پورے اور ۳/۱ مزید ہوتے ہیں اور یہ وزن چار مد کے مساوی ہوتا ہے۔ جدید حساب کے مطابق ایک صاع کا وزن اڑھائی کلوگرام کے قریب ہوتا ہے اور اس کا مکمل ضبط تو ممکن نہیں۔ جب کوئی چیز ہلکے وزن کی ہوتی ہے جیسے جو تو صاع اس کی قلیل مقدار سے پورا ہو جاتا ہے اور جب بھاری و ثقیل وزن کی ہوتی ہے تو اس سے بھی زیادہ وزن سے پورا ہوتا ہے۔ یہ حدیث ہر چیز سے فطرانہ ایک صاع کا تقاضا کرتی ہے اور نصف صاع فطرانہ کے فرض کی ادائیگی کیلئے کافی نہیں ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس امر میں بالکل واضح ہے کہ فطرانہ ایک صاع ہی مسنون ہے۔ خواہ کوئی جنس ہو۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا یہی موقف تھا۔ انہوں نے ایک صاع ہی دینے کا اظہار اسی لئے فرمایا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں آدھا صاع گندم کو پورے صاع جو کے برابر کر دیا اس لئے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا کہ ہم تو اتنا ہی فطرانہ ہر جنس سے ادا کرتے رہیں گے جتنا آپؐ کے دور میں کرتے رہے ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد سے کام لیا اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور اس پر عمل صحابہؓ کو دلیل بنایا۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی رائے وزنی ہے' اسی پر عمل ہونا چاہئے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے صاع کا اعتبار کیا ہے جنس کی گرانی اور ارزانی کا نہیں جبکہ دوسرے حضرات نے صاع کا نہیں بلکہ قیمت اشیاء کا اعتبار کیا ہے۔

(٥٠٧) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ، وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِينِ، فَمَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ فَهِيَ زَكَاةٌ مَقْبُولَةٌ، وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلَاةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِنَ الصَّدَقَاتِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر (فطرانہ) روزہ دار کی لغویات اور فحش گوئی سے روزہ کو پاک کرنے کیلئے اور مساکین کو کھانا کھلانے کیلئے مقرر کیا ہے۔ جو اسے نماز ادا کرنے سے پہلے ادا کر دے وہ تو مقبول ہے اور جو ادائیگی نماز کے بعد دیا جائے تو یہ صدقوں میں ایک صدقہ ہے۔ (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ. کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ طهرة ﴾ "طا" پر ضمہ۔ منصوب ہے مفعول لہ ہونے کی وجہ سے۔ معنی روزہ دار کے نفس کی طہارت کیلئے۔ ﴿ من اللغو ﴾ لغو کا تعلق زبان و قول سے ہے' دل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ﴿ والرفث ﴾ فحش کلامی۔ ﴿ طعمة ﴾ "طا" پر ضمہ۔ مراد کھانا اور اس کا عطف طھرۃ کے لفظ پر ہے۔ کہا گیا ہے کہ مساکین کا بالخصوص ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ صدقہء فطر بھی انہی کا مخصوص استحقاق ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صدقہ فطر کا مصرف وہی جگہیں ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔ بعض اصناف کا نص میں ذکر اس کی تخصیص کو مستلزم نہیں ہے۔ من اداھا قبل الصلاۃ قبل صلاۃ سے مراد ہے نماز عید سے پہلے ﴿ صدقة من الصدقات ﴾ یعنی پھر یہ عام صدقہ ہو گا۔ صدقہء فطر نہیں ہو گا' اور آدمی فریضہ کا تارک ہی رہے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فطرانہ مساکین کا حق ہے۔ یہ حق نماز عید سے پہلے ادا کر دینا چاہئے۔ نماز عید کے بعد ادا شدہ فطرانہ ایک عام صدقہ ہو گا' فطرانہ عید نہیں ہو گا۔

٢ - بَابُ صَدَقَةِ التَّطَوُّعِ — نفلی صدقے کا بیان

(٥٠٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ» - فَذَكَرَ ٱلْحَدِيْثَ - وَفِيهِ: «وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا، حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "سات قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ایسے روز میں سایہ عطا کرے گا جس روز اس کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہو گا۔" پھر ساری حدیث بیان کی۔ اس میں ہے کہ "ان سات آدمیوں میں وہ آدمی بھی شامل ہے جو ایسے طریقہ سے مخفی طور پر صدقہ دے کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہ ہونے پائے کہ دائیں ہاتھ سے کیا دیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ سبعة ﴾ سات اقسام و انواع کے لوگ۔ ﴿ يظلهم ﴾ باب افعال سے ماخوذ ہے۔ یعنی ان کو سایہ میں جگہ دے گا۔ ﴿ فى ظله ﴾ اپنے سائے میں۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم کا سایہ ہے۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنی حمایت و حفاظت میں لے لے گا۔ ﴿ يوم لاظل ﴾ جس روز کوئی سایہ نہ ہو گا اس سے مراد قیامت کا دن ہے ﴿ فذكر الحديث ﴾ پھر حدیث بیان فرمائی اور اس میں ان ساتوں کا ذکر کیا جو یہ ہیں۔ (۱) امام عادل۔ (۲) وہ نوجوان جس کی نشو و نما اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو۔ (۳) وہ آدمی جس کا قلب مسجد سے معلق ہو۔ (۴) ایسے دو آدمی جن کی باہمی

محبت اللہ کیلئے ہو۔ اگر جمع ہوں تب بھی اللہ کی خاطراور اگر جدا جدا ہوں تب بھی ان کی جدائی اللہ کیلئے ہو۔ (۵) وہ آدمی جسے حسب و نسب والی حسین و جمیل نوجوان عورت دعوت برائی دے اور وہ یہ کہہ کر کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں' اس کی دعوت کو ٹھکرا دے۔ (۶) وہ آدمی جو تنہائی اور کنج عزلت میں ذکر الٰہی میں ایسا مشغول ہو کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جائیں۔ (۷) اور ساتواں وہ آدمی ہے جو ایسے مخفی طریقہ سے صدقہ و خیرات کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ ﴿حتی لا تعلم شماله﴾ بائیں کو خبر نہ ہو کہ دائیں نے کیا دیا۔ دراصل اس میں مبالغہ آرائی ہے کہ صدقہ دیتے وقت ریا کا شائبہ و گمان تک نہ ہو۔ یہ حدیث صدقہ واجبہ اور نافلہ دونوں پر محیط ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے۔ اس روز عرش الٰہی کے علاوہ اور کہیں سایہ میسر نہیں آئے گا۔ عرش کیا ہے۔ اس کی صحیح کیفیت و نوعیت تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔

اس حدیث میں مرد کی قید اتفاقی ہے ورنہ انہی اوصاف سے متصف اگر کوئی خاتون ہوگی تو اسے بھی یہی ثواب ملے گا۔ نیز اس حدیث سے صدقہ و خیرات مخفی طریقہ سے دینے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ فرض اور واجب صدقہ دکھا کر کھلے عام دینا چاہئے تاکہ لوگوں میں رغبت و شوق پیدا ہو اور نفلی چھپا کر بہتر ہے۔ ضروری اور لازمی نہیں کیونکہ اگر نفلی خیرات عمومی حیثیت کی حامل ہو اور ریا بھی مطلوب نہ ہو تو اس کا بھی کھلے عام دینا زیادہ بہتر ہے۔

(۵۰۹) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: كُلُّ امْرِئٍ فِي ظِلِّ صَدَقَتِهِ حَتَّى يُفْصَلَ بَيْنَ النَّاسِ». رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ "ہر آدمی اپنے صدقہ کے سایہ میں کھڑا ہوگا یہاں تک کہ لوگوں کا فیصلہ ہو جائے۔" (ابن حبان اور مستدرک حاکم)

حاصل کلام: اس حدیث میں صدقہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ صدقہ کرنے والا قیامت کے روز اپنے صدقہ کے سایہ میں کھڑا ہوگا۔ اس روز گرمی و تمازت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہوگی۔ سایہ کا نصیب ہونا اس روز بڑی غیر معمولی نعمت ہوگی۔ سایہ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ واقعتاً صدقہ سائبان کی طرح سایہ دے رہا ہوگا اور صدقہ کرنے والا اس سایہ میں کھڑا سکون و طمانیت محسوس کر رہا ہوگا یا دوسرا معنی یہ کہ صدقہ آدمی کی حمایت کر رہا ہوگا اور اسے بخشوا کر رہے گا۔ صدقات نفلیہ کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ فرض زکوٰۃ میں اگر کسی قسم کی کمی یا نقص رہ گیا ہوگا تو اس سے وہ پورا کر دیا جائے گا۔

(۵۱۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِماً ثَوْباً عَلَى عُرْيٍ، كَسَاهُ اللَّهُ مِنْ خُضْرِ الجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِماً عَلَى جُوعٍ أَطْعَمَهُ اللَّهُ مِنْ ثِمَارِ الجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقَى مُسْلِماً عَلَى ظَمَإٍ سَقَاهُ اللَّهُ مِنَ الرَّحِيقِ المَخْتُومِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ لِينٌ.

ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا ”جو مسلمان اپنے برہنہ بھائی کو کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے سبز ریشمی کپڑے پہنائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی بھوکے مسلمان بھائی کو کھانا کھلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھل کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے پیاسے مسلمان بھائی کو پانی (یا مشروب) پلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت کی مہربند پاکیزہ شراب پلائے گا۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس کی سند میں کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿كسا﴾ کے معنی ہیں کسی کو لباس پہنانا۔ ﴿على عرى﴾ ”عری“ کے عین پر ضمہ اور ”را“ ساکن یہ مصدر واقع ہو رہا ہے۔ یعنی ایسی حالت کہ اس کے جسم پر لباس نہیں۔ من خضر الجنه - خضر کے ”خا“ پر ضمہ اور ضاد ساکن یہ اخضر کی جمع ہے۔ یعنی جنت کا سبز لباس۔ ﴿على جوع﴾ بھوکے کو۔ ﴿جائعا﴾ بھوکا' خالی پیٹ۔ ﴿على ظما﴾ شدید پیاس کی حالت میں۔ ”ظا“ اور ”میم“ دونوں پر فتحہ یعنی پیاسا۔ ﴿الرحيق﴾ خالص شراب جس میں نشہ نہ ہو۔ ﴿المختوم﴾ مہربند جسے مہر لگا کر منہ بند کر دیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو جنت کی ایسی شراب پلائے گا جس کو کستوری کی مہر لگا کر بند کر دیا گیا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے عمل کا آخرت میں جو بدلہ عنایت فرمائے گا وہ اس کی جنس سے ہوگا۔ البتہ جنت کا لباس دنیا کے لباس سے عمدہ' بہترین' خوبصورت اور قیمتی ہوگا۔ بدلہ اسے ملے گا جس کا عمل شرف قبولیت سے مشرف ہوگا۔ قبولیت عمل کیلئے دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مشروع و مسنون ہو غیر مشروع نہ ہو اور دوسرا اس سے مقصود و مطلوب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کا حصول ہو۔ شہرت و ریاکاری اور دکھاوا مطمع نظر نہ ہو۔

حدیث میں پیاسے' ننگے اور بھوکے کا ذکر کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہٹے کٹے نوجوان توانا کو اور مالدار اور پیشہ ور گداگر کو نہ دیا جائے۔ حقیقی ضرورت مند و حاجت مند کو دیا جائے۔ اس سے غرباء کی امداد پر جنت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کی بشارت ملتی ہے۔ سربند شراب پیش کرنے سے عز و شرف بھی حاصل ہوگا اور شراب میں کسی قسم کی آمیزش بھی نہ ہوگی۔ اس حدیث میں کمزوری جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ اس کی سند میں ابوخالد یزید بن عبدالرحمٰن مختلف فیہ راوی ہے۔

(٥١١) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْيَدُ العُلْيَا خَيْرٌ مِنَ اليَدِ

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا ”اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ آغاز و ابتداء ان سے کر

السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنىً، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللَّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

جن کی تو کفالت اور عیالداری کرتا ہے اور بہتر صدقہ وہ ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد دیا جائے۔ جو شخص دست سوال دراز کرنے سے بچے گا اللہ تعالیٰ اسے بچا لے گا اور جو استغناء کا مظاہرہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے مستغنی (بے پروا) کر دے گا۔" (بخاری و مسلم' متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ الید العلیا ﴾ اوپر والے ہاتھ سے مراد دینے والا ہاتھ ہے۔ ﴿ الید السفلی ﴾ نیچے والے ہاتھ سے مراد ہے لینے والا' سوال کرنے والا۔ ﴿ ابدا ﴾ شروع کر' ابتداء و آغاز کر یعنی دو اور خرچ کرو۔ ﴿ بمن تعول ﴾ جن کا نان و نفقہ تیرے ذمہ ہو۔ ﴿ ماکان عن ظھرغنی ﴾ اپنی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو زائد بچ رہے اور صاحب مال کو اس کی چنداں ضرورت و حاجت بھی نہ رہے اور لفظ ظھر محض کلام میں وسعت کیلئے استعمال کیا ہے۔ ﴿ ومن یستعفف ﴾ جو سوال کرنے' مانگنے سے بچنا چاہئے۔ ﴿ یعفہ اللہ ﴾ باب افعال سے اعف یعف سے ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ بچنے کی توفیق سے نواز دیتا ہے۔ ﴿ ومن یستغن ﴾ یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے۔ خواہ کم مقدار میں ہو یا کثیر' اسی پر قناعت کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر گھر کے افراد ضرورت مند و محتاج ہوں تو ان پر اپنا مال خرچ کرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔ ان کی موجودگی میں دوسرے کو صدقہ دینا کوئی مستحسن عمل نہیں۔ مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بہتر مال وہ ہے جسے آدمی اپنے اہل و عیال اور گھر والوں پر صرف کرے یا جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرے یا پھر اپنے احباب و رفقاء اور دوستوں پر (شرعی حدود میں رہتے ہوئے) خرچ کرے۔ اس حدیث میں صدقہ دینے کی فضیلت کے ساتھ ساتھ سوال کرنے اور بلا ضرورت مانگنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور جو از خود مانگنے سے بچنا چاہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے اسباب پیدا فرما کر بچا لیتا ہے۔

(٥١٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: جُهْدُ الْمُقِلِّ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا "کم مال والے کا صدقہ اور صدقہ کی ابتداء ان سے کر جن کی تو کفالت کرتا ہے۔" (اسے احمد' ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ' ابن حبان اور

وَالحَاكِمُ. حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ جهد المقل ﴾ الجهد کے "جیم" پر ضمہ اور "ھا" ساکن۔ ہمت' طاقت اور اگر فتحہ پڑھا جائے تو پھر اس کے معنی مشقت و محنت کے ہیں۔ المقل کے میم پر ضمہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ قلیل مال والا آدمی ہے معنی یہ ہوئے کہ جب آدمی کے پاس مال کی کمی ہو پھر اتنا صدقہ و خیرات کرے جتنی اس کی حالت اجازت دیتی ہے تو ایسی حالت میں کیا ہوا صدقہ دوسرے صدقات سے افضل ہے۔ بظاہر یہ حدیث پہلی حدیث کے معارض ہے جس کے الفاظ ہیں۔ افضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى ان کے مابین تطبیق یہ ہے کہ اس دوسری حدیث سے وہ شخص مراد ہے جو صدقہ کرنے کے بعد فقر کی مشقت کو برداشت نہیں کر سکتا اور پہلی حدیث اس آدمی کے بارے میں ہے جو ایسے حالات میں صبر و برداشت کر سکتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے غنی سے نفس و ضمیر کا استغناء مراد ہے اس اعتبار سے ان میں کوئی تفاوت نہیں رہتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ امیر و مالدار اور غریب و مفلس کے صدقہ و خیرات میں نمایاں فرق ہے۔ اور دوسری یہ کہ اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے بعد صدقہ و خیرات کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ خود تو صدقہ دیتا پھرے اور اس کے اہل و عیال محتاج ہوں اور دوسروں کے روبرو دست سوال دراز کرتے پھریں۔ اس لئے اپنے گھر والوں کی جائز شرعی ضروریات کی تکمیل کے بعد دوسروں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اول خویش بعد درویش کا محاورہ اس پر خوب چسپاں ہے۔

(٥١٣) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**تَصَدَّقُوا**»، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ! عِنْدِيْ دِيْنَارٌ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى نَفْسِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى وَلَدِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى زَوْجَتِكَ**»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى خَادِمِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: «**أَنْتَ أَبْصَرُ بِهِ**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدقہ و خیرات کرو۔" ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک دینار ہے۔ "آپ ؐ نے فرمایا "اسے تو اپنی ذات پر خرچ کر۔" وہ بولا میرے پاس ایک اور بھی ہے' آپ ؐ نے فرمایا "اسے اپنی اولاد پر صدقہ (خرچ) کر۔" اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے' آپ ؐ نے فرمایا "اسے اپنی اہلیہ پر صدقہ (خرچ) کر۔" اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے' آپ ؐ نے فرمایا "اسے اپنے خادم پر صدقہ (خرچ) کر" وہ بولا حضور ﷺ میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ آپ ؐ نے

فرمایا "اس کے خرچ کرنے کی تجھے زیادہ سمجھ بوجھ ہے۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿تصدق به على نفسك﴾ "تصدق" انفق کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی خرچ کر۔ صدقہ کا لفظ بول کر مراد انفاق لینے سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حقدار کیلئے خرچ کرنا اجر و ثواب میں صدقہ کرنے کے برابر ہے۔ ﴿انت ابصر﴾ یعنی تجھے زیادہ علم ہے کہ تیرے خرچ کرنے کا کونسا زیادہ مستحق ہے؟ اب تیری مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے تو اسے بھی خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس روک رکھ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اپنی ذات پر حدود شرعی کے اندر رہتے ہوئے خرچ کرنا بھی صدقہ و خیرات کرنے کی طرح اجر و ثواب رکھتا ہے۔ ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ پہلے اپنی ذات پر پھر اولاد پر پھر بیوی پر پھر خادم پر جو کچھ بچ جائے اسے اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہے تو کسی جگہ خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس محفوظ رکھے' آئندہ کسی کام آئے گا۔ لہذا ثابت ہوا کہ اہل حقوق کی ترتیب کے اعتبار سے خرچ کرنا واجب ہے تاکہ کسی مستحق کا استحقاق مجروح نہ ہو۔

(٥١٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا أَنْفَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ طَعَامِ بَيْتِهَا، غَيْرَ مُفْسِدَةٍ، كَانَ لَهَا أَجْرُهَا بِمَا أَنْفَقَتْ، وَلِزَوْجِهَا أَجْرُهُ بِمَا اكْتَسَبَ، وَلِلْخَازِنِ مِثْلُ ذٰلِكَ، لَا يَنْقُصُ بَعْضُهُمْ مِنْ أَجْرِ بَعْضٍ شَيْئاً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب عورت اپنے گھر کے مال سے فضول خرچی کئے بغیر خرچ کرے تو اسے خرچ کرنے کے بدلے میں اجر و ثواب ملے گا اور اس کے شوہر کیلئے کمانے کا ثواب اور اسی طرح خزانچی کیلئے بھی اجر ہے ہر ایک کا ثواب دوسرے کے ثواب میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿غير مفسدة﴾ یعنی فضول خرچی' اسراف و تبذیر بیوی کو خاوند کے مال سے خرچ کرنے کی اجازت۔ شوہر کی جانب سے بیوی کو صریح طور پر اجازت ملنے پر محمول کیا جائے گا یا کسی اشارہ وغیرہ پر۔ جیسا کہ معاشرہ میں یہ چیز معروف و معلوم ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر معمولی چیزوں کو خیرات میں دے دینا قابل مؤاخذہ تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ گویا اس کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے۔

حاصل کلام: عورت کو خاوند کی اجازت کے بغیر اتنا صدقہ و خیرات نہیں کرنا چاہئے کہ خاوند کے گھر کا معاشی نظام متاثر ہو کر برباد ہو جائے اور شوہر کیلئے معاشی مشکلات اور دشواریاں کھڑی ہو جائیں۔ معمولی

صدقہ مثلاً سائل کو روٹی دے دی یا تھوڑا بہت آٹا دے دیا یا پڑوسی کو تھوڑی بہت نمک مرچ دے دی وغیرہ۔ اس صدقہ میں بیوی کے ساتھ اس کا شوہر کما کر لانے کی وجہ سے' خزانچی اس کی حفاظت کرنے کی وجہ سے اور خادم خدمت گاری کی بنا پر اجر و ثواب کے مستحق ہیں کسی کے اجر میں سے کمی نہیں کی جائے گی' ہر ایک کو اس کا پورا پورا اجر ملے گا۔

(۵۱۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَتْ زَيْنَبُ امْرَأَةُ ابْنِ مَسْعُودٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّكَ أَمَرْتَ الْيَوْمَ بِالصَّدَقَةِ، وَكَانَ عِنْدِي حُلِيٌّ لِيْ، فَأَرَدْتُ أَنْ أَتَصَدَّقَ بِهِ، فَزَعَمَ ابْنُ مَسْعُودٍ أَنَّهُ وَوَلَدَهُ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «صَدَقَ ابْنُ مَسْعُودٍ، زَوْجُكِ وَوَلَدُكِ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتِ بِهِ عَلَيْهِمْ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ زینب رضی اللہ عنہا آئیں اور عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! آپ نے آج صدقہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ میرے پاس میرا ذاتی زیور ہے میں اسے صدقہ کرنا چاہتی ہوں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ وہ اور ان کی اولاد میرے صدقے کے زیادہ حقدار ہیں آپ نے فرمایا "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا ہے' تیرا شوہر اور اس کی اولاد تیرے صدقے کے زیادہ مستحق ہیں۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ حلی ﴾ "حا" پر ضمہ اور کسرہ دونوں ہیں اور "لام" پر کسرہ اور تشدید اور "یا" پر بھی تشدید۔ حلی کی جمع ہے حلی کی "حا" پر فتحہ اور لام ساکن۔ سونے چاندی کے وہ زیور جو عورت تزئین و آرائش کیلئے پہنتی ہے یا پھر اس سے ڈورے میں پروئے ہوئے گھونگے' سلیمانی منکے یا کوڑیاں مراد ہیں۔ نیز شیشے وغیرہ کے سوراخ دار دانے اور عمدہ پتھر کے نگینے وغیرہ۔ یہ اس امر کے جواز کی دلیل ہے کہ بیوی شوہر کے معاملات و مصالح میں اپنی زکوٰۃ دے سکتی ہے بشرطیکہ شوہر محتاج اور عیال دار ہو۔

حاصل کلام: لفظ صدقہ نفلی صدقہ اور فرض زکوٰۃ اور صدقہ فطر (فطرانہ) سب پر مشترک طور پر بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی زکوٰۃ کی تقسیم کے مصارف کے موقع پر لفظ صدقہ ہی استعمال ہوا ہے اگر اس بات کا کوئی قرینہ واضح موجود نہ ہو کہ یہاں عام صدقہ مراد ہے تو ایسی صورت میں اصول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ (فرضی صدقہ) ہوتا ہے۔ اس مقام پر بھی بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرضی صدقہ ہے اس لئے کہ نفلی صدقہ کے متعلق پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو اپنی زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی مگر ان کا یہ قول اس صریح حدیث کے مخالف ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شوہر اپنی اہلیہ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ اس حدیث کی روشنی میں جب بیوی فرضی زکوٰۃ دے سکتی ہے تو نفلی بدرجہ اولیٰ دے سکتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زینب رضی اللہ عنہا ﴾ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ بنو ثقیف سے

ہونے کی وجہ سے ثقفیہ کہلائیں۔ ان کے باپ کا نام معاویہ یا عبداللہ بن معاویہ یا ابو معاویہ ہے۔ یہ نبیؐ اور اپنے شوہر سے روایت کرتی ہیں اور حضرت عمرؓ سے بھی۔ ان سے ان کے بیٹے، بھتیجے اور بعض دوسرے احباب نے روایت کیا ہے۔

(٥١٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لاَ يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، حَتَّى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَيْسَ فِي وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو لوگ گداگری اور بھیک مانگنے کو پیشہ ہی بنا لیتے ہیں قیامت کے روز ایسی حالت میں آئیں گے کہ ان کے چہرے پر گوشت نہیں ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مضغة ﴾ اور ایک نسخہ میں ﴿ مزعة ﴾ بھی ہے۔ دونوں میں پہلے حرف پر ضمہ ہے اور دوسرا حرف ساکن ہے، اس کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے ایسے آدمی کی قیامت کے روز قدر و منزلت اور عزت و وجاہت نہیں ہوگی اور ذلیل و خوار اور گری ہوئی توقیر کے ساتھ آئے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ اسے اتنا عذاب دیا جائے گا کہ چہرے کا گوشت تک اڑ جائے اور جب اٹھایا جائے تو چہرہ صرف ہڈیوں کا خالی خولہ ڈھانچہ رہ جائے اور اسے اس کی پہچان کی علامت بنا دیا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گداگری کے پیشہ کی مذمت معلوم ہو رہی ہے۔ سوال صرف تین قسم کے آدمیوں کیلئے جائز ہے۔ ایک وہ شخص جو آفات ناگہانی کی زد میں آجائے اور سارا مال برباد ہو جائے۔ خورد و نوش کیلئے بھی باقی کچھ نہ بچے۔ اسے اپنے گزارہ کی حد تک مانگنے کی اجازت ہے اور ایسے آدمی کی مدد کرنا ضروری ہے۔ دوسرا وہ شخص جو کسی ناحق تاوان یا قرض کے گرداب میں پھنس جائے تو وہ مانگ کر اتنی رقم پوری کر سکتا ہے اور تیسرا وہ شخص جو دیانت داری سے کام کرتا ہے اور کرنا بھی چاہتا ہے مگر پوری کوشش کے باوجود کام نہ مل سکے یا جائز مصارف و اخراجات سے آمدنی کم ہو اور گھریلو معاشی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں اور فاقہ کشی کی نوبت کا اندیشہ لاحق ہو جائے تو ایسا آدمی بھی معاشرے کے دوسرے لوگوں سے مانگ کر اپنی ضروریات پوری کرنے کا استحقاق رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ غیر مستحق لوگ محض پیسہ جمع کرنے کی خاطر مانگتے ہیں ان کا انجام قیامت کے روز وہی ہو گا جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں ہوا ہے۔

(٥١٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّراً، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْراً، فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو آدمی اپنا مال بڑھانے اور زیادہ کرنے کی غرض سے لوگوں سے مانگتا ہے تو ایسا آدمی اپنے لئے انگاروں کے سوا اور کوئی چیز نہیں مانگتا۔ اب اس کی مرضی ہے چاہے انہیں کم کر لے چاہے

زیادہ۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ تکثرا ﴾ مال کو زیادہ کرنے کی غرض سے۔ اپنی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کیلئے نہیں۔ ﴿ جمرا ﴾ آگ کا دھکتا ہوا انگارا۔ ﴿ فلیستقل الخ ﴾ یعنی چاہے کم لے یا زیادہ حاصل کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گداگری کا پیشہ ناجائز ثابت ہوتا ہے۔ توانا و قوی الجثہ آدمی کا سوال کرنا معاشرہ میں بے عزت کرنے کا موجب ہوتا ہے جن لوگوں نے بلاوجہ مانگنے کو اپنا معمول بنا لیا ہو ان کو خیرات دینا محل نظر ہے۔

(۵۱۸) وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: **لأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ، فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ الْحَطَبِ عَلَى ظَهْرِهِ، فَيَبِيْعَهَا، فَيَكُفَّ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ، أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوْهُ.** رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر لکڑیوں کا گٹھا جنگل سے اپنی پشت پر اٹھا کر لائے پھر اسے فروخت کر دے پس اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے چہرے کو مانگنے سے روک دے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے اور وہ اس کو دیں یا نہ دیں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ بحزمة الحطب ﴾ حزمہ "حا" پر ضمہ اور "زا" ساکن۔ لکڑیوں کا گٹھا۔ ﴿ فیکف اللہ بہا وجہہ ﴾ یعنی اللہ اس کے ذریعہ سے اس کے چہرے کو محفوظ رکھتا ہے اور دست سوال دراز کرنے کی رسوائی سے باز رکھتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے گداگری اور بھیک مانگنا قابل مذمت فعل ہے۔ کما کر کھانا' محنت و مشقت کر کے حاصل کرنا بہتر ہے۔ سوالی و گداگر کو اگر کچھ مل بھی جائے تو سوال کرنے کی ذلت کیا کچھ کم ہے۔ بھیک مانگنے سے عزت و آبرو نہیں رہتی۔ معاشرہ میں وقار کم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی نگاہوں میں ایسے آدمی کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں رہتا۔ مفت خوری کی بد عادت ایسے آدمی کو کاہل و سست بنا کر رکھ دیتی ہے۔ معاشرے کی ترقی متاثر ہو جاتی ہے۔ نوبت بسا اوقات بایں جا رسید کہ خودکشی کی نوبت اور چوری اور ہیرا پھیری ایسی بری عادات کا خوگر بن کر رہ جاتا ہے۔

(۵۱۹) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «**الْمَسْأَلَةُ كَدٌّ يَكُدُّ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ، إِلاَّ أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ سُلْطَاناً أَوْ فِي أَمْرٍ لاَ بُدَّ**

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سوال کرنا ایک زخم ہے جس سے انسان اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے البتہ ایسا شخص جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرے یا سربراہ مملکت سے۔" اس کے لیے کوئی حرج نہیں۔ (اسے

مِنْهُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ. ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿كدوح﴾ "کاف" اور "دال" دونوں پر ضمہ۔ کدح کی جمع ہے اور کدح کے کاف پر فتحہ اور دال ساکن ہے۔ خراش، زخم کو کہتے ہیں یعنی اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات اور خراشوں کی ایسی علامات ہوں گی جو فی الحقیقت ناپسندیدہ ہوں گی یا یہ کہ اس کے چہرے پر ذلت و رسوائی اور اہانت کے نشانات ہویدا ہو رہے ہوں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کسی سے مانگنا جائز نہیں اور ضرورت مند کو بھی بادشاہ اور سربراہ مملکت سے مانگنا چاہئے کیونکہ حاجت مندوں کا بیت المال پر حق ہے اور بادشاہ سے سوال اپنے حق کے حصول کیلئے ہے۔ اس میں کسی کے امتنان و احسان کا کوئی تعلق نہیں۔

٣ - بَابُ قِسْمِ الصَّدَقَاتِ — اشیاء خیرات کو بانٹنے کا بیان

(٥٢٠) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ إلاَّ لِخَمْسَةٍ: لِعَامِلٍ عَلَيْهَا، أَوْ رَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهِ، أَوْ غَارِمٍ، أَوْ غَازٍ فِي سَبِيلِ اللهِ، أَوْ مِسْكِينٍ تُصُدِّقَ عَلَيْهِ مِنْهَا فَأَهْدَى مِنْهَا لِغَنِيٍّ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَأُعِلَّ بِالإِرْسَالِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مالدار کیلئے پانچ صورتوں کے علاوہ صدقہ حلال نہیں ہے (١) زکوٰۃ کا مال اکٹھا کرنے کی صورت میں (٢) وہ شخص جو اپنے مال سے صدقہ کی کوئی چیز خریدے (٣) مقروض (٤) فی سبیل اللہ جہاد کرنے والا (٥) مسکین پر جو صدقہ کیا گیا ہو اس میں سے وہ کچھ مالدار کو تحفہ کے طور پر دے۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اسے مرسل ہونے سے معلول قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لغنى﴾ غنی اسے کہتے ہیں جس کی ملکیت میں اوقیہ کے مساوی چیز ہو یا اتنی کہ صبح و شام اس کیلئے کافی ہو جائے۔ ﴿لعامل عليها﴾ عامل سے مراد وہ کارندہ اور تحصیل دار ہے جو صدقہ کی وصولی کیلئے کام کرتا ہے۔ مثلاً اسے اکٹھا کرنے والا' حساب رکھنے والا' تحریر کرنے والا۔ اس کیلئے کارکردگی کا معاوضہ لینا جائز ہے خواہ وہ خود مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ ﴿غارم﴾ مقروض' قرضدار۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ باہمی رقابت و دشمنی کی اصلاح کیلئے قرض لینا یا کسی پر کوئی بوجھ آن پڑا ہے اسے اتارنے کیلئے قرض لینا۔ رہا اپنی ذات کیلئے قرض کا حصول تو اگر وہ اس کے ادا کرنے کی قدرت و استطاعت ہی نہ رکھتا ہو تو پھر وہ فقراء کے زمرہ میں شامل ہو گا ورنہ اسے غنی شمار کیا جائے گا اس لئے صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غنی کیلئے زکوٰۃ لینا حلال نہیں۔ غنی کون ہے؟ اس کی تعریف

میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا کہ غنی کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا "جس کے پاس اتنی چیز ہو کہ اس کی صبح و شام کی گزر بسر ہو سکے۔" اور نسائی میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "جس کی ملکیت میں ایک اوقیہ (دس روپیہ) ہو پھر وہ سوال کرے تو اس نے لپٹ چمٹ کر سوال کیا۔"

(٥٢١) وَعَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الخِيَارِ، أَنَّ رَجُلَيْنِ حَدَّثَاهُ: أَنَّهُمَا أَتَيَا رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْأَلاَنِهِ مِنَ الصَّدَقَةِ، فَقَلَّبَ فِيهِمَا البَصَرَ، فَرَآهُمَا جَلْدَيْنِ، فَقَالَ: **إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا، وَلاَ حَظَّ فِيهَا لِغَنِيٍّ، وَلاَ لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ**. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَقَوَّاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت عبیداللہ بن عدی بن خیار رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمیوں نے انہیں اپنا واقعہ سنایا کہ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں نے آپؐ سے صدقہ کا سوال کیا۔ آپؐ نے ان دونوں کو ایک نظر اٹھا کر اوپر سے نیچے تک دیکھا تو دونوں کو طاقتور پایا۔ آپؐ نے فرمایا **"اگر تم چاہتے ہو تو تمہیں صدقہ دے دیتا ہوں مگر مالدار اور صحت مند کماؤ آدمی کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں۔"** (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد اور نسائی نے اسے قوی کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فقلب فيهما البصر﴾ آپؐ نے اپنی نگاہیں ان کی طرف اٹھا کر اوپر نیچے سے ان کو دیکھا۔ ﴿جلدين﴾ جیم پر فتحہ اور لام ساکن اور اس پر کسرہ بھی جائز ہے۔ مضبوط و قوی آدمی ﴿لا حظ﴾ کوئی حصہ نہیں اور نہ کوئی حق ہے۔ ﴿لقوی مكتسب﴾ صیغۂ اسم فاعل۔ اپنی ضرورت کے بقدر کمانے کی طاقت رکھنے والا ﴿ان شئتما اعطيكما﴾ یعنی صدقہ صحت مند اور غنی کیلئے لینا ذلت کا باعث اور حرام ہے۔ اس کے باوجود اگر تم حرام چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ یہ بات آپؐ نے ان سے زجر و توبیخ کے طور پر فرمائی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنی اور صحت مند کیلئے صدقہ و زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ صدقہ دینے والے کو بھی چاہئے کہ سائل کو اچھی طرح دیکھ لے کہ وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہ غیر مستحق کو سوال نہ کرنے کی تلقین کرے اور اس کو برے انجام سے خبردار کر دے۔

راوی حدیث: ﴿عبيدالله بن عدی بن خيار قرشی نوفلی﴾ خاندان قریش سے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی پیدائش عہد رسالت مآب ﷺ میں ہوئی۔ اس لئے ان کا شمار تابعین میں کیا گیا ہے۔ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کی ہے اور ایک قول کے مطابق ان کا والد حالت کفر میں بدر میں قتل ہوا اور یہ فتح مکہ کے موقع پر عاقل بالغ تھے۔ اس اعتبار سے وہ صحابی ہیں۔ ان کا شمار قریش کے فقہاء و علماء میں ہوتا ہے۔ ٩٠ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں وفات پائی۔

(۵۲۲) وَعَنْ قَبِيصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الْهِلَالِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لاَ تَحِلُّ إِلاَّ لِأَحَدِ ثَلاَثَةٍ: رَجُلٍ تَحَمَّلَ حَمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَاماً مِنْ عَيْشٍ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُومَ ثَلاَثَةٌ مِنْ ذَوِي الحِجَى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلاَناً فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَاماً مِنْ عَيْشٍ، فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ يَا قَبِيصَةُ سُحْتٌ، يَأْكُلُهُ صَاحِبُهُ سُحْتاً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سوال کرنا صرف تین آدمیوں کیلئے حلال ہے" ایک وہ شخص جو کسی کا بوجھ اٹھالیتا ہے یہاں تک کہ اس کا قرض وغیرہ ادا ہو جائے پھر وہ سوال کرنے سے باز آجائے اور دوسرا وہ جو کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہو اور اس کا مال تباہ و برباد ہوگیا ہو اسے گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور تیسرا وہ شخص جسے فاقے آرہے ہوں اور اس کی قوم کے تین صاحب عقل آدمی اس کی شہادت دیں کہ واقعی اسے فاقہ کشی کا سامنا ہے اسے بھی گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور ان کے علاوہ اے قبیصہ! سوال حرام ہے اور سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔" (مسلم' ابوداؤد' ابن خزیمہ' اور صحیح ابن حبان)

لغوی تشریح: ﴿ ثلاثة ﴾ اس پر تنوین ہے ﴿ رجل ﴾ ثلاثہ سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے یا پھر رفع ہے۔ اس صورت میں ﴿ احدهم ﴾ محذوف ہوگا۔ ﴿ تحمل ﴾ برداشت کیا' کفالت کی "حمالة " حا پر فتحہ ہے۔ وہ مال جو انسان دوسرے کی طرف سے ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ مثلاً دوسرے کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے یا کسی کی دیت ادا کرنے کی حامی بھرتا ہے یا فریقین کے مابین تنازع کو دور کرنے کیلئے رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرلی ہو اور وہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ رہا ہو تو وہ دوسروں سے تعاون کی اپیل کر سکتا ہے اور زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ ﴿ ثم يمسك ﴾ اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً دست سوال دراز کرنے سے رک جائے۔ ﴿ جائحة ﴾ آسمانی یا زمینی آفت مثلاً ژالہ باری سے اس کی فصل تباہ ہوگئی' آگ لگنے سے اور ڈوب کر مرنے کی صورت میں تلافی مافات کیلئے ﴿ اجتاحت ﴾ ہلاک ہوگئی۔ ﴿ قواما ﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ قوام جس سے کوئی اپنی حاجت و ضرورت کا انتظام کرتا ہے اور اپنی خستہ حالی کا سدباب کرتا ہے۔ ﴿ الحجى ﴾ "حا" کے نیچے کسرہ یعنی عقل مند ﴿ سحت ﴾ سین پر ضمہ اور "حا" ساکن معنی حرام۔ يسحت البركة کے معنی ہیں جو برکت کو لے اڑے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سوال کرنے والے کی پوزیشن معلوم کرنے کیلئے ایک ضابطہ بیان ہوا ہے وہ یہ کہ اس کی برادری یا قوم کے تین سرکردہ صاحب عقل و دانش آدمی اس کی حالت' کسمپرسی اور فاقہ کشی کی شہادت دیں تو اسے سوال کرنے کی اجازت ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین قسم کے آدمیوں کو سوال جائز ہے اور سائلین کی پوزیشن کو جانچنے اور تحقیق کرنے کا بھی حکم ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند ہو اور اس کے قبیلے کے تین عقلمند افراد گواہی دے دیں تو اس کیلئے سوال کرنا جائز ہے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلام نے گداگری کی کس طرح حوصلہ شکنی کی ہے اور محنت و مزدوری کی ترغیب دی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ قبیصہ بن مخارق الهلالی رضی اللہ عنہ ﴾ ابو بشر کنیت ہے۔ قبیصہ میں "قاف" پر فتحہ اور "باء" پر کسرہ ہے۔ اور مخارق میں میم پر ضمہ ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے۔ قبیصہ بن مخارق بن عبداللہ بن شراد العامری الہلالی۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ بصرہ میں رہائش پذیر ہوئے' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد کے ساتھ آئے اور آپؐ سے احادیث سنیں چھ حدیثوں کے راوی ہیں۔

(٥٢٣) وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الصَّدَقَةَ لاَ تَنبَغِي لِآلِ مُحَمَّدٍ، إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ». وَفِي رِوَايَةٍ: «وَإِنَّهَا لاَ تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلاَ لِآلِ مُحَمَّدٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صدقہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مناسب ہی نہیں۔ یہ تو لوگوں کے اموال کی میل کچیل ہے" اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ "صدقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے حلال نہیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اوساخ الناس ﴾ وسخ کی جمع ہے۔ میل کچیل۔ آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا ذکر کتاب الزکوۃ کی ایک ابتدائی حدیث میں گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ھاشم قرشی۔ مدینہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ پھر دمشق تشریف لے گئے اور ٦٢ھ میں وہیں پر وفات پائی۔

(٥٢٤) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَشَيْتُ أَنَا وَعُثْمَانَ بْنُ عَفَّانَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! أَعْطَيْتَ بَنِي الْمُطَّلِبِ مِنْ خُمُسِ خَيْبَرَ وَتَرَكْتَنَا، وَنَحْنُ وَهُمْ بِمَنْزِلَةٍ وَاحِدَةٍ، فَقَالَ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپؐ نے بنو عبدالمطلب کو خیبر کے خمس میں سے حصہ عنایت فرمایا ہے اور ہمیں نظر انداز فرمایا حالانکہ آپؐ کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ یہ سن کر

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلِبِ وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَّاحِدٌ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بنو عبدالمطلب اور بنو ہاشم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ من خمس خیبر ﴾ خمس میں خا اور میم دونوں پر ضمہ۔ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کل اموال کا پانچواں حصہ اللہ' اس کے رسول اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافر کیلئے لیا جانے والا مال خمس کہلاتا ہے۔ ﴿ ونحن وهم ﴾ "ھم" سے یہاں بنو عبدالمطلب مراد ہیں ﴿ بمنزلة واحدة ﴾ آپؐ سے قرابت داری کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو عبد شمس بن عبد مناف سے تھا اور حضرت جبیر کا بنو نوفل بن عبدمناف سے تھا اس طرح دونوں ہاشم بن عبدمناف کے بھائی بنتے ہیں جس طرح مطلب بن عبد مناف۔ اس طرح یہ تینوں عبد شمس' نوفل اور مطلب' ہاشم کے ساتھ قرابت داری میں برابر ہیں۔ تو پھر جب قرابت داری کی بنا پر اگر مطلب کی اولاد استحقاق رکھتی ہے تو عبد شمس اور نوفل کی اولاد بھی استحقاق رکھتی ہے۔ ﴿ انما بنو عبدالمطلب و بنو ہاشم شئی واحد ﴾ اس لئے کہ جاہلیت اور عہد اسلام میں ان کے مابین باہمی موالاۃ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے جبکہ غیروں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اپنوں کے علاوہ یہ لوگ قرابت داروں کو حصہ دینے میں شریک ہیں۔ اگرچہ نسب میں یہ سب برابر ہیں۔ مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں یہ تنبیہہ کرنے کیلئے بیان کیا ہے کہ بنو عبدالمطلب بھی بنو ہاشم کی طرح زکوٰۃ لینے کی حرمت میں برابر کے شریک ہیں۔ یعنی دونوں کیلئے زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا "ہم اور بنی مطلب برابر ہیں" کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وفاداری اور اطاعت کیشی جیسی بنو مطلب کر رہے ہیں ویسی ہم بھی کر رہے ہیں۔ فرمانبرداری میں یکساں ہیں۔ دوسرا یہ کہ قرابت داری کے اعتبار سے بھی ہم اور ان میں زیادہ تفاوت نہیں۔ جتنا کچھ استحقاق قرابت انہیں آپؐ سے حاصل ہے اتنا ہی ہمیں بھی حاصل ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ میں سے تھے ان کو شرف دامادی بھی حاصل تھا۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم قریش میں بالکل برابر کے قبائل شمار ہوتے تھے۔ بالفاظ دیگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنی عبد شمس میں سے اور حضرت جبیر رضی اللہ عنہ نوفل کی اولاد میں سے اور رسول اللہ ﷺ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاشم کی اولاد سے ہیں۔ اس طرح گویا یہ سب مطلب کی اولاد ہیں۔ ہاشم' مطلب' نوفل اور عبد شمس یہ چاروں عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ اس طرح حضرت جبیر رضی اللہ عنہ' عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کا تعلق نبی ﷺ سے ایک ہی درجہ کا ہے۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے سوال کا بھی یہی مطلب تھا۔

نبی ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ زمانۂ قدیم سے بنو ہاشم اور بنو امیہ برابر چلے آرہے ہیں۔ آپؐ نے اس حیثیت سے تفریق نہیں فرمائی بلکہ اس حیثیت سے فرمائی کہ بنو ہاشم بنو امیہ کی بہ نسبت آپؐ کے زیادہ قریب تھے اس لئے ان کیلئے زکوٰۃ لینا حرام قرار دے دیا اور بنو امیہ کیلئے

حرام نہیں کیا۔ اس لئے بنو ہاشم کو خمس میں سے دیا گیا اور بنو امیہ کو خمس میں سے نہیں دیا۔ اسی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خمس میں سے نہیں دیا گیا۔

(٥٢٥) وَعَنْ أَبِيْ رَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلاً عَلَى الصَّدَقَةِ مِنْ بَنِيْ مَخْزُوم، فَقَالَ لِأَبِيْ رَافِعٍ: اصْحَبْنِيْ، فَإِنَّكَ تُصِيْبُ مِنْهَا: فَقَالَ: لاَ، حَتَّى آتِيَ النَّبِيَّ ﷺ، فَأَسْأَلَهُ، فَأَتَاهُ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «**مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، وَإِنَّها لاَ تَحِلُّ لَنَا الصَّدَقَةُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلاَثَةُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بنو مخزوم کے ایک آدمی کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر فرمایا۔ اس نے ابو رافع رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم میرے ساتھ چلو تجھے اس میں سے کچھ حصہ مل جائے گا۔ اس نے کہا میں نہیں جاؤں گا تاوقتیکہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بارے میں دریافت نہ کر لوں۔ چنانچہ وہ آپؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا "قوم کا غلام بھی انہیں میں شمار ہوتا ہے اور ہمارے لئے صدقہ (زکوٰۃ) حلال نہیں ہے۔" (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے بھی)

لغوی تشریح: ﴿ بعث رجلا ﴾ آپؐ نے ایک آدمی کو بھیجا اس آدمی سے مراد حضرت ارقم رضی اللہ عنہ ہیں ﴿ تصیب منھا ﴾ اس حاصل شدہ صدقہ میں سے تو اس کا معاوضہ اور اجرت لے لینا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کے آزاد کردہ غلاموں پر بھی زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس آدمی کیلئے خود زکوٰۃ کا لینا حرام ہے اس کے غلام پر بھی حرام ہوتی ہے۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ چونکہ نبی ﷺ کے غلام تھے اس لئے ان کیلئے بھی زکوٰۃ لینا حرام تھا۔

راوی حدیث: ﴿ ابورافع رضی اللہ عنہ ﴾ ان کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ ان کا نام اسلم تھا یا ھرمز یا ثابت یا ابراھیم، قبطی تھے۔ یہ دراصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ انہوں نے انہیں نبی ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا۔ غزوۂ بدر سے پہلے ایمان قبول کر لیا تھا مگر اس میں شریک نہیں ہوئے اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ان کے اسلام قبول کرنے کی بشارت ابو رافع رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو دی۔ آپؐ نے اس مقام مسرت پر اسے آزاد فرما دیا۔ ٣٦ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں مدینہ میں وفات پائی۔

(٥٢٦) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ أَبِيْهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُعْطِي عُمَرَ الْعَطَاءَ،

حضرت سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی چیز عطا فرماتے تو حضرت عمر

فَيَقُوْلُ: أَعْطِهِ أَفْقَرَ مِنِّيْ، فَيَقُولُ: خُذْهُ، فَتَمَوَّلْهُ، أَوْ تَصَدَّقْ بِهِ، وَمَا جَاءَكَ مِنْ هٰذَا المَالِ، وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَلاَ سَائِلٍ، فَخُذْهُ، وَمالاَ فَلاَ تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

رضی اللہ عنہ عرض کرتے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ غریب ہیں انہیں عطا فرما دیجئے۔ اس کے جواب میں آپؐ فرماتے ''اسے لے لو اور مالدار ہو جاؤ یا اسے صدقہ و خیرات کر دو جو مال بغیر عوض و لالچ اور مانگنے کے تمہارے پاس آئے اسے لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ ملے اس کے پیچھے اپنے آپ کو نہ لگاؤ۔'' (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ العطاء ﴾ کام کرنے کا معاوضہ اور اجرت یا عطیہ ہو ﴿ افقر ﴾ افعل التفضیل کا صیغہ یعنی جو زیادہ فقیر ہے۔ ﴿ فتمولہ ﴾ امر کا صیغہ ہے یعنی اسے اپنا مال بنا لو۔ ﴿ مشرف ﴾ اس کی خواہش کرتے ہوئے اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنا اور اس کا تعرض کرنا اور اس پر حریص و لالچی ہونا۔ ﴿ فلا تتبعہ ﴾ اتباع سے امر کا صیغہ ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کی طلب میں معلق نہ کرو۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ عامل کو اپنی مزدوری و اجرت حاصل کر لینی چاہئے واپس نہیں کرنی چاہئے۔ اکثریت کی رائے کے مطابق یہاں امر ندب کیلئے ہے یعنی ایسا کرنا مندوب ہے فرض و واجب نہیں اور ایک رائے یہ ہے کہ اسے قبول کرنا واجب ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو دی جائے اسے لے لینا چاہئے۔ لہٰذا اس کا قبول کرنا دو شرطوں سے مشروط ہے جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عامل کو اپنے کام اور کارکردگی کی اجرت و معاوضہ لے لینا چاہئے کیونکہ اس حدیث میں ''عطاء'' سے مراد یہی ہے کیونکہ مسلم کی ایک حدیث میں ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وصولی زکوۃ کی اجرت کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا۔ یہ امر مستحب ہے' ایجابی نہیں اور اس سے مراد ہر عطیہ بھی ہے' جب دل میں حرص نہ ہو اور خود زبان سے یا حال سے اس کے حصول کا تقاضا بھی نہ ہو تو پھر جو کچھ وصول ہو اسے اخذ کر لے بشرطیکہ حلال ہو حرام نہ ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مالی حرص و طمع کے ساتھ سوال کرنا بھی حرام ہے۔

٥۔ كِتَابُ الصِّيَامِ

روزے کے مسائل

(٥٢٧) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَقَدَّمُوا رَمَضَانَ بِصَوْمِ يَوْمٍ وَلاَ يَوْمَيْنِ، إِلاَّ رَجُلٌ كَانَ يَصُومُ صَوْماً فَلْيَصُمْهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی بھی رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے نہ رکھے مگر جو شخص پہلے سے روزہ رکھتا آ رہا ہو اسے چاہئے کہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لا تقدموا ﴾ یہ اصل میں "لا تتقدموا" تھا یعنی رمضان کے استقبال کیلئے رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے مت رکھو ﴿ کان یصوم صوما ﴾ یعنی معمول کے گنے چنے دنوں میں جو وہ روزے رکھتا تھا اور وہ دن شعبان کے آخری دنوں میں واقع ہو جائیں۔ مثلاً ایک آدمی معمول کے مطابق ہر ہفتہ میں سوموار کا روزہ رکھتا ہے اور یہ سوموار کا دن شعبان کے آخر میں آگیا تو اس طرح روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں وہ حسب معمول روزہ رکھ سکتا ہے۔ ﴿ فلیصمه ﴾ اس میں لام امر جواز کے بیان کیلئے ہے یعنی معمول و عادت کے مطابق رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے رکھ سکتا ہے۔

(٥٢٨) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَنْ صَامَ الْيَوْمَ الَّذِيْ يُشَكُّ فِيْهِ، فَقَدْ عَصَى أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ. ذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيْقاً، وَوَصَلَهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص نے مشکوک دن میں روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔ (بخاری نے اسے تعلیقاً اور پانچوں نے اسے موصولاً ذکر کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الیوم الذی یشک فیه ﴾ یشک صیغۂ مجہول ہے۔ وہ شعبان کا تیسواں روز ہے جبکہ اس رات چاند ابر آلودگی وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آئے اور یہ شک واقع ہو جائے کہ آیا رمضان ہے یا شعبان۔

حاصل کلام: شریعت اسلامیہ نے یہ واضح اصول مقرر فرما دیا ہے کہ روزہ رکھو تو چاند دیکھ کر رکھو اور اسی طرح روزوں کا اختتام بھی عید کا چاند دیکھ کر کرو۔ اب اگر شعبان کی انتیسویں شب چاند نظر نہ آیا تو اس روز روزہ رکھنا مشکوک ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔ علم فلکیات کے ماہرین کی آراء بھی لازماً قابل اعتماد و یقین نہیں۔

(٥٢٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: «**إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: **فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ ثَلَاثِيْنَ**. وَلِلْبُخَارِيِّ: **فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ**. وَلَهُ فِي حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: **فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِيْنَ**.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”جب تم چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب (عید کے لیے) چاند دیکھ لو تو افطار کر دو اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کیلئے اندازہ لگا لو۔“ (متفق علیہ) مسلم کے الفاظ ہیں کہ ”اگر مطلع ابر آلود ہو تو پھر اس کے لئے تیس دن کی گنتی کا اندازہ رکھو اور بخاری کے الفاظ ہیں ”پھر تیس روز کی گنتی و تعداد پوری کرو۔“ اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ”پھر تم شعبان کے تیس دن پورے کرو۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اذا رایتموہ ﴾ جب تم اسے دیکھ لو' اسے سے مراد چاند ہے یعنی جب چاند تمہیں نظر آجائے۔ ﴿ فان غم ﴾ غم کے غین پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ صیغۂ مجہول۔ مطلب یہ ہے کہ جب چاند نظر نہ آئے مخفی اور پوشیدہ رہ جائے۔ ابر آلودگی کی وجہ سے یا کسی ایسی ہی دوسری وجہ سے۔ ﴿ فاقدرولہ ﴾ قدر سے امر کا صیغہ ہے۔ فاقدوالہ کے دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ مکمل مہینہ کی گنتی اور تعداد پوری کرو اور تیسویں روز افطار کرو۔

(٥٣٠) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ، فَأَخْبَرْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ، وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنا شروع کیا تو میں نے نبی ﷺ کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ آپ ؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ترا ای الناس الھلال لوگ عید کا چاند دیکھنے کیلئے اکٹھے ہوئے اور چاند دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کیلئے خبر واحد یعنی صرف ایک آدمی

کی شہادت مقبول ہے اور یہ جمہور کا مذہب ہے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ روزہ کا آغاز اور اختتام دونوں چاند کے نظر آنے پر منحصر ہے۔ چاند نظر آجائے تو روزہ رکھا جائے اور چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنا بند کرے۔ اگر انتیس شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو اس ماہ کے تیس دن پورے کئے جائیں اور اسی طرح اگر انتیس رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو روزے تیس پورے کئے جائیں۔ اگر گرد و غبار اور ابر آلودگی کی وجہ سے ایک مقام پر چاند نظر نہ آئے مگر دوسری جگہ مطلع صاف ہونے کی بنا پر نظر آجائے تو روزہ سارے شہروں' قصبوں اور دیہاتوں میں رکھا جائے گا۔ اسی طرح عید بھی منائی جائے گی بشرطیکہ ان جگہوں کا مطلع ایک ہو۔ اگر فاصلہ اس قدر ہو کہ مطلع ہی تبدیل ہو جائے تو پھر وہاں کی رؤیت قابل قبول نہ ہوگی۔ جیسا کہ جمہور علمائے کرام نے کہا ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے کیلئے ایک معتبر و مقبول آدمی کی شہادت کافی ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے مگر ہلال عید کیلئے دو شہادتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں' سب متفق ہیں۔

(٥٣١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَعْرَابِياً جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي رَأَيْتُ الهِلاَلَ، فَقَالَ: **أَتَشْهَدُ أَن لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ؟** قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: **أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُولُ اللهِ؟** قَالَ نَعَمْ، قَالَ: **فَأَذِّنْ فِي النَّاسِ يَا بِلاَلُ أَنْ يَصُوْمُوا غَداً.** رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ إِرْسَالَهُ.

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صحرا نورد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا "کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الٰہ نہیں؟" اس نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟" اس نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا بلال اٹھو اور لوگوں میں منادی کر دو کہ کل روزہ رکھا جائے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فاذن ﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ مراد اس سے عام اعلان اور منادی ہے۔ یہ حدیث مذہب جمہور کی تائید کرتی ہے کہ رمضان کے چاند کیلئے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

(٥٣٢) وَعَنْ حَفْصَةَ أُمِّ المُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ام المومنین سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے صبح صادق سے

ﷺ قَالَ: «مَنْ لَمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلاَ صِيَامَ لَهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَمَالَ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ إِلَى تَرْجِيحِ وَقْفِهِ، وَصَحَّحَهُ مَرْفُوعاً ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ. وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ: «لاَ صِيَامَ لِمَنْ لَمْ يَفْرِضْهُ مِنَ اللَّيْلِ».

پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کا رجحان اس کے موقوف ہونے کی طرف ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس کا مرفوع ہونا صحیح قرار دیا ہے) اور دارقطنی کی روایت میں ہے "جس نے رات کو اپنے آپ پر واجب نہ کر لیا اس کا کوئی روزہ نہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿ من لم یبیت ﴾ الخ تبییت سے ماخوذ ہے۔ یعنی رات میں روزے کی نیت کرنا ﴿ لم یفرضہ ﴾ باب ضرب یضرب سے ہے۔ یعنی اس کو اپنے اوپر فرض نہیں کیا اور یہ اس طرح کہ اس نے اس کی نیت نہ کی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضی روزے کی نیت صبح صادق سے پہلے ہونی ضروری ہے گویا غروب آفتاب کے بعد سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے تک نیت کی جا سکتی ہے۔ نیت اس لئے ضروری اور لازمی ہے کہ روزہ ایک عمل ہے اور عمل کیلئے نیت ضروری ہے اور ہر دن کے روزے کیلئے الگ الگ نیت شرط ہے۔ البتہ روزہ کی نیت کے جو الفاظ زبان سے کہے جاتے ہیں وہ بدعت ہے کیونکہ نیت دل کا عمل ہے' زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ حفصہ بنت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما ﴾ پہلے یہ خنیس بن حذافہ سہمی کے نکاح میں تھیں۔ ان کے ساتھ ہجرت کی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر یہ وفات پا گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے کر اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ یہ ۳ھ کی بات ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں شعبان ۴۵ھ میں فوت ہوئیں۔

(۵۳۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟ قُلْنَا: لاَ، قَالَ: فَإِنِّي إِذاً صَائِمٌ، ثُمَّ أَتَانَا يَوْماً آخَرَ، فَقُلْنَا: أُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ، فَقَالَ: أَرِينِيهِ فَلَقَدْ أَصْبَحْتُ صَائِماً، فَأَكَلَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک روز نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ "کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟" ہم نے عرض کیا' نہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا "اچھا تو میں روزہ سے ہوں۔" اس کے بعد پھر ایک روز تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا کہ حلوہ کا تحفہ ہمیں (کہیں سے) دیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "ذرا مجھے تو دکھاؤ صبح سے میں روزے سے تھا۔" (یہ فرما کر) آپؐ نے حلوہ

تناول فرمالیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فانی اذا صائم ﴾ اذاً پر تنوین ہے۔ اس حدیث سے یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ نفلی روزے کی نیت طلوع آفتاب کے بعد بھی ہو سکتی ہے اور یہ حدیث اس کا تقاضا کرتی ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی سابقہ روایت میں نیت کا لزوم فرض روزے کیلئے ہے' نفل روزے کیلئے نہیں ہے ﴿ حیس ﴾ "حا" پر فتحہ اور "یا" ساکن۔ جسے کھجور' مکھن' گھی اور پنیر شامل کر کے تیار کیا گیا ہو۔ ﴿ ارینیه ﴾ اراءۃ سے امر مخاطب کا صیغہ ہے اور اس میں نون وقایہ کا ہے اور بعد کی "یا" یائے متکلم ہے اور یہ فعل کا پہلا مفعول واقع ہو رہا ہے اور دوسرا مفعول ضمیر غائب ہے ﴿ فاکل ﴾ پھر آپؐ نے اسے تناول فرمالیا۔ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ نفلی روزہ دار بغیر کسی عذر کے روزہ افطار کر سکتا ہے۔ (توڑ سکتا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ نفلی روزہ کی نیت طلوع فجر سے پہلے لازمی نہیں بلکہ طلوع آفتاب کے بعد بھی کی جا سکتی ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نفلی روزے کی نیت بھی صبح صادق سے پہلے کرنے کو لازمی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ صریح حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ نفلی روزہ بغیر کسی عذر کے توڑا جا سکتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ (امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ) اور اکثر علماء کا یہی مذہب ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا عذر روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ اس کو پورا کرنا ان کے نزدیک واجب ہے۔ ان کے نزدیک عذر ضیافت کو قرار دیا گیا ہے۔ اگر افطار کر لیا تو اس کی قضاء توڑنے والے پر واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کسی کے نزدیک قضاء واجب نہیں اور نفلی روزے کو قصداً توڑنے کا کفارہ کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے۔

(٥٣٤) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**لاَ يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الفِطْرَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "لوگ اس وقت تک بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک روزہ افطار کرنے میں جلدی کریں گے" (بخاری و مسلم)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: «أَحَبُّ عِبَادِي إِلَيَّ، أَعْجَلُهُمْ فِطْراً».

اور ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "میرے بندوں میں میرے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو افطار کرنے میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿ ما عجلوا الفطر ﴾ جب تک افطار کرنے میں جلدی کریں گے۔ یہ تعجیل سے ماخوذ ہے یعنی تحقیق سے جب یہ ثابت ہو جائے کہ سورج غروب ہو چکا ہے تو فوراً روزہ افطار کر دینا چاہئے۔ اس عجلت کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب و پسندیدہ اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ افطار میں جلدی کرنا اہل

اسلام کا شعار ہے جبکہ اہل کتاب تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ اس میں آسانی کا بھی پہلو ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری کا بھی یہی تقاضا ہے اس لئے شعار اسلام کا اہتمام کرنا اور شریعت کی دی ہوئی سہولت کو لینا اور معاملات میں تکلیف و مشقت سے بچنا خیرو برکت کا باعث ہے۔

حاصل کلام: مطلع صاف ہو' گرد و غبار اور ابر آلودگی نہ ہو اور غروب آفتاب کا یقین ہو جائے تو پھر روزہ افطار کرنے میں بلاوجہ تاخیر کرنا جائز نہیں۔ تاخیر سے روزہ افطار کرنا اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے اور مصابیح میں یہ بھی ہے کہ افطاری میں تاخیر و دیر کرنا اہل بدعت کی علامت ہے۔ لہٰذا غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کر لینا چاہئے۔

(٥٣٥) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تَسَحَّرُوا، فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سحری کھایا کرو اس لئے کہ اس میں بڑی برکت ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿السحور﴾ سین پر فتحہ کی صورت میں طلوع فجر سے پہلے سحر کیلئے جو کچھ کھایا پیا جائے اسے سحور کہتے ہیں اور اس پر اگر ضمہ ہو تو پھر یہ مصدر ہوگا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سحری کھانے کی ترغیب ہے یہود و نصاریٰ چونکہ سحری کا اہتمام نہیں کرتے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق سحری کھانے کا ہے۔ اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی اور سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

(٥٣٦) وَعَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الضَّبِّي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى تَمْرٍ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى مَاءٍ، فَإِنَّهُ طَهُورٌ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے کھجور سے افطار کرنا چاہئے۔ پھر اگر کھجور دستیاب نہ ہو سکے تو پانی سے افطار کر لے اس لئے کہ وہ پاک ہے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ممکن ہو تو کھجور سے افطار کرنا چاہئے کیونکہ کھجور مقوی معدہ' مقوی اعصاب اور جسم میں واقع ہونے والی کمزوری کا بدل ہے۔ اگر کھجور مہیا نہ ہو سکے تو پھر پانی سے افطار بہتر ہے۔ نبی ﷺ تازہ کھجوروں سے افطار فرمایا کرتے تھے۔ اگر تازہ نہ ملتی تو خشک کھجور سے افطار کرتے۔ اگر یہ بھی نہ ملتی تو پھر چند گھونٹ پانی سے روزہ افطار فرما لیتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ﴾ سلمان بن عامر بن اوس بن حجر بن عمرو بن حارث الضبی۔

مشہور صحابی ہیں۔ بصرہ میں رہائش رکھی تھی۔ نبی ﷺ کی زندگی ہی میں یہ صاحب عمر رسیدہ تھے۔ خلافت معاویہ تک زندہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جنگ جمل میں شہید ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر سو برس کی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے ماسوا کوئی بھی ضبی صحابی نہیں۔

(٥٣٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الوِصَالِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ: فَإِنَّكَ تَوَاصِلُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «**وَأَيُّكُمْ مِثْلِيْ؟ إِنِّي أَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ**»، فَلَمَّا أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا عَنِ الوِصَالِ وَاصَلَ بِهِمْ يَوْماً، ثُمَّ يَوْماً، ثُمَّ رَأَوُا الهِلاَلَ، فَقَالَ: «**لَوْ تَأَخَّرَ الهِلاَلَ لَزِدْتُكُمْ**»، كَالْمُنْكِلِ لَهُمْ حِيْنَ أَبَوا أَن يَنْتَهُوا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وصال سے منع فرمایا' مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ اللہ کے رسول (ﷺ)! آپؐ خود تو وصال فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "تم میں سے میرے جیسا کون ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔" جب لوگوں نے وصال سے باز آنے سے انکار کر دیا تو آپؐ نے ان کے ساتھ ایک دن پھر دوسرے دن کا وصال کیا۔ پھر انہوں نے چاند کو دیکھ لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر چاند آج نظر نہ آتا تو میں تمہارے لئے زیادہ دن وصال کرتا۔" گویا آپؐ لوگوں کو اس سے باز نہ رہنے کی وجہ سے سزا دے رہے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الوصال ﴾ اس کو کہتے ہیں کہ آدمی قصداً دو دن یا زیادہ دن تک افطار نہ کرے اور مسلسل روزہ رکھے نہ رات کو کچھ کھائے پیئے اور نہ سحری کے وقت۔ جمہور علماء اسلام کا قول یہ ہے کہ وصال کرنا نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے۔ آپؐ کیلئے جائز اور امت کیلئے ناجائز ہے۔ ائمہ ثلاثہ' امام مالک رحمہ اللہ' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ وصال کے روزے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری بہرنوع کھانی چاہئے۔ ﴿ یطعمنی ربی ویسقینی ﴾ میرا رب مجھے کھلاتا ہے' پلاتا ہے۔ جمہور نے اسے مجازاً قوت پر محمول کیا ہے کہ کھانے پینے سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ وہ قوت مجھے عطا فرما دیتے ہیں۔ بعض نے اسے حقیقت پر معمول کرتے ہوئے کھانے پینے سے جنت کا کھانا پینا مراد لیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو اپنے معارف کی ایسی غذا کھلاتے ہیں جس سے آپؐ کے دل پر لذت سرگوشی و مناجات کا فیضان ہوتا ہے۔ اللہ کے قرب سے آپؐ کو آنکھوں کی ٹھنڈک ملتی ہے اور اللہ کی محبت کی نعمت سے آپؐ کو سرشاری نصیب ہوتی ہے اور اس کی جناب کی طرف شوق میں افزونی ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ غذا جو آپؐ کو اللہ کی

جناب سے عطا ہوتی ہے۔ یہ روحانی غذا ایسی ہے جو آپؐ کو دنیوی غذا سے ایک لمبی مدت تک بے نیاز کر دیتی ہے۔ (تلخیص از زاد المعاد' ج ا' ص: ۱۵۴' ۱۵۵) ﴿کالمنکل لھم﴾ تنکیل سے ماخوذ اسم فاعل ہے۔ معنی زجر و توبیخ' ڈانٹ ڈپٹ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔ یہ بیان صرف جواز کیلئے نہیں ہے بلکہ زجر و توبیخ کیلئے ہے اور اس سے ممانعت کے عمل کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ پس جب انہوں نے براہ راست صوم وصال رکھا تو ان کے سامنے اس کی حکمت ظاہر ہوئی۔ یہ چیز اسے قبول کرنے کی زیادہ داعی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے میں وصال مکروہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ مسلسل کچھ کھائے پیئے بغیر روزہ رکھنا انسانی قویٰ کو کمزور کر دینے کا بھی موجب ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی یا غذا کی قوت مل جاتی تھی اس لئے آپؐ وصال فرما لیتے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے نیکی کے جذبہ اور آپؐ کے عمل کو دیکھ کر وصال کرنا شروع کیا تو آپؐ نے انہیں اس سے منع فرمایا مگر جب وہ باز نہ آئے تو آپؐ نے سبق سکھانے کیلئے مسلسل روزے رکھنا شروع کئے تو اتنے میں چاند نظر آگیا تو آپؐ نے زجر و توبیخ کے طور پر فرمایا کہ "کرو وصال کہاں تک کرو گے۔ اگر چاند نظر نہ آتا تو میں وصال صوم کو مزید طول دے دیتا تاکہ تمہیں سبق ملے۔" البتہ بخاری میں ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "وصال نہ کرو ہاں! اگر تم میں سے کوئی وصال کرنا ہی چاہے تو سحر تک وصال کرے۔" جس سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری کا کھانا شعائر اسلام سے ہے۔ اس لئے سحری کھانا چاہئے اور رات دن کا وصال آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے۔

(۵۳۸) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ، وَالعَمَلَ بِهِ، والجَهْلَ، فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ». رَوَاهُ البخاريُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا اور حماقت و بیوقوفی کو ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے پینے کو چھڑانے کی ضرورت نہیں۔" (بخاری اور ابوداؤد۔ اور الفاظ ابوداؤد کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لم یدع﴾ نہ چھوڑا' ترک نہ کیا۔ ودع سے ماخوذ ہے۔ ﴿الزور﴾ زا پر ضمہ اور "واو" ساکن معنی جھوٹ ﴿الجھل﴾ حماقت و بیوقوفی اور سختی ﴿فلیس للہ حاجۃ﴾ تو اللہ کو اس کی طرف التفات و توجہ کی حاجت و ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اس کا یہ عمل قابل قبول نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں جھوٹ' غلط بیانی' جہالت و نادانی

کے کام بھی ترک کر دینے چاہئیں۔ جھوٹ بولنے اور غلط بیانی سے روزے کی روح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے روزے کی حالت میں ایک روزے دار کا بچنا نہایت ضروری ہے۔ روزے دار کی جسمانی تربیت کے ساتھ روحانی تربیت بھی ہوتی ہے۔ گویا روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت پر کنٹرول کرنا سیکھ جائے۔ جھوٹ' دغا' فریب اور نادانی کے کاموں سے اجتناب کرے۔ اگر یہی مقصود حاصل نہ ہوا تو پھر روزہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(٥٣٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَيُبَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَلٰكِنَّهُ كَانَ أَمْلَكَكُمْ لِإِرْبِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: «فِي رَمَضَانَ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لیتے تھے اور معانقہ بھی فرما لیتے تھے لیکن آپؐ تمہاری نسبت اپنی طبیعت پر زیادہ کنٹرول اور ضبط کرنے والے تھے۔ (بخاری و مسلم' یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ یہ دونوں فعل رمضان میں کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿یقبل﴾ تقبیل سے ماخوذ ہے۔ ﴿یباشر﴾ میاں بیوی کا ایک دوسرے کے جسم سے جسم ملانا' بغل گیر ہونا۔ ﴿لاربہ﴾ دونوں پر فتحہ ہے۔ یعنی حاجت' خواہش نفس (میاں بیوی کا صنفی تعلق) اور ایک قراءت کے مطابق همزہ کے نیچے کسرہ اور راء ساکن۔ اس صورت میں حاجت اور عضو مخصوص کا احتمال ہے۔ اس حدیث سے بوسہ اور مباشرت جسمانی ایسے آدمی کیلئے مباح ہے جو اپنے آپ پر قابو اور کنٹرول رکھنے کا حوصلہ اور طاقت رکھتا ہو اور یہ رعایت ایسے آدمی کیلئے نہیں جسے اپنے نفس پر پورا کنٹرول نہ ہو۔ یہ قول اس مسئلہ میں تمام اقوال و آراء میں زیادہ مناسب اور مبنی برعدل ہے۔

(٥٤٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ، وَاحْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے احرام اور روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ پچھنے یا سینگی لگوانے سے نہ احرام میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے اور نہ روزے میں کوئی کمی آتی ہے۔ دونوں حالتوں میں پچھنے لگوانے جائز ہیں۔ البتہ اگر کمزوری واقع ہو جائے اور اس کی وجہ سے روزہ ٹوٹنے کا اندیشہ و خطرہ پیدا ہو تو پھر پچھنے لگوانے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ اکثر ائمہ کرام کی رائے یہی ہے کہ پچھنے لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(٥٤١) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى عَلَى رَجُلٍ بِالْبَقِيْعِ، وَهُوَ يَحْتَجِمُ فِيْ رَمَضَانَ، فَقَالَ: «أَفْطَرَ الحَاجِمُ وَالمَحْجُومُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

ﷺ بقیع میں ایک ایسے شخص کے پاس تشریف لائے جو رمضان میں پچھنے لگوا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا کہ ''سینگی (پچھنے) لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔'' (بجز ترمذی اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ احمد' ابن خزیمہ اور ابن حبان تینوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿افطر الحاجم والمحجوم﴾ یہ حدیث اس بارے میں نص ہے کہ سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بظاہر یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابقہ حدیث کے معارض ہے۔ جمہور علماء روزے دار کیلئے سینگی لگوانے کے جواز کے قائل ہیں اور اس حدیث کی تاویل میں ان کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنے آپ افطار کیلئے خود کو پیش کر دیا ہے بلکہ قریب بھی پہنچ گئے جسے سینگی لگائی گئی وہ تو ضعف و کمزوری کی وجہ سے اور سینگی لگانے والا اس لئے کہ اس سے بچنا مشکل ہے کہ جب وہ خون چوس رہا ہو تو کوئی قطرۂ خون حلق میں چلا جائے اور روزہ ٹوٹ جائے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ آئندہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ لیکن جہاں تک تاویل مذکور کا تعلق ہے تو حدیث کے الفاظ اس کے اطلاق کا انکار کر رہے ہیں۔ یہی بات راجح ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتا رہی ہے کہ سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے مگر جمہور اس کے قائل نہیں۔ انہوں نے اس کی جو تاویل کی ہے وہ گو اتنی اہمیت نہیں رکھتی مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آئندہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کے نسخ کا احتمال قوی تر ہے۔

راوی حدیث: ﴿شداد بن اوس رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابویعلیٰ ہے۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری مدنی کہلائے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے برادر زادہ (بھتیجے) تھے۔ علم و حلم کے مالک تھے۔ ۵۸ھ میں ۷۵ برس کی عمر پا کر شام میں وفات پائی۔

(۵۴۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَوَّلُ مَا كُرِهَتِ الحِجَامَةُ لِلصَّائِمِ، أَنَّ جَعْفَرَ بْنَ أَبِيْ طَالِبٍ احْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَمَرَّ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: أَفْطَرَ هٰذَانِ. ثُمَّ رَخَّصَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْدُ فِي

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے روزہ دار کیلئے سینگی لگوانا اس لئے مکروہ ہوئی کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روزہ کی حالت میں سینگی لگوائی' نبی ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا ''ان دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔'' اس کے بعد نبی ﷺ نے روزہ دار کیلئے سینگی لگوانے کی رخصت دے دی

الحِجَامَةِ لِلصَّائِمِ، وَكَانَ أَنَسٌ يَحْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَقَوَّاهُ.

اور انس رضی اللہ عنہ روزہ کی حالت میں سینگی لگواتے تھے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کو قوی کہا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ بعد ﴾ کے دال پر عموماً ضمہ ہے۔ اسے مبنی علی الضم کہتے ہیں۔ نیت میں مضاف الیہ ہونے کے باوجود اسے حذف کر دیا جاتا ہے جیسے ﴿ بعد ذلک ﴾ اس میں "ذلک" ذہن میں ہوتا ہے مگر اسے حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے بعد پر ضمہ پڑھا جاتا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹ جانے کا حکم منسوخ ہو گیا ہے اور اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گذشتہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

(٥٤٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اكْتَحَلَ فِي رَمَضَانَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: لاَ يَصِحُّ فِيهِ شَيْءٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا۔ (اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں)

حاصل کلام : سرمہ لگانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ' اسحٰق رحمہ اللہ' ابن مبارک رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ روزہ دار کیلئے سرمہ لگانا مکروہ سمجھتے ہیں۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔ اس بارے میں گو مرفوعاً احادیث سب ضعیف ہیں جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر ان کا موید ہے جس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے ﴿ لاباس باسناده ﴾ ابن شبرمہ اور اور ابن ابی لیلیٰ نے تو کہہ دیا ہے کہ سرمہ ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایک حدیث میں ہے کہ "روزہ اندر جانے والی چیز سے ٹوٹ جاتا ہے) اور سرمہ وغیرہ کا اثر حلق میں اتر جاتا ہے۔ مگر یہ قول درست نہیں کیونکہ سرمہ وغیرہ کا اثر مساموں کے ذریعہ حلق میں ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھ براہ راست کھانے کی جگہ نہیں جیسے کوئی تمہ پاؤں کے تلوں پر ملے تو اس کی کڑواہٹ منہ میں محسوس ہوتی ہے حالانکہ اس سے کوئی بھی روزہ ٹوٹ جانے کا قائل نہیں۔ مزید برآں یہ روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں فضل بن المختار اور شعبہ مولیٰ ابن عباس دونوں ضعیف ہیں۔ رہی ابوداؤد کی ایک حدیث کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے پرہیز کرے تو اس کے بارے میں خود امام ابوداؤد نے وضاحت کر دی ہے کہ امام یحیٰی بن معین نے مجھ سے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ (نیل' سبل)

(٥٤٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو روزہ دار بھول کر کچھ کھا لے یا پی لے تو اسے چاہیئے کہ اپنا روزہ پورا کر لے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔" (بخاری و مسلم)

أَطْعَمَهُ اللّٰهُ، وَسَقَاهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِلْحَاكِمِ: مَنْ أَفْطَرَ فِيْ رَمَضَانَ نَاسِياً فَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ وَلاَ كَفَّارَةَ. وَهُوَ صَحِيْحٌ.

اور امام حاکم سے یوں روایت ہے کہ "اگر کوئی بھول کر رمضان میں روزہ کھول لے تو اس پر قضاء اور کفارہ نہیں۔" (اور یہ حدیث صحیح ہے۔)

(٥٤٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ ذَرَعَهُ القَيْءُ فَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ فَعَلَيْهِ القَضَاءُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَأَعَلَّهُ أَحْمَدُ، وَقَوَّاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جسے قے آجائے تو اس پر (روزہ کی) قضا نہیں اور جو جان بوجھ کر قے کرے اس پر قضا ہے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد نے اس کو معلول کہا ہے اور امام دارقطنی نے اسے قوی کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ذرعه القیئ ﴾ یعنی جو زور سے بغیر ارادہ اور قصد کے قے آئے اور "استقاء" کے معنی یہ ہیں کہ جو قصداً اور اراداتاً خود قے کرے۔

حاصل کلام: امام احمد رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے مگر امام دارقطنی رحمہ اللہ' امام ابن حبان رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ' ابن عمر رضی اللہ عنہما' زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور جمہور علماء کا اس روایت کے مطابق یہی قول ہے کہ قصداً قے کرنے سے ہی روزہ ٹوٹتا ہے بلکہ امام ابن منذر نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات قے سے روزہ ٹوٹ جانے اور اس کی قضاء کے قائل نہیں مگر یہ قول دلیل کے اعتبار سے انتہائی کمزور ہے۔

(٥٤٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ خَرَجَ عَامَ الفَتْحِ إِلَى مَكَّةَ، فِيْ رَمَضَانَ، فَصَامَ، حَتَّى بَلَغَ كُرَاعَ الغَمِيْمِ، فَصَامَ النَّاسُ، ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِّنْ مَّاءٍ فَرَفَعَهُ، حَتَّى نَظَرَ النَّاسُ إِلَيْهِ، ثُمَّ شَرِبَ، فَقِيْلَ لَهُ بَعْدَ ذٰلِكَ: إِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ، فَقَالَ: «أُولٰئِكَ العُصَاةُ، أُولٰئِكَ العُصَاةُ».

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ کی طرف رمضان میں نکلے تو آپؐ نے روزہ رکھا یہاں تک کہ آپؐ کراع الغمیم (ایک جگہ کا نام) پہنچے۔ اس دن لوگوں نے بھی روزہ رکھا۔ آپؐ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور اس کو اتنا اونچا کیا کہ لوگوں نے دیکھ لیا۔ پھر آپؐ نے اسے پی لیا۔ پھر اس کے بعد آپؐ سے کہا گیا کہ بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "یہی لوگ نافرمان ہیں' یہی لوگ نافرمان ہیں۔" اور ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ آپؐ سے کہا

وَفِي لَفْظٍ : «فَقِيْلَ لَهُ : إِنَّ النَّاسَ قَدْ شَقَّ عَلَيْهِمُ الصِّيَامُ، وَإِنَّمَا يَنْتَظِرُوْنَ فِيْمَا فَعَلْتَ، فَدَعَا بِقَدَحٍ مِّنْ مَّاءٍ بَعْدَ الْعَصْرِ فَشَرِبَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ

گیا کہ بے شک لوگوں کو روزہ نے مشقت میں ڈال دیا ہے اور اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ وہ آپؐ کے عمل کا انتظار کرتے ہیں تو آپؐ نے عصر کے بعد پانی کا پیالہ منگوایا اور پی لیا۔

لغوی تشریح: ﴿ خرج عام الفتح ﴾ نبی کریم ﷺ ۸ ہجری ۱۰ رمضان کو مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے ﴿ کراع الغمیم ﴾ "کاف" پر ضمہ اور "راء" پر تخفیف اور "انعمیم" میں "غین" پر فتحہ اور "میم" پر کسرہ ہے۔ عسفان سے آگے ایک وادی کا نام ہے۔ ﴿ دعا بقدح ﴾ یعنی پیالہ طلب کیا۔ ﴿ فرفعه ﴾ الخ اس کو ہاتھ پر رکھ کر بلند کیا تا کہ لوگ دیکھ لیں اور روزہ افطار کر لینے کا انہیں علم ہو جائے۔ ﴿ اولئک العصاة ﴾ "عصاة" عاص کی جمع ہے یعنی نافرمان۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ پر سختی کی اور روزہ افطار کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علامہ الیمانی نے سبل السلام میں کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مسافر کو اختیار ہے کہ چاہے تو روزہ رکھے اور اگر چاہے تو روزہ نہ رکھے اور ضرورت پر مسافر روزہ افطار بھی کر سکتا ہے اگرچہ دن کا اکثر حصہ روزہ سے گزر چکا ہو۔ مولانا صفی الرحمٰن فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سفر کے دوران مشقت کی صورت میں روزہ افطار کرنا افضل ہے۔

(۵۴۷) وَعَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! إِنِّي أَجِدُ بِيْ قُوَّةً عَلَى الصِّيَامِ فِي السَّفَرِ، فَهَلْ عَلَيَّ جُنَاحٌ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: **«هِيَ رُخْصَةٌ مِّنَ اللهِ، فَمَنْ أَخَذَ بِهَا فَحَسَنٌ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَصُومَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ»**. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ، أَنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو سَأَلَ.

حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول (ﷺ) سے کہا: میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں (اگر میں روزہ رکھ لوں) تو کیا مجھ پر کوئی حرج ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جو اس کو لے لے تو بہتر ہے اور جو کوئی روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں۔" (مسلم، اور اس حدیث کا اصل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ حدیث میں یوں ہے کہ حمزۃ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے سوال کیا)

راوی حدیث: ﴿ حمزه بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ ﴾ حجاز کے رہنے والے صحابی ہیں جن کی کنیت ابوصالح یا ابومحمد ہے۔ ان سے ان کے فرزند اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں۔ وہ ۶۱ھ میں فوت ہوئے اور ان کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔

(۵۴۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رُخِّصَ لِلشَّيْخِ الكَبِيْرِ أَنْ يُفْطِرَ وَيُطْعِمَ عَنْ كُلِّ يَوْمٍ مِّسْكِيْناً، وَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ.

بڑی عمر والے بوڑھے کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ افطار کرے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس پر قضاء نہیں ہے۔ (اسے دار قطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رخص ﴾ یہ "رخصت" سے ہے اور احتمال ہے کہ یہ رخصت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک کی آیت سے سمجھی ہو اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس رخصت کی صراحت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو۔ ﴿ ویطعم عن کل یوم مسکینا ﴾ کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی مقدار گندم اور کھجور وغیرہ کا ایک مد مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہت بوڑھا شخص جس کی طاقت بحال ہونے کی امید نہ ہو۔ اسی طرح علاج سے مایوس مریض کا بھی یہی حکم ہے کہ یومیہ ایک مسکین کے کھانے کے برابر صدقہ کرے۔ ایک روایت میں کھانے کا اندازہ آدھا صاع گندم آیا ہے۔ یعنی سوا کلو گندم۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بہت بوڑھے ہوگئے تو انہوں نے کھانا تیار کرایا اور تیس مسکینوں کو بلا کر کھلایا۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کا بھی یہی حکم ہے۔ مسکین کو کھانا کھلانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک ضروری ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اسے مستحب قرار دیتے ہیں اور بعض نے کھانا کھلانے کو منسوخ قرار دیا ہے۔ یعنی اتنی مقدار صدقہ کر دیا جائے تب بھی جائز ہے۔ (سبل، فتح)

(٥٤٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: هَلَكْتُ يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: «وَمَا أَهْلَكَكَ»؟ قَالَ: وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِيْ فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «هَلْ تَجِدُ مَا تُعْتِقُ رَقَبَةً»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «فَهَلْ تَسْتَطِيْعُ أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «فَهَلْ تَجِدُ مَا تُطْعِمُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْناً»؟ قَالَ: لاَ، ثُمَّ جَلَسَ، فَأُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِعَرَقٍ فِيْهِ تَمْرٌ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہلاک ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا "کس چیز نے تجھے ہلاک کیا؟" اس نے کہا میں رمضان میں اپنی عورت سے مباشرت کر بیٹھا۔ تو آپؐ نے فرمایا "کیا تجھ میں اتنی طاقت ہے کہ ایک گردن کو آزاد کر دے؟" اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ دو ماہ کے متواتر روزے رکھے؟" اس نے کہا، نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تیرے پاس اتنا مال ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکے؟" اس نے کہا نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ تو نبی

فَقَالَ: «تَصَدَّقْ بِهٰذَا»، فَقَالَ: أَعَلَى أَفْقَرَ مِنَّا؟ فَمَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا أَهْلُ بَيْتٍ أَحْوَجُ إِلَيْهِ مِنَّا، فَضَحِكَ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى بَدَتْ أَنْيَابُهُ، ثُمَّ قَالَ: «اذْهَبْ فَأَطْعِمْهُ أَهْلَكَ». رَوَاهُ السَّبْعَةُ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ﷺ کے پاس ایک ٹوکرا لایا گیا جس میں کھجوریں تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "ان کو خیرات کر دو۔" اس نے کہا کیا اپنے سے زیادہ محتاج پر (خیرات کروں)؟ کیونکہ دو سنگلاخ پہاڑوں (مدینہ) کے مابین کوئی گھر والا مجھ سے زیادہ محتاج نہیں۔ تو نبی ﷺ مسکرائے یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا "جاؤ اسے اپنے گھر والوں کو کھلا دو۔" (اسے ساتوں نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ جاء رجل ﴾ آدمی آیا۔ اس شخص کا نام سلمان یا سلمہ صخر بیاضی تھا۔ ﴿ وقعت علی امراتی ﴾ میں اپنی بیوی پر پڑ گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے میں نے اس سے وطی کی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ ﴿ هلکت ﴾ میں ہلاک ہوگیا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روزہ کی حالت میں بیوی سے جماع کرنے کی حرمت سے باخبر تھا اور اس نے عمداً یہ حرکت کرلی۔ جس سے وہ شخص اس حکم سے خارج ہے جس نے بھول کر جماع کیا ہو۔ ﴿ رقبة ﴾ سے مراد غلام یا لونڈی ہے اور یہ ﴿ ماتعتق ﴾ میں "ما" کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ فاتی ﴾ صیغۂ مجہول ہے یعنی نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔ ﴿ بعرق ﴾ سے مراد بڑا ٹوکرا ہے۔ ﴿ فیه تمر ﴾ جس میں پندرہ صاع یعنی ساٹھ مد کھجوریں تھیں۔ یہ اس لئے کہ ہر مسکین کیلئے ایک مد ہے اور دار قطنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا ہر مسکین کیلئے ایک مد ہو ﴿ اعلی افقر ﴾ میں ھمزہ استفہام ہے اور "علی" حرف جر ہے۔ یعنی کیا میں ایسے شخص پر صدقہ کروں جو مجھ سے اور میرے اہل بیت سے بھی زیادہ محتاج ہو؟ ﴿ فما بین لابتیها ﴾ میں ﴿ لابتیها ﴾ لابة کا ﴿ تثنیة ﴾ ہے اور باء پر فتح ہے۔ یعنی وہ سیاہ پتھریلی زمین جسے آگ نے جلایا ہو اور "ھا" کی ضمیر مدینہ طیبہ کی طرف ہے اور "لابتان" سے معروف دو حرے مراد ہیں جو مدینہ طیبہ کے شرقی اور غربی جانب ہیں۔ ایک کا نام "حرة الواقم" اور دوسرے کا "حرة الوبرة" ہے اور مدینہ طیبہ ان دونوں کے مابین واقعہ ہے۔ لہٰذا "لابتین" سے مراد مدینہ منورہ ہے۔ یعنی مدینہ میں کوئی اہل خانہ مجھ سے زیادہ ان کھجوروں کا محتاج نہیں۔ ﴿ انیابه ﴾ یہ "ناب" کی جمع ہے اور یہ وہ دانت ہوتے ہیں جو "رباعی" کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور "رباعی" ثنایا کے ساتھ والے دانت کو کہتے ہیں اور "ثنایا" سے سامنے کے دو دانت مراد ہوتے ہیں اور اس کا اطلاق اوپر اور نیچے کے سامنے کے دو دانتوں پر ہوتا ہے۔ (اطعمه اهلک) یہ اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔ یہ حدیث اس بات کی قطعاً دلیل نہیں کہ فقیر پر کفارہ نہیں یا فقیر کا اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا ہی کافی ہے بلکہ یہ تنگ دستی کی بنا پر کفارہ مؤخر ہونے کی دلیل ہے کہ جب میسر آئے تب کفارہ ادا کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک قول میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے کہ تنگ دست پر کفارہ نہیں۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوثور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ استدلال درست نہیں' کفارہ جب میسر ہو بہرنوع ادا کیا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کفارہ کا ذکر کیا۔ تنگ دستی کی بنا پر کھجوریں اسے بطور صدقہ کے دیں کفارہ کے طور پر نہیں۔ اس حدیث میں قطعاً ذکر نہیں کہ آپؐ نے اس سے کفارہ کو ساقط قرار دیا ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو کفارہ کے سقوط کا ذکر ہے وہ سخت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ نیز اس حدیث میں گو روزہ قضا رکھنے کا حکم نہیں مگر دوسری احادیث میں قضا کا حکم موجود ہے۔ اس بنا پر ائمہ اربعہ اور جمہور علماء ایسی صورت میں مرد و زن دونوں کیلئے روزہ رکھنے کے قائل ہیں۔ الّا یہ کہ عورت روزہ دار نہ ہو۔ تو عورت پر قضا نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے اس حدیث پر دو جلدوں میں بحث کی ہے اور اس سے ایک ہزار فوائد و مسائل کا استنباط کیا ہے۔

(٥٥٠) وَعَنْ عَائِشَةَ وَأُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصْبِحُ جُنُباً مِنْ جِمَاعٍ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ وَيَصُومُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ فِي حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ «وَلاَ يَقْضِي».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جماع سے جنبی ہوتے تو صبح ہونے پر آپؐ غسل کرتے اور روزہ رکھتے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں یہ زائد کیا کہ قضا نہیں دیتے تھے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنبی آدمی پر غسل سے پہلے صبح ہو جائے تو روزہ درست ہے۔ جمہور اسی کے قائل ہیں بلکہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے معارض مسند امام احمد وغیرہ میں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر کسی پر حالت جنابت میں صبح ہو جائے تو روزہ نہ رکھے' اس کے بارے میں جمہور نے کہا ہے کہ وہ منسوخ ہے اور خود حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ جو ایسی صورت میں روزہ نہ رکھنے کے قائل تھے' نے جب یہ حدیث سنی تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ (سبل وغیرہ)

(٥٥١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ، صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر روزہ لازم ہو تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وعلیہ صیام ﴾ یعنی اس کے ذمہ روزہ لازم و واجب ہو کیونکہ "علی" کا لفظ وجوب کیلئے ہے۔ ﴿ صام عنہ ولیہ ﴾ اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولی یعنی وارث کو میت کی طرف سے روزہ رکھنا چاہئے اور روزہ میں نیابت جائز ہے اور جن حضرات نے

کہا ہے کہ روزہ میں نیابت نہیں ان کے پاس کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں۔ راجح یہی ہے کہ روزہ میں نیابت ہے۔

حاصل کلام: عموماً محدثین نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حج کی طرح روزہ میں بھی نیابت درست ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے روزہ نہیں بلکہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ مگر اس صریح اور صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ میں نیابت بھی جائز ہے اور یہی بات راجح ہے۔ نیز حج کی طرح لازم نہیں کہ ولی ہی میت کی طرف سے روزہ رکھے کوئی اور دوسرا آدمی بھی روزہ رکھ سکتا ہے۔ حدیث میں ولی کا ذکر اغلبیت کی بنا پر ہے۔ (سبل)

١ - بَابُ صَوْمِ التَّطَوُّعِ، وَمَا نُهِيَ عَنْ صَوْمِهِ

نفلی روزے اور جن دنوں میں روزہ رکھنا منع کیا گیا ہے' کا بیان

(٥٥٢) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ، قَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ وَالْبَاقِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ فَقَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَومِ يَوْمِ الاثْنَيْنِ، فَقَالَ: «ذٰلِكَ يَوْمٌ وُلِدْتُ فِيهِ، وَبُعِثْتُ فِيهِ، وَأُنْزِلَ عَلَيَّ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرفہ (۹ ذوالحج) کے دن روزے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "(یہ روزہ) گزشتہ سال اور آئندہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔" اور آپؐ سے عاشورہ کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا "یہ گزشتہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔" اور آپؐ سے سوموار کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ "اس دن میں پیدا ہوا اور اسی دن مجھے نبوت دی گئی اور اسی دن مجھ پر قرآن اتارا گیا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یوم عرفۃ ﴾ عرفہ کا دن' ذی الحجہ کا نواں دن ہوتا ہے اور جو میدان عرفات میں نہ ہو اس کیلئے اس دن کا روزہ مستحب ہے اور جو میدان عرفات میں ہو اس کے بارے میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں سب سے معتدل قول یہ ہے کہ میدان عرفات میں حاجی کیلئے روزہ مستحب نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ ﴿ یکفر ﴾ یہ تکفیر سے ہے یعنی اس کی برکت سے پہلے اور آنے والے سال کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور ان گناہوں سے صغیرہ

گناہ مراد ہیں کبیرہ نہیں کیونکہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے' یا یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرما دیں۔ "یوم عاشوراء" عاشورہ کا دن محرم الحرام کی دس تاریخ کو ہوتا ہے۔ یہود اس دن روزہ رکھتے تھے۔ آپؐ نے بھی اس دن روزہ رکھنے کی ترغیب دی' البتہ فرمایا کہ "یہود کی مخالفت میں ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھو" اور سوموار کے روز' روزہ رکھنے کے بارے میں آپؐ نے جو فرمایا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اپنی کسی خاص نعمت سے نوازا ہو۔ بطور تشکر و تقرب اس دن روزہ مستحب ہے اور سوموار کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اس دن اللہ کے حضور اعمال پیش کئے جاتے ہیں اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ کے حضور میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش کئے جائیں۔"

(۵۵۳) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے رکھے یہ عمل سارے سال (روزے رکھنے) کی مانند ہوگا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ثم اتبعه﴾ یعنی رمضان کے بعد روزہ رکھے۔ ﴿ستامن شوال﴾ چھ شوال کے۔ خواہ یہ شوال کے آغاز میں رکھے یا درمیان میں یا آخر میں اور خواہ متواتر رکھے یا متفرق ﴿کان کصیام الدھر﴾ گویا اس نے سال بھر کے روزے رکھے۔ یہ اس لئے کہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔ رمضان کے روزے دس ماہ کے برابر اور چھ شوال کے دو ماہ کے برابر۔

(۵۵٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْ عَبْدٍ يَصُومُ يَوْماً فِي سَبِيلِ اللهِ إِلاَّ بَاعَدَ اللَّهُ بِذَلِكَ الْيَوْمِ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ سَبْعِينَ خَرِيفاً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کوئی شخص ایسا نہیں جو اللہ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھے مگر اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو ستر سال کیلئے جہنم کی آگ سے دور کر دیتے ہیں۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فی سبیل اللہ﴾ اللہ کی راہ میں' جب مطلقاً یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد جہاد ہوتا ہے۔ یعنی جہاد کے دوران جو ایک دن روزہ رکھتا ہے اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی لیکن اگر روزہ رکھنے سے کمزوری آجائے اور جہاد و قتال میں کمزوری کا باعث بنے تو پھر روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ "خریفا" سے مراد ایک سال ہے۔

(۵۵۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَصُومُ حَتَّى نَقُولَ لاَ يُفْطِرُ، وَيُفْطِرُ حَتَّى نَقُولَ لاَ يَصُومُ، وَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ اسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ إِلاَّ رَمَضَانَ، وَمَا رَأَيْتُهُ فِي شَهْرٍ أَكْثَرَ مِنْهُ صِيَاماً فِيْ شَعْبَانَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

روزے رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم کہتے: آپؐ کبھی افطار نہیں کریں گے اور آپؐ روزے چھوڑ دیتے یہاں تک کہ ہم کہتے تھے (اسی طرح) آپؐ کبھی روزے نہیں رکھیں گے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپؐ نے کبھی سوائے رمضان کے کسی مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں اور میں نے آپؐ کو نہیں دیکھا کہ کسی مہینے میں آپؐ نے شعبان سے زیادہ روزے رکھے ہوں۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کم و بیش ہر مہینے میں روزے رکھتے تھے۔ کبھی متواتر روزے رکھتے اور کبھی ضروری مشاغل کی بنا پر کئی کئی دن روزہ نہ رکھتے۔ البتہ رمضان کے علاوہ سب سے زیادہ روزے آپؐ شعبان میں رکھتے تھے۔

(٥٥٦) وَعَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن نَصُومَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ، ثَلاَثَ عَشْرَةَ، وَأَرْبَعَ عَشْرَةَ، وَخَمْسَ عَشْرَةَ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم ہرماہ تین دن کے روزے رکھیں یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ (تاریخ کو)۔ (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

(٥٥٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: **«لاَ يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُومَ، وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ، إِلاَّ بِإِذْنِهِ»**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ، زَادَ أَبُو دَاوُدَ: «غَيْرَ رَمَضَانَ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "کسی عورت کیلئے حلال نہیں کہ وہ روزہ رکھے جبکہ اس کا خاوند گھر میں ہو۔ الاّ یہ کہ شوہر اس کی اجازت دے۔" (بخاری و مسلم' یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور ابوداؤد نے "سوائے رمضان" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی نفلی روزہ سے مقدم ہے۔ نفلی روزہ خاوند کی اجازت کے بغیر رکھنا عورت پر حرام ہے۔ البتہ فرضی روزہ کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے کہ فرض کی ادائیگی بہرنوع مقدم ہے۔

(۵۵۸) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ صِيَامِ يَوْمَيْنِ: يَوْمِ الْفِطْرِ، وَيَوْمِ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ عیدالفطر کا دن اور قربانی کا دن۔ (بخاری و مسلم)

(۵۵۹) وَعَنْ نُبَيْشَةَ الْهُذَلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَيَّامُ التَّشْرِيقِ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت نبیشہ الھذلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تشریق کے دن کھانے' پینے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے دن ہیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ایام التشریق﴾ تشریق کے دن یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کو قربانی کے دن کے بعد۔ مزید تین دن ہیں۔ ﴿ایام اکل وشرب﴾ کھانے پینے کے دن ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ ان دنوں روزہ رکھنا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿نبیشة رضی اللہ عنہ﴾ تصغیر کے ساتھ' ان کے والد کا نام و نسب یوں ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن عتاب الھذلی۔ مشہور صحابی ہیں اور ان سے گیارہ احادیث مروی ہیں۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور انہیں "نبیشة الخیر" کہا جاتا تھا۔

(۵۶۰) وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمْ قَالاَ: لَمْ يُرَخَّصْ فِي أَيَّامِ التَّشْرِيْقِ أَنْ يُصَمْنَ إِلاَّ لِمَنْ لَمْ يَجِدِ الْهَدْيَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی سوائے اس شخص کے جسے قربانی کا جانور نہ ملا ہو۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لم یرخص﴾ یہ صیغۂ مجہول ہے کہ رخصت نہیں دی گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکماً مرفوع ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ ان دونوں (عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عمر رضی اللہ عنہ) نے سورۂ بقرہ کی اس آیت ۱۹۶ سے یہ مسئلہ سمجھا ہو۔ فمن لم یجد.... کہ جو ھدی نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے۔ ﴿ان یصمن﴾ یہ بھی صیغۂ مجہول ہے۔ ﴿الا لمن یجد الھدی﴾ سوائے اس شخص کے جو ھدی نہ پائے۔ "ھدی" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو کعبہ کی طرف حرم میں ذبح کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔ یعنی جو شخص حج تمتع یا قران کرنے والا ہو یا محصر ہو اور اس کے پاس قربانی نہ ہو تو اس کیلئے ایام تشریق میں روزے رکھنے جائز ہیں کیونکہ یہ حدیث حقیقی طور پر مرفوع نہیں اور جو اس بارے میں مرفوع روایات میں ہے وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔

حاصل کلام: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی متعدد احادیث میں ممانعت آئی ہے اور اس بارے میں علماء کا

اختلاف ہے۔ بعض اہل علم مطلقاً ان دنوں روزہ رکھنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے اور ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے ہے مگر یہ حقیقتاً مرفوع نہیں۔ احتمال ہے کہ ان حضرات نے قرآن مجید کے ظاہری سیاق سے یہی سمجھا ہو کہ "ایام حج" سے مراد یہی ایام تشریق ہیں۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے۔ یوم النحر سے پہلے اور ایام تشریق کے بعد کے دن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور سنن دار قطنی وغیرہ میں جو یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ھدی نہ رکھنے والے متمتع کو روزہ کی رخصت دی تو وہ ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی یحییٰ بن سلام قوی نہیں۔ اس لئے راجح یہی ہے کہ ایام تشریق میں بہر نوع روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

(٥٦١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لاَ تَخُصُّوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِي، وَلاَ تَخُصُّوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ الأَيَّامِ، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ فِي صَوْمٍ يَصُومُهُ أَحَدُكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دوسری راتوں میں سے جمعہ کی رات کو قیام کرنے کیلئے مخصوص نہ کرو اور نہ ہی دوسرے دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص کرو سوائے اس کے کہ جمعہ کا دن ایسے دن میں آجائے جس دن روزہ رکھتا ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لاتختصوا یوم الجمعة﴾ یعنی اکیلا جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص نہ کرو۔ اس لئے کہ جمعہ کا دن عید کا دن ہے اور عید کے دن روزہ نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ممانعت تحریمی ہے مگر جمہور نے اسے نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے کیونکہ ترمذی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت کم جمعہ کا روزہ چھوڑتے تھے۔ مگر اس میں احتمال ہے کہ شاید اس کے ساتھ آپؐ ایک دن پہلے یا بعد میں بھی روزہ رکھتے ہوں گے۔ یاد رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا ریب جمعہ کو عید کا دن فرمایا ہے مگر عید اور جمعہ میں اتنا فرق ضرور ہے کہ عید کا دن روزہ اس سے ایک روز پہلے یا بعد روزہ رکھنے سے بھی جائز نہیں جبکہ جمعہ میں یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس کی بعد کی حدیث میں آرہا ہے۔

(٥٦٢) وَعَنْهُ أَيْضاً قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَصُومَنَّ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، إِلاَّ أَنْ يَصُومَ يَوْماً قَبْلَهُ، أَوْ يَوْماً بَعْدَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کوئی بھی جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے سوائے اس کے کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)

(٥٦٣) وَعَنْهُ أَيْضاً أَنَّ رَسُولَ اللهِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول

ﷺ قَالَ: «إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلاَ تَصُومُوا». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَحْمَدُ.

اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب شعبان آدھا ہو جائے تو روزہ نہ رکھو۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: یہ ممانعت اس لئے ہے کہ شعبان کے آخری دنوں میں روزے رکھ کر ضعف و کمزوری لاحق نہ ہو جائے اور رمضان المبارک کے روزہ میں قوت بحال رہے۔ یہ نہی تنزیہی ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعبان کے آخری دنوں میں بھی روزہ رکھ لیتے تھے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس حدیث کو منکر کہا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ اس کا کوئی راوی ضعیف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اسے بیان کرنے میں علاء بن عبدالرحمٰن منفرد ہیں اور امام احمد تفرد ثقہ پر بھی منکر کا لفظ بول دیتے ہیں۔ نیز اس ممانعت سے وہ روزے مستثنیٰ ہیں جو عادتاً رکھے جاتے ہیں مثلاً جو شخص ہر سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھتا ہے تو نصف شعبان کے بعد بھی ان دنوں روزہ رکھنا جائز ہے۔ (فتح الباری وغیرہ)

(٥٦٤) وَعَنِ الصَّمَّاءِ بِنْتِ بُسْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ تَصُومُوا يَوْمَ السَّبْتِ إِلاَّ فِيمَا افْتُرِضَ عَلَيْكُمْ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ أَحَدُكُمْ إِلاَّ لِحَاءَ عِنَبٍ، أَوْ عُودَ شَجَرَةٍ، فَلْيَمْضُغْهَا». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ مُضْطَرِبٌ، وَقَدْ أَنْكَرَهُ مَالِكٌ، وَقَالَ أَبُو دَاوُدَ: هُوَ مَنْسُوخٌ.

حضرت صماء بنت بسر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہفتہ کے دن کا روزہ نہ رکھو۔ سوائے اس روزہ کے جو تم پر فرض کیا گیا ہے۔ پس اگر تم میں سے کوئی انگور کا چھلکا یا کسی درخت کا تنکا پائے تو چاہئے کہ اس کو کھالے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس میں اضطراب ہے۔ بے شک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا انکار کیا ہے اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ منسوخ ہے)

لغوی تشریح: ﴿لحاء عنب﴾ کے لام پر فتحہ اور کسرہ دونوں طرح پر ہے اور آخر میں مد ہے۔ جس کے معنی ہیں چھلکا اور "العنب" کی عین کے نیچے زیر اور نون پر فتحہ ہے۔ مشہور پھل یعنی انگور کو "عنب" کہتے ہیں۔ ﴿فلیمضغها﴾ یہ باب نصر اور فتح دونوں سے آتا ہے۔ یعنی اسے کھالے اور اس سے روزہ افطار کرلے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ "ہفتہ کے روز روزہ کی یہ ممانعت اس لئے ہے کہ یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔" اور اس کی تائید آئندہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿الصماء بنت بسر رضی اللہ عنہا﴾ صاد پر زبر اور میم مشدد ان کا نام بہیہ تھا اور بھیہ کی باء پر پیش "حاء" مفتوح اور باء مشدد اور ایک قول کے مطابق ان کا نام بھیمہ میم کے اضافہ کے ساتھ تھا۔ "بسر" کی باء پر پیش اور را ساکن قبیلہ مازن سے تعلق رکھتی تھیں۔ صحابیہ تھیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبداللہ بن بسر کی بہن تھیں اور بعض نے پھوپھی اور بعض نے خالہ کہا ہے۔

(٥٦٥) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَكْثَرَ مَا كَانَ يَصُومُ مِنَ الأَيَّامِ، يَوْمُ السَّبْتِ، وَيَوْمُ الأَحَدِ، وَكَانَ يَقُولُ: «إِنَّهُمَا يَوْمَا عِيدٍ لِلْمُشْرِكِينَ، وَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَهُمْ». أخرجَهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَهٰذَا لَفْظُهُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو اکثر روزہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے دن ہیں اور میں ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔" (اسے امام نسائی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ ابن خزیمہ کے ہیں)

حاصل کلام: پہلی حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہفتہ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ لیکن وہ روایت مضطرب اور منسوخ ہے جیسا کہ مصنف علام نے ذکر کیا ہے اور اس کی ناسخ یہی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو عموماً روزہ رکھتے تھے محض اس لئے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کی جائے۔ کیونکہ یہود ہفتہ کے دن کی اور نصاریٰ اتوار کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کے برعکس ان دنوں کا روزہ رکھ کر واضح کر دیا کہ یہ عید اور تعظیم کے دن نہیں ہیں۔

(٥٦٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ العُقَيْلِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفات میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر اس لئے کہا ہے کہ اس کے راوی حوشب بن عقیل نے یہ حدیث مھدی بن حرب الھجری سے روایت کی ہے اور حوشب کی کسی نے بھی متابعت نہیں کی۔ مگر یہ اعتراض کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ حوشب کو اکثر محدثینؒ نے ثقہ کہا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا فیصلہ بھی تقریب التھذیب میں یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ البتہ مھدی الھجری کے بارے میں امام ابن معین نے کہا ہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ لیکن امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ذھبی نے تلخیص المستدرک میں ان کی تائید کی ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقات میں اسے ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "مقبول" کہا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عرفات میں حاجی کو یوم عرفہ کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ امام یحیٰی بن سعید انصاری کا یہی موقف ہے۔ اس کی تائید سنن نسائی' ترمذی وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ "یوم عرفہ ہماری عید کا دن ہے" یعنی اہل عرفہ کیلئے یہ دن عید کا ہے۔ اس لئے انہیں اس روز روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ البتہ جمہور کے نزدیک روزہ نہ رکھنا مستحب ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی حجۃ الوداع کے موقعہ پر یوم

عرفہ کا روزہ نہیں رکھا تھا۔

(٥٦٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ صَامَ مَنْ صَامَ الأَبَدَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ بِلَفْظِ: «لاَ صَامَ وَلاَ أَفْطَرَ».

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے (گویا) روزہ نہیں رکھا۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ ہیں کہ "نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔"

لغوی تشریح: ﴿ لاصام من صام الابد ﴾ میں "الابد" ہمیشہ اور سال بھر روزہ رکھنا مراد ہے اور ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی سنت کے خلاف ہے جس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ﴿ لاصام ولا افطر ﴾ یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے والے کا نہ روزہ ہے اور نہ افطار ہے۔ روزہ نہ ہونے کا مفہوم تو یہی ہے کہ یہ سنت کے خلاف ہے اور "نہ افطار کیا" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں سے محروم رہا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ ہے اور باقی سارا سال روزے رکھ کر صرف عیدین اور ایام تشریق کے روزے نہ رکھنے سے یہ کراہت رفع نہیں ہو جاتی۔

٢ - بَابُ الاعْتِكَافِ وَقِيَامِ رَمَضَانَ

اعتکاف اور قیام رمضان کا بیان

(٥٦٨) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص ایمان اور ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کرتا ہے اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الاعتکاف ﴾ کے لغوی معنی روکنے اور بند کرنے کے ہیں اور شرعی مفہوم یہ ہے کہ مسجد میں ایک خاص کیفیت سے اپنے آپ کو روکنا اور "قیام رمضان" سے مراد رات کو نماز پڑھنا یا قرآن پاک کی تلاوت کرنا ہے اور اس کا غالب استعمال نماز تراویح پر ہوتا ہے۔ ﴿ ایمانا ﴾ مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب پر یقین رکھتے ہوئے اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اس کا ایمان ہی اسے قیام رمضان پر آمادہ کرتا ہے جس میں اخلاص کی نیت کی طرف اشارہ ہے اور ریاء و نمائش سے اجتناب مقصود ہے۔ ﴿ احتسابا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے ثواب اور اس کی رضا کی نیت سے جو قیام کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کی راتوں کا قیام کتنے بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ آنحضرت ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں عموماً آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھتے اور قیام بہت لمبا کرتے تھے بلکہ جن تین راتوں میں رسول اللہ ﷺ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں بھی آپؐ

نے گیارہ رکعات ہی پڑھیں۔ (ابن حبان) اس لئے سنت نبوی ﷺ تو بہرنوع گیارہ رکعت ہے۔ علامہ ابن ھمام رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی اس سے زائد رکعتوں کو سنت نہیں بلکہ نفل قرار دیا ہے۔ (فتح القدیر)

(٥٦٩) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ العَشْرُ، - أَيِ العَشْرُ الأَخِيْرَةُ مِنْ رَمَضَانَ، - شَدَّ مِئْزَرَهُ، وَأَحْيَا لَيْلَهُ، وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری دھا کہ شروع ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اپنی کمر کس لیتے' رات بھر جاگتے رہتے اور اپنی بیویوں کو بھی جگاتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿شد مئزرہ﴾ مئزر کی میم کے نیچے زیر' ھمزہ ساکن ہے۔ یعنی اپنی چادر باندھ لیتے۔ یہ دراصل کنایہ ہے کہ آپؐ عبادت کے لئے کمر ہمت باندھ لیتے اس کیلئے بڑی کوشش کرتے اور سب کچھ چھوڑ کر عبادت میں لگ جاتے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی ازواج مطہرات سے عبادت کی وجہ سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔ ﴿واحیا لیلہ﴾ یعنی نماز وغیرہ میں شب بیدار رہتے یا اس کا اکثر حصہ جاگتے۔ ﴿وایقظ اھلہ﴾ یعنی اپنے اہل خانہ کو بھی نماز و عبادت کیلئے نیند سے اٹھاتے۔

(٥٧٠) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَعْتَكِفَ، صَلَّى الفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ مُعْتَكَفَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھتے اور پھر اعتکاف کی جگہ داخل ہو جاتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿صلی الفجر﴾ صبح کی نماز پڑھتے' اکیس رمضان کی نماز مراد ہے۔ ﴿ثم دخل معتکفہ﴾ اسم ظرف کا صیغہ ہے یعنی اپنے اعتکاف کی جگہ نماز فجر کے بعد آپؐ علیحدگی اختیار کر لیتے' یوں نہیں کہ یہ وقت اعتکاف کے ابتداء کا ہے بلکہ اعتکاف کیلئے تو آپؐ اکیس کی نماز مغرب ہی مسجد میں پڑھتے اور اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں رات گزارتے' جب صبح کی نماز پڑھتے تو اعتکاف کی مخصوص جگہ میں تشریف لے جاتے جیسا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے۔ اس حدیث کی یہ تاویل اس لئے ضروری ہے کہ آئندہ حدیث میں وضاحت ہے کہ آپؐ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے۔

(٥٧١) وَعَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَعْتَكِفُ العَشْرَ الأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ، حَتَّى تَوَفَّاهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

انہی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تاآنکہ آپؐ وفات پاگئے۔ آپؐ کی بیویاں آپؐ کے بعد اعتکاف کرتیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف سنت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا اور آپ کے بعد ازواج مطہرات بھی اس کا اہتمام کرتی تھیں۔ (سبل)

(۵۷۲) وَعَنْهَا قَالَتْ: إِنْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَيُدْخِلُ عَلَيَّ رَأْسَهُ، - وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ، - فَأُرَجِّلُهُ، وَكَانَ لاَ يَدْخُلُ الْبَيْتَ إِلاَّ لِحَاجَةٍ، إِذَا كَانَ مُعْتَكِفاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنا سر مبارک میرے آگے کر دیتے جبکہ آپ (اعتکاف کی حالت میں) مسجد میں ہوتے۔ پس میں آپ کو کنگھی کرتی اور جب آپ اعتکاف میں ہوتے تو آپ سوائے ضروری حاجات کے گھر میں داخل نہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان کان﴾ یہ "ان" حرف تاکید ہے اور یہ ان ثقیلہ سے خفیفہ استعمال ہوا ہے' اصل کلام "انہ کان" تھا ﴿لیدخل﴾ ادخال سے ہے یعنی داخل ہوتے ﴿علی﴾ یہ علی حرف جار نہیں بلکہ یاء مشددہ ہے یعنی میری جانب ﴿فارجلہ﴾ تو میں آپ کو کنگھی کرتی۔ آپ کے بالوں کو کنگھی سے درست کرتی' تیل لگاتی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کرنے والا اپنے جسم کا بعض حصہ مسجد سے باہر کر سکتا ہے اور اعتکاف میں اپنی بیوی سے خدمت لے سکتا ہے۔ ﴿الا لحاجۃ﴾ مگر ضروری حاجت کیلئے۔ اس سے بول و براز' غسل جنابت اور خون نکلوانا وغیرہ مراد ہے جو مسجد میں نہیں کئے جا سکتے۔

(۵۷۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: السُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ أَن لاَ يَعُودَ مَرِيضاً، وَلاَ يَشْهَدَ جَنَازَةً، وَلاَ يَمَسَّ امْرَأَةً، وَلاَ يُبَاشِرَهَا، وَلاَ يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ إِلاَّ لِمَا لاَ بُدَّ لَهُ مِنْهُ، وَلاَ اعْتِكَافَ إِلاَّ بِصَوْمٍ. وَلاَ اعْتِكَافَ إِلاَّ فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَلاَ بَأْسَ بِرِجَالِهِ، إِلاَّ أَنَّ الرَّاجِحَ وَقْفُ آخِرِهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اعتکاف کرنے والے پر سنت ہے کہ وہ نہ کسی مریض کی بیمار پرسی کرے نہ جنازہ میں شرکت کرے' نہ عورت کو ہاتھ لگائے اور نہ ہی اس سے مباشرت کرے اور سوائے حاجات ضروریہ کے مسجد میں سے نہ نکلے اور سوائے جامع مسجد کے اعتکاف نہ کرے۔ (ابوداؤد' اس کے راویوں میں کوئی خلل نہیں لیکن راجح یہ ہے کہ اس کے آخری الفاظ موقوف ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان لایعود﴾ یہ عیادت سے ہے یعنی اعتکاف کی جگہ سے عیادت کیلئے نہ نکلتے۔ البتہ اگر راہ چلتے مریض کی حالت کے بارے میں سوال کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ﴿ولا یمس امراۃ﴾ یعنی شہوت سے عورت کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ﴿ولا یباشرھا﴾ اور نہ اس سے جماع کرتے اور یہ بھی احتمال ہے کہ "لمس" سے جماع مراد ہو اور مباشرت سے گلے ملنا وغیرہ مراد ہو۔ ﴿ولا اعتکاف الا بصوم﴾

اور روزہ کے بغیر اعتکاف نہ کرتے۔ اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے' دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ اعتکاف کے ساتھ روزہ مشروط نہیں ہے۔ ﴿ مسجد جامع ﴾ وہ مسجد جس میں باجماعت نماز ہوتی ہو۔ ﴿ الاان الراجح وقف آخرہ ﴾ یعنی آخری جملہ ﴿ والاعتکاف الا بصوم ﴾ موقوف ہے۔ مصنف علام نے فتح الباری میں کہا ہے کہ امام دارقطنی نے بالجزم فرمایا ہے کہ مرفوع حدیث صرف ﴿ لا یخرج لحاجۃ ﴾ ہے اور اس کے علاوہ باقی موقوف ہے اور یہاں فرمایا ہے آخری حصہ ہی موقوف ہے۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے عبدالرحمٰن بن اسحٰق کے علاوہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہو کہ یہ سنت ہے۔

(٥٧٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ عَلَى الْمُعْتَكِفِ صِيَامٌ، إِلاَّ أَنْ يَجْعَلَهُ عَلَى نَفْسِهِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ أَيْضاً.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "اعتکاف کرنے والے پر روزہ نہیں الاّ یہ کہ وہ اسے اپنے آپ پر مقرر کر لے۔" (اسے دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کا بھی موقوف ہونا ہی راجح ہے)

حاصل کلام: صحیح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور اس میں سے ﴿ لا یخرج لحاجۃ ﴾ کا جملہ ہی مرفوع ثابت ہے۔ جیسا کہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ اعتکاف بہرنوع مسجد میں ہونا چاہئے۔ جامع مسجد سے مراد امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں نماز باجماعت ہوتی ہو۔ جمہور کا خیال ہے کہ جس پر جمعہ فرض نہیں وہ ہر اس مسجد میں اعتکاف کر سکتا ہے جس میں نماز باجماعت ہوتی ہو لیکن جس پر جمعہ فرض ہے اس کیلئے اس مسجد میں اعتکاف کرنا چاہئے جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو۔ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ اعتکاف کیلئے روزہ شرط ہے یا نہیں۔ اکثر کا خیال ہے کہ روزہ شرط ہے لیکن کوئی واضح نص اس بارے میں منقول نہیں۔ تاہم رسول اللہ ﷺ سے بلاصوم اعتکاف کرنا ثابت نہیں۔ لیکن اس سے روزہ شرط ہونا لازم نہیں آتا۔

(٥٧٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رِجَالاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أُرُوا لَيْلَةَ القَدْرِ فِي المَنَامِ، فِي السَّبْعِ الأَوَاخِرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الأَوَاخِرِ، فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيهَا، فَلْيَتَحَرَّهَا فِي

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کچھ مردوں کو آخری ہفتہ میں شب قدر دکھائی گئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں تمہاری خواب کو دیکھتا ہوں جو آخری ہفتہ میں موافق آیا ہے۔ اگر کوئی اس کو تلاش کرنے والا ہو تو وہ آخری ہفتہ میں اسے تلاش کرے۔" (بخاری و مسلم)

السَّبْعِ الأَوَاخِرِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿ اروا ﴾ اراءة سے مبنی بر مفعول ہے۔ ﴿ فی السبع الاواخر ﴾ سے آخری سات دن مراد ہیں جس کی ابتداء تیئس کی رات سے ہوتی ہے۔ ﴿ اری ﴾ کے معنی ظن و گمان کے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں۔ ﴿ تواطات ﴾ کے معنی موافقت کے ہیں۔ ﴿ متحریھا ﴾ جو اس کا طالب ہو۔ یہ "التحری" سے ہے جس کے معنی مطلوب کو حاصل کرنے میں کوشش اور جستجو کرنا ہے۔

(٥٧٦) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ فِي لَيْلَةِ القَدْرِ: «لَيْلَةُ سَبْعٍ وَعِشْرِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

وَقَدِ اخْتُلِفَ فِيْ تَعْيِيْنِهَا عَلَى أَرْبَعِيْنَ قَوْلاً، أَوْرَدْتُها فِي فَتْحِ البَارِي.

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شب قدر کے بارے میں فرمایا "یہ ستائیس کی رات ہے۔" (ابوداؤد) اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ راجح ہے۔ (حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ) شب قدر کی تعیین میں اختلاف کیا گیا ہے' اس بارے میں چالیس اقوال ہیں۔ جنہیں میں نے فتح الباری میں نقل کیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ والراجح وقفہ ﴾ یعنی راجح یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے نبی ﷺ کا یہ فرمان نہیں۔ البتہ یہ حکماً مرفوع ہے۔ ﴿ قد اختلف ﴾ اس کے تعین میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں چالیس قول نقل کئے ہیں مگر ان میں راجح اور زیادہ قوی قول یہ ہے کہ شب قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے اور وہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی اکیس' کبھی تیئس' کبھی پچیس' کبھی ستائیس اور کبھی انتیس کی رات کو اور جن روایات میں بڑے جزم سے تعین کا ذکر ہے جیسے اسی روایت میں ستائیس کا ذکر اور بعض روایات میں اکیس اور بعض میں تیئس کا ذکر ہے تو یہ اس لئے کہ اس سال اسی رات شب قدر تھی یوں نہیں کہ ہمیشہ اسی رات ہی شب قدر ہوگی۔ مگر بعض نے اس سے سمجھ لیا کہ ہمیشہ شب قدر اسی رات ہوگی۔ اس بارے میں اختلاف کا سبب بھی درحقیقت یہی ہے۔

(٥٧٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَرَأَيْتَ إِنْ عَلِمْتُ أَيُّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ القَدْرِ، ما أقول فيها؟ قَالَ: «قُولِي اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول! (ﷺ) مجھے بتلائیں کہ اگر میں جان لوں' شب قدر کونسی ہے تو اس میں کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا "کہہ' اے اللہ! بے شک تو ہی درگزر کرنے والا ہے' تو درگزر کرنا پسند کرتا ہے' مجھ

الْعَفْوَ، فَاعْفُ عَنِّي». رَوَاهُ الخَمْسَةُ غَيْرَ أَبِي دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ. سے درگزر فرما۔" (اسے ابوداؤد کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور اسے ترمذی اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ارایت ﴾ آپ مجھے بتلائیں یہ ﴿ اخبرنی ﴾ کے معنی میں ہے۔ ﴿ ای لیلۃ ﴾ مفعول ہونے کے اعتبار سے ﴿ ای ﴾ پر نصب اور مبتداء ہونے کے ناطے ضمہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی خبر ہے۔ ﴿ عفو ﴾ کے عین پر زبر اور واؤ مشدد ہے۔ یعنی بہت درگزر کرنے والا' بہت معاف کرنے اور بخشنے والا۔

(٥٧٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَشُدُّوا الرِّحَالَ إِلاَّ إِلى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ، المَسْجِدِ الحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالمَسْجِدِ الأَقْصَى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سوائے تین مسجدوں کے (کسی کیلئے) کجاوے نہ باندھو۔ (یعنی) مسجد الحرام' میری اس مسجد اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لا تشدوا الرحال ﴾ "الرحال" رحل کی جمع ہے اور وہ اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں جیسے گھوڑے کی کاٹھی ہوتی ہے اور کجاوے باندھنا سے کنایہ یہ ہے کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ حصول برکت و فضیلت' سفر مت کرو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان تین مقامات کے علاوہ کسی بھی مقام کو باعث برکت سمجھ کر یا وہاں نماز پڑھنے کی نیت سے سفر کرنا درست نہیں۔ تبرک کی تخصیص اس لئے ہے کہ ان تین مساجد کی طرف سفر اسی مقصد کیلئے ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے علاوہ دوسرے مقامات کی طرف سفر کی ممانعت بھی اسی مقصد سے مختص ہے۔ البتہ دوسرے اغراض و مقاصد کیلئے سفر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بسا اوقات واجب ہے جس کی تفصیل الصارم المنکی وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ حدیث ان تینوں مقامات کے شرف و فضل پر دال ہے اور اسے یہاں لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مقامات میں اعتکاف کیا جائے' وہاں عبادت اور ذکر و تلاوت میں مقدور بھر کوشش کی جائے۔

٦۔ كِتَابُ الْحَجِّ

حج کے مسائل

(١) بَابُ فَضْلِهِ وَبَيَانُ مَنْ فُرِضَ عَلَيْهِ

حج کی فضیلت و فرضیت کا بیان

(٥٧٩) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلاَّ الْجَنَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”عمرہ دوسرے عمرے تک دونوں کے مابین گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الحج﴾ کی حاء پر فتح اور کسرہ دونوں آتے ہیں' جس کے لغوی معنی ہیں قصد کرنا اور لغت کے امام خلیل نے کہا ہے کہ اس کے معنی محترم مقام کی طرف باکثرت قصد کرنا ہے اور اصطلاح شریعت میں مسجد الحرام کی طرف مخصوص اعمال سے قصد کرنا ہے اور یہ بالاتفاق اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کی فرضیت سن چھ ہجری میں ہوئی بعض نے نو یا دس ہجری کہا ہے۔ زاد المعاد میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا رجحان اسی طرف ہے۔ ﴿العمرۃ﴾ لغت میں عمرہ کے معنی زیارت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی قصد و ارادہ کے کئے ہیں اور اصطلاح شریعت میں اس سے مراد احرام' طواف' سعی' صفا و مروہ' سر منڈانا یا بال کٹوانا ہے۔ اسے عمرہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہی اعمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیت اللہ کا قصد کیا جاتا ہے۔ ﴿الحج المبرور﴾ سے مراد وہ حج ہے جس میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے حج مبرور وہ ہے جس کے بعد حج کرنے والے کی دینی و اخلاقی حیثیت پہلے سے بہتر ہو جائے اور بعض نے اس کے معنی حج مقبول کے کئے ہیں اور یہ سب اقوال باہم قریب ہیں' ان میں کوئی بڑا فرق نہیں۔

(۵۸۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟ قَالَ: «نَعَمْ، عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لاَ قِتَالَ فِيهِ؛ الحَجُّ وَالعُمْرَةُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں! ان پر وہ جہاد ہے جس میں لڑائی نہیں (یعنی) حج اور عمرہ۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اس کی سند صحیح ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿علی النساء جهاد﴾ کہ کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ اس میں حرف استفہام محذوف ہے اور حج و عمرہ پر جہاد کا اطلاق مجازاً ہے کیونکہ ان میں بھی جہاد کی طرح مشقت و تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ ﴿واصله فی الصحیح﴾ اس کی اصل ﴿الصحیح﴾ میں ہے۔ صحیح سے یہاں صحیح بخاری مراد ہے اور یہ حدیث عمرہ کے وجوب کی دلیل ہے۔

(۵۸۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَخْبِرْنِي عَنِ العُمْرَةِ، أَوَاجِبَةٌ هِيَ؟ فَقَالَ: «لاَ، وَأَنْ تَعْتَمِرَ خَيْرٌ لَكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ. وَأَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ضَعِيفٍ وَعَنْ جَابِرٍ مَرْفُوعاً: «اَلْحَجُّ وَالعُمْرَةُ فَرِيضَتَانِ».

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بدوی حاضر ہوا تو اس نے کہا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے عمرہ کے بارے بتلائیے کہ کیا یہ واجب ہے؟ تو آپ نے فرمایا "نہیں اگر تو عمرہ کرے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔" (اسے احمد و ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کا موقوف ہونا راجح ہے) اور امام ابن عدی نے ایک اور ضعیف سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿والراجح وقفه﴾ راجح بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے انہی سے ایک صحرا نورد بدو نے سوال کیا اور انہوں نے اسے یہ جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت راوی کا وہم ہے بلکہ اس کی سند ضعیف اور ناقابل استدلال ہے جس کی تفصیل تحفۃ الاحوذی (ج ۲ : ص ۱۱۳) میں دیکھی جا سکتی ہے ﴿من وجه آخر ضعیف﴾ ایک اور ضعیف سند سے کیونکہ وہ عبداللہ بن لھیعہ عن عطاء عن جابر کی سند سے مروی ہے اور ابن لھیعہ اس میں کمزور ہے۔ امام ابن عدی نے کہا ہے کہ یہ عطاء سے غیر محفوظ ہے۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے یہی روایت حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت سے مرفوعاً بیان کی ہے مگر اس میں اسماعیل بن مسلم المکی ضعیف ہے اور ابن سیرین کا حضرت زید

سے سماع بھی نہیں اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے ابن سیرین سے موقوف روایت کیا ہے اس کی سند پہلی سے زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قول ہے مگر سند میں انقطاع ہے۔ (سبل' التلخیص) عمرہ کے وجوب اور عدم وجوب کے بارے میں اختلاف ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ یہ واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ' ابن عباس رضی اللہ عنہما ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔

(۵۸۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ! مَا السَّبِيلُ؟ قَالَ: «الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ إِرْسَالُهُ، أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ أَيْضاً، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کیا گیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! "سبیل" سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا "راستے کا خرچ اور سواری۔" (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے مگر راجح اس کا مرسل ہونا ہے اور ترمذی نے اسے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ما السبیل ﴾ "سبیل" کیا ہے؟ یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو وجوب حج کیلئے "سبیل" کو شرط قرار دیا ہے یہ سبیل کیا ہے؟ جس کا حکم سورۂ ال عمران میں یوں ہے وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا (۳ : ۹۷) ﴿ الزاد والراحلہ ﴾ راحلہ سے مراد سواری' خواہ وہ جانور ہو' موٹر کار ہو' بحری جہاز ہو یا ہوائی جہاز اور الزاد سے واپسی تک اہل و عیال کے خرچ سے زائد مال مراد ہے۔

(۵۸۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَ رَكْباً بِالرَّوْحَاءِ، فَقَالَ: «مَنِ القَوْمُ»؟ قَالُوا: الْمُسْلِمُونَ، فَقَالُوا: مَنْ أَنْتَ؟ قَالَ: «رَسُولُ اللهِ»، فَرَفَعَتْ إِلَيْهِ امْرَأَةٌ صَبِياً، فَقَالَتْ: أَلِهٰذَا حَجٌّ؟ قَالَ: «نَعَمْ، وَلَكِ أَجْرٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روحاء مقام پر کچھ سواروں سے ملے تو آپ نے فرمایا تم کون ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا' ہم مسلمان ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا "اللہ کا رسول ہوں۔" پھر آپ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر لائی اور پوچھا کیا اس کا حج ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں! اس کا ثواب تجھے ملے گا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ رکبا ﴾ را پر زبر اور کاف ساکن یہ "راکب" کی جمع ہے۔ قافلے کو کہتے ہیں۔ ﴿ بالروحاء ﴾ راء پر فتحہ آخر میں مد ہے۔ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ ﴿ فقالوا من انت ﴾

تو انہوں نے کہا آپ کون ہیں؟ قاضی عیاض نے کہا کہ آپ انہیں رات کے وقت ملے ہوں اور وہ آپؐ کو پہچان نہ سکے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن کو ملے ہوں مگر پہلے انہوں نے آپؐ کو نہ دیکھا ہو ﴿ولك اجر﴾ اور اجر و ثواب تمہیں ملے گا اسے اٹھانے اور ساتھ لے کر حج کرنے کی بدولت۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نابالغ بچے کا حج درست ہے لیکن یہ حج اس سے بلوغت کے بعد کفایت نہیں کرتا جیسا کہ آئندہ چوتھی حدیث کے تحت آرہا ہے۔

(٥٨٤) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ الفَضْلُ بْنُ عَبَّاسٍ رَدِيفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَجَاءَتِ امْرَأَةٌ مِّنْ خَثْعَمَ، فَجَعَلَ الفَضْلُ يَنْظُرُ إِلَيْها، وَتَنْظُرُ إِلَيْهِ، وَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يَصْرِفُ وَجْهَ الفَضْلِ إِلَى الشِّقِّ الآخَرِ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ فَرِيْضَةَ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ فِي الحَجِّ أَدْرَكَتْ أَبِيْ شَيْخاً كَبِيْراً، لاَ يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ، أَفَأَحُجُّ عَنْهُ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، وَذَلِكَ فِي حَجَّةِ الوَدَاعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت آئی تو فضل رضی اللہ عنہ اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فضل رضی اللہ عنہ کا منہ دوسری جانب پھیرتے تھے۔ پس اس عورت نے کہا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! بے شک حج' اللہ کا فرض ہے اس کے بندوں پر۔ میرا باپ بڑی عمر والا بوڑھا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتا کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! اور یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ردیف﴾ ایک سواری پر دو بیٹھنے والوں میں سے پیچھے والے کو "ردیف" کہتے ہیں۔ ﴿خثعم﴾ خاء پر زبر اور ثاء ساکن اور عین پر زبر' یمن کے مشہور قبیلہ کا نام ہے اور اسے منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ ﴿الشق﴾ یعنی جانب۔ آپؐ نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کا چہرا اس لئے پھیر دیا تاکہ شیطان انہیں فتنہ میں مبتلا نہ کر دے۔ ﴿حجۃ الوداع﴾ یہ وہ حج ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہجری میں کیا اور اس کے تین ماہ بعد آپؐ وفات پا گئے اور "الوداع" کے واؤ پر زبر ہے اس کا مصدر "ودع تودیعا" ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ کے نیچے کسرہ ہے یوں یہ موادعۃ کا مصدر ہے۔ آخری حج کا نام حجۃ الوداع اس لئے رکھا گیا کہ آپؐ نے اس سال لوگوں کو یا حرم کعبہ کو رخصت کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ زندہ آدمی اگر معذور ہو اور اس کی صحت کی امید نہ ہو تو اس کی جانب سے حج بدل جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس پر حج فرض ہو مگر وہ کسی مستقل بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے حج کرنے کی طاقت نہ پاتا ہو تو اس کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ لیکن عارضی بیماری جس کے دور

ہو جانے کا امکان ہو' میں نیابت درست نہیں یہ شرط حج فرض کیلئے ہے نفلی حج کیلئے اس میں بلا شرط نیابت جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی موقف ہے اور حج بدل کیلئے بہتر یہی ہے کہ اس کا قریبی ہی نائب بنے۔

راوی حدیث: ﴿ فضل بن عباس رضی اللہ عنہ ﴾ آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام ام الفضل لبابۃ الکبری بنت الحارث الھلالیۃ تھا۔ نہایت حسین و جمیل تھے۔ معرکہ حنین میں آپؐ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپؐ کو غسل دینے میں بھی شریک تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے یہی تھے۔ جہاد کیلئے شام تشریف لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ طاعون عمواس کے سال ۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ بعض نے کہا ہے یرموک میں شہید ہوئے اور بعض نے کہا کہ دمشق میں وفات پائی۔ ان کے جسم پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر تھی۔

(٥٨٥) وَعَنْهُ أَنَّ ٱمْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ، فَلَمْ تَحُجَّ، حَتَّى مَاتَتْ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: «نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَتَهُ؟ اقْضُوا اللَّهَ، فَاللَّهُ أَحَقُّ بِالوَفَاءِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ قبیلہ جھینہ کی ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا' بے شک میری ماں نے حج کرنے کی منت مانی تھی لیکن وہ حج نہیں کر سکی' اور فوت ہو گئی ہے کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! اس کی طرف سے حج کر' اگر تیری ماں کے ذمہ ادھار ہوتا تو کیا تو وہ قرض نہ اتارتی؟ اللہ کا حق پورا کرو کیونکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کا حق پورا کیا جائے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ جھینہ ﴾ جیم پر پیش' ھا پر زبر۔ یہ تصغیر ہے اور مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ اکثر کا خیال ہے یہ قحطان کی اولاد میں حمیر کی ایک شاخ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا تعلق معد بن عدنان سے ہے۔ ﴿ حجی ﴾ امر مخاطب کا صیغہ ہے اور یہ دلیل ہے کہ میت کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ "دین" دال پر زبر یعنی قرض اور اسے دین اس لئے کہا گیا تا کہ اس کی اہمیت اجاگر ہو جائے۔

(٥٨٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَيُّمَا صَبِيٍّ حَجَّ، ثُمَّ بَلَغَ الحِنْثَ، فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى، وَأَيُّمَا عَبْدٍ حَجَّ، ثُمَّ أُعْتِقَ فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى». رَوَاهُ ابْنُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو بچہ حج کرے پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس پر ضروری ہے کہ دوسرا حج کرے اور جو غلام حج کرے پھر آزاد کر دیا جائے تو اس پر لازم ہے کہ دوسرا حج کرے۔" (اسے ابن ابی شیبہ اور

أَبِي شَيْبَةَ وَالبَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِي رَفْعِهِ، وَالمَحْفُوظُ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ.

بیہقی نے روایت کیا ہے اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف کیا گیا ہے اور محفوظ یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ بلغ الحنث ﴾ کی حاء کے نیچے کسرہ' نون ساکن' اس کے معنی گناہ کے ہیں۔ یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ اس کے نامۂ اعمال میں جرم کی بنا پر گناہ لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ بچپن میں کیا ہوا جرم اللہ کے ہاں قابل مواخذہ نہیں۔ بلوغت کی عام علامت احتلام کا ہونا ہے۔ جس سے وہ مرد بن جاتا ہے۔

(٥٨٧) وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَخْطُبُ يَقُولُ: «**لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلاَّ وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ، وَلاَ تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ**»، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ امْرَأَتِي خَرَجَتْ حَاجَّةً، وَإِنِّي اكْتُتِبْتُ فِي غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: «**انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ میں یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ ہرگز اکیلا نہ ہو مگر اس کے ساتھ محرم ہو اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔" پس ایک آدمی کھڑا ہوا تو اس نے کہا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بے شک میری عورت حج کیلئے روانہ ہوئی اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں شامل ہونے کیلئے لکھا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "جاؤ اپنی بیوی کے ہمراہ حج کرو۔" (متفق علیہ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لا یخلون ﴾ یہ نون تاکید کے ساتھ "خلوۃ" سے نہی کا صیغہ ہے ﴿ ذومحرم ﴾ میم اور راء پر زبر اور ان کے مابین حاء ساکن ہے۔ اس سے عورت کے وہ قریبی مراد ہیں جن سے اس کا نکاح حرام ہے۔ جیسے باپ' بیٹا' بھائی وغیرہ ﴿ اکتتبت ﴾ باب افتعال سے متکلم مجہول کا صیغہ ہے یعنی میرا نام مجاہدین کی فہرست میں شامل ہے۔ فلاں غزوہ کیلئے متعین کیا گیا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت محرم کے بغیر حج نہیں کر سکتی اور عورت کیلئے یہ بھی فی الجملہ "من استطاع الیہ سبیلا" کے حکم میں شامل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر محرم مرد اور عورت کیلئے تنہائی میں علیحدہ ہونا حرام ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے جب بھی دونوں علیحدہ ہوں گے تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوگا۔ اس طرح عورت کو تنہا محرم کے بغیر سفر کرنا بھی حرام ہے۔ بعض فقہاء نے بعض ادلہ کی بنا پر بوڑھی' قافلہ کی صورت میں یا ذی حشمت عورت کو اس کی اجازت دی ہے مگر حدیث کے صریح الفاظ اس کے خلاف ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت پر حج فرض ہو تو نماز کی طرح اس کی اجازت خاوند سے ضروری نہیں۔ البتہ

نفلی حج ہو تو عورت کو بہرنوع اجازت لے کر جانا چاہئے۔

(٥٨٨) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَمِعَ رَجُلاً يَقُولُ: لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرُمَةَ، قَالَ: «مَنْ شُبْرُمَةُ»؟ قَالَ: أَخٌ لِيْ، أَوْ قَرِيْبٌ لِيْ، قَالَ: «حَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ، ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَالرَّاجِحُ عِنْدَ أَحْمَدَ وَقْفُهُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے سنا' وہ کہہ رہا تھا: "شبرمہ کی طرف سے لبیک۔ آپؐ نے فرمایا "شبرمہ کون ہے؟" اس نے کہا میرا بھائی یا میرا قریبی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا "تو نے اپنی طرف سے حج کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا" پہلے اپنی طرف سے کر کر پھر شبرمہ کی طرف سے کرلینا۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور امام احمد کے نزدیک اس کا موقوف ہونا راجح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شبرمۃ ﴾ شین اور راء پر پیش ہے ان کے مابین باء ساکن۔ ﴿ او قریب لی ﴾ یہ راوی کا شک ہے کہ اس نے بھائی کہا یا کہ وہ میرا قریبی ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اگر کسی نے خود حج نہیں کیا تو وہ دوسرے کی طرف سے نیابت نہیں کر سکتا اور اگر اس نے کسی کی جانب سے حج کی نیت سے احرام باندھا ہو تو وہ اسی کی جانب سے قرار پائے گا۔ دوسرے کی طرف سے نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مرفوع ہونے کی نفی کی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی تصحیح بھی منقول ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ' ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے جبکہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مرسل کہا ہے۔ بہرنوع اگر اسے موقوف بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ قابل استدلال ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کسی بھی صحابی سے مخالفت ثابت نہیں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ حج بدل میں نائب پہلے خود حج کرے پھر نیابت کرے۔

(٥٨٩) وَعَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الحَجَّ»، فَقَامَ الأَقْرَعُ ابْنُ حَابِسٍ، فَقَالَ: أَفِيْ كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللهِ!؟ قَالَ: «لَوْ قُلْتُهَا لَوَجَبَتْ. الحَجُّ مَرَّةً، فَمَا زَادَ فَهُوَ تَطَوُّعٌ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا تو آپؐ نے فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے" تو اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا: کیا ہر سال' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپؐ نے فرمایا "اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ (ہر سال کے لیے) فرض ہو جاتا۔ حج ایک بار ہے پس اس سے جو زائد ہے وہ نفل ہے۔" (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا

ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ حج عمر بھر میں صرف ایک بار فرض ہے اس سے زائد نفل ہے اور اس روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ اگر میں ہر سال حج فرض ہونے کا کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ مگر یہ نہیں کہتا تا کہ امت پر مشقت نہ پڑ جائے۔ اس سے بعض علماء کا خیال ہے کہ احکام شرعیہ کا تقرر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی مرضی سے کر سکتے تھے لیکن اکثر علماء اسے درست نہیں سمجھتے اور یہی موقف درست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریعی حکم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا پر ہی موقوف ہوتا تھا۔ اس اصولی اختلاف کی تفصیل اصول و عقائد کی کتابوں میں موجود ہے جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

راوی حدیث: ﴿ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ ﴾ یہ قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جو وفد بنو تمیم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اس میں شامل تھے اور مؤلفۃ القلوب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام میں اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

٢ - بَابُ الْمَوَاقِيتِ

(احرام کے) میقات کا بیان

(٥٩٠) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ، وَلِأَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ، وَلِأَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ، وَلِأَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ، هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، وَمَنْ كَانَ دُونَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ، حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ والوں کے لئے ذوالحلیفہ، شام والوں کیلئے جحفہ، نجد والوں کیلئے قرن منازل اور یمن والوں کیلئے یلملم کو احرام باندھ کر نیت کرنے کی جگہیں مقرر کیا ہے اور یہ میقاتیں ان کیلئے ہیں (جن کا ذکر ہوا) اور ان لوگوں کیلئے بھی، جو دوسرے شہروں سے ان کے پاس سے حج یا عمرہ کے ارادہ سے گزریں اور جو کوئی ان میقاتوں کے ورے (اندر) ہو وہ جہاں سے چلے وہیں سے (احرام باندھے) یہاں تک کہ مکہ والے مکہ سے احرام باندھیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب المواقیت ﴾ یہ میقات کی جمع ہے۔ وہ ہے جو ایک عبادت کے وقت اور جگہ کی حد بندی کرتا اور متعین کرتا ہے۔ اور یہاں ان سے وہ مقامات مراد ہیں جنہیں شارع علیہ السلام نے احرام کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اس سے آگے احرام باندھے بغیر حرم کی طرف جانا جائز نہیں ہے۔ ﴿ وقت ﴾ یعنی

احرام کیلئے میقات مقرر کیا اور یہ توقیت سے تحدید و تعین کے معنی کیلئے ہے۔ ﴿ ذوالحلیفۃ ﴾ حاء پر ضمہ، تصغیر ہے، جو مدینہ طیبہ کے وسط سے پانچ میل کی مسافت پر ہے جو آج کل "بئر علی" کے نام سے مشہور ہے۔ "الجحفۃ" جیم پر پیش اور حاء ساکن، مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو سمندر کے قریب مکہ مکرمہ سے ساڑھے چار مراحل (مرحلہ ایک دن کی مسافت کے برابر فاصلے کو کہتے ہیں) پر اور مدینہ طیبہ سے پونے چھ مراحل پر واقع ہے اس کا نام مھیعہ تھا۔ سیلاب آیا تو وہ سب کچھ بہا لے گیا جس کی بنا پر اسے جحفہ کہا جانے لگا۔ یہ بہت بڑی بستی تھی مگر اب ویران ہو چکی ہے۔ اسی لئے آج کل اس سے کچھ پہلے "رابغ" مقام سے احرام باندھتے ہیں۔ کیونکہ وہاں پانی کا انتظام ہے۔ ﴿ قرن المنازل ﴾ اسے ﴿ قرن الشعالب ﴾ بھی کہا گیا ہے یا یہ دو علیحدہ مقام ہیں۔ یہ بیضوی شکل کا چمکدار پہاڑ ہے جو مکہ مکرمہ سے مشرق کی جانب دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ہے۔ ﴿ یلملم ﴾ یاء اور دونوں لام پر فتحہ ہے اور درمیانی میم ساکن، جو مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف دو مرحلوں کی مسافت پر واقع پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے درمیان تقریباً تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿ ھن ﴾ یعنی یہ میقات اور مقامات ﴿ لھن ﴾ ان مذکورہ اہل بلدان کے لئے ہیں۔ ﴿ ممن اراد الحج والعمرۃ ﴾ جو حج اور عمرہ کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو حج اور عمرہ کی نیت سے نہ ہو وہ احرام کے بغیر مکہ مکرمہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ ﴿ ومن کان دون ذلک ﴾ اور جو اس کے ورے ہو یعنی جو میقات اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہو تو وہ احرام باندھے ﴿ من حیث انشا ﴾ جہاں سے نکلا ہے یا جہاں سے سفر کا آغاز کیا ہے۔ یعنی اپنے گھر اور اپنی بستی سے ہی احرام باندھے۔ ﴿ حتی اھل مکۃ من مکۃ ﴾ یہاں تک کہ اہل مکہ، مکہ مکرمہ ہی سے احرام باندھیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اہل مکہ حج اور عمرہ کا احرام مکہ مکرمہ سے باندھیں جو حکماً اہل مکہ میں سے ہیں وہ بھی وہیں احرام باندھیں اور آج کل جو عمرہ کے احرام کیلئے میقات سے باہر جا کر احرام باندھنے کا طریقہ چل نکلا ہے، اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

(٥٩١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ العِرَاقِ ذَاتَ عِرْقٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ، إِلاَّ أَنَّ رَاوِيَه شَكَّ فِيْ رَفْعِهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عراق کیلئے ذات عرق کو۔ میقات مقرر کیا (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے مگر اس کے راوی نے اس کے مرفوع ہونے میں شک کیا ہے)

وَفِيْ صَحِيْحِ البُخَارِيِّ: أَنَّ عُمَرَ هُوَ الَّذِيْ وَقَّتَ ذَاتَ عِرْقٍ.

اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کیا تھا۔

وَعِنْدَ أَحْمَدَ وَأَبِيْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

احمد، ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرق والوں کیلئے عقیق کو میقات مقرر فرمایا

وَقَّتَ لِأَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعَقِيْقَ. تھا۔"

لغوی تشریح: ﴿ ذات عرق ﴾ عین کے نیچے کسرہ ہے اور یہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ایک جگہ کا نام ہے اور وہ قرن منازل کے شمال میں اس کے برابر واقع ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ ﴿ وفی البخاری ..... ﴾ اور بخاری میں ہے کہ ذات عرق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میقات مقرر کیا۔ تو یہ بظاہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت کے خلاف ہے اور ان دونوں میں جمع و تطبیق کی صورت یوں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مرفوع روایت نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اس بارے میں اجتہاد کیا تو ان کا اجتہاد درست اور سنت کے مطابق نکلا۔ ﴿ العقیق ﴾ یہ "ذات عرق" سے کچھ پیچھے ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ "ذات عرق" کی حدود میں داخل ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ ہر وادی جسے سیلاب نے وسیع کر دیا ہو اسے عقیق کہتے ہیں اور اہل مشرق سے اہل عراق اور ان کے راستے سے گزرنے والے مراد ہیں۔ ان دونوں احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ "ذات عرق" میقات واجب ہے اور "عقیق" میقات مستحب ہے کیونکہ وہ بھی ذات عرق ہی سے ہے۔

حاصل کلام: خوب یاد رہے کہ وادی "مر الظہران" جو آج کل وادی فاطمہ کے نام سے مشہور و معروف ہے، وہ طائف کے سامنے مکہ کی مشرقی جانب سے شروع ہوتی ہے اور جنوب جدہ کے قریب بحر احمر کے مغربی جانب جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس وادی کے دو کنارے ہیں۔ ایک جنوبی کنارہ جو طائف کے راستے میں بڑی وادی کے پاس نخلہ یمانیہ سے پہلے ہے اور اسی کو "قرن المنازل" کہتے ہیں اور دوسرا شمالی کنارہ ضریبہ کے قریب ہے جسے "ذات عرق" کہتے ہیں۔ جہاں سے اہل عراق، اہل نجد شمالی گزرتے ہیں اور یہ دونوں کنارے ایک دوسرے کے محاذات ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان بہت مسافت ہے اور یہ مسافت مکہ مکرمہ سے ایک جیسی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کرنے میں اجتہاد سے کام لیا جو علاقے والوں کی ضرورت اور شریعت میں آسانی کے عین مطابق تھا جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقررہ میقات کے موافق ہوا تو گویا نور علی نور کا مصداق ہوا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ جو شخص ان پانچوں میقات میں کسی ایک میقات پر سے نہ گزرے تو اسے چاہئے کہ وہ جونسے میقات کے برابر سے گزرے۔ وہاں احرام باندھ لے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی میقات کے محاذ اور برابری کی وجہ سے ہی ذات عرق کو اہل عراق کیلئے مقرر کیا تھا اور تمام علماء اس اصول و ضابطہ پر متفق ہیں۔ محاذات کا مفہوم یہ ہے کہ جو میقات کسی کے دائیں یا بائیں جانب ہو اور وہ مکہ کی طرف جانے والا ہو۔ اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ جب ہم ان پانچوں میقات کو ایک خط کے ذریعے ملائیں تو مکہ مکرمہ کو ہر جانب سے وہ خط گھیرے میں لے لے گا۔ لہٰذا جب بھی کوئی شخص مکہ مکرمہ کی طرف ان میقات کے علاوہ کسی بھی جگہ سے آئے تو لازمی ہے کہ وہ اس خط پر سے گزرے گا جو دوسرے میقات سے ملا رہا ہوگا۔ یہ خط ہی دراصل میقات کے برابر کا خط ہے۔

اس لئے حاجی جب اس خط سے باہر ہوگا وہ آفاق میں ہوگا اس پر احرام واجب نہیں مگر جب اس خط کے پاس سے گزرے گا تو وہ میقات کے محاذ پر ہوگا اس لئے اسے بغیر احرام کے آگے بڑھنا جائز نہیں ہوگا۔ پھر یہ تمام میقات خشکی پر ہیں اور ان کو ملانے والے خطوط بھی خشکی پر ہوں گے لہٰذا جب تک کوئی شخص بحری جہاز کے ذریعے سمندر میں سفر کر رہا ہوگا وہ ان میقات کے برابر نہیں ہوگا۔ یہ صورت تو تبھی ہوگی جب وہ سمندری سفر سے فارغ ہو کر خشکی کے راستہ پر پڑے گا۔ ہماری تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے جو حجاج کرام بذریعہ بحری جہاز حج کرنے کیلئے جاتے ہیں ان پر جدہ تک پہنچنے سے پہلے احرام باندھنا واجب نہیں کیونکہ وہ سمندری سفر میں نہ تو میقات پر سے گزرے ہیں اور نہ ہی کسی میقات کے برابر سے گزرے ہیں۔ ان کا جہاز ابھی یلملم اور اس کے محاذات سے دور آفاق میں ہے جبکہ ان کے اور حدود میقات کے مابین تقریباً ایک سو میل کی مسافت ہے۔ ان کی مثال تو ابھی اس شخص کی سی ہے جو خرمہ سے طائف یا لیث سے طائف جا رہا ہے یا مدینہ طیبہ سے یا خیبر سے ینبع کی طرف ذوالحلیفہ کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ سے جا رہا ہو۔ بلاشبہ میقات اس کے دائیں یا بائیں جانب آئے گا لیکن ابھی وہ میقات کے برابر نہیں آیا کیونکہ ابھی وہ حدود میقات کے پیچھے ہے۔ اسی طرح بحری جہاز پر سفر کرنے والا جب تک سمندر میں رہے گا وہ حدود میقات کے پیچھے ہوگا اس کے برابر قطعاً نہیں ہوگا تا آنکہ جدہ پر جا کر نہ اترے کیونکہ جو خط یلملم اور جحفہ کو ملاتا ہے وہ سمندر کے قریب جدہ سے کچھ آگے مکہ مکرمہ کی جانب پڑتا ہے۔

٢ - بَابُ وُجُوهِ الإِحْرَامِ وَصِفَتُهُ احرام کی اقسام اور صفت کا بیان

(٥٩٢) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ وَعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، وَأَهَلَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالْحَجِّ، فَأَمَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ عِنْدَ قُدُومِهِ، وَأَمَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، أَوْ جَمَعَ بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَلَمْ يَحِلُّوا حَتَّى كَانَ يَوْمُ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے سال نکلے، ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے حج اور عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے حج کیلئے لبیک پکارا اور رسول اللہ ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ پکارا۔ پھر جنہوں نے عمرہ کیلئے لبیک کہا تھا وہ حلال ہوگئے اور جنہوں نے حج کیلئے لبیک کہا یا حج اور عمرہ کو جمع کیا تھا وہ حلال نہ ہوئے یہاں تک کہ قربانی کا دن ہوا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب وجوہ الاحرام و صفتہ﴾ الوجوہ وجہ کی جمع ہے۔ اور اس سے اقسام احرام

مراد ہیں۔ اور وہ حج یا عمرہ یا دونوں ہیں اور صفتہ' سے مراد محرم کی وہ کیفیت ہے جسے وہ حالت احرام میں اختیار کرتا ہے۔ ﴿ خرجنا ﴾ ہم نکلے۔ حج کیلئے نبی کریم ﷺ کی معیت میں نکلنا ہفتہ کے روز نماز ظہر کے بعد تھا جبکہ ذی القعدہ کے پانچ دن ابھی باقی تھے۔ ﴿ حجۃ الوداع ﴾ حجۃ الوداع دس ہجری میں ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے بعد اس کے علاوہ اور کوئی حج نہیں کیا اور اسے حجۃ الوداع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں آپؐ نے لوگوں کو الوداع کہا تھا۔ ﴿ اھل بعمرۃ ﴾ یعنی صرف عمرہ کا احرام باندھا ایسے شخص کو متمتع کہتے ہیں۔ ﴿ اھل بحج و عمرۃ ﴾ حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا۔ ایسے شخص کو ''قارن'' کہتے ہیں اور جس نے صرف حج کیلئے احرام باندھا ہو اسے ﴿ مفرد ﴾ کہتے ہیں اور ﴿ الاھلال ﴾ بلند آواز کو کہتے ہیں اور اس سے مراد احرام باندھنے کے بعد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے۔ ﴿ فحل ﴾ یعنی وہ حلال ہوگیا اور یہ تب ہوتا ہے جب بیت اللہ کے طواف اور صفا و مروہ کے مابین سعی کرنے کے بعد سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں یا کٹوائے جاتے ہیں اور احرام کھول دیا جاتا ہے۔ ﴿ یوم النحر ﴾ نحر یعنی قربانی کا دن اور وہ دس ذی الحجہ ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے تنہا حج کا احرام باندھا تھا یعنی حج مفرد کیا تھا لیکن دوسرے بہت سے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ قارن تھے اور حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا تھا اور یہی بات صحیح ہے اور اقسام حج میں یہی قسم سب سے افضل ہے جس کی تفصیل دو بڑی بڑی شروح احادیث میں موجود ہے اور جو شخص ''مفرد'' ہوتا ہے تو وہ صرف قربانی کے دن ہی حلال ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم کی ان روایات کے بھی مخالف ہے جن میں آپؐ نے جن صحابہ کرامؓ کے پاس ھدی یعنی قربانی نہ تھی انہیں فرمایا تھا کہ تم حج کو عمرہ بنالو۔ عمرہ کو مکمل کر کے حج کا احرام مکہ سے باندھ لو۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت دراصل ان صحابہ کرامؓ کے متعلق ہے جن کے پاس قربانی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج کی تین قسمیں ہیں۔ حج قران' حج تمتع' حج افراد۔ ان تینوں میں سے افضل کونسا حج ہے؟ عموماً اہل حدیث اور احناف حج قران کو افضل قرار دیتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کیلئے یہی حج پسند کیا۔ اس میں مشقت بھی زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں اس پر نفیس بحث کی ہے۔ مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حج تمتع کو افضل کہتے ہیں کہ اس میں سہولت ہے اور آنحضرت ﷺ نے ایک مرحلہ پر اس کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے اور بعض حضرات حج افرا کو افضل قرار دیتے ہیں مگر پہلا قول ہی دلائل کے اعتبار سے بوجوہ راجح ہے۔

٤ - بَابُ الإِحْرَامِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ. احرام اور اس کے متعلقہ امور کا بیان

(٥٩٣) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا أَهَلَّ رَسُولُ اللہ ﷺ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں لبیک پکارا مگر صرف مسجد کے

اللهِ ﷺ إِلاَّ مِنْ عِنْدِ الْمَسْجِدِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ پاس۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الاحرام ﴾ احرام کا باب' یہ حج یا عمرہ میں داخل ہونے کا نام ہے۔ "احرام" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو جانے والے پر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو اس سے پہلے حلال تھیں۔ ﴿ الا من عند المسجد ﴾ مگر صرف مسجد کے پاس۔

حاصل کلام: مسجد سے مسجد ذوالحلیفہ مراد ہے۔ جس وقت آپ اپنی اونٹنی پر سیدھے کھڑے ہوئے تھے یہ بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان حضرات کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کہی ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے "بیداء" کے مقام سے احرام باندھا تھا۔ احادیث میں منقول ہے کہ آپ نے تین بار لبیک پکارا تھا۔ جب آپ نے دو رکعات پڑھ لی تھیں۔ یعنی آپ مسجد کے اندر ہی تھے کہ آپ نے لبیک کہا اور یہ بھی منقول ہے کہ جب آپ "بیداء" کی چوٹی پر چڑھے تو آپ نے لبیک کہا۔ یہ احادیث بظاہر آپس میں متعارض ہیں مگر ان میں یوں تطبیق دی گئی ہے کہ آپ نے احرام تو مسجد کے اندر ہی باندھا اور جنہوں نے وہاں آپ کے احرام کا مشاہدہ کیا انہوں نے اسی کا ذکر کیا اور جب آپ مسجد سے باہر تشریف لائے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر باواز بلند لبیک کہا تو باہر دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اب آپ نے احرام باندھا ہے۔ پھر جب بیداء پر پہنچے اور لبیک کہا تو جن حضرات نے وہاں لبیک کہتے سنا تو انہوں نے سمجھا کہ آپ نے یہاں سے احرام باندھا ہے گویا ہر فریق نے اپنے مشاہدہ کے مطابق خبر دی۔ اس لئے ان روایات میں کوئی تناقض نہیں۔

(٥٩٤) وَعَنْ خَلاَّدِ بْنِ السَّائِبِ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَتَانِي جِبْرِيلُ، فَأَمَرَنِي أَنْ آمُرَ أَصْحَابِي، أَنْ يَرْفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ بِالإِهْلاَلِ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

خلاد بن سائب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے صحابہ کو حکم دوں کہ لبیک کہتے ہوئے اپنی آوازوں کو بلند کریں۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اور امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ بلند آواز سے لبیک کہنی چاہئے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ صحابہ کرام اس قدر اونچی آواز سے تلبیہ کہتے کہ ان کا گلا بیٹھ جاتا۔ جمہور علماء کرام کی یہی رائے ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے تلبیہ صرف مسجد منیٰ اور مسجد حرام کے پاس کہنا چاہئے۔ (السبل)

راوی حدیث: ﴿ خلاد ﴾ کی خاء پر زبر اور لام مشدد۔ یہ خلاد بن سائب بن خلاد بن سوید انصاری خزرجی ہیں۔ ثقہ تابعی ہیں جنہوں نے انہیں صحابی کہا انہیں وہم ہوا۔

﴿ ابیہ ﴾ ان کے والد سائب رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ابو سلمہ ہے۔ اور وہ بدر میں شہید

ہوئے۔ خلاد عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں یمن کے گورنر بنے۔ بعض نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں یمن کا عامل مقرر کیا اور ا۷ھ میں فوت ہوئے۔

(۵۹۵) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَجَرَّدَ لِإِهْلَالِهِ، وَاغْتَسَلَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے احرام باندھنے کے وقت کپڑے اتارے اور غسل کیا۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے)

حاصل کلام: امام ترمذی رحمہ اللہ نے گو اس حدیث کو حسن کہا ہے مگر امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اس لئے احرام کے وقت غسل کرنا مسنون ہے۔

(۵۹۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ سُئِلَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ؟ قَالَ: «لاَ يَلْبَسُ الْقَمِيصَ، وَلاَ الْعَمَائِمَ، وَلاَ السَّرَاوِيلاَتِ، وَلاَ الْبَرَانِسَ، وَلاَ الْخِفَافَ، إِلاَّ أَحَدٌ لاَ يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ، وَلاَ تَلْبَسُوا شَيْئاً مِنَ الثِّيَابِ مَسَّهُ الزَّعْفَرَانُ، وَلاَ الْوَرْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: احرام باندھنے والا کیا لباس پہنے؟ آپ ؐ نے فرمایا ”وہ قمیص‘ پگڑی‘ شلوار و پاجامہ‘ کنٹوپ اور موزے نہ پہنے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس جوتے نہیں تو وہ موزے پہن لے اور اسے چاہئے کہ دونوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے اور ایسا کوئی کپڑا نہ پہنے جسے زعفران اور کیسو (ایک زرد رنگ کی خوشبو دار بوٹی) لگا ہوا ہو۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿العمائم﴾ یہ عمامہ کی جمع ہے جو سر پر لپیٹا جاتا ہے اور ﴿السراویل﴾ چادر کی جگہ ٹانگوں میں پہنی جاتی ہے۔ جس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ﴿البرانس﴾ یہ برنس کی جمع ہے باء اور نون پر ضمہ اور راء ساکن ہے۔ یہ ہر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ ٹوپی وغیرہ پر مشتمل ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لمبی ٹوپی ہے جو ابتدائے اسلام میں حج کرنے والے پہنتے تھے۔ ﴿الخفاف﴾ خاء کے نیچے زیر۔ خف کی جمع ہے یعنی موزے۔ ﴿من الكعبين﴾ کہ انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے تاکہ وہ جوتے کے حکم میں ہو جائیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ احرام کے دوران ٹخنے ننگے رہیں اور ”کعب“ سے مراد وہ ابھری ہوئی دو ہڈیاں ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ کے قریب دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ ﴿الورس﴾ واؤ پر زبر اور راء ساکن زرد رنگ کی خوشبودار گھاس جس میں کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ زعفران اور ورس کے رنگ سے رنگے ہوئے لباس کی ممانعت اس لئے ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے کیلئے قمیص' پاجامہ' شلوار' ٹوپی اور موزے پہننا درست نہیں۔ جوتا اگر میسر نہ ہو اور صرف موزے ہوں تو انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لینے کا حکم ہے۔ فقہاء کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ موزے پہننے کو جائز قرار دیتے ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں موزوں کو کاٹنے کا حکم منسوخ ہے کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ابتداء احرام کے وقت تھی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں کاٹنے کا حکم نہیں اور یہ حکم آپؐ نے عرفات میں بیان فرمایا تھا۔ اس لئے کاٹنے کا حکم منسوخ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کاٹنے کا حکم اس حدیث سے واجب نہیں رہا۔ مگر جمہور علماء کاٹنے کے قائل ہیں اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مطلق روایت کو مقید پر محمول کرتے ہیں۔ امام ابن قدامہ (صاحب المغنی) نے کہا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ حدیث پر عمل کرتے ہوئے موزوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لیا جائے تاکہ اختلاف سے بچ نکلے۔ اسی طرح شلوار کے بارے میں بھی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر شوافع اس کو چادر نہ ہونے کی صورت میں مطلقاً پہننے کے قائل ہیں اور ان کا استدلال بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کے قطعاً قائل نہیں۔ البتہ امام محمد بن حسن شیبانی اور بعض شوافع کا کہنا ہے کہ اگر چادر میسر نہ ہو تو شلوار کو پھاڑ کر چادر نما بنا کر پہننا جائز ہے۔ مگر ان کا یہ قول محض قیاس پر مبنی ہے جس پر کوئی نص نہیں۔ اس لئے شلوار کے بارے میں صحیح موقف امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہی کا معلوم ہوتا ہے کہ چادر نہ ہونے کی بنا پر احرام میں شلوار پہننا جائز ہے۔ نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زعفران اور ورس سے رنگا ہوا لباس بھی احرام میں جائز نہیں۔ یہ ممانعت رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ خوشبو کی وجہ سے ہے کیونکہ احرام کے بعد خوشبو لگانا بالاتفاق حرام ہے۔ البتہ اگر اسے دھو کر اس کی خوشبو زائل کر دی جائے تب جائز ہے۔

(۵۹۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَطَيِّبُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ، وَلِحِلِّهِ قَبْلَ أَنْ يَطُوفَ بِالْبَيْتِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے میں رسول اللہ ﷺ کو احرام کے وقت اور احرام کھولنے کے وقت خوشبو لگاتی تھی۔ اس سے پہلے کہ آپؐ بیت اللہ کا طواف کریں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اطیب﴾ یہ تطییب سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے کہ اس میں خوشبو لگاتی تھی۔ ﴿لاحرامہ﴾ یعنی احرام پہننے سے پہلے۔ اس سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگانا جائز ہے گو اس کی خوشبو حالت احرام میں بھی آتی رہے مگر احرام کی حالت میں خوشبو لگانا حرام ہے۔ ﴿قبل ان یطوف بالبیت﴾ بیت اللہ کے طواف سے پہلے' اس سے مراد طواف زیارت ہے جو دس ذی الحجہ کو رمی جمار' قربانی اور حلق یعنی سر منڈوانے کے بعد کیا جاتا ہے۔

(۵۹۸) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلاَ يُنْكِحُ، وَلاَ يَخْطُبُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "احرام والا نکاح نہ کرے اور نہ نکاح دے اور نہ منگنی کرے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا ینکح المحرم﴾ یعنی خود نکاح نہ کرے ﴿ولا ینکح﴾ یہ پہلے نکاح سے ہے یعنی نہ کسی دوسرے کو نکاح دے۔ ﴿ولا یخطب﴾ یہ خطبہ خاء کی زیر سے ہے یعنی نہ منگنی کرے۔ نکاح کیلئے کسی عورت کا مطالبہ نہ کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام کی حالت میں خود نکاح کرنا یا کسی کو نکاح دینا کسی کو اپنے لئے یا کسی اور کیلئے شادی کا پیغام دینا ناجائز ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو یہ مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا تو یہ محض وہم ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۵۹۹) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ صَيْدِهِ الْحِمَارَ الْوَحْشِيَّ وَهُوَ غَيْرُ مُحْرِمٍ - قَالَ: فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لأَصْحَابِهِ - وَكَانُوا مُحْرِمِينَ -: هَلْ مِنْكُمْ أَحَدٌ أَمَرَهُ، أَوْ أَشَارَ إِلَيْهِ بِشَيْءٍ؟ قَالُوا: لاَ، قَالَ: «فَكُلُوا مَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے ان کے جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصے میں جبکہ انہوں نے احرام نہیں باندھا تھا' مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا اور وہ احرام والے تھے "کیا تم میں سے کسی نے اسے حکم دیا تھا یا اس کی طرف کسی چیز سے اشارہ کیا تھا؟" انہوں نے کہا نہیں' آپ نے فرمایا "پس کھاؤ اس کے گوشت سے جو بچ گیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی قصة الحمار الوحشی﴾ جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصہ میں' اس قصہ کی تفصیل یہ ہے کہ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کہیں نکلے تھے مگر اپنے چند ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے احرام نہیں باندھا تھا مگر ان کے ساتھی احرام کی حالت میں تھے۔ انہوں نے جب وحشی گدھا دیکھا تو اسے نظرانداز کر دیا مگر جب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوگئے اور ساتھیوں سے کہا کہ میری لاٹھی پکڑاؤ مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر ابو قتادہ رضی اللہ عنہ اس پر حملہ آور ہوئے اور اسے زخمی کر دیا۔ ذبح کر کے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا گوشت کھایا اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھایا مگر پھر وہ پریشان ہوگئے۔ بالآخر جب وہ آنحضرت ﷺ سے جا ملے تو آپ نے یہ سارا ماجرہ عرض کیا جس کا جواب اس روایت میں مذکور ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنگلی جانور کا شکار جب غیر محرم کرے اور محرم نے اس سلسلے میں اس سے کوئی اعانت نہ کی ہو اور نہ ہی

اس بارے میں کوئی اشارہ کیا ہو تو محرم بھی اس سے کھا سکتا ہے مگر اس بارے میں مزید تفصیل ہے جو آئندہ حدیث کے تحت آرہی ہے۔

(٦٠٠) وَعَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ أَهْدَى لِرَسُولِ اللهِ ﷺ حِمَاراً وَحْشِياً، وَهُوَ بِالأَبْوَاءِ أَوْ بِوَدَّانَ، فَرَدَّهُ عَلَيْهِ، وَقَالَ: «إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكَ إِلاَّ أَنَّا حُرُمٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک وحشی گدھا بطور تحفہ بھیجا اور آپؐ "ابواء" یا "ودان" مقام پر تھے تو آپؐ نے وہ انہیں واپس کر دیا اور فرمایا کہ "ہم نے یہ اس لئے واپس کیا کہ ہم احرام والے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حمارا وحشیا﴾ یعنی وحشی گدھے کا ایک ٹکڑا۔ کیونکہ صحیح مسلم میں اس کے گوشت اور گوشت کا کچھ حصہ کے الفاظ بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو مسلم باب تحریم الصید للمحرم ﴿بالابواء﴾ الف پر زبر اور باء ساکن ہے۔ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے مابین ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے پاس ایک بستی آباد ہے اور وہ بستی بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ آنحضرت ﷺ کی والدہ کا انتقال اسی جگہ پر ہوا اس کے اور جحفہ کے مابین بیس یا تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿ودان﴾ واؤ پر زبر اور دال مشدد ہے۔ یہ ابواء کے قریب جگہ کا نام ہے۔ ﴿حرم﴾ حاء اور راء دونوں پر پیش ہے۔ یعنی ہم محرم ہیں۔ یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کیلئے شکار کا گوشت حرام ہے گو اس کی اجازت یا اشارہ وغیرہ سے شکار نہ کیا گیا ہو مگر پہلی حدیث میں اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ دی گئی ہے کہ شکار جب محرم کیلئے کیا گیا ہو تو اس کا کھانا بھی محرم کیلئے حرام ہے گو اس نے اس کا اشارہ وغیرہ بھی نہ کیا ہو کیونکہ مسند امام احمد اور ابن ماجہ میں سند جید کے ساتھ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ہی کی حدیث میں مروی ہے کہ جب میں نے آپؐ نے عرض کیا کہ جناب یہ شکار میں نے آپؐ کیلئے کیا ہے تو آپؐ نے اس میں سے کچھ بھی تناول نہ فرمایا۔ اسی طرح ترمذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "حالت احرام میں زمین کا شکار تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ تم نے اسے شکار نہ کیا ہو یا تمہارے لئے وہ شکار نہ کیا گیا ہو۔" جس سے معلوم ہوا کہ شکار جب محرم کے حکم سے یا اس کے اشارہ وغیرہ سے کیا گیا ہو یا شکار محرم کی ضیافت کیلئے کیا گیا ہو تو اس کیلئے اس کا کھانا ناجائز ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو محرم شکار کا گوشت کھا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿صعب رضی اللہ عنہ﴾ کی صاد پر زبر اور عین ساکن۔ بن ﴿جثامہ﴾ جیم پر زبر اور "ثا" مشدد، اللیثی لیث قبیلہ سے تھے۔ ودان اور الابواء میں رہتے تھے۔ خلافت صدیقی میں ان کا انتقال ہوا مگر بعض کا قول ہے کہ خلافت عثمانؓ تک زندہ رہے۔

(٦٠١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ كُلُّهُنَّ فَوَاسِقُ، يُقْتَلْنَ فِي الحِلِّ وَالحَرَمِ: العَقْرَبُ، وَالحِدَأَةُ، وَالغُرَابُ، وَالفَأْرَةُ، وَالكَلْبُ العَقُورُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ﷺ نے فرمایا "جانوروں میں سے پانچ سب کے سب شریر ہیں۔ حل اور حرم (سب جگہوں پر) مار دیئے جائیں اور وہ ہیں بچھو، چیل، کوا، چوہا اور کاٹ کھانے والا کتا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الدواب ﴾ باء پر شد ہے اور دابۃ کی جمع ہے۔ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتا ہے پھر عموماً اس کا استعمال چوپائے جانوروں پر ہونے لگا۔ ﴿ فواسق ﴾ فاسقۃ کی جمع اور ان کا فسق اور شر ان کی خباثت اور کثرت نقصان کی بنا پر ہے۔ ﴿ الحداۃ ﴾ حاء کی کسرہ کے ساتھ "عنبۃ" کے وزن پر وہ خبیث جانور جسے چیل کہتے ہیں۔ ﴿ العقرب ﴾ یعنی بچھو اور اس میں سانپ بالاولیٰ شامل ہے۔ ﴿ والکلب العقور ﴾ عین پر زبر ﴿ عقر ﴾ سے ہے جس کے معنی قتل کرنا اور زخمی کرنا ہیں اور اس سے مراد ہر چیرنے پھاڑنے والا درندہ مراد ہے۔ جیسے شیر، چیتا بھیڑیا وغیرہ۔

(٦٠٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک نبی ﷺ نے سینگی لگوائی جب کہ آپؐ احرام کی حالت میں تھے۔ (بخاری و مسلم)

(٦٠٣) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: حُمِلْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَالقَمْلُ يَتَنَاثَرُ عَلَى وَجْهِي، فَقَالَ: «مَا كُنْتُ أُرَى الوَجَعَ بَلَغَ بِكَ مَا أَرَى، أَتَجِدُ شَاةً؟» قُلْتُ: لَا، قَالَ: «فَصُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، أَوْ أَطْعِمْ سِتَّةَ مَسَاكِينَ، لِكُلِّ مِسْكِينٍ نِصْفُ صَاعٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس اٹھا کر لایا گیا اور جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "میرا یہ خیال نہ تھا کہ تم کو بیماری نے اس حالت کو پہنچا دیا ہو گا جو میں دیکھ رہا ہوں، کیا تیرے پاس بکری ہے؟" میں نے عرض کیا کہ: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "تین دن روزہ رکھ یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع ہر مسکین کے حساب سے کھانا دے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ حملت ﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی مجھے اٹھا کر لایا گیا۔ ﴿ القمل ﴾ قاف پر زبر اور میم ساکن جنہیں جوئیں کہتے ہیں۔ ﴿ یتناثر ﴾ یعنی کثرت کی وجہ سے وہ سر سے میرے منہ پر گر رہی تھیں اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ انہیں مارتے نہیں تھے کیونکہ وہ محرم تھے۔ "ما کنت اری" اری کے ھمزہ پر پیش صیغہ مجہول کی وجہ سے یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا۔ ﴿ الوجع ﴾ یعنی تکلیف ﴿ ما اری ﴾ ھمزہ پر زبر۔ دیکھنے کے معنی میں۔ یعنی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ﴿ اتجد شاۃ ﴾ یعنی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ نے انہیں سر منڈوانے کا حکم دیا اور اس کے کفارہ کے طور پر ایک بکری ذبح کرنے یا تین دن کا روزہ رکھنے

کا یا چھ مساکین کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ﴾ عجرہ کے عین پر پیش اور جیم ساکن' یہ جلیل القدر صحابی قبیلہ "البلی" سے تعلق رکھتے تھے جو انصار کا حلیف تھا۔ کوفہ چلے گئے تھے بالآخر مدینہ طیبہ میں ۵۱ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(٦٠٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مَكَّةَ، قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي النَّاسِ، فَحَمِدَ اللَّهَ، وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الفِيلَ، وَسَلَّطَ عَلَيْهَا رَسُولَهُ وَالمُؤْمِنِينَ، وَإِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ كَانَ قَبْلِي، وَإِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، وَإِنَّهَا لَنْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِي، فَلاَ يُنَفَّرُ صَيْدُهَا، وَلاَ يُخْتَلَى شَوْكُهَا، وَلاَ يَحِلُّ سَاقِطَتُهَا إِلاَّ لِمُنْشِدٍ. وَمَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ»، فَقَالَ العَبَّاسُ: إِلاَّ الإِذْخِرَ، يَا رَسُولَ اللهِ! فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي قُبُورِنَا وَبُيُوتِنَا، فَقَالَ: «إِلاَّ الإِذْخِرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مکہ کی فتح دی تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے پھر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں کو مکہ سے روک دیا مگر اپنے رسول (ﷺ) اور مومنوں کو اس پر غلبہ عطا فرمایا اور تحقیق مجھ سے پہلے مکہ کسی پر حلال نہ تھا مگر میرے لئے دن کی ایک گھڑی حلال کر دیا گیا ہے اور یقیناً میرے بعد یہ کسی کیلئے حلال نہیں ہو گا یعنی نہ اس کا شکار بھگایا جائے' نہ اس کا کوئی کانٹے دار درخت کاٹا جائے اور نہ ہی اس کی گری ہوئی چیز سوائے شناخت کرنے والے کے کسی پر حلال ہے اور جس کا کوئی آدمی مارا جائے وہ دو بہتر سوچے ہوئے کاموں میں سے ایک کام میں اختیار رکھتا ہے۔" تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! اذخر (ایک قسم کی گھاس) کے سوا' کیونکہ اسے ہم اپنی قبروں اور چھتوں میں رکھتے ہیں۔ تو آپ ؐ نے فرمایا "سوائے اذخر کے' (یعنی اسے کاٹنے کی اجازت ہے۔)" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حبس﴾ یعنی روکا اور منع کیا۔ ﴿الفیل﴾ ہاتھی جسے ابرہہ اور اس کا لشکر بیت اللہ کو گرانے کیلئے لے کر آیا تھا۔ جس کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ "وسلط" یہ تسلیط سے ہے یعنی غلبہ کے معنی میں ﴿ساعۃ من نھار﴾ دن کی ایک گھڑی اور اس سے بیت اللہ میں داخل ہونے سے عصر تک کا وقت مراد ہے۔ ﴿لاینفر﴾ صیغہ مجہول تنفیر سے ہے یعنی بھگایا نہ جائے ﴿ولا یختلی﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے یعنی نہ کاٹا جائے۔ ﴿ساقطتھا﴾ یعنی اس کی گری پڑی چیز۔ ﴿الالمنشد﴾ یہ انشاد

سے ہے یعنی اس کی گری پڑی چیز کھانے یا قبضہ کرنے کی نیت سے نہ اٹھائی جائے البتہ اس کو اس نیت سے اٹھانا جائز ہے کہ اسے لوگوں میں متعارف کرایا جائے تاآنکہ اس کا مالک مل جائے اور وہ اسے حاصل کرے۔ ﴿ قتيل ﴾ يعنى مقتول۔ ﴿ فهو ﴾ یعنی مقتول کا ولی۔ ﴿ بخير النظرين ﴾ یعنی ولی کو دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق ہے' چاہے تو قصاص لے یا دیت وصول کرے۔ ﴿ الا الاذخر ﴾ یعنی آپؐ یہ فرمائیں "الا الاذخر" اذخر کے سوا کہ اس کو کاٹنے کی اجازت ہے۔ اذخر کے ھمزہ اور خاء کے نیچے زیر ہے اور ذال ساکن۔ یہ لمبے پتوں والی خوشبو دار گھاس ہے جسے گھروں کی چھتوں میں لکڑیوں کے اوپر رکھا جاتا تھا اور قبروں کو بند کرنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا۔ مکہ مکرمہ کی حرمت کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں بسنے والوں کو قتل کرنا حرام ہے جو اس میں داخل ہوگیا اسے گویا امن مل گیا۔ اس کا شکار اور اس کے درخت اور جڑی بوٹی کاٹنا حرام ہیں۔ اس میں گری پڑی چیز اپنے استعمال کیلئے اٹھانی حرام ہے۔

(٦٠٥) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ، وَدَعَا لِأَهْلِهَا، وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ، كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ؛ وَإِنِّي دَعَوْتُ فِي صَاعِهَا وَمُدِّهَا بِمِثْلِ مَا دَعَا بِهِ إِبْرَاهِيمُ لِأَهْلِ مَكَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تحقیق ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی اور اس کے بسنے والوں کیلئے دعا کی اور بے شک میں نے مدینہ کو حرمت دی۔ جس طرح ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام قرار دیا اور یقیناً میں نے مدینہ کے صاع اور اس کے مد کے متعلق ابراھیم علیہ السلام کی طرح دعا کی جو مکہ میں بسنے والوں کے متعلق تھی۔"

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ حرم مكة ﴾ یہ تحریم سے ہے یعنی اس کو حرم بنایا اور مدینہ طیبہ کی تحریم کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا شکار حرام ہے۔ اس کے درخت کاٹنے حرام ہیں اور وہاں بدعات کا ارتکاب حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ طیبہ بھی حرم ہے اور ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی کا مفہوم یہ ہے کہ دعا سے اسے حرمت دی گئی کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ ان الله حرم مكة کہ اللہ نے مکہ کو حرام قرار دیا ہے۔

(٦٠٦) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْمَدِينَةُ حَرَامٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلَى ثَوْرٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مدینہ حرم ہے عیر سے ثور کے درمیان۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ عير ﴾ عین کے نیچے زیر اور یاء ساکن۔ یہ مدینہ طیبہ کے جنوب میں پہاڑ کا نام ہے جس

کے جنوب مغرب میں قباء واقع ہے ﴿ ثور ﴾ ثاء پر زبر' واؤ ساکن' یہ چھوٹا سا گول پہاڑ ہے جو مدینہ طیبہ کے شمال میں جبل احد کے پیچھے واقع ہے۔ ایک روایت میں ہے "مابین عیر و احد" کہ عیر اور احد کے درمیان یعنی ثور کی جگہ جبل احد کا ذکر ہے مگر دونوں میں کوئی جوہری فرق نہیں۔ احد اور ثور قریب قریب ہیں۔ جبل ثور مکہ مکرمہ میں بھی ہے۔ اس میں ہجرت کے موقعہ پر آپؐ چھپے تھے اور اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ہے "اذهما فی الغار" یہاں سے یہ جبل ثور نہیں بلکہ مدینہ طیبہ کا جبل ثور مراد ہے۔ اس حدیث سے شمالاً جنوباً حرم مدینہ کی تحدید معلوم ہوتی ہے۔ شرقاً غرباً اس کی تحدید کے متعلق مروی ہے کہ "انها حرام مابین لابتيها" کہ دو حروں کے درمیان جو کچھ ہے حرام ہے اور اس سے مراد ایک "حرۂ و برہ" ہے جو مدینہ طیبہ کے مغرب میں ہے اور دوسرا حرۂ واقم جو مدینہ طیبہ کے مشرق میں ہے یوں چاروں سمت حرم مدینہ کی تحدید واضح ہو جاتی ہے۔

٥ - بَابُ صِفَةِ الحَجّ وَدُخُول مَكّة — حج کا طریقہ اور مکہ میں داخل ہونے کا بیان

(٦٠٧) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ حَجَّ، فَخَرَجْنَا مَعَهُ، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا ذَا الحُلَيْفَةِ فَوَلَدَتْ أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ، فَقَالَ: «اغْتَسِلِي، وَاسْتَثْفِرِي بِثَوْبٍ، وَأَحْرِمِي»، وَصَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي المَسْجِدِ، ثُمَّ رَكِبَ القَصْوَاءَ، حَتَّى إِذَا اسْتَوَتْ بِهِ عَلَى البَيْدَاءِ، أَهَلَّ بِالتَّوْحِيدِ: **«لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لاَ شَرِيكَ لَكَ، لَبَّيْكَ، إِنَّ الحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالمُلْكَ، لاَ شَرِيكَ لَكَ»**، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا البَيْتَ اسْتَلَمَ الرُّكْنَ، فَرَمَلَ ثَلاَثاً، وَمَشَى أَرْبَعاً، ثُمَّ أَتَى مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ فَصَلَّى، ثُمَّ رَجَعَ إِلَى

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا تو ہم آپؐ کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ ہم ذوالحلیفہ پہنچے تو اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے بچہ جنا۔ آپؐ نے فرمایا "غسل کر اور کسی کپڑے سے لنگوٹ باندھ لے اور احرام باندھ لے۔" رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی اور قصواء (آپؐ کی اونٹنی کا نام) پر سوار ہو گئے یہاں تک کہ جب آپؐ بیداء کے برابر آئے تو آپؐ نے توحیدی تلبیہ پکارا "حاضر ہوں' اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں' بلاشک سب تعریفیں اور انعامات تیرے ہیں۔ بادشاہت بھی تیری ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔" یہاں تک کہ ہم بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ رکن (اسود) کو آپؐ نے بوسہ دیا' تین بار رمل کیا اور چار بار معمول کے مطابق چلے۔ پھر آپؐ مقام ابراہیم پر

الرُّكْنِ، فَاسْتَلَمَهُ، ثُمَّ خَرَجَ مِنَ الْبَابِ إِلَى الصَّفَا، فَلَمَّا دَنَا مِنَ الصَّفَا، قَرَأَ ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ﴾ «أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ»، فَرَقِيَ الصَّفَا حَتَّى رَأَى الْبَيْتَ، فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَوَحَّدَ اللَّهَ، وَكَبَّرَهُ، وَقَالَ: «**لَا إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَحْدَهُ، لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الأَحْزَابَ وَحْدَهُ**»، ثُمَّ دَعَا بَيْنَ ذٰلِكَ قَالَ مِثْلَ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ نَزَلَ مِنَ الصَّفَا إِلَى الْمَرْوَةِ، حَتَّى إِذَا انْصَبَّتْ قَدَمَاهُ فِي بَطْنِ الْوَادِيْ سَعَى، حَتَّى إِذَا صَعِدَ مَشَى إِلَى الْمَرْوَةِ، فَفَعَلَ عَلَى الْمَرْوَةِ كَمَا فَعَلَ عَلَى الصَّفَا، فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ، وَفِيْهِ: فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى مِنًى، وَرَكِبَ النَّبِيُّ ﷺ، فَصَلَّى بِهَا الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ، ثُمَّ مَكَثَ قَلِيْلاً حَتَّى طَلَعَتِ الشَّمْسُ، فَأَجَازَ حَتَّى أَتَى عَرَفَةَ، فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ، فَنَزَلَ بِهَا، حَتَّى إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ، فَأَتَى بَطْنَ الْوَادِيْ، فَخَطَبَ النَّاسَ، ثُمَّ أَذَّنَ، ثُمَّ أَقَامَ، فَصَلَّى الظُّهْرَ،

آئے اور نماز پڑھی پھر رکن (حجر اسود) کی طرف واپس آئے اور اس کو بوسہ دیا۔ پھر مسجد حرام کے دروازہ سے صفا کی طرف نکلے جب صفا کے نزدیک پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔ "تحقیق صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔" (پھر فرمایا) "میں شروع کرتا ہوں (سعی کو) اس مقام سے کہ جہاں سے اللہ نے شروع کیا ہے۔" پھر صفا پر چڑھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے بیت اللہ کو دیکھا۔ پھر قبلہ رخ ہوئے اور اللہ کی وحدانیت اور کبریائی بیان کی اور کہا" اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ بادشاہی اور سب خوبیاں اسی کی ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور کفار کی جماعت کو اکیلے اسی نے شکست دی۔" پھر اس کے درمیان تین بار دعا کی۔ پھر صفا سے اترے اور مروہ کی طرف گئے۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کے دونوں پاؤں وادی کے نشیب میں پڑے تو دوڑے یہاں تک کہ آپؐ نشیب سے اوپر چڑھے اور مروہ کی طرف چلے۔ مروہ پر وہی کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا۔ پھر جابر رضی اللہ عنہ نے ساری حدیث بیان کی جس میں یہ ہے کہ جب ترویہ کا دن (۸ ذی الحج) ہوا تو لوگ منیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور نبی ﷺ سوار تھے پھر وہاں ظہر' عصر' مغرب' عشاء اور صبح کی نماز پڑھی۔ پھر تھوڑی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ سورج نکل آیا تو وہاں سے روانہ ہوئے اور مزدلفہ سے گزرتے ہوئے عرفات میں پہنچے تو خیمہ میں اترے جو آپؐ

ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى العَصْرَ، وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى المَوقِفَ، فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ القَصْوَاءِ إِلَى الصَّخَرَاتِ، وَجَعَلَ جَبَلَ المُشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيْلاً، حَتَّى إِذَا غَابَ القُرْصُ دَفَعَ، وَقَدْ شَنَقَ لِلْقَصْوَاءِ الزِّمَامَ، حَتَّى إِنَّ رَأْسَهَا لَيُصِيْبَ مَورِكَ رَحْلِهِ، وَيَقُولُ بِيَدِهِ اليُمْنَى: «**يَا أَيُّهَا النَّاسُ! اَلسَّكِيْنَةَ، اَلسَّكِيْنَةَ**»، وَكُلَّمَا أَتَى جَبَلاً أَرْخَى لَهَا قَلِيْلاً حَتَّى تَصْعَدَ، حَتَّى أَتَى المُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا المَغْرِبَ وَالعِشَاءَ، بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ، وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتَّى طَلَعَ الفَجْرُ، فَصَلَّى الفَجْرَ حِيْنَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ، بِأَذَانٍ وَإِقَامَةٍ، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى المَشْعَرَ الحَرَامَ، فَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَدَعَا، وَكَبَّرَ، وَهَلَّلَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى أَسْفَرَ جِدًّا، فَدَفَعَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، حَتَّى أَتَى بَطْنَ مُحَسِّرٍ، فَحَرَّكَ قَلِيْلاً، ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيْقَ الوُسْطَى الَّتِيْ تَخْرُجُ عَلَى الجَمْرَةِ الكُبْرَى، حَتَّى أَتَى الجَمْرَةَ الَّتِي

کیلئے نمرہ میں لگایا گیا تھا۔ پھر جب سورج ڈھلنے لگا تو آپؐ نے قصواء پر پالان رکھنے کا حکم دیا۔ آپؐ سوار ہو کر وادی کے درمیان میں آئے اور لوگوں کو خطبہ دیا پھر اذان دلوائی پھر اقامت کہلوائی تو نماز ظہر ادا کی پھر اقامت کہلوائی تو عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی۔ پھر سوار ہو کر ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی اونٹنی قصواء کا پیٹ پتھروں کی طرف کر دیا اور راہ چلنے والوں کو اپنے سامنے کر لیا اور اپنا رخ قبلہ کی جانب کر لیا۔ پھر آپؐ اس وقت تک ٹھہرے رہے کہ سورج غروب ہونے لگا اور تھوڑی سی زردی ختم ہو گئی حتیٰ کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا پھر آپؐ اسی حالت میں واپس ہوئے۔ آپؐ نے قصواء کی باگ اتنی تنگ کر رکھی تھی کہ اس کا سر آپؐ کے پالان کے اگلے ابھرے ہوئے حصے کو پہنچتا تھا اور آپؐ اپنے داہنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے تھے "اے لوگو! تسکین و اطمینان اختیار کرو" اور جب بھی آپؐ کسی ٹیلے پر آتے تو باگ تھوڑی سی ڈھیلی کر دیتے کہ وہ اوپر چڑھ جاتی یہاں تک کہ آپؐ مزدلفہ تشریف لائے اور وہاں ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان کوئی نفلی نماز نہیں پڑھی۔ پھر لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جب صبح کا وقت ظاہر ہوا تو آپؐ نے اذان اور اقامت سے فجر کی نماز پڑھی۔ پھر سوار ہو کر مشعر حرام پر آئے۔ پس آپؐ قبلہ رو ہوئے دعا کی اور تکبیر و تہلیل کہتے رہے۔ آپؐ وہاں اچھی طرح

عِنْدَ الشَّجَرَةِ، فَرَمَاهَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ مِّنْهَا، مِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ، رَمَى مِنْ بَطْنِ الْوَادِيْ، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَنْحَرِ، فَنَحَرَ، ثُمَّ رَكِبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَأَفَاضَ إِلَى الْبَيْتِ، فَصَلَّى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ مُطَوَّلاً.

سفیدی ظاہر ہونے تک ٹھہرے رہے پھر سورج نکلنے سے پہلے واپس ہو کر وادی محسر کے نشیب میں آگئے تو سواری کو کچھ تیز کر دیا۔ پھر درمیانی راستہ پر چلے جو جمرہ کبریٰ (بڑا شیطان) پر پہنچتا ہے پھر آپؐ اس جمرہ پر آئے جو درخت کے پاس ہے تو اسے سات کنکریاں وادی کے نشیب سے ماریں' ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے تھے' ان میں سے ہر کنکری خذف (لوبیے کے دانے) کے برابر تھی۔ پھر آپؐ قربان گاہ کی طرف گئے اور وہاں قربانی کی پھر رسول اللہ ﷺ سوار ہوئے اور بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ (اسے مسلم نے تفصیل سے بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اسماء بنت عمیس ﴾ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ کا نام ہے اور جو بچہ اس وقت پیدا ہوا اس کا نام محمد رضی اللہ عنہ تھا۔ ﴿ واستثفری ﴾ یہ "استثفار" سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں لنگوٹ کسنا اور وہ یوں کہ عورت اپنی کمر سے کوئی چیز یا (رسی یا ازار وغیرہ) بند باندھ لیتی ہے پھر ایک چوڑا کپڑا خون کی جگہ پر رکھ کر اسے آگے پیچھے سے کمر کی رسی کے ساتھ باندھ لیتی ہے۔ ﴿ واحرمی ﴾ احرام باندھ لے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفاس کی حالت میں احرام باندھنا درست ہے۔ ﴿ القصواء ﴾ قاف پر زبر اور صاد ساکن' اس کے اصل معنی تو کان کٹا ہوا' کے ہیں مگر یہاں یہ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کا لقب ہے اس کا کان کٹا ہوا نہ تھا بلکہ آپؐ نے پیار سے اس کا یہ لقب رکھا تھا۔ ﴿ البیداء ﴾ دراصل بیابان جگہ جہاں کوئی چیز نہ ہو۔ اسے "البیداء" کہتے ہیں مگر یہاں ذوالحلیفہ کے قریب مخصوص جگہ کا نام مراد ہے۔ ﴿ اهل ﴾ اہلال سے ماضی کا صیغہ ہے یعنی آپ ﷺ نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ ﴿ بالتوحید ﴾ یعنی تلبیہ میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کا ذکر کیا جبکہ جاہلیت میں مشرکین تلبیہ میں شرکیہ کلمات بھی کہتے تھے۔ ﴿ لبیك ﴾ لبی کا مصدر ہے جب "لبیك" کہے کا تو یہ مصدری معنی میں منصوب ہوگا اور اس کا عامل محذوف ہوگا اور مکرر "لبیك" سے مقصود تکثیر و تاکید ہے۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ کے دربار میں حاضر ہوں۔ یعنی آپ کی اطاعت پر قائم۔ آپ کی اطاعت پر قائم ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ میں نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا' قبول کر لیا۔ اور یہ تلبیہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حج کا جواب ہے۔ ﴿ ان الحمد ﴾ ہمزہ کے نیچے زیر ہے جملہ مستانفہ کی بنا پر مگر تعلیل کی صورت میں اس پر زبر آئے گی۔ ﴿ استلم الرکن ﴾ رکن یعنی حجر اسود

پر ہاتھ رکھا اور اس کا بوسہ لیا۔ ﴿ فرمل ﴾ یعنی اپنے کندھوں کو ہلاتے ہوئے پہلوانوں کی طرح تیز تیز چلے۔ ﴿ ثلاثا ﴾ یعنی سات میں سے تین چکریوں دوڑ کر پورے کئے۔ ﴿ ومشی اربعا ﴾ اور باقی چار حسب عادت چل کر پورے کئے۔ اس طواف کو طواف قدوم کہتے ہیں نیز اسے طواف دخول' طواف ورود بھی کہتے ہیں اور یہ حج کا پہلا طواف ہے۔ ﴿ مقام ابراهیم ﴾ وہ معروف پتھر جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس پر حضرت ابراهیم علیہ السلام کے پاؤں کا نقش ہے۔ حضرت ابراهیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر اسی کے اوپر کھڑے ہو کر کی تھی۔ تعمیر کے وقت جب دیوار اوپر ہوتی تو یہ پتھر بھی خود بخود اوپر ہو جاتا تھا۔ ﴿ فصلی ﴾ پھر دو رکعت طواف کے بعد پڑھیں۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد قل یا ایھا الکفرون اور دوسری میں قل ھو اللہ احد پڑھی۔ ﴿ من الباب ﴾ یعنی الصفا کا معروف دروازہ۔ ﴿ دنا ﴾ قریب ہوئے۔ ﴿ شعائر ﴾ یہ شعیرۃ کی جمع ہے یعنی علامت اور یہاں شعائر سے مراد وہ مناسک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کی علامت قرار دیا ہے۔ صفا اور مروہ بھی انہی شعائر میں سے ہیں جن کے مابین سعی کی جاتی ہے۔ ﴿ ابدا بما بدا الله ﴾ یعنی میں صفا سے شروع کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی صفا کا ذکر پہلے کیا ہے۔ اور مروہ کا بعد میں ﴿ فرقی ﴾ سبل السلام میں ہے کہ قاف پر زبر ہے مگر مختار الصحاح میں ہے کہ اس کے نیچے زیر پڑھی جائے گی۔ یعنی چڑھے ﴿ انجز وعده ﴾ یعنی اپنے رسول اور دین کے بارے میں غلبہ کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔ ﴿ نصر عبده ﴾ اپنے بندے کی مدد کی۔ بندہ سے خود آپؐ کی ذات گرامی مراد ہے۔ ﴿ وهم الاحزاب ﴾ یہ حزب کی جمع ہے اس کے معنی جماعت اور لشکر ہے۔ یعنی ان کے لشکر کو ختم کر دیا اور شکست سے دوچار کیا۔ ﴿ ثم دعا بین ذلك ﴾ یعنی مذکورہ ذکر کے درمیان دعا کی۔ ﴿ ثلاث مرات ﴾ تین مرتبہ اس سے لازم آتا ہے کہ آپؐ نے یہ ذکر تین بار کیا۔ ﴿ حتی اذا انصب ﴾ یہ انصباب سے ہے یعنی وادی میں نیچے اترے۔ ﴿ حتی اذا صعد ﴾ یعنی وادی کے نشیب سے اوپر چڑھے۔ ﴿ فذکر الحدیث ﴾ یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مکمل حدیث ذکر کی' مگر مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں سے بقدر ضرورت ذکر کی۔ ﴿ یوم الترویة ﴾ تاء پر زبر راء ساکن اور واؤ کے نیچے زیر اور یاء مخفف یہ مصدر ہے۔ "ارواء" یعنی پینے کے معنی میں اور "یوم الترویة" ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ ہوتی ہے۔ اسے یوم ترویہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسی دن حجاج میدان عرفات کی ضرورت کیلئے پانی لیتے تھے کیونکہ وہاں ان دنوں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ﴿ توجهوا ﴾ یعنی انہوں نے قصد کیا اور روانہ ہوگئے۔ ﴿ فصلی بها ﴾ یعنی منیٰ میں پہنچنے کے بعد پانچوں نمازیں وقت کے مطابق ادا کیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ایک دن اور ایک رات قیام فرمایا تھا ﴿ ثم مكث قليلا ﴾ یعنی نو ذی الحجہ کی نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر ٹھہرے۔ ﴿ فاجاز ﴾ یعنی پھر چلے اور آگے بڑھے ﴿ حتی اتی عرفة ﴾ یعنی میدان عرفات کے قریب پہنچ گئے۔ ﴿ القبة ﴾ قاف پر پیش' چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں۔ ﴿ بنمرة ﴾ نون پر زبر' میم کے نیچے زیر اور راء پر زبر میدان عرفات سے کچھ پہلے معروف جگہ کا نام ہے جو عرفات کا حصہ نہیں۔ ﴿ فرحلت ﴾ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ ترحیل سے ہے یعنی اس پر کجاوا رکھا اور چلنے کی تیاری کی۔ ﴿ فاتی بطن الوادی ﴾

اس وادی سے مراد وادی عرنہ ہے جس کے عین پر پیش راء پر زبر اور اس کے بعد نون۔ وادی عرنہ امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک میدان عرفات میں سے نہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے عرفات کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ ﴿ الموقف ﴾ قاف کے نیچے زیر یعنی عرفات میں ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿ الی الصخرات ﴾ پتھروں کی طرف۔ اس سے مراد وہ بکھرے ہوئے پتھر جو جبل رحمت کے دامن میں ہیں۔ یہ میدان عرفات کا درمیانی حصہ ہے اور یہاں ٹھہرنا مستحب ہے۔ ﴿ حبل المشاة ﴾ حاء کے اوپر زبر اور باء ساکن اور مشاۃ کی میم پر پیش "ماش" کی جمع ہے اس کے معنی ہیں پیدل چلنے کا راستہ۔ ریت کے درمیان ٹیلے کو بھی حبل کہتے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ لفظ "جبل" بھی آیا ہے۔ ﴿ وذھبت الصفرۃ قلیلا ﴾ یعنی سورج غروب ہونے کے بعد اس کی کچھ زردی بھی ختم ہوگئی۔ جس سے اس کے غروب کا یقین ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ میدان عرفات میں اپنے موقف میں اچھی طرح سورج غروب ہونے تک ٹھہرا جائے اور میدان عرفات میں وقوف کا وقت عرفہ کے دن سورج ڈھلنے سے لے کر یوم النحر کی طلوع فجر تک ہے۔ جو شخص اس وقت میں میدان عرفات میں ٹھہرے گا اس کا موقف صحیح ہے اور جو اس دوران یہاں قیام نہ کر سکا اس کا حج فوت ہو گیا۔ ﴿ حتی اذا غاب القرص ﴾ یعنی جب سورج کی ٹکیہ غائب ہوگئی اور وہ اچھی طرح غروب ہوگیا۔ قرص کسی گول چیز کو کہتے ہیں۔ ﴿ دفع ﴾ یہ "اذا" کا جواب ہے یعنی آپؐ عرفات سے روانہ ہوئے۔ ﴿ وقد شنق ﴾ واؤ حالیہ ہے اور ﴿ شنق ﴾ کی نون پر زبر یعنی ملا اور کھینچنے سے تنگ ہوا۔ ﴿ الزمام ﴾ زاء کے نیچے زیر یعنی اونٹنی کی مہار یعنی مہار کو کھینچا تنگ کیا تاکہ وہ نہ بھاگے۔ ﴿ لیصیب ﴾ لام تاکید کا ہے اور اس پر زبر ہے یعنی چھوٹا تھا اور پہنچ جاتا تھا۔ ﴿ مورک ﴾ میم پر زبر واؤ ساکن راء کے نیچے زیر۔ کجاوے کا اگلا حصہ جس پر سوار ہونے والا تھک کر کبھی اپنے پاؤں بھی رکھ لیتا ہے۔ ﴿ السکینۃ ﴾ اس پر زبر ہے یعنی اطمینان کو لازم پکڑو۔ ﴿ کلما اتی حبلا ﴾ حاء کے ساتھ یعنی جب بھی ریت کے کسی ٹیلے پر آتے ﴿ ارخی لھا ﴾ تو اس کی مہار ڈھیلی کر دیتے ﴿ لم یسبح ﴾ یہ تسبیح سے ہے یعنی نفل نہیں پڑھے۔ ﴿ اضطجع ﴾ یعنی سونے کیلئے لیٹ گئے۔ ﴿ لاتبین ﴾ یعنی ظاہر ہوا۔ ﴿ لمشعر الحرام ﴾ یہ مزدلفہ میں مشہور پہاڑ کا نام ہے جسے قزح بھی کہا جاتا ہے۔ ﴿ وھلل ﴾ یہ تہلیل سے ہے یعنی لا الہ الا اللہ پڑھا۔ ﴿ اسفر ﴾ یعنی جب روشن ہوگیا۔ ﴿ بطن محسر ﴾ میم پر پیش حاء پر زبر سین کے نیچے زیر اور شد مشہور وادی کا نام ہے جو منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ہے اور یہ نہ منیٰ کا حصہ ہے اور نہ ہی مزدلفہ کا اس کا نام "وادی محسر" اس لئے رکھا گیا کہ ابرہہ کے ہاتھی یہاں رک گئے اور آگے پیش قدمی سے عاجز آگئے۔ ﴿ فحرک ﴾ یہ تحریک سے ہے یعنی آپؐ نے اپنی اونٹنی کو حرکت دی تاکہ وہ تیز چلے اس لئے کہ یہ وادی عذاب کی جگہ ہے جیسے آپؐ سفر کے دوران میں قوم ثمود کی بستی سے جلدی سے گزر گئے تھے۔ ﴿ ثم سلک الطریق الوسطی ﴾ دونوں راستوں کے درمیان والے راستہ پر چلے اور یہ وہ راستہ تھا جو عرفات کے راستہ کے علاوہ تھا ﴿ التی تخرج علی الجمرۃ الکبری ﴾ اسے جمرۂ عقبہ بھی کہتے ہیں اور "جمرۃ" کنکریوں

کے جمع ہونے کا نام ہے۔ ﴿ حتی اتی ﴾ یعنی یہاں تک کہ آپؐ وہاں پہنچے۔ ﴿ الجمرہ التی عند الشجرہ ﴾ یہ جمرات میں سے سب سے آخری جمرہ ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ منیٰ کی حد کیلئے منیٰ کا حصہ نہیں۔ آپؐ کے زمانہ میں وہاں درخت تھا تبھی اسے کہا گیا ہے کہ جو جمرہ درخت کے قریب ہے۔ ﴿ الخذف ﴾ فاء پر زبر ذال ساکن' انگلیوں کے پوروں سے کنکری پھینکنا جو لوبیا کے دانہ کے برابر ہوتی ہو۔ ﴿ رمی من بطن الوادی ﴾ یعنی وادی کے نشیب سے کنکریاں ماریں۔ بایں طور پر کہ منیٰ' عرفہ اور مزدلفہ آپؐ کی دائیں جانب اور مکہ مکرمہ بائیں جانب تھا۔ اس رمی کے بعد تلبیہ ختم ہو جاتا ہے۔ ﴿ المنحر ﴾ یعنی قربان گاہ اور وہ منیٰ ہے۔ ﴿ نحر ﴾ یہ لبہ سے ہوتا ہے جیسے حلق سے دوسرا جانور ذبح کیا جاتا ہے ﴿ افاض ﴾ یعنی آپؐ روانہ ہوئے اور وہاں سے کوچ کیا۔ ﴿ الی البیت ﴾ یعنی کعبہ مکرمہ کی طرف طواف زیارت کیلئے اور اسے طواف افاضہ اور طواف الرکن بھی کہتے ہیں۔ یہ طواف حج میں فرض ہے۔ یوم النحر کو اگر یہ طواف نہ ہو سکے تو یہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہر صورت میں یہ طواف کرنا پڑے گا۔

(٦٠٨) وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهِ فِي حَجٍّ أَوْ عُمْرَةٍ سَأَلَ اللَّهَ رِضْوَانَهُ وَالجَنَّةَ، وَاسْتَعَاذَ بِرَحْمَتِهِ مِنَ النَّارِ. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب حج یا عمرہ میں تلبیہ یعنی لبیک کہنے سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رضامندی اور جنت طلب کرتے اور اس کی رحمت کے ساتھ آگ سے پناہ مانگتے۔ (اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا فرغ من تلبیتہ ﴾ اس سے مراد ہر وہ تلبیہ ہے جو محرم کسی بھی وقت کہے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد دعا مستحب ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فراغت سے مراد وہ وقت ہو جب لبیک کہنا ختم ہو جاتا ہے اور یہ روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کا راوی محمد بن ابی زائدہ ضعیف ہے۔

راوی حدیث ﴿ حضرت خزیمہ بن ثابت بن الفاکہ رضی اللہ عنہ ﴾ انصار کے قبیلہ اوس کی خطمی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کنیت ابو عمارہ ہے۔ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ فتح مکہ کے دن خطمی قبیلہ کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے اور اسی موقعہ پر شہید ہوئے۔

(٦٠٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «نَحَرْتُ هٰهُنَا، وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ، فَانْحَرُوا فِي رِحَالِكُمْ، وَوَقَفْتُ هٰهُنَا، وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ،

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں نے قربانی اس جگہ کی ہے مگر منیٰ سارے کا سارا قربان گاہ ہے۔ لہٰذا تم اپنے اپنے ٹھہرنے کے مقامات پر قربانی کر دو اور میں نے اس جگہ قیام کیا ہے مگر عرفات کا سارا میدان جائے قیام

وَوَقَفْتُ هٰهُنَا ، وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ» . رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ہے اور میں نے یہاں قیام کیا مگر مزدلفہ سارا جائے قیام ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وجمع کلھا موقف ﴾ الجمع میں جیم پر فتحہ اور میم ساکن ہے۔ مزدلفہ کا دوسرا نام ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے جمع اس لئے کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم و حوا کو جنت سے زمین پر اپنے اپنے مقام و ٹھکانے پر اتارا گیا تو دونوں کی اس مقام پر ملاقات ہوئی۔ ان کے یہاں جمع ہونے کی بنا پر اس جگہ کا نام جمع پڑ گیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اجتماع اور اکٹھے ہونے یا اس مقام پر مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے کی وجہ سے اسے "الجمع" کہا گیا ہے۔

(٦١٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ إِلَى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلاَهَا ، وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب حج کیلئے مکہ میں داخل ہوئے تو اس موقع پر مکہ کی بالائی جانب سے داخل ہوئے اور جب واپس جانے کیلئے مکہ سے نکلے تو زیریں حصہ سے نکلے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ بیان ہوا کہ آپؐ ثنیہ علیا کے راستہ سے داخل ہوئے اور ثنیہ سفلیٰ سے واپس ہوئے۔ بعض کے نزدیک حج کیلئے مکہ میں داخل ہونا انہی راستوں سے مسنون ہے اور بعض نے اسے سہولت اور آسانی پر محمول کیا ہے اور اسے مسنون قرار نہیں دیا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس طرح مکہ میں داخلہ کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ بالائی جانب سے مکہ میں داخلہ کی صورت میں شہر مکہ اور خانہ کعبہ سامنے کی جانب پڑتے ہیں۔

(٦١١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا ، أَنَّهُ كَانَ لاَ يَقْدُمُ مَكَّةَ إِلاَّ بَاتَ بِذِيْ طُوًى ، حَتَّى يُصْبِحَ ، وَيَغْتَسِلَ ، وَيَذْكُرُ ذٰلِكَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جب بھی مکہ میں آتے تو ذی طویٰ میں صبح تک شب بسر کرتے اور غسل کرتے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بات ﴾ رات گزارتے۔ ﴿ بذی طوی ﴾ طویٰ کے "طا" پر ضمہ اور آخر پر تنوین۔ مکہ کے قریب ایک مقام و جگہ۔ (کہ جو آج کل --- ایک پرانے کنویں کی وجہ سے --- بئر طویٰ کے نام سے مشہور ہے)

(٦١٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپؐ حجر

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يُقَبِّلُ الْحَجَرَ الأَسْوَدَ، وَيَسْجُدُ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الحَاكِمُ مَرْفُوعاً، وَالبَيْهَقِيُّ مَوْقُوفاً.

اسود کو بوسہ دیتے اور اس کے سامنے سجدہ کرتے۔ (اسے حاکم نے مرفوع اور بیہقی نے موقوف روایت کیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے حجر اسود کو بوسہ دینے اور اس پر سجدہ کرنے کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔ جمہور کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن اس حدیث میں وھم اور اضطراب پایا جاتا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حجر اسود پر سجدہ کرنا بدعت ہے۔ اس کی تفصیل نیل الاوطار (ص: ۴۴) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

غالباً مطلب یہ ہے کہ اس پر اپنی پیشانی رکھتے تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اسے جائز سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بدعت کہا ہے اور قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا شذوذ ہے۔

(٦١٣) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْمُلُوا ثَلاثَةَ أَشْوَاطٍ وَيَمْشُوا أَرْبَعاً، وَأَنْ يَمْشُوا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ تین چکروں میں تیز قدم چلیں اور دونوں رکنوں کے درمیان چار چکر عام معمول کے مطابق چل کر لگائیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿امرھم﴾ ھم سے مراد آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم ارشاد فرمایا تھا۔ ﴿ان یرملوا﴾ میم پر ضمہ۔ دوڑتے ہوئے۔ ﴿اشواط﴾ شوط کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چکر لگانا۔

(٦١٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما (أَنَّهُ كَانَ إِذَا طَافَ بِالبَيْتِ الطَّوَافَ الأَوَّلَ خَبَّ ثَلاثاً وَمَشَى أَرْبعاً. وَفِي رِوَايَةٍ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ إِذَا طَافَ فِي الحَجِّ أَوِ العُمْرَةِ أَوَّلَ مَا يَقْدُمُ فَإِنَّهُ يَسْعَى ثَلاثَةَ أَطْوَافٍ بِالبَيْتِ وَيَمْشِي أَرْبَعَةً). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب بھی بیت اللہ کا طواف قدوم (پہلا طواف) کرتے تو اس کے پہلے تین چکروں میں پہلوانوں کی سی چال چلتے اور (باقی) چار میں آہستہ چلتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کا عمل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں) میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے حج یا عمرہ کے لیے بھی جب طواف قدوم کیا تو اس کے پہلے تین چکر دوڑ کر لگائے اور باقی چار میں آپ آہستہ چال چلتے۔

(متفق علیہ)

(٦١٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمْ أَرَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَلِمُ مِنَ الْبَيْتِ غَيْرَ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی اس کے راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سوائے دونوں یمانی رکنوں کے بیت اللہ کے کسی رکن کو چھوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ يستلم ﴾ یعنی ہاتھ سے چھوتے۔ یہ ہر طواف میں مسنون ہے ﴿ غير الركنين اليمانيين ﴾ نون کے بعد والی "یا" مخفف ہے اور یمن کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اس پر تشدید ہے اور یمن کی طرف ان کا رخ ہے' اس لئے ان کو رکن یمانی کہتے ہیں اور ﴿ ركن البيت ﴾ یعنی حجر اسود کا رخ بھی اسی طرف ہے اور یہ دونوں رکن حجر اسود اور دوسرا رکن وہ ہے جو کعبہ کے جنوب مغرب میں ہے۔ ان دونوں کا استلام اس وجہ سے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی رکھی ہوئی بنیادوں پر قائم ہیں۔ دونوں شامی رکنوں کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

(٦١٦) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَبَّلَ الْحَجَرَ الْأَسْوَدَ، وَقَالَ: إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، لاَ تَضُرُّ وَلاَ تَنْفَعُ، وَلَوْلاَ أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو پتھر ہے کسی قسم کے نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ اسے نفع و نقصان دینے والا سمجھ کر نہیں دیا جاتا۔ عمل تو صرف رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے مشرکین کے اس نظریہ کی تردید مقصود تھی جو پتھروں کو بذات خود نفع و نقصان کا مختار و مالک سمجھتے تھے۔

(٦١٧) وَعَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ، وَيَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ مَعَهُ، وَيُقَبِّلُ الْمِحْجَنَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو طفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا ہے آپؐ نوکیلے سرے والی چھڑی جو آپؐ کے پاس تھی' سے حجر اسود کو چھوتے اور اس چھڑی کو بوسہ دیتے تھے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بمحجن ﴾ میم پر کسرہ۔ ٹیڑھے سرے والا ڈنڈا۔ خم دار چھڑی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر اژدھام اور رش زیادہ ہو اور حجر اسود کو بوسہ دینا مشکل یا ناممکن نظر آئے تو چھڑی لگا کر اس چھڑی کو چوم لے۔ مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا "تو طاقتور اور زور آور آدمی ہے۔ حجر اسود تک رسائی حاصل کرنا تیرے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے مگر دھکم پیل سے کمزوروں کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے اگر تمہیں فارغ وقت میسر آجائے تو ہاتھ سے مس کر لیا کرو بصورت دیگر حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ہی کہہ لیا کرو۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مناسک حج کے ادا کرتے ہوئے دوسروں کو تکلیف و اذیت دینا جائز نہیں اور اگر حجر اسود کا استلام صرف ہاتھ کے اشارہ سے ہو تو ہاتھ کو چومنا نہیں چاہیے کیونکہ ہاتھ اور چھڑی وغیرہ کو تبھی بوسا دینا ہے جب وہ حجر اسود سے لگیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوالطفیل رضی اللہ عنہ ﴾ عامر بن واثلہ لیثی کنانی رضی اللہ عنہ۔ حیات نبی ﷺ کے آٹھ سال پائے۔ ۱۰۰ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ایک قول کے مطابق ۱۰۲ھ میں وفات پائی اور ایک قول ان کی وفات کے بارے میں ۱۰۳ھ کا بھی ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے صحابہ کرام ؓ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہ خوش قسمت صحابی ہیں۔

(٦١٨) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مُضْطَبِعاً بِبُرْدٍ أَخْضَرَ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سبز چادر میں طواف کیا جس کو آپؐ نے دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ مضطبعا ﴾ اضطباع سے ماخوذ ہے۔ اپنی چادر کے درمیانی حصہ کو اپنی دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈالنا۔ اس طرح دایاں کندھا ننگا و برہنہ رہتا ہے۔

حاصل کلام: اضطباع پہلے پہل عمرۃ القضاء میں کیا گیا کیونکہ اس وقت مشرکین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ مسلمان جسمانی و بدنی طور پر کمزور نہیں۔ اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق رمل اور اضطباع دونوں ہمیشہ کیلئے مسنون قرار پائے۔ اب اس طرح کے لباس کے علاوہ مردوں کیلئے دوسرے کسی بھی طرز و ڈھنگ کا لباس جائز نہیں۔ البتہ یہ اضطباع صرف پہلے سات چکروں کیلئے اور بعض نے کہا ہے کہ صرف رمل کی صورت میں اضطباع ہے بعد کے چار چکروں میں نہیں۔ (سبل)

راوی حدیث: ﴿ یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوصفوان تمیمی ہے۔ مکہ کے رہنے والے تھے اور قریش کے حلیف تھے۔ مشہور و معروف صحابی رسول ہیں۔ حنین' طائف اور تبوک کے معرکوں میں حاضر ہو کر داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے عامل مقرر کئے جاتے رہے۔ تقریباً پچاس برس کی عمر تک بقید حیات رہے۔

(٦١٩) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ يُهِلُّ مِنَّا المُهِلُّ فَلاَ يُنْكَرُ عَلَيْهِ، وَيُكَبِّرُ مِنَّا المُكَبِّرُ فَلاَ يُنْكَرُ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ لا الہ الا اللہ کہتے تھے' اسے بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور بعض ہم میں سے تکبیریں کہتے تھے ان کو بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منیٰ سے عرفات جانے کی کیفیت کا بیان ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام پر تلبیہ کی جگہ تکبیر کہنا بھی صحیح اور درست ہے۔

(٦٢٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِي الثَّقَلِ، أَوْ قَالَ: فِي الضَّعَفَةِ، مِنْ جَمْعٍ، بِلَيْلٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے مسافروں کے سامان کے ساتھ (یا فرمایا) کہ کمزوروں کے ساتھ رات ہی کو مزدلفہ سے (منیٰ کی جانب) بھیج دیا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی الثقل﴾ ثا اور قاف دونوں پر فتحہ۔ سامان مسافر ﴿الضعفة﴾ ضاد' عین اور فا پر فتحہ ضعیف کی جمع ہے۔ اس سے مراد خواتین' بچے' خادم وغیرہ ﴿من الجمع﴾ مزدلفہ سے منیٰ کی طرف لے جانے کیلئے مجھے بھیجا۔ ﴿بليل﴾ رات کے وقت۔ طیبی کی رائے یہ ہے کہ کمزور و ضعیف حضرات کو اژدھام کی زحمت اور تکلیف سے بچنے کی غرض سے پہلے بھیج دینا مستحب ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور حضرات کیلئے مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر ہی منیٰ کی جانب روانگی کی رخصت ہے اور جو اس اژدھام اور کثرت میں آئے اس کیلئے مزدلفہ سے نماز فجر سے پہلے واپس روانہ ہونا جائز نہیں۔

(٦٢١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: اسْتَأْذَنَتْ سَوْدَةُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَيْلَةَ المُزْدَلِفَةِ أَنْ تَدْفَعَ قَبْلَهُ، وَكَانَتْ ثَبْطَةً، يَعْنِي ثَقِيلَةً، فَأَذِنَ لَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے مزدلفہ کی رات آپؐ سے اجازت طلب کی کہ وہ آپؐ سے پہلے واپس آجائے (یہ اجازت انہوں نے اس لئے طلب کی) کہ بھاری جسم والی تھیں۔ (اس وجہ سے آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر چلتی تھیں) آپؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: بیماری اور جسمانی کمزوری کے علاوہ بھاری بھرکم جسم بھی معذوری میں شامل ہے۔ ایسے حاجی کو بھی مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر منیٰ کی طرف جانے کی رخصت و اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت سودہ بنت زمعہ بن عبد شمس قرشیہ عامریہ رضی اللہ عنہا﴾

ان کا کا شمار امہات المومنین میں ہوتا ہے مکہ مکرمہ ہی میں ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا اور اپنے خاوند کے ساتھ دوسری بار ہجرت حبشہ میں شریک ہوئیں۔ ان کا خاوند وہاں فوت ہوگیا۔ تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے پہلے آپؐ نے ان سے نکاح کرلیا۔ اور ۵۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(٦٢٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لاَ تَرْمُوا الجَمْرَةَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَفِيْهِ انْقِطَاعٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ "طلوع آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مارو۔" (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رات کو رمی جائز نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک رمی طلوع آفتاب کے بعد جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک آدھی رات کے بعد جائز ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قادر اور باہمت آدمی طلوع فجر کے بعد رمی کرے۔ مجبور رات کو بھی کر سکتا ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ صرف طلوع آفتاب کے بعد ہی رمی کے قائل ہیں۔ ﴿وفيه انقطاع﴾ اس کی سند منقطع ہے۔ اس لئے کہ اس کے راوی حسن عرنی کا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں۔

(٦٢٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَرْسَلَ النَّبِيُّ ﷺ بِأُمِّ سَلَمَةَ لَيْلَةَ النَّحْرِ، فَرَمَتِ الجَمْرَةَ قَبْلَ الفَجْرِ، ثُمَّ مَضَتْ، فَأَفَاضَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو قربانی والی رات پہلے بھیج دیا تھا۔ انہوں نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے کنکریاں ماریں پھر جا کر طواف افاضہ کیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿فرمت الجمرة قبل الفجر﴾ انہوں نے فجر سے پہلے رمی کی یہ رعایت صرف عورتوں کیلئے اور ان کمزوروں کیلئے ہے جو ان کے ہمراہ جائیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل پکڑنا صحیح نہیں ہے کہ اس وقت ان مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ بھی دوسروں کیلئے کنکریاں مارنا جائز ہے۔ یہ حدیث پہلی حدیث سے سند کے اعتبار سے راجح ہے۔ اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

(٦٢٤) وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ مُضَرِّسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ

حضرت عروہ بن مضرس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی مزدلفہ میں ہماری

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ صَلاَتَنَا هَذِهِ، يَعْنِي بِالْمُزْدَلِفَةِ، فَوَقَفَ مَعَنَا حَتَّى نَدْفَعَ، وَقَدْ وَقَفَ بِعَرَفَةَ قَبْلَ ذَلِكَ لَيْلاً أَوْ نَهَاراً، فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ، وَقَضَى تَفَثَهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

نماز میں شامل ہوا اور ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں تک کہ ہم نے کوچ کیا اور اس سے قبل عرفات میں رات یا دن میں قیام کر چکا ہو تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور اس نے اپنی میل کچیل اتار لی۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿من شهد صلاتنا هذه﴾ جس نماز کیلئے اب ہم نکلے ہیں اس میں جو حاضر ہو گیا۔ ﴿ليلا اونهارا﴾ اس میں ایک فقہی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ عرفہ کے روز زوال آفتاب کے بعد سے لے کر دسویں ذی الحجہ کی صبح تک جو عرفات میں قیام پذیر رہا اس نے حج پالیا جیسا کہ خطابی نے کہا ہے۔ ﴿فقد تم حجه﴾ اس نے حج کو پورا کر لیا سے مراد ہے حج کا بڑا حصہ مکمل کر لیا۔ اس سے عرفہ کا وقوف مراد ہے کیونکہ اسی کے فوت ہونے کا خوف اور اندیشہ ہوتا ہے ﴿وقضى تفثه﴾ اس نے اپنے مناسک حج ادا کر لئے۔ "تفث" دراصل سر کے بال منڈوانے یا ترشوانے کے بعد محرم حلال ہونے کے موقع پر جو کچھ کرتا ہے اس میں اونٹوں کی قربانی اور دیگر سارے مناسک حج ادا کرنے بھی شامل ہیں کیونکہ "تفث" تو اس کے بعد ہی پورا ہوتا ہے۔ اصل میں "تفث" میل کچیل کو کہتے ہیں۔ اس حدیث کے شروع کا حصہ یوں ہے کہ عروہ بن مضرس نے فرمایا کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس مزدلفہ میں اس وقت پہنچا جب آپ نماز کیلئے تشریف لے جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا میں "طے" کے پہاڑوں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اپنی سواری کو دوڑا دوڑا کر تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو مشقت میں مبتلا کیا ہے۔ خدا کی قسم میں ہر پہاڑ پر قیام کرتا رہا ہوں، کیا اب بھی مجھ پر حج کے کوئی ارکان باقی ہیں؟ پھر ساری حدیث ذکر کی۔

راوی حدیث: ﴿عروه بن مضرس رضی اللہ عنہ﴾ میم پر ضمہ، ضاد پر فتحہ اور راء مشدد اس کے نیچے زیر، سلسلہ نسب یوں ہے۔ ابن اوس بن حارثہ بن لام الطائی۔ حجۃ الوداع میں شامل ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان سے دس احادیث مروی ہیں۔

(٦٢٥) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ الْمُشْرِكِينَ كَانُوا لاَ يُفِيضُونَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، وَيَقُولُونَ: أَشْرِقْ ثَبِيرُ! وَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَالَفَهُمْ، فَأَفَاضَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مشرکین طلوع آفتاب کے بعد واپس لوٹتے تھے اور کہتے تھے ثبیر تو (ایک پہاڑ کا نام) روشن ہو گیا اور نبی ﷺ نے ان کی مخالفت کی اور طلوع آفتاب سے پہلے واپس تشریف لے آئے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لايفيضون﴾ واپس نہیں آتے تھے یعنی مزدلفہ سے منیٰ کی جانب۔ ﴿اشرق﴾ اشراق

سے امر کا صیغہ ہے۔ اشراق کہتے ہیں روشنی میں دخول کو۔ یعنی چاہیئے کہ تجھ پر سورج طلوع ہو۔ ثبیر کی ثا پر فتحہ اور باء کے نیچے کسرہ۔ مبنی علم الضم ہے۔ نداء محذوف کا منادیٰ ہونے کی وجہ سے ثبیر ہے۔ منیٰ کی طرف جانے والے کے بائیں پہلو معروف پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ کے بڑے عظیم پہاڑوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قبیلہ ھذیل کے ثبیر نامی ایک شخص کے نام پر معروف ہوا۔ اسی پہاڑ پر وہ دفن ہوا۔ ایک روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے "کیما نغیر" تاکہ ہم غارت گری کر سکیں۔ یا ہم چل سکیں۔ اس کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں تاکہ ہم چلیں اور ہمارے گھوڑے ہمیں لے کر سرپٹ دوڑیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل ملتی ہے کہ مزدلفہ سے واپسی طلوع آفتاب سے پہلے روشنی میں ہونی چاہئے اور جو طلوع سورج تک وہاں وقوف نہ کر سکا اس کا وقوف فوت ہو گیا۔

(٦٢٦) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُم، قَالَا: لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يُلَبِّي حَتَّى رَمَى جَمْرَةَ العَقَبَةِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جمرہ عقبہ (چھوٹا شیطان) کو کنکری مارنے تک تلبیہ کہتے رہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ حتی رمی جمرة العقبة ﴾ جمرہ عقبہ کو کنکری مارنے کے عمل سے فارغ ہونے کے بعد تلبیہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جونہی پہلی کنکری ماری جائے گی تلبیہ ختم ہو جائے گا۔

(٦٢٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ جَعَلَ البَيْتَ عَنْ يَسَارِهِ، وَمِنًى عَنْ يَمِينِهِ، وَرَمَى الجَمْرَةَ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، وَقَالَ: هٰذَا مَقَامُ الَّذِي أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُوْرَةُ البَقَرَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے بیت اللہ کو اپنی بائیں جانب اور منیٰ کو اپنی دائیں جانب رکھا اور جمرہ کو سات سنگریزے مارے اور فرمایا کہ یہ ان کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے جن پر سورۂ بقرہ کا نزول ہوا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ رمی الجمرة ﴾ اس جمرہ سے جمرة العقبہ مراد ہے۔ ﴿ انزلت علیه سورة البقرة ﴾ سورۂ کا بالخصوص ذکر اس لئے کیا کہ حج کے اکثر احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔ گویا اس سے اس پر متنبہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ حج کے اعمال توقیفی ہیں۔ ان میں رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ کا کوئی مجاز نہیں۔

راوی حدیث ﴿ اسامه بن زید رضی اللہ عنہما ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو زید تھی۔ اسامہ کے ہمزہ پر ضمہ ہے۔ نسب نامہ اس طرح ہے۔ اسامہ بن زید بن حارثہ بن شراحیل کلبی۔ رسول اللہ ﷺ کے پیارے اور محبوب آزاد کردہ غلام کا بیٹا۔ ان کی والدہ محترمہ ام ایمن رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ۔ اپنی وفات سے

قبل ان کو ایسے لشکر کا سربراہ مقرر فرمایا جس میں اکابر صحابہ کرام ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے بھی شامل تھے۔ اس وقت اٹھارہ برس کے نوجوان تھے۔ یہ لشکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے روانہ نہ ہو سکا۔ بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے روانہ فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی وفات ۵۴ھ میں ہوئی۔

(٦٢٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَمَى رَسُولُ اللهِ ﷺ الجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى، وَأَمَّا بَعْدَ ذٰلِكَ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمرہ کو قربانی کے روز چاشت کے وقت کنکریاں ماریں اور اس روز کے بعد آفتاب ڈھلنے کے بعد۔ (مسلم)

حاصل کلام: پہلے روز زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں مارنی چاہئیں اور باقی ایام میں زوال آفتاب کے بعد۔ اگر دس تاریخ کو زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مار سکے تو پھر اسی روز زوال آفتاب کے بعد مارنی چاہئیں۔

(٦٢٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يَرْمِيْ الجَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، يُكَبِّرُ عَلَى إِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ، ثُمَّ يَتَقَدَّمُ، ثُمَّ يُسْهِلُ، فَيَقُومُ، فَيَسْتَقْبِلُ القِبْلَةَ، فَيَقُومُ طَوِيلاً، وَيَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، ثُمَّ يَرْمِي الوُسْطَى، ثُمَّ يَأْخُذُ ذَاتَ الشِّمَالِ، فَيُسْهِلُ، وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ القِبْلَةِ، ثُمَّ يَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، وَيَقُوْمُ طَوِيلاً، ثُمَّ يَرْمِي جَمْرَةَ ذَاتِ العَقَبَةِ، مِنْ بَطْنِ الوَادِيْ، وَلاَ يَقِفُ عِنْدَهَا، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُولُ: هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَفْعَلُهُ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ سب سے قریبی جمرہ کو سات سنگریزے مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے۔ پھر آگے تشریف لے جاتے اور میدان میں آکر کھڑے ہو جاتے اور قبلہ رخ ہو کر طویل قیام فرماتے اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا کرتے۔ پھر جمرہ وسطیٰ (درمیانہ شیطان) کو کنکریاں مارتے۔ پھر بائیں جانب ہو جاتے اور میدان میں آکر قبلہ رخ کھڑے ہو جاتے۔ پھر اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے اور دعا فرماتے اور طویل قیام فرماتے۔ اس کے بعد جمرۂ عقبہ کو کنکریاں وادی کی نچلی جگہ سے مارتے مگر وہاں قیام نہ فرماتے پھر واپس تشریف لے آتے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح عمل کرتے دیکھا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ الجمرة الدنيا ﴾ دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں طرح ہے۔ اس کے معنی قریب کے ہیں۔ مسجد خیف کے قریب ہونے کی وجہ سے اسے ﴿ الجمره الدنيا ﴾ کہا گیا ہے اور یہ پہلا جمرہ ہے جسے ایام تشریق میں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ﴿ ثم يسهل ﴾ يسهل میں "یا" پر ضمہ معنی اس کے

میدان کی طرف آنے کے ہیں۔ زمین کا نشیبی حصہ۔ ﴿ یرمی الوسطی ﴾ وسطیٰ سے مراد جمرہ ثانیہ (دوسرا جمرہ) جو دونوں جمروں کے درمیان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جمرہ کو سنگریزے مار کر وہیں کھڑے نہ رہتے بلکہ وہاں سے چل کر میدان میں آکھڑے ہوتے اور پورے اطمینان کے ساتھ قبلہ رخ ہو کر طویل دعا فرماتے۔ لہٰذا کنکریوں کے مارے جانے کے بعد وہیں کھڑے نہیں رہنا چاہئے بلکہ میدان میں کھلی جگہ آکر طویل دعا ہاتھ اوپر اٹھا کر کرنی چاہئے۔ اس طرح اژدھام کی زد سے بھی محفوظ رہے گا۔

(٦٣٠) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «اللَّهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِينَ»، قَالُوا: وَالْمُقَصِّرِيْنَ، يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: «وَالْمُقَصِّرِينَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی یہ حدیث بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”الٰہی سر منڈوانے والے حاجیوں پر رحم فرما۔“ صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بال ترشوانے والے پر بھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا ”بال ترشوانے والوں پر بھی۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ المحلقین ﴾ تحلیق سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج اور عمرہ سے حلال ہونے کے موقع پر اپنے سر منڈواتے ہیں۔ حلق دراصل بالوں کو جڑوں تک صاف کر دینا۔ ﴿ والمقصرین ﴾ یہ عطف تلقین ہے یعنی آپ یہ کہیں قل والمقصرین اور تقصیر بال ترشوانے کو کہتے ہیں جن میں بال جڑ سے صاف نہیں کئے جاتے۔

(٦٣١) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَجَعَلُوا يَسْأَلُونَهُ، فَقَالَ رَجُلٌ: لَمْ أَشْعُرْ، فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ، قَالَ: «اذْبَحْ وَلاَ حَرَجَ»، وَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ: لَمْ أَشْعُرْ، فَنَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ، قَالَ: «ارْمِ وَلاَ حَرَجَ»، فَمَا سُئِلَ يَوْمَئِذٍ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلاَ أُخِّرَ إِلاَّ قَالَ: «افْعَلْ وَلاَ حَرَجَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع میں ایک مقام پر کھڑے ہوگئے۔ صحابہؓ نے آپؐ سے سوالات کرنے شروع کئے۔ کسی نے کہا مجھے علم نہیں تھا میں نے قربانی سے پہلے حجامت بنوا لی۔ آپؐ نے اسے فرمایا قربانی کرو کوئی حرج نہیں اور ایک آدمی نے عرض کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کرلی۔ آپؐ نے اسے فرمایا ”اب کنکریاں مار لے کوئی حرج نہیں۔“ اس روز آپؐ سے کسی عمل کے مقدم و مؤخر کرنے کے متعلق استفسار پر آپؐ نے فرمایا ”جاؤ اب کر لو، کوئی حرج نہیں۔“

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وقف فی حجۃ الوداع ﴾ دسویں ذی الحجہ کے روز زوال آفتاب کے بعد جب آپؐ اپنی سواری پر سوار رہتے ہوئے جمرہ کے پاس خطاب فرمانے کھڑے ہوتے۔ ﴿ لم اشعر ﴾ اشعر میں عین پر ضمہ' معنی ہے مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ ﴿ قدم ولا اخر ﴾ قدم' اخر دونوں باب تفعیل سے ماخوذ ہیں صیغہ' مجہول ہیں۔ یاد رہے کہ قربانی کے روز حجاج کرام کے ذمہ چار کام بالترتیب انجام دینا ہوتے ہیں۔ پہلا جمرہ عقبہ کو سنگریزے مارنا۔ دوسرا قربانی کرنا۔ تیسرا سر منڈانا یا بال ترشوانا۔ چوتھا طواف افاضہ۔ علماء کا اس پر تو اتفاق و اجماع ہے کہ یہ ترتیب شرعی طور پر مطلوب و مقصود ہے لیکن ان کے درمیان بعض معمولات کے آگے پیچھے ہونے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ ترتیب آگے پیچھے ہونے پر وجوب دم میں بھی اختلاف ہے اور اس حدیث سے ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو تقدیم و تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اور دم کے بھی قائل نہیں ہیں۔

(٦٣٢) وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَحَرَ قَبْلَ أَنْ يَحْلِقَ، وَأَمَرَ أَصْحَابَهُ بِذٰلِكَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود قربانی حجامت کرانے سے پہلے کی اور اپنے صحابہؓ کو بھی اس کا حکم دیا۔ (بخاری)

راوی حدیث: ﴿ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما ﴾ مسور کے میم کے نیچے کسرہ ہے۔ سین ساکن اور "واؤ" پر فتحہ' بن مخرمہ۔ مخرمہ میں میم پر فتحہ اور "خاء" ساکن اور "راء" پر فتحہ۔ زھری قرشی ہیں۔ صاحب فضل لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مکہ منتقل ہوگئے۔ یزید بن معاویہ نے جب ۶۴ھ کے آغاز میں مکہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت نماز پڑھتے ہوئے ان کو منجنیق کا گولہ آکر لگا اور وہ وفات پاگئے۔

(٦٣٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا رَمَيْتُمْ وَحَلَقْتُمْ، فَقَدْ حَلَّ لَكُمُ الطِّيبُ، وَكُلُّ شَيْءٍ، إِلاَّ النِّسَاءَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب کنکریاں مار چکو اور سر کے بال منڈوا لو تو تمہارے لئے خوشبو اور بیویوں کے علاوہ ہر چیز حلال ہوگئی۔" (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ الا النساء ﴾ یعنی بیویوں سے مجامعت جائز نہیں کیونکہ بیویوں سے مباشرت و ہم بستری طواف افاضہ کے بعد جائز ہوتی ہے ﴿ وفی سندہ ضعف ﴾ اس لئے کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ ایسا راوی ہے جس کے متعلق کلام ہے۔

(٦٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ حَلْقٌ، وَإِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

ﷺ نے فرمایا کہ "عورتوں کیلئے سر منڈوانا نہیں بلکہ ان کیلئے صرف بال ترشوانا ہے۔" (اسے ابوداؤد نے حسن سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خواتین کو سر کے بال منڈوانا نہیں بلکہ انہیں صرف بال کتروانا چاہئے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کیلئے بال کترانا ہی مشروع ہے۔

(٦٣٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ الْعَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اسْتَأْذَنَ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَنْ يَبِيتَ بِمَكَّةَ لَيَالِيَ مِنًى، مِنْ أَجْلِ سِقَايَتِهِ، فَأَذِنَ لَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی کہ وہ منیٰ والی راتیں مکہ میں کاٹے تاکہ وہ آب زمزم پلا سکیں تو آپؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لیالی منی﴾ منیٰ کی راتوں سے مراد' ۱۱ ویں' ۱۲ ویں اور ۱۳ ویں کی راتیں ہیں۔ یہ اجازت انہوں نے اس مقصد اور غرض کیلئے طلب کی کہ وہ اور اس کے ساتھی رات کو آب زمزم کھینچ کر حوض بھر لیتے تھے اور فی سبیل اللہ اس کو تقسیم کرتے تھے۔ "فاذن لہ" یہ اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ معذور نہ ہوں ان کو منیٰ ہی میں یہ راتیں گزارنی واجب ہیں اور جس کو کوئی عذر پیش آجائے مثلاً منیٰ میں خیمے میں آگ بھڑک اٹھے اور طویل رات گزارنا ناممکن و مشکل نظر آئے تو وہاں رات گزارنا ضروری نہیں اور تیسری رات بھی وہاں گزارنا واجب نہیں کیونکہ جو شخص جلدی کر کے دو دن ہی منیٰ میں رہ کر چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے۔

(٦٣٦) وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ عَدِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَرْخَصَ لِرُعَاةِ الإِبِلِ فِي الْبَيْتُوتَةِ عَنْ مِنًى، يَرْمُونَ يَوْمَ النَّحْرِ، ثُمَّ يَرْمُونَ الْغَدَ وَمِنْ بَعْدِ الْغَدِ لِيَوْمَيْنِ، ثُمَّ يَرْمُونَ يَوْمَ النَّفْرِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ کے چرواہوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت دے دی کہ قربانی کے دن کنکریاں ماریں پھر دوسرے اور تیسرے دو روز بھی کنکریاں ماریں پھر کوچ کے روز سنگریزے ماریں۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے' ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ارخص﴾ اور ایک نسخہ میں رخص ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی رخصت و اجازت دے دی۔ ﴿رعاۃ﴾ "را" پر ضمہ راع کی جمع ہے۔ ﴿فی البیتوتۃ﴾ بات کا مصدر ہے۔ رات

گزارنا کے معنی ہیں اور رات گزارنے سے مراد منیٰ میں مذکورہ راتوں میں سے رات کا بسر کرنا۔ عن منی عن یہاں بعد اور دوری کیلئے ہے۔ یعنی منیٰ سے باہر اس سے دور رہتے ہوئے یعنی نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے اونٹوں کی دیکھ بھال اور منیٰ سے دوران کی حفاظت و حراست کیلئے منیٰ میں رات نہ گزارنے کی اجازت دے دی۔ ﴿ ثم یرمون الغد ومن بعد الغد لیومین ﴾ یعنی وہ گیارہ اور بارہ ذوالحجہ کو کنکریاں مارتے تھے۔ مراد ہے کہ وہ دو دن کی رمی کو جمع کرتے تھے۔ ﴿ ثم یرمون یوم النفر ﴾ منی سے واپسی کا دن اور اس سے مراد ہے تیرہویں تاریخ۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ عام حاجیوں کیلئے منیٰ میں شب باشی واجب ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ رخصت و اجازت واجب ہی کی صورت میں ہوتی ہے ورنہ اجازت کی ضرورت ہی نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبیداللہ یا ابوعمرو ہے۔ بنو عبید بن زید کے حلیف تھے۔ بنو عبید کا تعلق بنو عمرو بن عوف جو انصار سے تھے' کے ساتھ تھا۔ غزوۂ بدر اور بعد کے غزوات میں حاضر رہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بدر کے روز یہ قبائل عالیہ پر امیر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کیلئے حصہ مقرر فرمایا۔ ۴۵ھ میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جنگ یمامہ کے روز شہید ہوئے اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔

(٦٣٧) وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَوْمَ النَّحْرِ، اَلْحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے روز خطبہ دیا اور ساری حدیث ذکر کی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام : حج کے دورانیہ میں نبی کریم ﷺ سے کئی خطبے ثابت ہیں۔ مالکیہ اور احناف کے نزدیک ایک خطاب ساتویں ذی الحجہ کو اور دوسرا عرفہ میں اور تیسرا گیارہویں ذی الحجہ کو۔ دسویں ذی الحجہ یعنی قربانی کے دن کے خطاب کو مالکیہ اور حنفیہ خطبہ نہیں صرف چند نصیحتیں کہتے ہیں۔ یہ عید کا خطبہ نہیں کیونکہ آنحضور ﷺ نے نماز عید تو ادا فرمائی نہیں تھی۔ بعض اسے بھی خطبہ ہی کہتے ہیں اس طرح چار خطبے مسنون ہو جاتے ہیں۔

(٦٣٨) وَعَنْ سَرَّآءَ بِنْتِ نَبْهَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَومَ الرُّءُوسِ فَقَالَ: «أَلَيْسَ هٰذَا أَوْسَطَ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ؟» اَلْحَدِيْثَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت سراء بنت نبہان رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سروں والے دن خطاب فرمایا اور فرمایا "کیا یہ دن ایام تشریق کا درمیانہ دن نہیں ہے؟" اور ساری حدیث ذکر کی۔ (اسے ابوداؤد نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ یوم الرووس ﴾ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ یوم الرؤس سے ذوالحجہ کی ۱۲ ویں تاریخ مراد ہے۔ اس کا نام یوم الرؤس اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس روز کثرت سے قربانی کے جانوروں کے

سروں کو پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ ﴿ اوسط ایام التشریق ﴾ سبل السلام میں ہے کہ اس سے اس دن کے افضل ہونے کا بھی احتمال ہے اور اوسط سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان میں واقع ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یوم النحر بھی ایام تشریق میں شامل ہے مگر بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ ایام تشریق سے مراد قربانی کے دن کو چھوڑ کر باقی تین دن ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ ان تین ایام میں قربانی کے گوشت کو خشک کرنے کیلئے دھوپ میں رکھتے تھے۔ اس لئے ان ایام کا نام ایام تشریق ہے۔

راوی حدیث : ﴿ سراء بنت نبهان رضی اللہ عنہا ﴾ سراء کے را پر فتحہ اور تشدید اور نبھان کے نون پر فتحہ اور با ساکن ہے۔ قبیلہ غنو سے تھیں۔ ربیعہ بن عبدالرحمٰن نے اس سے روایت بیان کی ہے۔

(٦٣٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «طَوَافُكِ بِالبَيْتِ، وَسَعْيُكِ بَيْنَ الصَّفَا وَالمَرْوَةِ، يَكْفِيكِ لِحَجِّكِ وَعُمْرَتِكِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "تیرا بیت اللہ کا طواف کر لینا صفا اور مروہ کے مابین سعی کر لینا حج اور عمرے کیلئے کافی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح : معلوم رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تلبیہ عمرہ کا کہا تھا۔ مگر وہ ایام ماہواری میں مبتلا ہوگئیں تو ان سے نبی ﷺ نے فرمایا "عمرے کو چھوڑ دو اور ان سے فرمایا کہ حج کا احرام باندھ لو۔" ﴿ رفضها ﴾ کے معنی ہیں اسے ترک کر دے اور عمرے کے اعمال و افعال کو نظرانداز کر دے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمرے سے نکل جا اور اسے باطل کر دے۔ یہ ابطال کا فعل حج اور عمرہ میں صحیح نہیں بجز اس صورت کے کہ احکام سے فراغت کے بعد حلال ہو جائے۔ جب انہوں نے حج کا احرام باندھ لیا تو اب وہ قارنہ بن گئیں۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ قارن کیلئے حج اور عمرہ دونوں کیلئے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کافی ہے۔

(٦٤٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَرْمُلْ فِي السَّبْعِ الَّذِيْ أَفَاضَ فِيْهِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے طواف افاضہ میں طواف کے سات چکروں (پھیروں) میں کسی چکر میں بھی رمل نہیں فرمایا۔" (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ فی السبع الذی افاض فیہ ﴾ طواف افاضہ کے طواف کے سات پھیرے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طواف افاضہ میں رمل نہیں اور نہ ہی طواف وداع میں۔ رمل صرف طواف قدوم میں ہے۔ طواف قدوم اس طواف کو کہتے ہیں جو مکہ میں پہلے داخلہ کے وقت کیا جاتا ہے۔ نیز یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ رمل صرف مردوں کیلئے ہے۔ خواتین کیلئے نہیں ہے ہاں اگر

کسی وجہ سے کسی حاجی کا طواف قدوم میں رمل چھوٹ گیا ہو تو اس کی تلافی کیلئے طواف افاضہ میں رمل کر لے۔

(٦٤١) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ وَالعَصْرَ وَالمَغْرِبَ وَالعِشَاءَ، ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالمُحَصَّبِ، ثُمَّ رَكِبَ إِلَى البَيْتِ، فَطَافَ بِهِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بالترتیب اپنے اپنے وقت میں) ظہر اور عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں اور پھر مقام محصب پر تھوڑا سوگئے پھر سوار ہو کر بیت اللہ کی جانب تشریف لے گئے اور طواف کیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ رقد رقدۃ ﴾ یعنی تھوڑا سا سو گئے۔ ﴿ بالمحصب ﴾ محصب اس جگہ کا نام ہے جہاں آپؐ نے نمازیں ادا فرمائیں اور استراحت بھی فرمائی اور یہ کوچ کا آخری دن تھا۔ یعنی ایام تشریق کا تیسرا دن۔ محصب بروزن محمد۔ جگہ کا نام ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بہ نسبت مکہ سے منیٰ کے زیادہ قریب ہے اسے ابطح اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ فطاف بہ۔ اس سے طواف وداع مراد ہے اور یہ حج کا سب سے آخری طواف ہوتا ہے۔

(٦٤٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّهَا لَمْ تَكُنْ تَفْعَلُ ذٰلِكَ - أَيِ النُّزُولَ بِالأَبْطَحِ - وَتَقُولُ: إِنَّمَا نَزَلَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِأَنَّهُ كَانَ مَنْزِلاً أَسْمَحَ لِخُرُوجِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ ابطح (محصب) میں فروکش ہونے کا عمل نہیں کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اس لئے قیام فرمایا تھا کہ یہاں سے واپسی میں آسانی و سہولت زیادہ تھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بالا بطح ﴾ ابطح سے محصب مراد ہے۔ ﴿ اسمح ﴾ زیادہ سہل و آسان ﴿ لخروجه ﴾ مکہ سے مدینہ کو جانے کیلئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محصب میں قیام کرنا ان مناسک حج میں سے نہیں ہے جو مستحب ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ آپؐ اس مقام پر اس لئے اترے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں قریش نے بنو ہاشم سے نبوت کے ساتویں سال میں قطع تعلق کا عہد و پیمان کیا اور وہاں بیٹھ کر اس بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے اترے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنے رسول کو غلبہ عطا فرمایا۔ اس لئے ان کا قول ہے کہ حاجیوں کو یہاں فروکش ہونا چاہئے۔ مگر میرے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہی درست ہے۔ واللہ اعلم۔

(٦٤٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالبَيْتِ، إِلاَّ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ سب سے آخر میں تمہارا عمل بیت اللہ کا طواف ہو مگر ایام ماہواری والی

أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الحَائِضِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. عورتوں کیلئے تخفیف کر دی گئی ہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ طواف وداع ہے جو سب مناسک حج کے اتمام و اختتام پر کیا جاتا ہے۔ یہ طواف امام مالک رحمہ اللہ کے سوا سب کے نزدیک واجب ہے۔ اگر کسی وجہ سے رہ جائے تو دم دینا پڑتا ہے مگر ان عورتوں کیلئے معاف ہے جو ایام ماہواری میں ہوں۔

(٦٤٤) وَعَنِ ابْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلاَةٌ فِي مَسْجِدِي هَذَا، أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلاَةٍ فِيمَا سِوَاهُ، إِلاَّ الْمَسْجِدَ الحَرَامَ، وَصَلاَةٌ فِي الْمَسْجِدِ الحَرَامِ، أَفْضَلُ مِنْ صَلاَةٍ فِي مَسْجِدِي هَذَا بِمِائَةِ صَلاَةٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب دوسری مساجد میں نماز ادا کرنے کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ ہے۔ بجز مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی میری اس مسجد میں سو نماز پڑھنے سے افضل ہے۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں مسجد نبویؐ اور بیت اللہ میں نماز پڑھنے کا ثواب مذکور ہے۔ آپؐ نے اپنی مسجد کی طرف لفظ ھذا سے جو اشارہ فرمایا ہے اس سے یہ مطلب مفہوم ہوتا ہے کہ جتنی مسجد نبوی عہد نبوی میں تھی اس میں ایک نماز کا ثواب دوسری مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ بعد کے ادوار میں جو اضافے اور وسعت ہوئی ہے وہ گویا اس میں شامل نہیں مگر اضافہ شدہ حصہ بھی چونکہ اصل مسجد نبوی کے ساتھ ملحق ہے اس لئے وہ بھی مسجد نبوی کے حکم میں ہے اور اس میں بھی ثواب اسی قدر ملے گا جو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب پانچ صد نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے اور مسجد نبویؐ میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی کا دوسری مساجد میں ایک لاکھ پڑھی جانے والی نمازوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابن الزبیر رضی اللہ عنہما ﴾ ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ نام ان کا عبداللہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ہے۔ قریش کے قبیلہ اسد سے ہیں۔ اس لئے قرشی اسدی کہلائے۔ ان کی والدہ محترمہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ہجرت مدینہ کے وقت حمل سے تھیں۔ جوں ہی یہ قباء پہنچیں ابن زبیر کی ولادت ہوگئی۔ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والا یہ پہلا نومولود تھا۔ بکثرت روزے رکھتے۔ بہت نمازیں پڑھتے۔ بڑے جسیم اور مضبوط گرفت کے مالک تھے۔ فصیح اللسان تھے۔ حق و صداقت کو قبول کرنے والے اور رشتہ داروں کے دکھ تکلیف کو پہنچنے والے تھے۔ ۶۴ھ میں یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کی بیعت کی گئی۔ حجاز' عراق' یمن' مصر اور اکثر علاقہ شام پر یہ غالب آئے۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے مکہ میں ان کا محاصرہ کر لیا اور ان

کو ۷۳ھ میں پھانسی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔

٦ - بَابُ الفَوَاتِ وَالإِحْصَارِ حج سے رہ جانے اور روکے جانے کا بیان

(٦٤٥) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَدْ أُحْصِرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَحَلَقَ رَأْسَهُ، وَجَامَعَ نِسَاءَهُ، وَنَحَرَ هَدْيَهُ، حَتَّى اعْتَمَرَ عَاماً قَابلاً. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا گیا تو آپؐ نے اپنا سر منڈوایا اور قربانی کی اور اپنی ازدواج سے تعلق زن و شو قائم کیا یہاں تک کہ آپؐ نے آئندہ سال عمرہ کیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ باب الفوات والاحصار ﴾ فوات کے فاء پر فتحہ۔ یعنی اس کا کیا حکم ہے۔ جس نے حج کا احرام باندھا ہو مگر وہ حج نہ کر سکے۔ جیسے وہ شخص جو عرفہ میں اس وقت پر نہ پہنچ سکا جس میں وقوف عرفہ ضروری اور فرض ہے اور احصار کے معنی رکنا ہے۔ جیسے کوئی بیمار ہو جائے یا پہنچنے سے عاجز ہو جائے یا اس کے اور بیت اللہ کے درمیان دشمن حائل ہو جائے جو اسے بیت اللہ پہنچنے میں رکاوٹ ہو۔ جب دشمن کی وجہ سے پہنچنا ناممکن ہو تو دشمن کی اس رکاوٹ و ممانعت کو حصر کہتے ہیں۔ ﴿ احصر ﴾ صیغہ مجہول یعنی عمرہ سے روک دیا گیا۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ٦ھ میں پیش آیا تھا۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ محصر کو جہاں روک دیا گیا ہو وہیں احرام کھول کر حلال ہو جائے اور وہیں اپنی قربانی کر دے۔ ﴿ حتی اعتمر عاما قابلا ﴾ حتی کہ آئندہ سال عمرہ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرہ کی قضا واجب ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہی خبر ہے کہ آپؐ نے کیا اور یہ وجوب کو مقتضی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ یہ عمرہ آپؐ کا پہلے عمرہ کی قضا تھی۔ بلکہ یہ تو مستقل طور پر دوسرا عمرہ تھا اور اس کا نام عمرۃ القضاء تو صرف اس لئے رکھا گیا کہ حدیبیہ کے موقع پر اس مسئلہ کا فیصلہ دونوں فریق کیلئے تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں صلح حدیبیہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ٦ھ میں رسول اللہ ﷺ احرام بند ہو کر اپنے اصحاب کے ہمراہ مکہ کی طرف آئے۔ مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ آپؐ نے وہیں احرام کھول دیا' قربانی کی اور سر کے بال منڈائے۔ صحابہ نے بھی تھوڑے سے تامل کے بعد احرام کھول دیئے اور جن کے پاس قربانی کے جانور تھے وہیں نحر و ذبح کر دیئے۔

احصار میں کون سی چیزیں شمار ہوتی ہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ حج و عمرہ کے بجا لانے میں جو چیز بھی مانع ہو اور رکاوٹ بنے اسی سے احصار پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ احصار صرف دشمن کے مانع آنے کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ محصر کی قربانی کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا مذہب ہے

کہ جس جگہ احرام کھولا جائے اسی جگہ قربانی کر دی جائے گی خواہ وہ جگہ حل ہو یا حرم اور یہی قول راجح ہے۔ مگر احناف کے نزدیک قربانی ہر صورت میں حرم میں ذبح و نحر ہونی چاہئے اور اسے کسی کے ذریعہ سے حرم میں بھیج دیا جائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر قربانی کا جانور حرم میں پہنچانا ناممکن ہو تو جہاں ہو وہیں ذبح کر دے۔ رہا یہ مسئلہ کہ محصر پر قربانی واجب ہے یا نہیں اکثر علماء تو اسے واجب کہتے ہیں مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ واجب نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب کے پاس ھدی تو نہیں تھی اگر واجب ہوتی تو پھر سب کیلئے اس کا وجوب ہوتا۔ حالانکہ ایسا ثابت نہیں اور یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے۔

(٦٤٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى ضُبَاعَةَ بِنْتِ الزُّبَيْرِ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أُرِيْدُ الحَجَّ، وَأَنَا شَاكِيَةٌ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «**حُجِّي وَاشْتَرِطِي أَنَّ مَحِلِّي حَيْثُ حَبَسْتَنِي**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے۔ اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! میں حج کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں مگر میں بیمار ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ "حج کر مگر یہ شرط کر لے کہ میرے احرام کھولنے کی جگہ وہی ہوگی جہاں اے اللہ! تو نے مجھے روکا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿شاکیۃ﴾ بیمار۔ ﴿محلی﴾ میم پر فتحہ اور "حا" کے نیچے کسرہ یعنی حج سے خروج کا وقت اور احرام کھول کر میرے حلال ہو جانے کی جگہ۔ یعنی وقت اور مقام دونوں کا بیان مقصود ہے۔ ﴿حبستنی﴾ صیغۂ مخاطب یعنی اے اللہ! جہاں تو مجھے روک لے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام میں شرط لگانا صحیح ہے۔ شرط لگانے والے کو جب کوئی مانع پیش ہو جائے تو محصر کی طرح اس پر قربانی وغیرہ کرنا لازم نہیں۔

(٦٤٧) وَعَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ الحَجَّاجِ بْنِ عَمْرٍو الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَنْ كُسِرَ أَوْ عَرِجَ فَقَدْ حَلَّ، وَعَلَيْهِ الحَجُّ مِنْ قَابِلٍ**»، قَالَ عِكْرِمَةُ: فَسَأَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَأَبَا هُرَيْرَةَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالاَ: صَدَقَ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کا پاؤں توڑا جائے یا لنگڑا ہو جائے وہ احرام سے باہر آگیا اب اس پر آئندہ سال حج کرنا لازمی و ضروری ہے۔" عکرمہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو ان دونوں نے جواب دیا کہ حجاج بن عمرو نے ٹھیک اور سچ کہا ہے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

قَالَ مُصَنِّفُهُ - حَافِظُ العَصْرِ، قَاضِي القُضَاةِ أَبُو الفَضْلِ أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ حَجَرِ الكَنَانِيُّ العَسْقَلَانِيُّ المِصْرِيُّ، أَبْقَاهُ اللَّهُ فِي خَيْرٍ -: آخِرُ الجُزْءِ ٱلأَوَّلِ، وَهُوَ النِّصْفُ مِنْ هٰذَا الكِتَابِ المُبَارَكِ، قَالَ: وَكَانَ الفَرَاغُ مِنْهُ فِي ثَانِيَ عَشَرَ شَهْرِ رَبِيْعِ الأَوَّلِ سَنَةَ سَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ وَثَمَانِمِائَةٍ، وَهُوَ آخِرُ رُبْعِ العِبَادَاتِ، يَتْلُوْهُ فِي الجُزْءِ الثَّانِي كِتَابُ البُيُوعِ. وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً دَائِماً أَبَداً. غَفَرَ اللَّهُ لِكَاتِبِهِ وَلِوَالِدَيْهِ وَلِكُلِّ المُسْلِمِيْنَ، وَحَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الوَكِيْلُ.

بلوغ المرام کے مصنف حافظ العصر، قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ابوالفضل احمد بن علی بن حجرالکنانی العسقلانی مصری اللہ تعالیٰ ان کو بھلائیوں میں ہمیشہ زندہ رکھے نے کہا ہے کہ اتنا حصہ جزء اول کا آخری حصہ ہے اور وہ اس کتاب کا نصف ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں ۸۲۷ھ ماہ ربیع الاول کی ۱۲/ تاریخ کو اس سے فارغ ہوا اور یہ عبادات کے چوتھائی کا آخری حصہ ہے۔ اب اس کے ساتھ دوسرا نصف کتاب البیوع کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے کاتب اور اس کے والدین اور جمیع مسلمین کو اپنے دامن مغفرت میں ڈھانپ لے اور اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

لغوی تشریح: ﴿کسر﴾ صیغہ مجہول۔ ﴿اوعرج﴾ عین اور را دونوں پر فتحہ۔ پاؤں میں ایسی چوٹ آنا جو پیدائشی نہ ہو اور جب پیدائشی ہو تو اس صورت میں عرج را کو کسرہ سے پڑھا جائے گا۔ ﴿فقد حل﴾ یعنی اس کیلئے احرام ترک کر دینا جائز ہے اس کے بعد وہ اپنے وطن اور گھر کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ ﴿وعليه الحج من قابل﴾ آئندہ سال حج کی قضائی دے گا جبکہ یہ فرضی حج ہو لیکن اگر حج نفلی ہو تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اس سلسلے میں علامہ الیمانی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ محرم احرام سے تین امور کی وجہ سے نکل سکتا ہے۔ (۱) احصار کی وجہ سے۔ یہ احصار خواہ کسی مانع کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ (۲) اس نے شرط کر لی ہو۔ (۳) کسی حادثہ کی وجہ سے پاؤں وغیرہ میں چوٹ آگئی ہو یا وہ لنگڑا ہوگیا ہو۔ جس شخص کا حج احصار کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے فوت ہوا ہو اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ حج اور عمرہ کیلئے جو احرام باندھا تھا اس سے حلال ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ عمرہ کے لئے تلبیہ کہے گا اور ازسرنو دوبارہ احرام باندھے گا پھر جس کا حج فوت ہو جائے اس کیلئے دم دینے میں اختلاف ہے۔ ظاہر بات یہی ہے کہ دم دینا واجب نہیں ہے۔ (دم دینا--- یعنی قربانی کرنا)

حدیث کے بعد والی عبارت ۱۲۹۹ھ کے مطبوعہ نسخہ مطبع صدیقیہ جو بھوپال کا ایک سرکاری مطبع ہے میں موجود ہے۔ یہ نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ کا مطبع ہے۔ اس طباعت کی چند خصوصیات و امتیازات ہیں۔ یہ مطبوعہ نسخہ شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری کے تحریر کردہ مخطوطہ نسخہ سے لیا گیا ہے جو مؤلف کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اس نسخہ کو اول تا آخر پوری احتیاط اور تحقیق سے ان کے روبرو پڑھا۔ اس مخطوطہ نسخہ میں ان کے بڑے بڑے شاگردوں کے نام بھی ہیں جنہوں نے شیخ الاسلام زکریا کے سامنے اس نسخہ کو پڑھا تھا۔ انہوں نے اس میں اپنے اپنے دستخطوں اور مہروں کے ساتھ اپنی شنید اور سنی ہوئی باتیں اور پیغامات اور اجازات کو ثبت کر دیا۔ مثلاً امام یوسف جو مصنف کی اولاد ہیں۔ شیخ عبدالباسط بن احمد ھیثمی' ازھری' شیخ محمد بن عبداللطیف ملیجی اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کا ذکر ہے۔ اس نسخہ کی طباعت نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی زیر نگرانی ہوئی اور اس کی مراجعت و تصحیح بڑے بڑے محققین علماء نے فرمائی اور اس کے آخر میں کچھ کلمات جناب شیخ علی علاء الدین آلوسی مؤلف روح المعانی کے پوتے کے ہیں جو جمادی الاولیٰ ۱۲۹۹ھ میں بھوپال میں تشریف لائے تھے۔

راوی حدیث : ﴿ ضباعہ بنت زبیر ﴾ ان کی کنیت ام حکیم ہے۔ ضباعہ کے ضاد پر ضمہ۔ پورا نام ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب بن ھاشم بن عبد مناف ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد بہن ہیں۔ مقداد بن اسود کی اہلیہ تھیں اور ان کے دو بچے عبداللہ اور کریمہ تھے۔ حضرت علیؓ کی خلافت میں فوت ہوئیں۔

﴿ عکرمہ ﴾ عکرمہ کے عین پر کسرہ' کاف ساکن اور راء پر کسرہ۔ ابو عبداللہ کنیت۔ عکرمہ مدنی' عبداللہ بن عباسؓ کے غلام تھے۔ بربر قبیلہ سے تھے۔ بڑے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فقہاء مکہ میں سے تھے۔ تابعین کے درمیانے درجے میں شامل ہیں۔ ۱۰۷ھ میں اسی سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ بعض نے سن وفات میں اختلاف کیا ہے۔

﴿ حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا پورا نام حجاج بن عمرو بن غزیہ انصاری مازنی مدنی ہے۔ شرف صحابیت سے سرفراز ہیں۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ صفین میں شامل ہوئے۔ ان سے دو احادیث مروی ہیں' جن میں سے ایک یہ ہے۔